بسم اللہ الرحمن الرحیم

دیباچہ

یہ کتاب میری ہفت سالہ سیر و سیاحت ہند کا لُبِ لُباب ہے۔ ا...
ہندوستان کے ہر صوبہ کے حالات۔ چشم دید واقعات اور تمدنی ترقیات کے
سنہ ۱۹۰۹ع تک کے تاریخی کوائف اس جامعیت سے قلم بند کئے ہیں کہ ا...
... انگریزی کے سفرناموں میں بیک جا بمشکل مل سکینگے۔ قابل دید مقامات کی ...
...ات قدیمہ و جدیدہ کی ۳۴ عکسی تصویریں اور ہندوستان کا ایک نقشہ شامل ...
...س لمبی چوڑی سیا... سے اپنی زندگی کے اس حصہ میں جو کامیابی
ہوئی وہ میرے والد بزرگوار ...الدین صاحب مرحوم ہوشیارپوری کی دعاؤں
کی برکات کا اثر ہے۔ جنہوں نے کچھ عرصہ ہوا بمقام امرتسر انتقال کیا۔ اللہ تعالٰے
اُنہیں جوارِ رحمت میں جگہ عطا کرے +

جن دوستوں نے سفر و حضر میں میری امداد کی اور جن اُردو و انگریزی
اخباروں نے میرے سفر کی نسبت اپنی قیمتی رایوں کا اظہار فرما کر میری عزت افزائی
کی ہیں اُن کا تہ دل سے ممنون ہوں۔ ناظرین سے التماس ہے کہ اس سفرنامہ
کے مطالعہ کے بعد حُسن و قبح سے خاکسار کو مطلع فرمائیں تاکہ آئندہ اشاعت میں
اُن کی رایوں سے استفادہ کیا جائے +

راقم خاکسار
عبدالرحمن امرتسری

لاہور ۱۵ - دسمبر سنہ ۱۹۰۹ع

پہلی فہرست سفروں کی ترتیب سے

صفحہ

تمہید

ہندوستان کا سفر۔ ریلوے بورڈ کا پاس۔ ہندوستان کے سفروں کی تقسیم۔ مضامین سفرنامہ ۲

ریلوے سفر کے حالات .. .. ۵ — ۸

سفر صوبہ پنجاب :-

(۱) پنجاب کی گزشتہ اور موجودہ حالت پر ایک نظر .. .. ۹ — ۲۰

(۲) شملہ سے انبالہ۔ پٹیالہ۔ سرہند۔ لدھیانہ۔ جالندھر۔ امرتسر۔ قادیان۔ لاہور۔ گوجرانوالہ۔ وزیرآباد۔ سیالکوٹ۔ گجرات۔ جہلم۔ راولپنڈی۔ حسن ابدال۔ اٹک۔ پشاور اور درہ خیبر .. .. ۲۱ — ۴۲

سفر پنجاب و سندھ :-

(۱) سندھ کی گزشتہ اور موجودہ حالت پر ایک نظر .. .. ۴۳ — ۸۰

(۲) لاہور سے پاک پٹن۔ ملتان۔ بہاولپور۔ اُچ۔ سکھر۔ بھکر۔ روہڑی۔ خیرپور۔ حیدرآباد۔ کراچی اور وہاں سے سہوان۔ شکارپور و کوئٹہ ۸۰ — ۱۰۴

سفر لاہور سے بمبئی :-

لاہور سے روانگی براہ تھانیسر۔ پانی پت۔ دہلی۔ دہلی قدیم۔ متھرا۔ بندرابن۔ آگرہ۔ دھولپور۔ گوالیار۔ بھوپال۔ برہانپور۔ بمبئی اور ایلیفنٹا .. ۱۰۵ — ۱۶۵

سفر گجرات۔ ایجنسی وسط ہند اور راجپوتانہ :- ۱۶۶

گجرات (۱) گجرات و کاٹھیاوار کی گزشتہ و موجودہ حالت پر ایک نظر .. .. ۱۶۶ — ۱۸۹

(۲) بمبئی سے سورت۔ بڑودہ۔ احمدآباد۔ بھاؤنگر۔ پالیتانہ۔ جوناگڑھ۔ ویراول۔ سومنات۔ راجکوٹ .. .. ۱۸۹ — ۲۰۲

ایجنسی وسط ہند (۱) ایجنسی وسط ہند کی گزشتہ و موجودہ حالت پر ایک نظر ۲۰۳ — ۲۰۵

(۲) احمدآباد سے اندور۔ مئو۔ اجین۔ رتلام۔ جاورہ .. ۲۰۶ — ۲۱۴

راجپوتانہ (۱) راجپوتانہ کی گزشتہ و موجودہ حالت پر ایک نظر .. .. ۲۱۵ — ۲۲۰

پانچواں سفر ممالک متحدہ آگرہ و اودھ :-

(۱) ممالک متحدہ آگرہ و اودھ کی گزشتہ و موجودہ حالت پر ایک نظر .. ۲۴۷

(۲) لاہور سے روانگی براہ سہارنپور۔ دیوبند۔ رڑکی۔ پیران کلیر۔ ہردوار۔ گروکل۔ ڈیرہ دون۔ مرادآباد۔ رام پور۔ بریلی۔ بدایوں۔ شاہجہاں آباد۔ لکھنؤ۔ ردولی۔ فیض آباد۔ اجودھیا۔ جونپور۔ بنارس ۲۴۲

چھٹا سفر صوبہ بنگالہ و مشرقی بنگال :- ۳۰۱

بہار
(۱) بہار کی گزشتہ و موجودہ حالت پر ایک نظر .. ..
(۲) بنارس سے سہسرام۔ گیا۔ بدھ گیا۔ پٹنہ۔ پھلواری۔ بہار۔ ہگلی۔ کلکتہ۔ کٹک۔ پوری اور وہاں سے مرشدآباد ۳۰۸

بنگالہ
(۱) مشرقی بنگال کی گزشتہ و موجودہ حالت پر ایک نظر ۳۴۹ ۳۵۱
(۲) کلکتہ سے ڈھاکہ۔ دارجیلنگ۔ بھاگل پور۔ دربھنگا۔ مظفرپور۔ گورکھپور۔ نگھر۔ بہرائچ۔ نیپال گنج۔ امروہہ۔ میرٹھ ۳۵۲ - ۳۶۳

پانچویں اور چھٹے سفر کا ضمیمہ :-

میرٹھ سے علیگڈھ۔ کانپور۔ الہ آباد .. .. ۳۶۴ ۔ ۳۹۰

ساتواں سفر ملک دکن :-

(۱) دکن کی گزشتہ اور موجودہ حالت پر ایک نظر .. .. .. ۳۹۱ - ۳۹۱

(۲) الہ آباد سے جبل پور۔ اورنگ آباد۔ دولت آباد۔ خلدآباد۔ غارہائے الورا۔ ناندیر۔ حیدرآباد۔ سکندرآباد (وہاں سے منماڑ کی واپسی) احمدنگر۔ بیجاپور۔ گلبرگہ۔ مدراس۔ پانڈی چری۔ ترچناپلی۔ ٹوٹی کورن۔ (وہاں سے مدراس کی واپسی) ویلور۔ بنگلور۔ میسور۔ سری رنگاپٹن۔ کولھاپور۔ پونہ .. .. ۳۹۹ - ۴۲۸

دوسری فہرست حروف تہجی کی ترتیب سے

نام شہر	نمبر صفحہ
الف	
آگرہ	۱۴۵-۱۳۸
اٹک	۶۶-۶۵
اجمیر	۲۲۴-۲۲۲
اجودھیا	۲۹۱-۲۹۰
اُجین	۲۱۳-۲۰۸
اُوچ	۸۸-۸۷
احمد آباد	۱۹۴-۱۸۸
احمد نگر	۴۱۹-۴۱۷
الٰہ آباد	۳۹۰-۳۸۵
الور	۲۲۵-۲۲۳
امرتسر	۳۷-۳۲
امروہہ	۳۷۱-۳۷۰
انبالہ	۲۶-۲۵
اندور	۲۰۸-۲۰۴
اودے پور	۲۲۲-۲۱۹
اورنگ آباد	۴۰۲-۴۰۱
ایلیفنٹا	۱۷۴
ب	
بھٹنڈا	۲۳۶
بدایوں	۲۷۲-۲۷۱
بڑودہ	۲۸۹-۲۸۳
بدھ گیا	۳۰۹
برہانپور	۱۶۲-۱۶۰
بریلی	۲۷۰-۲۶۸
بمبئی	۱۷۴-۱۶۳
[illegible]	۳۰۰-۲۹۶
بندرابن	۱۳۸-۱۳۷

نمبر شمار	نام شہر	نمبر صفحہ
۲۷	بہار	۳۱۵-۳۱۴
۲۸	بہاولپور	۸۶-۸۴
۲۹	بہرائچ	۳۷۰-۳۶۹
۳۰	بنگلور	۴۴۱-۴۴۰
۳۱	بھاگلپور	۳۶۵
۳۲	بھاؤنگر	۱۹۵-۱۹۴
۳۳	بھرتپور	۲۳۲-۲۳۱
۳۴	بھکّر	۹۰-۸۹
۳۵	بھوپال	۱۶۰-۱۵۶
۳۶	بیجاپور	۴۲۴-۴۱۹
	پ	
۳۷	پاک پٹن	۸۱-۸۰
۳۸	پالیتانہ	۱۹۵
۳۹	پانڈی چری	۴۳۵-۴۳۴
۴۰	پانی پت	۱۱۰-۱۰۸
۴۱	پٹنہ	۳۱۳-۳۰۹
۴۲	پٹیالہ	۲۸-۲۶
۴۳	پشاور	۷۰-۶۶
۴۴	پوری (جگن ناتھ)	۳۴۶-۳۴۲
۴۵	پونہ	۴۴۸-۴۴۶
۴۶	پھلواری	۳۱۴-۳۱۳
۴۷	پیران کلیر	۲۵۲
	ت	
۴۸	ترچناپلی	۴۳۷-۴۳۶
۴۹	ٹوٹی کورن	۴۳۸-۴۳۷
۵۰	تھانیسر	۱۰۷-۱۰۵
	ج	
۵۱	جالندھر	۳۱

نمبر شمار	نام شہر	نمبر صفحہ
۵۲	جاورہ	۲۱۴-
۵۳	جبل پور	۴۰۱-۳۹۹
۵۴	جودھ پور	۲۲۶-۲۲۴
۵۵	جوناگڑھ	۱۹۷-۱۹۶
۵۶	جونپور	۲۹۵-۲۹۲
۵۷	جہلم	۶۲
۵۸	جے پور	۲۳۰-۲۲۷
	چ	
۵۹	چتوڑ گڑھ	۲۱۹-۲۱۸
	ح	
۶۰	حسن ابدال	۶۵-۶۴
۶۱	حصار	۲۳۵
۶۲	حیدرآباد (سندھ)	۹۷-۹۴
۶۳	حیدرآباد (دکن)	۴۱۶-۴۰۶
	خ	
۶۴	خلد آباد	۴۰۴
۶۵	خیرپور	۹۴-۹۲
	د	
۶۶	دارجیلنگ	۳۶۴-۳۶۳
۶۷	دربھنگا	۳۶۶
۶۸	درہ خیبر	۷۲-۷۱
۶۹	دولت آباد	۴۰۳-۴۰۲
۷۰	دہلی	۱۲۲-۱۱۰
۷۱	دہلی (قدیم)	۱۳۴-۱۲۳
۷۲	دھولپور	۱۴۷-۱۴۵
۷۳	دیرہ دون	۲۶۲-۲۵۸
۷۴	دیوبند	۲۵۰-۲۴۹
۷۵	ڈھاکہ	۳۶۳-۳۵۶

نمبر	نام شہر	نمبر صفحہ
	ر	
۷۶	راجکوٹ	۲۰۱-۲۰۲
۷۷	رام پور	۲۶۴-۲۶۷
۷۸	راولپنڈی	۶۲-۶۴
۷۹	رتلام	۲۱۳-۲۱۴
۸۰	ردولی	۲۰۸-۲۰۹
۸۱	رڑکی	۲۵۱-۲۵۲
۸۲	روڑھی	۹۱-۹۲
	س	
۸۳	سرہند	۲۸-۲۹
۸۴	سری رنگ پٹن	۴۴۲-۴۴۳
۸۵	سکندرآباد	۴۰۹
۸۶	سکھر	۸۸-۸۹
۸۷	سملہ	۲۱-۲۴
۸۸	سورت	۱۷۹-۱۸۲
۸۹	سومناتھ	۱۹۸-۲۰۱
۹۰	سہارنپور	۲۴۶-۲۴۹
۹۱	سہسرام	۳۰۵-۳۰۶
۹۲	سیالکوٹ	۵۹-۶۰
۹۳	سیہوان	۱۰۱
	ش	
۹۴	شاہجہانپور	۲۶۳-۲۶۴
۹۵	شکارپور	۱۰۱-۱۰۲
	ع-غ-ف-ق	
۹۶	علیگڈھ	۳۷۴-۳۸۲
۹۷	غارہائے ایلورا	۴۰۵-۴۰۶
۹۸	فیض آباد	۲۸۹
۹۹	قادیاں	۳۸-۴۱
	ک	
۱۰۰	کٹک	۳۴۲
۱۰۱	کراچی	۹۸-۱۰۰
۱۰۲	کلکتہ	۳۲۰-۳۲۱
۱۰۳	کولھاپور	۴۴۴-۴۴۵
۱۰۴	کوئٹہ	۱۰۳-۱۰۴
	گ	
۱۰۵	گجرات	۶۰-۶۱
۱۰۶	گروکل	۲۵۳-۲۵۷
۱۰۷	گلبرگہ	۴۲۴-۴۲۵
۱۰۸	گوجرانوالہ	۵۷-۵۸
۱۰۹	گوالیر	۱۴۸-۱۵۶
۱۱۰	گورکھپور	۳۶۷-۳۶۸
۱۱۱	گیا	۳۰۷-۳۰۸
	ل	
۱۱۲	لاہور	۴۲-۵۷
۱۱۳	لکھنؤ	۲۷۵-۲۸۸
۱۱۴	لدھیانہ	۲۹-۳۰
	م	
۱۱۵	متھرا	۱۳۵-۱۳۶
۱۱۶	مدراس	۴۲۶-۴۳۴
۱۱۷	مرادآباد	۲۶۲-۲۶۳
۱۱۸	مرشدآباد	۳۴۷-۳۴۸
۱۱۹	مظفرپور	۳۶۷
۱۲۰	مگھر	۳۶۸-۳۶۹
۱۲۱	ملتان	۸۱-۸۲
۱۲۲	مئو	۲۰۸
۱۲۳	میرٹھ	۳۷۲-۳۷۳
۱۲۵	میسور	۴۴۱-۴۴۲
	ن	
۱۲۶	ناندیر	۴۰۶
۱۲۷	نیپال گنج	۳۷۰
	و	
۱۲۸	وراول	۱۹۸
۱۲۹	وزیرآباد	۵۸
۱۳۰	ویلور	۴۳۸-۴۳۹
	ہ	
۱۳۱	ہردوار	۲۵۲-۲۵۴
۱۳۲	ہنگلی	۳۱۵-۳۱۹

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سیاحتِ ہند

(یعنی ہندوستان کا ہفت سالہ سفرنامہ)

تمہید

مارچ ۱۸۹۵ء سے میری زندگی کا وہ حصہ شروع ہوتا ہے جس میں مجھے دُنیا کی سیر و سیاحت کا شوق پیدا ہُوا اور خدا کے فضل سے اب تک جاری ہے۔ اس گیارہ برس کے عرصے میں ہندوستان، عراق عرب، الجزیرہ، شام، استنبول، بیت المقدس، مصر، طرابلس، تونس، الجزائر، مراکو، اندلس، انگلستان، فرانس، رومتہ الکبریٰ، سِسلی، مالٹا، اور بلادِ عرب کی سیر کی +

پہلا سفر

میرا پہلا سفر ۱۸۹۵ء میں بحیرۂ قلزم کے راستے سے قاہرہ کو تھا۔ یہ سیاحت مصر، شام اور اسلامی دارالخلافہ قسطنطنیہ کے سفر تک محدود رہی۔ اور فروری ۱۹۰۰ء میں [illegible] تک پہنچے [illegible] بنارس [illegible] دو سال کے عرصے میں عربی علم ادب اور عرب کی تاریخ میں مہارت پیدا کرنے کا اچھا موقع ملا۔ جامع ازہر کے شیوخ (پروفیسروں) اور مختلف

شہروں کے علما کی صحبتوں سے جو استفادہ کیا۔ امیروں کی ملاقات اور قومی مجالس میں شریک ہونے کے باعث اُس طرف کے مسلمانوں کی طرزِ معاشرت کی واقفیت سے جو مسرت حاصل ہوئی۔ اور خاصکر تجارتی مشاغل نے فارغ البالی اور آزادانہ زندگی بسر کرنے میں جو رہنمائی کی۔ وہ میری آئندہ زندگی کے لئے ایک عظیم انقلاب کا موجب قرار پائی۔ سرکاری ملازمت جو سفر سے پیشتر بہت دلپسند شغلہ تھا۔ اب قیدِ بے زنجیر معلوم ہونے لگی۔ وطن پہنچ کر نوکری کو خیرباد کہا۔ بقیۂ عمر سیر و سیاحت میں بسر کرنے اور علمی معلومات بڑھانے کو اپنا مقصد قرار دیا۔ سب سے پہلے عربی زبان پر دو رسالے لکھے جن کے اب تک ہزاروں نسخے ملک میں پھیل چکے ہیں پھر ایک سفرنامہ بلادِ اسلامیہ کے نام سے شائع کیا جو قوم میں پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا گیا +

دوسرا سفر

دوسرا سفر ۱۹۰۵ء میں خلیج فارس کے راستہ سے بغداد، دیاربکر اور حلب کا تھا۔ جس سے مقامات مقدسہ کی زیارت اور بابل۔ نینوے اور بعلبک کے کھنڈر دیکھنے مقصود تھے۔ یہ دشوار گزار سفر بغداد سے حلب تک ۳۰ دن خچروں اور گاڑیوں کے ذریعے جاری رہا۔ اور اس میں عبدالسلام افغان میرے باوفا ملازم کی مستعدی نے بڑا کام کیا۔ پھر بیروت سے مصر اور وہاں سے افریقہ ہوتے ہوئے یورپ کی سیر کا اتفاق ہوا۔ جو اس وقت علمی صناعی۔ تجارتی اور تمدنی ترقیات میں شہرہ آفاق ہے۔ خدا تعالےٰ کا ہزار ہزار شکر ہے کہ واپسی پر اخیر ۱۹۰۶ء میں ادائے فریضہ حج کا شرف بھی حاصل ہوا +

ہندوستان کا سفر

اِن سفروں کے دوران میں تقریباً سات سال ہندوستان کی سیاحت پر صرف ہوئے جو کثرت آبادی میں یورپ کا ہم پلہ۔ قدیمی علوم و فنون میں ایران اور مصر کا مدمقابل۔ تموّل کے لحاظ سے ہمیشہ غیر قوموں کا مطمح نظر اور آثار قدیمہ کے

لحاظ سے آج کل یورپ و امریکہ کے عالموں اور سیاحوں کا مرجع ہے۔ ہندوستان کے
مختلف حصوں کی سیر سے میرا خاص مقصد کتب قدیمہ کی فراہمی اور ہندوستان کی
پرانی مصنوعات و نوادر کی بہم رسانی تھی جس کی تجارت سے ہندوستان۔ ایشیا۔
افریقہ اور یورپ کے سفروں میں میرے مصارف چلتے رہے۔ ان نوادر کا بڑا
حصہ اگرچہ انیسویں صدی مسیحی میں یورپین و امریکن سیاحوں کی قدر دانی سے
لندن۔ پیرس۔ برلن اور ممالک متحدہ امریکہ کے کتب خانوں اور عجائب گھروں میں
پہنچ چکا ہے مگر ہندوستان کے سلاطین اسلام اور امرائے عظام کی سات سو سالہ
کوششوں سے صنعت و حرفت میں جو ترقی ہوئی تھی۔ ابھی اس کے آثار باقی
ہیں اور تلاش کرنے سے جا بجا دستیاب ہوتے ہیں۔ انہی چیزوں کی خرید و فروخت
امرا اور علما کی ملاقات اور باشندوں کے عادات و اطوار جاننے کا ذریعہ تھی ہندوستان
میں کوئی بڑا شہر ایسا کم ہوگا جہاں مجھے چند روز ٹھیرنے کا اتفاق نہ ہوا ہو اور
بعض جگہ تو مہینوں ٹھیرنا پڑا +

ریلوے بورڈ کا پاس

۱۹۰۸ء میں ہندوستان کے تمام صوبوں کی سیر اور سابقہ معلومات تازہ
کرنے کا ایک خاص موقع ریلوے بورڈ کے پریزیڈنٹ سر ایف۔ رپکاٹ۔ کے۔ سی
Sir F. Rupcatt K.C.V.O, C.S.I,
President Ry. Board India.
وی۔ او۔ سی۔ ایس۔ آئی
کی مہربانی سے مجھے حاصل ہوا جو انہوں نے ہندوستان کا سفرنامہ مرتب کرنے
اور مسافروں کے واسطے سہولتیں بہم پہنچانے کی غرض سے میری اعانت کی تھی۔
دوسرے درجہ کا ٹکٹ مع نوکر مجھے عطا کیا۔ ان کی اس فیاضی سے ریل کے
دروازے میری آمد و رفت کے واسطے ہر وقت کھلے رہتے تھے اور غالباً میں
پہلا شخص ہوں جس کو حکام ریلوے نے یہ امتیاز بخشا +

سفروں کی تقسیم

ان سفروں میں جو کچھ میں نے دیکھا ہے۔ اس کا مختصر حال دو حصوں میں

قلم بند کیا ہے - پہلا حصہ جس کا نام سیاحت ہند ہے اسوقت پبلک کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے۔
اور اس کا ضمیمہ عنقریب شائع ہوگا۔ دوسرا حصہ جس میں بلاد اسلامیہ و یورپ کی مفصل سرگزشت ہے
بعد میں ہدیۂ ناظرین ہوگا۔ سیاحت ہند سات سفروں میں حسب ذیل منقسم ہے:-

پہلا سفر - ملک پنجاب - شملہ سے پشاور تک +

دوسرا سفر - پنجاب و سندھ - لاہور سے کراچی و کوئٹہ تک +

تیسرا سفر - لاہور سے بمبئی تک +

چوتھا سفر - گجرات - اجنٹی وسط ہند اور راجپوتانہ +

پانچواں سفر - ممالک متحدہ آگرہ و اودھ - سہارنپور سے بنارس تک +

چھٹا سفر - صوبۂ بہار، اڑیسہ و بنگالہ - (پانچویں اور چھٹے سفر کا ضمیمہ) +

ساتواں سفر - دکن - جبل پور سے براہ حیدر آباد - ٹوٹی کورن تک +

مضامین

ہر سفر کے پہلے اُس صوبہ کے حدود - آب و ہوا - پیداوار - باشندوں کے عادات و اطوار - صنعت و تجارت اور تعلیم کا اجمالی حال درج کیا ہے - تمام نامی گرامی شہروں کی گزشتہ و موجودہ حالت - تمدنی ترقیات - قابل دید مسجدوں - مندروں - مقبروں - قلعوں اور شاہی محلات کی مختصر کیفیت اور تاریخی واقعات درج کئے ہیں - ۴۴ عکسی تصویریں اُن مقامات کی شامل کی گئی ہیں جو عمارتی خوبیوں کے لحاظ سے تمام ہندوستان میں مشہور ہیں +

اس کے علاوہ اُنیسویں صدی کے بعض مشاہیر کے حالات اور ملک کے مشہور واقعات خصوصاً مشرقی علوم کی ترقی و تنزل - انگریزی تعلیم سے آزاد خیالی پیدا ہونے - نیشنل کانگریس کے ملکی حمایت پر کمر باندھنے - ہندو و مسلمانوں کے اعلیٰ درجہ کے دینی اور دنیاوی سکولوں اور کالجوں کے قائم کرنے ۔ ۱۹۰۷ء میں ملکی شورش سے جابجا تہلکہ برپا ہونے کے اسباب اپنے اپنے موقع پر درج ہوئے ہیں +

ریلوے سفر کے حالات

ریل کا اتنا لمبا چوڑا سفر جو میں نے ہندوستان میں کیا۔ دس ہزار میل سے کسی طرح کم نہ تھا۔ اس تمام سفر میں جہاں تک حالات دیکھنے کا موقع ملا۔ ریلوے مسافروں کے آرام و آسائش کا انتظام۔ ان کی نوعیت اور مقامی حیثیت کے لحاظ سے خاصا پایا۔ ہر سٹیشن کے ساتھ مسافروں کے واسطے ویٹنگ روم۔ ریفرشمنٹ روم۔ بیرون سٹیشن کھاتے پینے کی دکانیں موجود ہیں۔ اس سلسلہ میں اودھ رہیلکھنڈ ریلوے کا انتظام ہندوستان بھر میں سب لائینوں سے اچھا نظر آیا۔ ہر سٹیشن کے باہر حلوائی۔ میوہ فروش اور نانبائی کی دکانیں ایک قطار میں بنی ہوئی ہیں۔ انگریزوں اور انگریزی فیشن کے مسافروں کے واسطے ہندوستان کے بڑے بڑے سٹیشنوں پر ریفرشمنٹ روم ہیں۔ جہاں انگریزی طریق کے کھانے بہم پہنچائے جاتے ہیں۔ چند جنکشن سٹیشنوں پر ہندو مسلمانوں کے واسطے علٰحدہ علٰحدہ بھی ریفرشمنٹ روم بنائے گئے ہیں تاکہ ہندوستانی مسافروں کو دیسی مذاق کے موافق عمدہ کھانے مل سکیں۔ ان دیسی ریفرشمنٹ روموں کو اب تک بہت فروغ نہیں ہوا۔ کاٹھیاوار کے سوا ملک کے باقی حصوں میں مسلمانوں کی نسبت ہندوؤں کے ریفرشمنٹ روم زیادہ کامیاب ہیں۔

ریفرشمنٹ روم

مدراس اور جنوبی ہند میں مسلمان مسافروں کو علی العموم وہ سہولتیں حاصل نہیں جو دیگر مقامات پر ہیں۔ اور غالباً مسلمانوں کی کمی کے سوا اس کی دوسری وجہ ہوگی

ہر مقام پر سٹیشن کے اندر اور باہر اسباب لانے اور لے جانے کے واسطے لائسنس دار قُلی اور شہر تک آمد و رفت کے واسطے مقامی حالات کے موافق "یکے"۔ ٹانگے۔ گھوڑا گاڑیاں اور بیل گاڑیاں موجود رہتی ہیں۔ اکثر سٹیشنوں اور شہر کے قریب ڈاک بنگلے۔ دھرم سالہ اور سرائیں بنی ہوئی ہیں۔ بڑے بڑے شہروں

سواری و مسافر خانے

اور خصوصاً چھاؤنیوں میں انگریزی فیشن کے بہت عمدہ ہوٹل ہیں۔ جو مسافر صرف چند گھنٹے کے واسطے شہر کی سیر کرنا چاہتا ہو۔ اس کے واسطے کلوک روم موجود ہیں۔ جہاں وہ اپنا اسباب ریلوے کی حفاظت میں رکھوا سکتا ہے۔ اس حفاظت کا معاوضہ صرف دو آنے یومیہ فی بنڈل دینا پڑتا ہے +

ٹائم ٹیبل

پلیٹ فارم پر جدا جدا ریلوں کے چھپے ہوئے ٹائم ٹیبل تختوں پر چسپاں ہیں جن میں مختلف مقامات کا فاصلہ اور ہر درجہ کا کرایہ درج ہوتا ہے۔ اے ایچ ویلر کمپنی کی طرف سے کتب فروشی کا کافی انتظام ہے۔ ریلوے ٹائم ٹیبل ناول وغیرہ جو چیزیں اثنائے سفر میں مسافر کے دل بہلاؤ کے واسطے درکار ہوں۔ یہاں سے مل جاتی ہیں۔ بعض مقامات پر اس ملک کی مقامی مصنوعات بھی فروخت ہوتی رہتی ہیں۔ غرض انگریزی تمدن اور اہالیانِ ریلوے کے حسن انتظام سے مسافروں کے آرام و آسائش کا انتظام اس حد تک بہت عمدہ ہے۔ جہاں تک کہ انگریزوں کو اکثر سفر کرنے کا اتفاق ہوتا ہے۔ اور انگریزوں کی بدولت دیسی بھی فائدہ اٹھاتے ہیں +

مسافران درجہ اول و دوم

اس عام انتظام کے ساتھ مختلف درجہ کے مسافروں کا جو سماں سٹیشن اور گاڑیوں میں نظر آتا ہے۔ اس کے دو اس قدر مختلف نظارے ہیں کہ اگر نسبتاً ایک کو بہشت سے اور دوسرے کو جہنم سے تشبیہ دی جائے تو کچھ ناموزوں نہ ہوگا۔ مثلاً پہلے اور دوسرے درجہ کے مسافروں کو ہر قسم کی پوری سہولتیں حاصل ہیں۔ ان کے بکنگ آفس علیحدہ بنے ہوئے ہیں۔ جہاں ان کو بڑی آسانی سے ٹکٹ مل جاتا ہے۔ یہ لوگ ٹکٹ لیتے ہی اپنے اسباب سمیت پلیٹ فارم پر آجاتے ہیں۔ ہر گاڑی میں ایک ایک مسافر کو اس قدر جگہ دی جاتی ہے۔ جس میں اس کے بیٹھنے اور لیٹنے کی پوری گنجائش ہو۔ ہر کمرے میں منہ ہاتھ

دھونے کو غسل خانہ اور رفع ضروریات کے واسطے جائے ضرور موجود ہے۔ لمپ رات بھر جلتے رہتے ہیں۔ ویٹنگ روم میں میز۔ کرسی۔ کوچ۔ آئینہ اور کھونٹیاں موجود ہیں۔ مُنہ ہاتھ دھونے۔ غسل کرنے اور رفع ضروریات کا پورا انتظام ہے۔ گرمیوں کے موسم میں پنکھے بھی موجود ہیں۔ ہر ویٹنگ روم کے واسطے ایک بہرہ نوکر ہوتا ہے جو حسب ضرورت مسافروں کے اسباب کی نگرانی بھی رکھتا ہے +

مسافران درجہ سوم

پہلے اور دوسرے درجہ سے ہٹ کر جب تیسرے درجہ کے مسافروں کی حالت دیکھی جائے تو اس کا نظارہ بہت ہی افسوسناک شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ سب سے پہلے بکنگ اوفس کی کمی۔ مسافروں کی بیشی۔ ہر شخص کی پیش قدمی۔ پولیس کی سخت گیری کبھی اُن کی بد زبانی اور کبھی دست درازی سے مسافروں خصوصاً بوڑھوں بچوں اور عورتوں کی حالت ناگفتہ بہ ہوتی ہے۔ پھر جب تک گاڑی اسٹیشن پر نہ آجائے۔ اُن کو پلیٹ فارم پر جانے کی اجازت نہیں ہوتی۔ پلیٹ فارم پر جاتے وقت ان کی درگت ٹکٹ خریدنے کے وقت سے بھی زیادہ ہوتی ہے۔ اِس افراتفری میں بعض مسافروں کو سوار ہونے ہی کا موقع نہیں ملتا۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک آدمی سوار ہو گیا۔ اور اس کا ساتھی رہ گیا۔ اور دونو کے ٹکٹ ایک ہی کے پاس رہے۔ اکثر اوقات ایک ایک گاڑی میں اس طرح مسافر بٹھانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ جس طرح مال گدام میں اسباب کی گٹھڑیاں رکھی جاتی ہیں۔ جگہ نہ ہونے سے کئی آدمی گھنٹوں کھڑے کھڑے سفر کرتے ہیں۔ اور جو ایک دوسرے کے ساتھ گھچ پچ بیٹھتے ہیں تو گرمیوں میں انہیں سخت تکلیف ہوتی ہے۔ غرض ہر کمپارٹمنٹ کے مسافروں کی جو تعداد مقرر ہے۔ اس کا اکثر خیال نہیں کیا جاتا۔ بعض

اوقات گاڑیوں کی کمی سے مسافروں کو جگہ ہی نہیں ملتی - دوسری ٹرین کے انتظار میں نہایت بے چینی سے ان کو وقت گزارنا پڑتا ہے۔ رفع ضروریات کے واسطے کسی گاڑی میں پاخانہ ہوتا ہے اور کسی میں نہیں - ویٹنگ روم میں کرسی اور کوچ کا تو کیا ذکر ہے - گرمیوں کی تپش اور سردیوں کی ٹھنڈی ہواؤں سے محفوظ رہنے کا بھی کوئی بندوبست نہیں - اور بعض سٹیشنوں میں برسات کی بوچھاڑ سے تو جسمانی تکلیف کے علاوہ مال کو بھی نقصان پہنچتا ہے - پھر اسباب کی حفاظت کا کوئی انتظام نہیں - مسافر ذرا کہیں اُٹھ کر گیا اور گٹھڑی غائب - اس بارے میں الہ آباد ریلوے سٹیشن کا انتظام بہت عمدہ نظر آیا - جہاں تیسرے درجہ کے مسافرخانوں میں دو تین آدمیوں نے علیحدہ علیحدہ لائسنس لیکر مقررہ قطعہ زمین پر قبضہ کر رکھا ہے - یہ لوگ تھوڑے سے معاوضہ پر مسافروں کے اسباب کی حفاظت کرتے ہیں - ان کو حقہ پلاتے ہیں - اور ہر طرح کی ضروریات میں مدد دیتے ہیں +

پانی پلانے والے

ہر اسٹیشن پر اگرچہ ہندو اور مسلمانوں کے واسطے علیحدہ علیحدہ پانی پلانیوالے بہشتی مقرر ہیں - مگر مسلمان مسافروں کو اکثر پانی نہیں ملتا - اس تکلیف کا سب سے زیادہ اثر ان لوگوں پر ہوتا ہے جن کے ننھے ننھے بچے گرمی کے دنوں میں پیاس کی شدت سے بلبلاتے اور اپنی ماؤں کو گھبراہٹ میں ڈالتے ہیں +

انٹر میڈیٹ

ڈیوڑھا درجہ جو صرف ہندوستانی معززین کی آسائش کی غرض سے بنایا گیا ہے - اس کے مسافروں کی حالت کمپارٹمنٹ کی تنگی اور سواریوں کی کثرت سے تھرڈ کلاس کے مسافروں کی مانند ہوتی ہے - البتہ نارتھ ویسٹرن ریلوے نے تھوڑے دنوں سے اس درجہ کی جو گاڑیاں بنائی ہیں وہ ہر طرح سے آرام دہ ہیں +

اب میں اپنے سفر کے حالات شروع کرتا ہوں +

۷۸۶

پہلا سفر صوبہ پنجاب

شملہ سے انبالہ۔پٹیالہ۔سرہند۔لدھیانہ۔جالندھر۔امرتسر۔قادیان۔
لاہور۔گوجرانوالہ۔وزیرآباد۔سیالکوٹ۔گجرات۔جہلم۔
راولپنڈی۔حسن ابدال۔اٹک۔پشاور اور وہاں سے امرتسر
کی واپسی

(پنجاب کی گزشتہ اور موجودہ حالت پر ایک نظر)

اس سفر میں جس قدر شہر میری نظر سے گزرے۔اُس ملک کی آبادی کے
بڑے بڑے مشہور حصّے ہیں جو تاریخ ہند میں صوبۂ پنجاب کے نام سے موسوم ہے
پنجاب دراصل فارسی کے دو لفظوں پنج اور آب سے مرکب ہے جس کے معنی
پانچ دریاؤں کے ہیں۔مغلوں کے زمانے میں یہ لفظ اس وسیع رقبۂ زمین پر بولا جاتا
تھا جو ستلج۔بیاس۔راوی۔چناب اور جہلم کے درمیان واقع ہے مگر اس وقت صوبۂ
پنجاب میں مغلوں کے وقت کا تمام صوبۂ لاہور اور صوبجات دہلی و ملتان کے کچھ
کچھ حصّے شامل ہیں۔انگریزی عملداری کی ابتدا میں اس کی مشرقی حد دریائے جمنا
سے شروع ہو کر مغرب میں کوہ سلیمان تک پھیلتی تھی۔مگر ۱۹۰۱ء میں ہندوستان
کے ویسرائے لارڈ کرزن نے دریائے اٹک کو مغربی حد قرار دیکر پشاور اور دیگر چار

اضلاع کو پنجاب سے جدا کر دیا ہے۔ اور اُن کو ایک علٰحدہ صوبہ قرار دیکر شمال مغربی سرحدی صوبہ کے نام سے موسوم کیا۔ اس وقت صوبۂ پنجاب کا انتظام نواب لفٹنٹ گورنر بہادر کے زیر حکم اور صوبۂ سرحدی کا نظم و نسق ایک چیف کمشنر بہادر کے متعلق ہے جس کا صدر مقام پشاور ہے +

رقبہ و آبادی

صوبۂ پنجاب کا رقبہ ۹۷ ہزار ۲۹۴ مربع میل ہے سنہ ۱۹۰۱ء میں اس کی مردم شماری دو کروڑ تین لاکھ ۳۰ ہزار ۳۹۹ تھی۔ برٹش انڈیا میں یہ صوبہ مردم شماری کے لحاظ سے چوتھے اور رقبے کے لحاظ سے چھٹے درجے پر ہے۔ اگر اس کی آبادی میلوں کے حساب سے پھیلائی جائے تو ایک میل میں ۲۰۹ آدمی آباد ہیں۔ اس آبادی میں نصف کے قریب مسلمان۔ بیس لاکھ سکھ اور باقی ہندو ہیں کسی قدر وہ عیسائی بھی ہیں جنہوں نے انگریزی عملداری میں اس مذہب کو قبول کیا ہے۔ سرکاری مالگزاری سنہ ۱۹۰۶ء میں ۲ کروڑ ۵ لاکھ ۸۶ ہزار ۲۶ روپے سالانہ تھی +

آب و ہوا

پنجاب کا شمالی حصہ کوہستانی ہے جس میں بہت سی پُرفضا وادیاں واقع ہیں۔ جہلم سے مشرق کی طرف نمک کے پہاڑوں کا سلسلہ دریائے سندھ کے پار تک چلا گیا ہے۔ صوبہ کا جنوبی حصہ میدانی علاقہ ہے جس میں کئی دریا بہتے ہیں۔ دو دریاؤں کے درمیانی میدان کو دوآبہ کہتے ہیں۔ یہ دوآبے سرسبزی اور زرخیزی میں مشہور ہیں۔ مگر صوبہ کا بہت بڑا حصہ ریگستانوں اور چٹیل میدانوں سے محیط ہے جس میں کچھ پیداوار نہیں ہوتی۔ موسم گرما میں یہاں سخت گرمی اور سردیوں میں کڑاکے کا جاڑا پڑتا ہے۔ شدت سرما کے لحاظ سے یہ صوبہ تمام ہندوستان میں اوّل درجے پر ہے +

پیداوار

دریاؤں کی کثرت سے یوں تو یہ ملک پہلے بھی سرسبز تھا۔ مگر اب گورنمنٹ انگریزی کی توجہ سے مغربی نہر جمن۔ ستلج کی نہریں۔ باری دوآب کی نہر اور جہلم کی نہر

تیار ہونے سے کئی لاکھ ایکڑ افتادہ اراضی کے مزروعہ بن جانے سے صوبہ
کی پیداوار میں بہت ترقی ہوگئی ہے - نہری اضلاع میں گیہوں - روئی اور
سرسوں بہتات سے ہوتی ہے - خصوصاً گیہوں اس کثرت سے ہوتا ہے - کہ
ہندوستان کے علاوہ ہزاروں من ہر سال یورپ و امریکہ کو جاتا ہے - اگرچہ
زراعت کی اس کثرت سے ملک کی مالی حالت میں ایک تغیر عظیم پیدا ہوگیا ہے -
مگر غلہ کی نکاسی سے ملک میں آئے دن گرانی اور قحط کے آثار نمودار رہتے ہیں ❊

صنعت و حرفت

ایک زمانے میں دیسی صنعت و حرفت یہاں بہت ترقی پر تھی - امیر و غریب
سب یہیں کی بنی ہوئی چیزیں استعمال کرتے تھے - مگر جب سے ولایتی مال آنا
شروع ہؤا اُس کی ارزانی اور نفاست سے ملکی دستکاریاں ماند پڑ گئیں - تصویر
اور نقاشی کا کام جو لاہور میں بالخصوص عمدہ بنتا تھا عکسی کام کے سامنے اس کی
کچھ قدر و منزلت نہ رہی - ملتان کے روغنی برتن جو بہت مشہور تھے چینی برتنوں
کے سامنے اُن کی مانگ کم ہوگئی - البتہ امرتسر اور لدھیانہ میں شال اور قالین اب
تک عمدہ قسم کے بنتے ہیں - اور دور دور تک جاتے ہیں - لدھیانہ کا دیسی کپڑا -
لنگیاں اور کلاہ بہت عمدہ ہوتے ہیں - لنگیاں اور کلاہ خاصکر فوجوں میں زیادہ
کام آتی ہیں ❊

ریل کے اجرا اور سرکاری و پبلک عمارتوں کی روز افزوں ترقی سے معمار -
بڑھئی اور لوہار وغیرہ پیشہ وروں کی قدر البتہ پہلے کی نسبت زیادہ ہوگئی ہے -
پیشتر مزدور کو دو آنے - معمار - بڑھئی اور لوہار کو چار چار آنے یومیہ ملتے تھے -
اب ہر ایک کی اُجرت چوگنی ہے - انگریزی لباس کے عام رواج پانے سے
درزیوں کی سلائی اور دھوبیوں کی دُھلائی بھی اسی نسبت سے بڑھ گئی ہے -
لیکن اس اضافہ اُجرت کے ساتھ چونکہ غلہ گراں اور ضروریات زندگی میں تکلفات

زیادہ ہو گئے ہیں۔ اس واسطے چوگنا معاوضہ ملنے پر بھی عام لوگ تنگ حال ہیں۔ مندرجہ ذیل اعداد کے مقابلہ سے معلوم ہوگا کہ اشیا کا نرخ پہلے کیا تھا اور اب کیا ہے :۔

نام جنس	ریل جاری ہونے سے پہلے کا نرخ	زمانہ حال کا نرخ
گیہوں	ایک روپیہ من پختہ	فی روپیہ آٹھ سیر
چنے	״ دو من پختہ	״ ۱۲ ثار
دود	״ ۲۰ سیر پختہ	״ ۵ ثار
گھی	״ تین سیر پختہ	״ یک ثار
تیل	״ ۱۲ سیر پختہ	״ ۲½ ثار
لکڑی	״ ۵ من پختہ	״ ۱½ من

تجارت

اس ملک سے گیہوں۔ روئی۔ چاے۔ تمباکو۔ میوہ جات۔ خام چمڑا۔ ہڈیاں اور سینگ باہر جاتے ہیں۔ ممالک بیرونی سے جو مال آتا ہے۔ اُس میں سب سے زیادہ مقدار سوتی اور اُونی کپڑے کی ہے۔ اس کا کچھ حصہ کراچی اور بمبئی کے بندرگاہوں اور زیادہ تر ممالک متحدہ آگرہ کے ذریعے آتا ہے۔ کراچی کا بندرگاہ کمی مسافت اور قلت مصارف کے باعث نہایت ترقی پر ہے۔ مٹی کا تیل کلیں اور رانیل کے برتن بھی بکثرت آتے ہیں اور ملک میں ان چیزوں کی زیادہ مانگ ہے۔ علاوہ بریں چرس اور اُون لداخ سے۔ دُھسّے پوستین۔ سمور اور میوہ جات کابل سے آتے ہیں ؀

پنجاب میں دہلی۔ لاہور۔ امرتسر۔ ملتان۔ راولپنڈی اور پشاور تجارت کے بڑے مرکز ہیں۔ یہاں کے تاجروں کے ایجنٹ کراچی۔ بمبئی۔ کلکتہ اور ولایت میں سب جگہ کام کر رہے ہیں۔ ترقی تجارت کے باعث ان شہروں

میں کئی انگریزی بینک موجود ہیں - اور کچھ عرصے سے ہم وطنوں کی مزید سہولت کی غرض سے دیسی لوگوں نے بھی اپنے بینک جاری کر دئیے ہیں +

گورنمنٹ پنجاب نے برآمد اور درآمد مال کے جو نقشے ۱۹۰۶ء میں مرتب کرائے ہیں - اُن کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سال مذکور میں ۲۹ لاکھ روپیہ کا مال باہر گیا اور ایک کروڑ ۱۷ لاکھ کا باہر سے آیا - گویا برآمد کی مقدار درآمد کے مقابلہ میں تقریباً نصف تھی +

ریلوے لائن

نارتھ ویسٹرن ریلوے لائن کا بڑا وسیع سلسلہ پنجاب میں پھیلا ہوا ہے - ایک لائن دہلی سے لاہور اور لاہور سے پشاور تک ۵۷۰ میل جاری ہے - ایک لائن لاہور سے ملتان ہوتی ہوئی مغرب کی طرف کوئٹہ اور جنوب کی طرف کراچی تک چلی گئی ہے ایک تیسری لائن لاہور سے فیروزپور اور بھٹنڈا ہوتی ہوئی راجپوتانہ مالوہ ریلوے سے جا ملی ہے - اور بھی کئی چھوٹی چھوٹی شاخیں اِدھر اُدھر پھیلی ہوئی ہیں +

باشندوں کی حالت

آب و ہوا کی عمدگی کے باعث یہاں کے لوگ قوی الجثہ اور قد آور ہیں - ان کی طبائع - رسم و رواج - عادات و اطوار میں بہت سادگی پائی جاتی ہے - جفاکشی - دلیری - جوانمردی اور ہر قسم کے مشکل کاروبار انصرام کرنے کے اوصاف ان میں جمع ہیں - دیسی فوجوں میں زیادہ تر اسی صوبہ کے لوگ بھرتی ہیں - سکھ اور سرحدی مسلمان اعلےٰ درجے کے سپاہی خیال کئے جاتے ہیں - خصوصاً سکھوں نے فوجی خدمات میں بہت نام پیدا کیا - ملک کی اندرونی لڑائیوں اور سرحدی محاربات کے علاوہ چین - ابی سینیا - مصر اور ٹرنسوال کی مشہور جانکاہ لڑائیوں میں جو جرأت اور بہادری ان سے ظاہر ہوئی - وہ بڑی قابل قدر سمجھی گئی +

پنجاب کے لوگ ایک مدت تک نادر شاہ اور احمد شاہ دُرّانی کی لوٹ مار اور پھر سکھوں کی سیہ اشنڈالیوں سے بدامنی کے میدان اور جہالت کے گڑھے

میں پڑے رہے ۔ مگر انگریزی عملداری میں جب امن کا پھریرا ان کے سروں
پر لہرانے لگا اور ریل و جہاز کے ذریعے آمدورفت کے راستے کھل گئے ۔ تو
پنجاب کے لوگوں کو ممالک بیرونی میں اپنی قابلیت کے جوہر دکھلانے کا موقع ملا۔
پھر تو کسی نے محنت و مزدوری کی وجہ سے ۔ کسی نے تجارت کی خاطر اور کسی نے
اپنے اظہار کمالات کی غرض سے ہندوستان کے باہر دور دور تک جانا شروع
کر دیا ۔ لنکا ۔ آسٹریلیا ۔ مشرقی افریقہ اور مصر میں یہاں کے بہت لوگ کام کر رہے
ہیں ۔ منجملہ ان کے فرقۂ اول خصوصیت سے قابل ذکر ہے ۔ یہ لوگ ہوشیارپور اور
جالندھر کے رہنے والے ہیں ۔ ان میں سے اکثر آنکھوں کا علاج کرتے ہیں اور
بعض رمل و نجوم سے لوگوں کی آئندہ زندگی کے حالات بتا کر انہیں اپنا گرویدہ
بنا لیتے ہیں ۔ اگرچہ یہ لوگ پڑھے لکھے نہیں ہوتے ۔ مگر اپنے فن میں پورے
کامل ہیں ۔ مجھے اپنے سفر بلاد اسلامیہ اور یورپ میں دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے
کہ یہ لوگ مصر ۔ استنبول و افریقہ کے علاوہ یورپ تک پہنچتے ہیں ۔ اور بڑے بڑے
ڈاکٹروں کی موجودگی میں آنکھ کے بیماروں کا علاج کر کے ہزارہا پونڈ کماتے ہیں ۔
چنانچہ جہانگیر نامی ایک شخص ساکن ضلع جالندھر نے لیورپول میں بڑی حیرت ناک
کامیابی حاصل کی ہے ۔ روپے کے علاوہ صدہا سرٹیفکیٹ مریضوں کی صحت یابی
سے فراہم کئے ہیں ۔

تعلیم

انگریزی عملداری سے پیشتر اہل پنجاب علمی قابلیت میں بہت گرے ہوئے
تھے ۔ اور دیگر صوبجات کے مقابلہ میں پست حالت میں نظر آتے تھے ۔ سرکار
انگریزی نے جب علمی ترقیات کے میدان ان کے واسطے صاف کر دئے تو پچاس
برس کے عرصے میں انہوں نے دماغی ترقی کی گھوڑدوڑ میں ایسے تیز قدم اٹھائے
کہ دیگر صوبجات کے بعض تعلیم یافتوں سے کچھ آگے بڑھ گئے ۔ اس وقت

پنجاب میں اعلےٰ تعلیم کے واسطے دس آرٹس کالج اور نین پروفیشنل کالج ہیں۔ علمی ترقی کا سب سے بڑا مرکز لاہور ہے جہاں سرکاری اور پرائیویٹ چار آرٹس کالج اور تین پروفیشنل کالج ہیں۔ ان میں قانون۔ ڈاکٹری اور ویٹیناری کی تعلیم ہوتی ہے۔ مشرقی علوم کے واسطے اورینٹل کالج ہے جس میں عربی۔ فارسی اور سنسکرت کی تعلیم اعلےٰ درجے کی دی جاتی ہے۔ رئیس زادوں کی تعلیم اور تربیت کے واسطے چیفس کالج ہے جو غالباً ہندوستان کے تمام چیفس کالجوں میں خصوصیت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ مگر انجینیرنگ کالج نہ ہونے سے یہاں کے طلبا کو رڑکی تامسن کالج میں جانا پڑتا ہے۔ حالانکہ جتنے انجنیر اس صوبہ میں کام کر رہے ہیں دوسرے صوبہ میں نہیں۔ اس صوبہ کی اپنی یونیورسٹی ہے اور اگرچہ دیگر صوبجات سے بعد میں قائم ہوئی ہے مگر پھر بھی گریجوایٹوں کی تعداد معقول ہے۔ ہر سال دو ہزار سے زیادہ طالب علم امتحانات آرٹس میں شریک ہوتے ہیں ÷

تعلیم میں ہندؤں خصوصاً آریوں کا قدم مسلمانوں سے بہت آگے بڑھا ہؤا ہے۔ متعدد اشخاص نے دل کھولکر روپے سے مدد دی۔ لائق لوگوں نے قومی خدمات کے واسطے زندگی وقف کی۔ پبلک اور گورنمنٹ تک اپنے خیالات پہنچانے کے لیئے اُردو اور انگریزی اخبار جاری کیئے۔ اور خوب دھڑلّے سے مضامین لکھے۔ غرض کہ ان کاموں کی تکمیل کے واسطے جان و مال تک سے دریغ نہیں کیا۔ خصوصاً سردار دیال سنگھ صاحب رئیس و جاگیردار مجیٹھہ ضلع امرتسر کی اولوالعزمی بہت کچھ تحسین و آفرین کے قابل ہے جنہوں نے چودہ لاکھ روپے کی جائداد قومی کاموں کے واسطے وقف کردی۔ اُن کے روپیہ سے ایک روزانہ انگریزی اخبار ٹریبیون اور ایک ہائی سکول لاہور میں جاری ہے جو اب کالج کے

٭ رئیس زادوں کی تعلیم کے واسطے ہندوستان میں چار کالج لاہور۔ اجمیر۔ اندور اور راجکوٹ میں ہیں ÷

درجے تک ترقی کرنے والا ہے - ایک لائبریری بھی قائم ہوگئی ہے - سردار صاحب کا انتقال ۱۹۰۸ء میں ہوا - اس وقت جائداد کا انتظام چند تعلیم یافتہ اصحاب کے سپرد ہے - اور آنریبل لالہ ہرکشن لعل بیرسٹرایٹ لا کے زیر نگرانی کام ہو رہا ہے ◆

مسلمان بھی انگریزی میں ترقی کر رہے ہیں اور پہلے کی نسبت ان کی حالت اچھی ہے - ان کا ایک انگریزی اخبار آبزرور ہفتہ میں دو بار لاہور سے شائع ہوتا ہے جو لدھیانہ کے ایک رئیس خواجہ احمد شاہ صاحب کی بلند ہمتی کا نمونہ ہے - مگر ان میں قومی کاموں کے واسطے دل کھولکر روپیہ دینے اور زندگی وقف کرنے والا اب تک کوئی باعزم نظر نہیں آتا ◆

اُردو کی ترقی

اس وقت جتنے اُردو اخبار ملک پنجاب خاصکر لاہور سے شائع ہوتے ہیں - دوسرے کسی صوبہ سے نہیں ہوتے - اُردو زبان کی تصنیف وتالیف کے اعتبار سے یہ صوبہ تمام ہندوستان میں اول درجے پر ہے - اس صوبہ میں اُردو کو اس درجہ ترقی ہے کہ بعض فرقے باوجود اُردو زبان کی سخت مخالفت کے بھی اپنے مذہبی اور ملکی خیالات عام جلسوں میں اسی زبان کے ذریعے ظاہر کرتے ہیں - ان کی تصنیفات کا بڑا حصّہ اور اکثر ہندو اخبار اسی زبان میں شائع ہوتے ہیں ◆

سنہ ۱۹۰۷ء کی شورش

سنہ ۱۹۰۱ء میں تقسیم بنگال کے باعث جو شورش بنگالہ میں ہوئی تھی - اس کی آوازیں براہ راست پنجاب میں آنی شروع ہوئیں - اور بعض لوگوں پر کچھ عجیب اثر پیدا کیا - انہیں دنوں اتفاق سے اراضیات کے متعلق ایک قانون پاس ہوا جو اس صوبہ کے زمینداروں کے حق میں بہت مضر تھا - اس پر تعلیم یافتہ جماعت خصوصاً اخبار نویس اور وکیلوں نے راولپنڈی و لاہور

ہیں۔ اور ہندو و مسلمان زمینداروں نے لائل پور میں اس قانون سے ناراضی کا اظہار کیا۔ متعدد جلسوں میں لکچر دئے۔ اخباروں میں مضامین شائع کئے*۔ اگرچہ اس سے اصل مدعا ملک کی خیرخواہی تھی مگر ناراضی ظاہر کرنے کا جو طریقہ انہوں نے اختیار کیا وہ اچھا نہ تھا۔ عام لوگوں میں ایک تہلکہ برپا ہوگیا۔ پنجاب کا پولیٹیکل مطلع بنگال کی طرح غبار آلود ہونا شروع ہوا اور امن و امان میں خلل پیدا ہونے کا بہت اندیشہ نظر آیا۔ سنہ ۱۹۰۷ء میں پنجاب کی پولیٹیکل شورشوں کا چرچا تمام ہندوستان میں پھیل گیا۔ صوبہ کے نئے لفٹنٹ گورنر سر ڈنزل ابٹسن نے اس شورش کے فرو کرنے کی یہ تجویز کی کہ ایک طرف تو قانون اراضیات التوا میں ڈال دیا اور دوسری طرف ایکٹ ۳ سنہ ۱۸۱۸ء کے مطابق شورش کنندوں کی گرفتاری اور جلاوطنی کی اجازت گورنمنٹ ہند سے حاصل کی۔ چنانچہ لالہ لاجپت رائے اور بھائی اجیت سنگھ کو جو سرغنہ سمجھے گئے تھے فوراً گرفتار کرکے برہما کو جلاوطن کیا۔ چند اخبارنویسوں کو جنہوں نے شورش انگیز مضامین شائع کئے تھے بعد تحقیقات جیل خانے میں بھیج دیا۔ راولپنڈی کے وکلا پر فوجداری مقدمات دائر کئے۔ ان تجاویز سے تمام شورشیں دفعتہً فرو ہوگئیں۔ اور ملک میں بدستور امن و امان قائم ہوگیا۔ گورنمنٹ پنجاب نے اپنی قوت و شوکت اور ملک کی حالت کا پورا اندازہ کرلیا۔ راولپنڈی کے وکلا بری ہوگئے۔ لالہ لاجپت رائے اور بھائی اجیت سنگھ بھی برہما سے رہا ہوکر پنجاب واپس بھیجدئے گئے۔

تاریخی حالات

تاریخی واقعات کے لحاظ سے اس صوبہ کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ حضرت مسیح سے پیشتر قوم آریا۔ ایرانی اور سکندر اعظم نے مغرب کی جانب سے یہاں بڑی بڑی فتوحات حاصل کیں۔ پھر راجہ اشوک نے اندرون ہند سے آکر بدھ مذہب کا سکہ جمایا۔ حضرت مسیح کے ایک ہزار برس بعد سلطان محمود غزنوی کی مہم پوشیوں نے خراسان و ترکستان کے مسلمان بادشاہوں کے واسطے ہندوستان کی فتوحات

* دیکھو صفحہ ۵۲ و ۱۱۳

کا دروازہ کھول دیا۔ سلطان شہاب الدین غوری۔ امیر تیمور۔ شہنشاہ بابر۔ نادر شاہ اور احمد شاہ کی چڑھائیوں کے باعث ایک عرصہ تک یہ صوبہ حملہ آوروں کا گزرگاہ بنا رہا۔ اُنیسویں صدی مسیحی کے شروع میں مہاراجہ رنجیت سنگھ سکھوں کی فوج ترتیب دیکر اس ملک کے والی بن بیٹھے۔ الغرض سلطنتوں کے پے در پے انقلابات اور فاتحین کے علمی آثار چھوڑ جانے سے یہ صوبہ سیاحوں اور مؤرخوں کے لیئے تاریخی تحقیقات اور علمی معلومات کا ایک عمدہ ذخیرہ ہے ✢

مذہبی انقلاب

مذہبی حیثیت سے جو تغیرات اس صوبہ میں ہوئے وہ بھی خاص وقعت کی نگاہ سے دیکھے جانے کے قابل ہیں۔ آج سے چار سو برس پیشتر بابا نانک صاحب نے جو اسی ملک کے رہنے والے تھے سکھ مذہب کی بنیاد ڈالی۔ اُنہوں نے ہندو و مسلمانوں کو ایک ہی مذہبی رشتہ میں منسلک کرنے کی کوشش کی۔ یہ بزرگوار ایسے صلح کل اور ہر دلعزیز تھے کہ سکھوں کے علاوہ ہندو اور مسلمان بھی ان کا ادب کرتے ہیں۔ مگر ان کے خیالات کی لہریں صرف پنجاب کی سرزمین تک موجیں مارتی رہیں۔ قبول اثر کا مادہ جو خدا تعالے نے پنجابیوں کی طبیعت میں ودیعت کر رکھا تھا اُس کا پورا پورا ظہور گزشتہ صدی سے ہوا۔ اور تیس چالیس برس کے عرصے میں مذہبی انقلاب کی صدا یہاں سے ایسی بلند ہوئی کہ اس کی گونج ہندوستان کے چاروں طرف پہنچ گئی ✢

سر سید احمد خاں صاحب مرحوم جب ممالک مغربی و شمالی کے مسلمانوں کو خواب غفلت سے بیدار کرتے ہوئے (اور مولویوں کے ہاتھوں سے کفر و الحاد کے تمغے لیتے ہوئے) ۱۸۸۴ء میں پنجاب کے مسلمانوں کو گہری نیند سے اُٹھانے آئے تو انہوں نے اپنے آپ کو اُن کا اس قدر ہم خیال اور معاون ثابت کیا کہ سید صاحب کو انہیں "زندہ دلان پنجاب" کا خطاب دینا پڑا ✢

سوامی دیانند صاحب سرستی دیسی ریاستوں کا گشت لگاتے ہوئے پنجاب میں آئے اور ہندو مذہب میں اصلاح کرنے کا بیڑا اُٹھایا۔ پنجابیوں نے ان کی تعلیمات کو مان کر ایسا فروغ دیا کہ ہندوؤں میں ایک نیا فرقہ قائم ہو گیا۔ اس فرقے میں ایسے مشنری پیدا ہوئے۔ جنہوں نے اپنی اَن تھک کوششوں سے ہندوستان کے دیگر صوبجات میں بھی اپنی ہم خیال جماعت پیدا کر لی ہے ۔

مرزا غلام احمد صاحب رئیس قادیاں ضلع گورداسپور نے جب مسیح موعود اور مہدی معہود ہونے کا دعوے کیا تو بیشمار آدمی اُن کی طرف جُھک پڑے۔ تھوڑے عرصے میں اس فرقہ کو ایسی ترقی ہوئی کہ ایک بھاری جماعت بن گئی جو فرقہ احمدیہ کے نام سے مشہور ہے ۔

چند سال سے مولوی عبداللہ صاحب چکڑالہ ضلع میانوالی سے آکر لاہور میں مقیم ہوئے اور کتب فقہ و حدیث سے دست بردار ہو کر ہر کام کا دارومدار صرف قرآن پر رکھا۔ کئی لوگ اِن کے ہم آواز ہو کر ان کے ساتھ ہو لئے۔ جو اہل قرآن کہلاتے ہیں ۔

جب لیڈران نیشنل کانگریس کو پنجابیوں کی طبائع کا پتہ چلا تو اُنھوں نے بھی اپنے ہم خیال پیدا کرنے کی غرض سے اس صوبے میں دورے شروع کئے۔ اور بہت لوگوں کو اپنا خیر مقدم کہتے ہوئے پایا ۔

تاریخی شہر

صوبہ پنجاب میں پانچ کمشنریاں اور ۲۹ ضلعے ہیں۔ ان میں سے کمشنری لاہور صوبہ کے مرکز میں ہے۔ اس سے مشرق کی طرف جالندھر اور جنوب کی طرف دہلی کی کمشنریاں ہیں۔ مغرب کی جانب راولپنڈی اور مغربی سرحد پر ڈیرہ جات کی کمشنری ہے۔ اس صوبہ میں مشہور تاریخی مقام یہ ہیں :- (۱) دہلی۔ یہ شہر سلاطین اسلام کے عہد حکومت میں ہندوستان کا پایہ تخت رہ چکا ہے ۔

ابتدائے آبادی سے غدر ۱۸۵۷ء تک جتنے انقلاب اور حوادث اس شہر نے دیکھے ہیں کسی اور شہر نے کم دیکھے ہونگے۔ مسلمان فرمانرواؤں کی اس قدر یادگاریں اس شہر میں اب تک موجود ہیں جو ہندوستان کے کسی دوسرے شہر میں نہ ہونگی۔ (۲) پانی پت وہ جگہ ہے جہاں مغربی حملہ آوروں اور سلاطین دہلی کی قسمتوں کا فیصلہ تین مرتبہ ہؤا ہے۔ (۳) تھانیسر۔ ہندوؤں کا ایک مشہور مذہبی مقام ہے۔ مہابھارت کی قیامت خیز لڑائی جو حضرت مسیح سے پیشتر ہوئی تھی۔ اس کا میدان جنگ یہی سرزمین ہے۔ (۴) ماچھی واڑہ و سرہند ضلع لدھیانہ ہیں۔ (۵) دیوی کا بھون اور جوالا مکھی ضلع کانگڑہ ہیں۔ یہ دونو بڑے مشہور مندر ہیں۔ جوالا مکھی کے مندر سے آگ کا شعلہ نکلتا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ اپریل ۱۹۰۵ء کے زلزلہ سے ضلع کانگڑہ کی عمارتوں اور باشندوں کو جو قیامت خیز تباہی اور بربادی پیش آئی۔ اس میں یہ مندر بھی سطح زمین کے ہموار ہو گئے تھے۔ کانگڑہ کو قدیم زمانہ میں نگر کوٹ کہتے تھے۔ (۶) امرتسر جس میں سکھوں کا ایک مقدس طلائی مندر ہے۔ (۷) لاہور جو ہندو راجاؤں اور مسلمان بادشاہوں کے عہد میں مدتوں پنجاب کا پایہ تخت رہ چکا ہے۔ اس میں مسلمان بادشاہوں کی متعدد یادگاریں قابل دید موجود ہیں۔ (۸) ملتان بہت پرانا شہر اور شاہی زمانہ میں صوبہ کا پایہ تخت تھا۔ اس قدامت کے ساتھ چینی کے روغنی برتنوں اور ریشمی کام کے لئے مشہور ہے۔ (۹) سیالکوٹ بہت پرانا شہر ہے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے زمانہ میں کچھ مدت تک پنجاب کے پایۂ تخت رہنے کا شرف بھی اس کو حاصل ہو چکا ہے۔ (۱۰) راولپنڈی بھی تاریخی شہر ہے جس کو سکندر اعظم اور یونانی مصنفوں نے ٹیکسالا سے تعبیر کیا ہے۔ (۱۱) اٹک جو قلعہ کی وجہ سے مشہور اور دریائے سندھ کے کنارے پر واقع ہے۔ (۱۲) پشاور جو ہمیشہ سے مغربی حملہ آوروں کا پہلا مقام اور بہت سی تاریخی سرگزشتوں کا مجموعہ ہے +

اب میں یہاں سے اپنے سفر کے تفصیلی حالات شروع کرتا ہوں +

شملہ

اس سفر میں ایک دوست میرے ہمراہ تھے جن سے میری ملاقات کالکا اسٹیشن پر ہوئی۔ یہ اسٹیشن انبالہ چھاؤنی سے ۴۰ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہاں سے ہم دو نو ٹانگہ کی سواری میں شملہ کو روانہ ہوئے۔ کالکا سے شملہ ۵۸ میل ہے۔ راستہ اگرچہ پہاڑی ہے مگر گورنمنٹ ہند و پنجاب اور دیگر حکام کی آمد و رفت کے باعث سڑک کی صفائی کا عمدہ انتظام ہے۔ ہم صبح کے ۸ بجے روانہ ہو کر شام کے ۴ بجے شملے پہنچ گئے۔ راستہ میں سولن کی چھاؤنی پر ٹھیرے یہاں مسافر تھوڑی دیر آرام کرتے ہیں۔ دوسری مرتبہ ریل میں سفر کیا جو لارڈ کرزن بہادر کی کوشش سے ۱۹۰۳ء میں جاری ہو چکی تھی۔ یہ لائن ۷۰ میل لمبی اور پہاڑوں میں سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی چلی گئی ہے۔ اور متعدد مقامات پر ٹنلوں سے گزرتی ہے جو پہاڑوں کے درمیان سُرنگیں کھود کر بنائے گئے ہیں ؞

شملہ کوہ ہمالہ کا ایک حصہ ہے جو سطح سمندر سے سات ہزار فٹ بلند ہے اس کی صحت بخش اور خوشگوار آب و ہوا نے گورنمنٹ کو اس کی آبادی پر متوجہ کیا۔ لارڈ امہرسٹ پہلے گورنر جنرل ہیں۔ جنہوں نے فتح بھرت پور کے بعد ایک مختصر سٹاف کے ساتھ ۱۸۲۷ء میں یہاں موسم گرما بسر کیا۔ پھر لارڈ لارنس صاحب کے عہد ۱۸۶۴ء میں یہ جگہ گورنمنٹ ہند کا گرمائی صدر مقام قرار پائی۔ اس وقت سے اس کی آبادی روز افزوں ترقی پر ہے۔ آغاز موسم گرما میں گورنمنٹ ہند و پنجاب کے تمام دفاتر کلکتہ اور لاہور سے یہاں

آتے ہیں۔گرمی اور برسات گزار کر واپس چلے جاتے ہیں۔ان کے علاوہ بہت سے انگریز۔ہندوستانی راجے۔نواب اور دیگر امراء شائقین یہ موسم یہیں بسر کرتے ہیں۔دور دراز سے بڑے بڑے سوداگر۔صناع۔انجمنوں کے وکلا۔اور متلاشیان روزگار بھی اس موقع پر یہاں چلے آتے ہیں۔غرض اس موسم میں کئی مہینے تک شملہ میں میلا لگا رہتا ہے +

شملہ کی سرزمین دیسی ریاستوں سے گھری ہوئی ہے۔پہلے یہ جگہ مہاراجہ پٹیالہ* کی عملداری میں تھی۔گورنمنٹ نے ایک علاقہ دیکر شملہ کا تبادلہ اُس سے کر لیا۔اس کی مردم شماری مع مضافات تقریباً بیس ہزار ہے۔ہندوؤں کے مقابلے میں مسلمان ایک چوتھائی ہیں +

شملہ میں سب سے بارونق اور خوبصورت اپر بازار ہے۔اس کی سڑک نہایت مصفا۔مکانات شاندار اور صاف ستھرے ہیں۔اس میں بڑے بڑے دیسی اور انگریز سوداگروں کی دکانیں۔پوسٹ آفس۔بنک اور ٹون ہال ہیں۔ہندوستان اور یورپ کی ہر قسم کی پیداوار اور اشیا یہاں فروخت ہوتی ہیں۔اس بازار کے دونو طرف ایک سڑک ہلالی شکل میں دور تک چلی گئی ہے جس پر انگریزوں کی سینکڑوں کوٹھیاں اور بڑے بڑے ہوٹل واقع ہیں۔اس سڑک کی شرقی آبادی کو چھوٹا شملہ اور انتہائی مغربی کنارہ کو بالوگنج کہتے ہیں۔ان دونو کا فاصلہ تقریباً چھ میل ہوگا +

اپر بازار کے نیچے کی جانب لوئر بازار ہے۔یہاں کھانے پینے کی اشیا۔میوہ جات اور ترکاریاں وغیرہ فروخت ہوتی ہیں۔اس حصہ میں زیادہ تر دیسی لوگ رہتے ہیں۔ایک جامع مسجد اور ایک شوالہ بھی یہاں ہے

* دیکھو صفحہ ۴۷

جامع مسجد نہایت وسیع اور اچھے موقع پر واقع ہے۔ اسلامی انجمنوں کے جلسے علے العموم یہیں ہؤا کرتے ہیں۔ ٹانگہ روڈ پر سکھوں کا ایک دھرم سالہ ہے۔ جس میں سکھ مسافر آرام پاتے ہیں ؛

شملہ کی مختلف آبادیوں کے جدا جدا نام ہیں۔ شملہ۔ چھوٹا شملہ۔ بالوگنج۔ سنجولی۔ لکڑ بازار۔ جتوک وغیرہ۔ نواب لفٹنٹ گورنر پنجاب کا گورنمنٹ ہاؤس چھوٹے شملہ میں ہے۔ کمانڈر انچیف کی کوٹھی لکڑ بازار اور سنجولی کے درمیان اور گورنر جنرل کا دلیسریگل لاج بالوگنج کے نزدیک ہے۔ یہ سب عمارتیں بہت عالیشان ہیں ؛ ان کے علاوہ گورنمنٹ ہند کے دفاتر۔ رپن ہسپتال۔ ٹون ہال اور سنجولی کے پاس کی سُرنگ قابل دید مقامات ہیں۔ پہاڑیوں میں سب سے مشہور اور پُرلطف جاکو کا ٹیلہ ہے جو شملہ کی معمولی سطح سے ایک ہزار فٹ سے کچھ اونچا ہے۔ اس میں بندر کثرت سے رہتے ہیں ؛

شملہ کے قدرتی نظاروں کا لطف پہاڑیوں کی سیر کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔ بنفشہ۔ چیڑ اور رہناس پتی کے بن کے بن کھڑے ہیں کہیں نالہ بہتا ہے کہیں چشموں سے پانی نکل رہا ہے۔ ہوا تازہ اور صحت بخش ہے پہاڑوں کی رفعت۔ سبزہ کی کثرت۔ کھڈوں کی گہرائی اور پانی کی خوشنمائی یہ سب ایسی چیزیں ہیں جن کے دیکھنے سے قدرت کا تماشا نظر آتا ہے ؛

قدرتی مناظر کے علاوہ کلب اور کتب خانے بھی موجود ہیں۔ جہاں صاحبان انگریز فرصت کا وقت بسر کرتے ہیں۔ اخبار پڑھتے ہیں۔ کتابیں دیکھتے اور تفریحی کھیل کھیلتے ہیں۔ اکثر اُمرا اور روالیانِ ریاست نے بھی یہاں اپنی اپنی کوٹھیاں بنا کر اُنہیں خوب آراستہ کر رکھا ہے۔ مگر ان سے عموماً انگریز ہی فائدہ اُٹھاتے ہیں ؛

تجارتی مال کی آمد و رفت کثرت سے ہوتی ہے۔ لاکھوں روپے کا غلہ۔ گھی۔ کھانڈ۔ مصالح۔ چائے۔ شراب۔ تمباکو۔ نمک۔ انگریزی اور دیسی کپڑا۔ پیتل اور کانسی کے برتن وغیرہ سب باہر سے آتے ہیں۔ یہاں کی پیداوار سے افیون۔ چرس۔ اخروٹ۔ میوہ۔ شہد۔ ریشم۔ اُون اور سہاگہ باہر جاتا ہے۔ مگر اس کی مالیت ہزاروں سے زیادہ کی نہیں ہوتی۔ لکڑی کا کام اس جگہ اچھا بنتا ہے۔ یہاں کی چھڑیاں خاصکر مشہور ہیں جو کثرت سے بکتی ہیں۔ کاریگر زیادہ تر ہوشیارپور اور جالندھر کے رہنے والے ہیں +

یہاں ایک گورنمنٹ سکول ہے جس میں انٹرنس کے درجے تک پڑھائی ہوتی ہے۔ اُردو کا کوئی مطبع یا اخبار نہیں۔ البتہ انگریزی پریس بکثرت ہیں۔ خصوصاً گورنمنٹ پریس بہت اعلےٰ درجے کا ہے جس میں ہزاروں آدمی کام کرتے ہیں +

ہندو مسلمانوں کی کچھ مقامی انجمنیں موجود ہیں۔ ایک انجمن شُبان المسلمین ملک تاج الدین صاحب بی اے کے اہتمام سے قائم ہوئی ہے جو گورنمنٹ انڈیا کے اکونٹ برانچ میں ایک اعلےٰ عہدے پر ممتاز ہیں۔ اس کے کئی سالانہ جلسے بہت دھوم دھام سے ہو چکے ہیں۔ اس کا دفتر لوئر بازار میں ہے۔ جس میں ہر قسم کے اخبارات شائقین کے مطالعہ کے واسطے موجود رہتے ہیں +

یہ سب چہل پہل صرف گرمی اور برسات میں ہوتی ہے۔ جاڑے کے موسم میں شملہ بالکل اُجاڑ ہو جاتا ہے۔ پہاڑی باشندوں معمولی دُکانداروں اور بعض دفاتر کے کارکوں کے سوا یہاں کوئی نظر نہیں آتا۔ اور ان دنوں کثرت سے برف باری ہوتی ہے +

دیسی مسافروں کے ٹھہرنے کے لئے یہاں کوئی اچھی جگہ نہیں اور

نہ کھانا اچھا ملتا ہے۔ کچھ دنوں پیشتر صاحب ڈپٹی کمشنر شملہ کے سررشتہ دار مولوی سید عبداللہ صاحب دہلوی کا مکان مسلمان مسافروں کی فرودگاہ تھا اگر باشندگانِ شملہ اس طرف توجہ کریں۔ تو مسافروں کے آرام کے علاوہ ان کو مالی آمدنی بھی کافی ہوسکتی ہے۔ کوئی اچھا مسافرخانہ نہ ہونے کے سبب میں اپنے دوسرے سفر میں بابو عبدالاحد صاحب سب انجنیر کے ہاں ایک ماہ مقیم رہا جنھوں نے مہماں نوازی کا حق اچھی طرح ادا کیا +

انبالہ

شملہ سے ۱۱۴ میل طے کرنے کے بعد ہم انبالہ پہنچے۔ یہ شہر سکھوں کے زمانے میں ایک چھوٹا سا قصبہ تھا۔ ۱۸۴۳ء میں سرکار انگریزی کے قبضے میں آیا۔ اُس وقت سے اس کی آبادی خوب ترقی پر ہے۔ حُکّام سول کا صدر مقام اور فوجی سٹیشن ہے۔ شہر کی آبادی مع چھاؤنی بروے مردم شماری ۱۹۰۱ء ۷۸ ہزار ۶۳۸ ہے +

شہر کے مکانات پختہ اور بازار نو تعمیر ہیں۔ مگر کنوؤں کا پانی کھاری اور گرمیوں کے موسم میں اکثر خشک ہوجاتا ہے۔ اِسی وجہ سے نواح شہر میں باغات کی قلت ہے۔ تجارتی مقاصد کے لحاظ سے اس کا موقع بہت موزوں اور میدانی و پہاڑی ریاستوں کی پیداوار کا مرکز ہے۔ رُوئی اور غلہ کی تجارت یہاں خوب ہوتی ہے۔ گورنمنٹ ہند کے گرمائی صدر مقام (شملہ) کا گذرگاہ ہونے سے اس کی اہمیت اور بھی بڑھ گئی ہے۔ دو سوتی اور دریاں یہاں سے باہر جاتی ہیں۔ روئی کے کئی کارخانے جاری ہیں۔ انگریزی تعلیم اچھی ترقی پر ہے۔ تین ہائی سکول اور دو مڈل سکول موجود ہیں۔ سائیں توکل شاہ

صاحب ایک مشہور بزرگ یہاں ہو گزرے ہیں جن کا مزار زیارتگاہ خلق اللہ ہے۔ اور ہر سال دھوم دھام سے عُرس ہوتا ہے +

شہر سے ۴ میل کے فاصلے پر انگریزی چھاؤنی ریلوے لائن پر واقع ہے جو ہندوستان کی بڑی چھاؤنیوں میں شمار کی جاتی ہے۔ دہلی۔ سہارنپور۔ شملہ اور لاہور کی ریلوں کا جنکشن ہونے سے اس میں خوب رونق ہے +

پٹیالہ

انبالہ شہر سے ۲۸ میل طے کرنے کے بعد ہم پٹیالہ آئے۔ راستہ میں بمقام راجپورہ گاڑی تبدیل کرنی پڑی۔ انبالہ یہاں سے ۱۲ میل اور پٹیالہ ۱۶ میل ہے۔ یہ شہر ریلوے لائن کے کنارہ اسی نام کی ریاست کا دارالحکومت اور ایک متوسط درجے کا شہر ہے۔ اس کی عمارتیں پختہ اور بازار خوب آباد ہیں۔ خصوصاً قلعہ کے نیچے ایک چوک بہت وسیع اور بارونق ہے۔ قلعہ کے ایک طرف دربار ہال ہر قسم کے آرائشی سامان سے سجا ہوا ہے۔ بیرون شہر باغ کی آراستگی قابل دید ہے +

اُنیسویں صدی مسیحی کے آخری حصّہ میں مہاراجہ مہندر سنگھ بہادر والئے ریاست کی قدردانی اور خلیفہ سید محمد حسن خان مرحوم وزیراعظم کے حُسن تدبیر سے ریاست نے بہت ترقی کی۔ تعلیم۔ ہسپتال۔ عدالت اور پولیس غرض ہر صیغہ کا انتظام خوش اسلوبی سے کیا گیا۔ سکولوں کے علاوہ ایک کالج جاری کیا جو مہندر کالج کے نام سے موسوم ہے۔ اس کالج کے ساتھ علوم مشرقیہ کی تعلیم کا بھی اچھا انتظام ہے۔ ان کے عہد میں علما۔ فضلا۔ شعرا اور ہر قسم کے باکمالوں کا یہاں مجمع ہو گیا تھا۔ باشندوں کا میلان نوکری کی طرف زیادہ اور حرفت وصنعت سے فی الجملہ بے پروا ہیں +

موجودہ فرمانروا مہاراجہ بھوپ اندر سنگھ مہاراجہ مہندر سنگھ کے پوتے اور مہاراجہ راجندر سنگھ کے بیٹے ہنوز نابالغ ہیں۔ انہوں نے چیفس کالج لاہور میں عمدہ تعلیم حاصل کی ہے۔ اور اب ریاست کے کاروبار سے واقفیت پیدا کر رہے ہیں۔ اس وقت ریاست کے کاروبار ایک کونسل کے متعلق ہیں جس کے ممبر اور پریزیڈنٹ سب اسی ملک کے رہنے والے ہیں۔ سردار گورنکھ سنگھ صاحب پریزیڈنٹ کی اعلےٰ قابلیت اور کرنیل عبد المجید خاں صاحب فارن منسٹر کی معاملہ فہمی سے ریاست کا انتظام ترقی پر ہے۔ ان کے علاوہ گورنمنٹ انگریزی کی طرف سے ایک پولیٹیکل ایجنٹ بھی یہاں رہتا ہے۔ جو ریاستہائے پھلکیاں* کی نگرانی کرتا ہے۔ قاضی محمد سلیمان صاحب یہاں کے اہلکاروں میں ایک ذی علم مصنّف اور مہمان نواز آدمی ہیں۔ ان کو قومی معاملات سے بڑی دلچسپی ہے۔ مجھے ان کے ذریعے مقامی سیر اور تاریخی حالات دریافت کرنے کا اچھا موقع ملا ✣

تاریخی حالات۔ پنجاب کی سکھ ریاستوں میں پٹیالہ سب سے بڑی ریاست ہے۔ سدّھو جاٹ خاندان کے ایک سرگروہ سردار آلا سنگھ نے جو چودھری پھول کے بیٹے رام کی اولاد سے تھا ۱۱۶۶ھ (۱۷۵۲ء) میں اس کی بنیاد ڈالی تھی۔ سردار آلا سنگھ نے ایسے وقت میں یہ کارنامہ اپنی یادگار چھوڑا جبکہ احمد شاہ ابدالی کی فتوحات کا ڈنکا ہندوستان میں بج رہا تھا۔ ۱۸۰۹ء میں گورنمنٹ انگریزی کے ساتھ اس کا تعلق ہوا۔ اس وقت سے والیان ریاست پٹیالہ ہمیشہ خیر خواہ سرکار رہے۔ ۱۸۱۴ء میں جنرل اکٹرلونی کو مہم نیپال میں۔ ۱۸۴۷ء میں سکھوں کی

---

* ریاستہائے پھلکیاں سے مراد پٹیالہ۔ جیند اور نابھہ ہے۔ ان تینوں کے فرمانروا قومیت اور مذہب میں باہم متحد ہیں ✣

لڑائی میں سنہ ۱۸۵۷ء کا مفسدہ فرو کرنے اور سنہ ۱۸۷۲ء میں کوکوں کی گرفتاری میں اس ریاست نے اپنی فوج سے گورنمنٹ انگریزی کو مدد دی - اور ہر موقع پر ہمعصر والیانِ ملک میں ترقی اعزاز اور مزید امتیاز کا شرف اس کو حاصل ہوتا رہا +

اِس ریاست کا کچھ حصّہ میدانی اور کچھ کوہستانی ہے - بڑا حصّہ جو میدانی ہے ستلج کے جنوب میں واقع ہے - اور کوہی حصّے کا سلسلہ کوہ شملہ تک چلا گیا ہے - شملہ پہلے اسی ریاست میں تھا - مگر گورنمنٹ انگریزی نے سنہ ۱۸۳۰ء میں بڑولی کے تین مواضعات کے عوض مہاراجہ صاحب سے بدل لیا - شاہی زمانہ کے چند مشہور شہر مثل سُنّام پنجور کا شالامار باغ - سرہند بٹھنڈا اور نارنول اسی ریاست کی حدود میں ہیں +

ریاست کا رقبہ ۵ ہزار چار سو ۱۲ مربع میل ہے - آبادی ۱۵ لاکھ ۸۶ ہزار - محاصل ۶۶ لاکھ روپے سالانہ اور فوج مع پولیس چھ ہزار ہے - ۳۱ میدانی اور ۷۰ دیگر توپیں ہیں +

سرہند

پٹیالہ سے راجپورہ ہوتے ہوئے ۳۲ میل طے کرنے کے بعد ہم سرہند پہنچے - یہ شہر راجپورہ سے ۱۶ میل لدھیانہ و انبالہ کے درمیان مہاراجہ پٹیالہ کی ریاست میں واقع ہے - اس کی آبادی بہت پرانی اور تاریخی واقعات کی درد انگیز یادگار ہے - مغلوں کے اخیر زمانے میں سکھوں کی لوٹ مار سے یہ شہر بالکل برباد ہو گیا تھا - قدیم عمارتیں اس وقت کھنڈر کی شکل میں دکھائی دیتی ہیں - باغ عام و خاص جو سٹیشن سے ڈیڑھ میل کے فاصلے پر سڑک

کے کنارے واقع ہے۔ اس کی سابقہ عظمت کی گواہی دے رہا ہے۔ یہاں سے ایک میل کے فاصلے پر پرانا قلعہ ہے جس میں مغلوں کا نائب صوبہ رہا کرتا تھا۔ یہاں ایک چھوٹا سا گاؤں آباد ہو گیا ہے۔ سکھ اس کو ڈیرہ صاحب کہتے ہیں۔ اس میں دسویں گورو گوبند سنگھ صاحب کے دو بیٹوں کی سمادھیں (قبریں) ہیں *

اس کے قریب حضرت شیخ احمد مجدد الف ثانیؒ کا مزار ہے جو گیارھویں صدی ہجری کے شروع میں مشاہیر نقش بندی بزرگوں میں گزرے ہیں۔ بالفعل اس شہر کو جو شہرت حاصل ہے وہ اسی مزار کے باعث ہے۔ مجدد صاحب کے حالات ضمیمہ میں درج ہیں *

لدھیانہ

سرہند سے ۴۰ میل چلنے کے بعد ہم لدھیانہ آئے۔ یہ شہر شہزادگان لودھی خاندان کی یادگار ہے۔ جنھوں نے پندرھویں صدی مسیحی کے آخر میں اس کی بنیاد ڈالی تھی۔ ۱۸۰۹ء میں مہاراجہ رنجیت سنگھ والئے پنجاب اور سرکار انگریزی میں جو معاہدہ ہوا اُس کے رو سے ایں روئے ستلج کی ریاستیں سرکار کی حفاظت و نگرانی میں آگئیں اور لدھیانہ میں ایک پولیٹیکل ایجنٹ مقرر ہوا۔ ۱۸۴۵ء تک یہ شہر انگریزا ور سکھ سلطنتوں کی حد فاصل سمجھا جاتا تھا۔ اس وقت یہاں ایک زبردست چھاؤنی بھی تھی۔ لیکن سال آئندہ میں سکھوں اور انگریزوں کی لڑائی کے خاتمے پر دوآبہ جالندھر بھی انگریزوں کے قبضے میں آگیا۔ اور چھاؤنی ۱۸۵۴ء میں اُٹھ گئی *

شہر کی آبادی بہت خوش وضع ہے۔ بازار بارونق اور سیدھے ہیں خصوصاً

چوڑے - بازار میں صبح وشام خوب چہل پہل رہتی ہے - باشندے زیادہ تر کشمیری اور کچھ شاہ شجاع الملک سابق والئے کابل کی نسل سے ہیں +

یہاں اناج کی بڑی بھاری منڈی ہے - چارخانہ کپڑا اور "ٹھجر" فرش خوب تیار ہوتا ہے - لنگی اور کلاہ پشاور کے بعد یہاں سے بہتر کہیں نہیں بنتا - اُونی جرابیں اور دستانے بکثرت بنتے اور دور دور تک جاتے ہیں +

انگریزی تعلیم یہاں اچھی ترقی پر ہے - ایک گورنمنٹ ہائی سکول - مشن ہائی سکول - ایک خالصہ ہائی سکول اور ایک اسلامیہ ہائی سکول ہے - سول اینڈ ملٹری نیوز - آرمی نیوز اور نورافشاں تین اخبار اُردو میں ہفتہ وار شائع ہوتے ہیں -

طبّاعی اور ذہانت کے لحاظ سے اس ضلع کے بعض اشخاص بالخصوص قابل ذکر ہیں - مثلاً بھائی رام سنگھ صاحب کوکا جس نے کوکا پنتھ ایجاد کر کے سکھوں کی ایک زبردست جماعت اپنی ہم خیال پیدا کر لی تھی - مولوی محمد حسن صاحب پنشنخوار محکمہ تعلیم جنہوں نے نیوٹن کے ضابطہ صعود کے برعکس ضابطہ نزول ایجاد کرنے میں یورپین پروفیسروں سے اعلےٰ درجے کی سندیں حاصل کیں - سردار چنداسنگھ جس نے باوجود نابینائی کے انٹرنس اور وکالت کا امتحان پاس کیا - لالہ لاجپت رائے جنہوں نے ۱۹۰۷ء کی شورش میں بڑی ناموری حاصل کی +

لدھیانہ ایک اوسط درجے کا جنکشن ہے - یہاں سے ایک لائن فیروزپور کو اور دوسری دُھری کو جاتی ہے - یہ وہ مقام ہے - جہاں سے پٹیالہ اور بھٹنڈا کو دو ریلیں نکلتی ہیں - ریاستہائے مالیرکوٹلہ - نابھہ - پٹیالہ و جیند اسی لائن پر ہیں +

جالندھر

لدھیانہ سے روانہ ہو کر ہم جالندھر پہنچے - لدھیانہ یہاں سے ۳۶ میل ہے - راستہ میں دریائے ستلج سے ریل کا گزر ہوا جو لدھیانہ سے پانچ چھ میل اس طرف پھلور کے قریب بہتا ہے - یہ پنجاب کا پہلا دریا ہے - جس سے پرانے پنجاب کی حد شروع ہوتی تھی +

شہر کی عمارتیں پختہ اور پرانی چند مسجدیں اور مقبرے بھی موجود ہیں - جو اس کی قدامت کا پتا دیتے ہیں - شاہی زمانہ میں یہاں نائب صوبہ رہا کرتا تھا - وسط شہر میں امام ناصر صاحب کی ایک مشہور خانقاہ ہے جو آٹھویں صدی ہجری کے مشاہیر اولیاء اللہ میں گزرے ہیں - آپ کے مزار پر ہر سال ایک بہت بارونق میلہ ہوتا ہے - یوں بھی ہر جمعرات کو اچھا خاصا ہجوم ہو جاتا ہے +

لکڑی کا کام یہاں بہت عمدہ ہوتا ہے اور دور دور تک دساور جاتا ہے قند سرخ (گڑ) حلاوت اور نفاست میں جالندھر سے بہتر سارے پنجاب میں کہیں نہیں ہوتا +

اس شہر میں انگریزی تعلیم اچھی ترقی پر ہے - اس کی اشاعت خاصکر مشن سکول کے ذریعے ہوئی ہے جو سب سے پرانا مدرسہ ہے - اس کی بنیاد پادری گولک ناتھ صاحب نے قائم کی تھی جو بڑے لائق اور ہر دلعزیز شخص ہوئے ہیں - اب کچھ عرصے سے گورنمنٹ سکول بھی قائم ہو گیا ہے - اور بہت کامیابی سے چل رہا ہے +

شہر کا بیرونی حصہ باغات سے بہت دلچسپ اور خوشنما معلوم ہوتا ہے نواح شہر میں بارہ بستیاں ہیں - ان کے باشندے بیشتر پٹھان اور کچھ

راجپوت ہیں جو بہت معزز ہیں اور تحصیل علوم پر خاص توجہ رکھتے ہیں ؛
شہر سے تین میل کے فاصلے پر چھاؤنی کا ریلوے سٹیشن ہے۔
یہاں پہلے بہت فوج رہا کرتی تھی۔ مگر اب پہلے کی سی رونق نہیں ؛

امرتسر

جالندھر سے ۴۹ میل طے کرنے کے بعد ہم امرتسر آئے۔ راستہ میں دریائے بیاس سے گزر ہوا۔ امرتسر سکھوں کا ایک نہایت مقدس مقام ہے۔ اس کی آبادی کا آغاز سولھویں صدی مسیحی سے ہے۔ جبکہ سکھوں کے چوتھے گورو رام داس صاحب نے ایک تالاب اور گُردوارہ کی بنیاد یہاں ڈالی۔ یہ زمین شہنشاہ اکبر نے انعام کے طور پر گورو صاحب کو دی تھی۔ اس کی موجودہ شان و شوکت مہاراجہ رنجیت سنگھ کی دلی عقیدت کا نتیجہ ہے۔ جنہوں نے اپنے عہد حکومت میں شہر کی آبادی اور گُردوارہ کی آرائش پر زرِ کثیر صرف کر کے ایک قابل دید جگہ بنا دی۔ یہ گُردوارہ اب دربار صاحب کے نام سے مشہور ہے۔ اس مذہبی عظمت کے ساتھ تجارت نے بھی ایسی ترقی کی کہ امرتسر پنجاب کے مشہور شہروں میں شمار ہونے لگا۔ اس وقت آبادی کے لحاظ سے پنجاب میں اس کا تیسرا درجہ ہے۔ کل آبادی ایک لاکھ ۶۲ ہزار ۴۲۹ ہے ؛

دور دراز کے سیاحوں کو جو چیز امرتسر میں کھینچ لاتی ہے۔ وہ یہاں کا دربار صاحب ہے۔ ریل سے اُتر کر سیّاح کا گزر پہلے ہال بازار میں ہوتا ہے۔ یہ بازار اس قدر وسیع اور بارونق ہے کہ اس کے دیکھنے سے تھوڑی دیر کے واسطے لاہور کی انار کلی کا منظر آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔

دربار صاحب - امرتسر
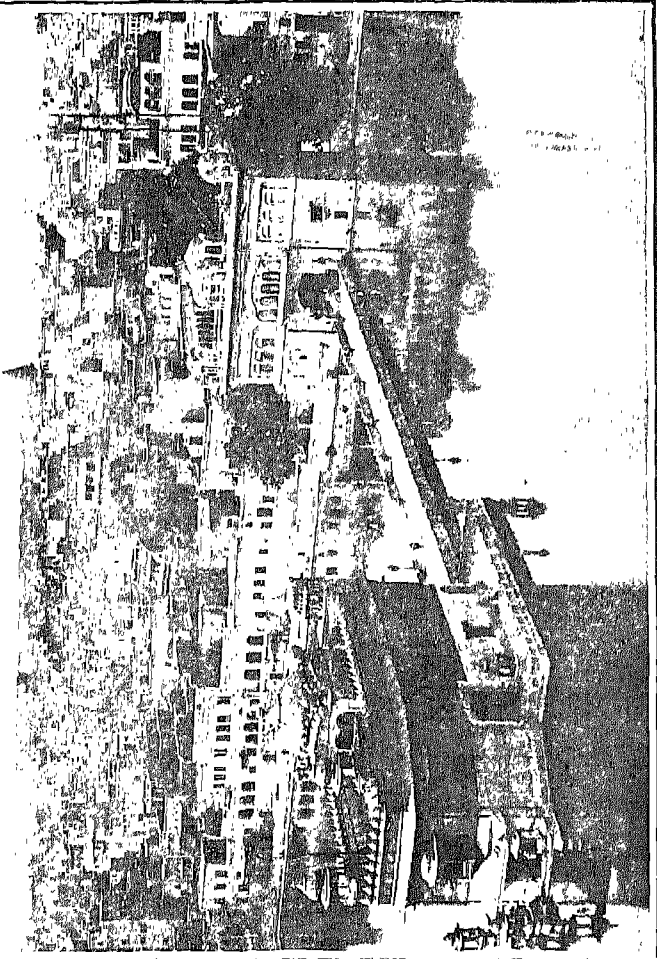
بازار کے دائیں جانب خان محمد شاہ مرحوم کی بہت بڑی سرائے آتی ہے۔ جس میں ہندوستان اور وسط ایشیا کے مسافر ٹھیرتے ہیں۔ اس سے کچھ آگے بڑھ کر شیخ خیرالدین مرحوم کی عظیم الشان مسجد ہے جو بلحاظ وسعت اور خوبصورتی شہر کی سب مسجدوں پر فوقیت رکھتی ہے۔ بازار کے خاتمہ پر ٹون ہال ایک عالیشان اور خوش وضع سرکاری عمارت ہے جس میں متعدد دفتر اور ایک لائبریری (کتب خانہ) ہے۔ عمارت کے بیچوں بیچ ایک لمبی اور چھتی ہوئی سڑک واقع ہے۔ اس سے گزر کر قیصری باغ آتا ہے۔ سکھوں کے زمانہ میں اس کی زمین بالکل دلدل تھی۔ مگر اب خوشنما روشوں اور سرسبز درختوں سے یہ مقام دلچسپ منظر بن گیا ہے۔ باغ کے وسط میں ایک چوک ہے جس میں ملکہ معظمہ کا سنگ مرمر کا بُت کھڑا ہے۔ چوک کے ایک طرف گورنمنٹ کی طرف سے سکھوں کی خوشنودی کے لئے ایک خوبصورت عمارت بنائی گئی ہے جو سارا گڑھی کے مقتولوں کی یادگار اور گنج شہیداں کے نام سے موسوم ہے۔ اس کے بعد اہلو والیہ بازار آتا ہے جس میں سب سے بڑے مالدار تاجروں کی دو منزلہ سہ منزلہ عالیشان دکانیں لاکھوں روپے کے اسباب سے بھری ہوئی ہیں۔ اس بازار کا خاتمہ دربار صاحب کے چوک میں ہوتا ہے +

دربار صاحب کی عمارت مربع کوٹھے کی وضع پر ایک عظیم الشان پختہ تالاب کے وسط میں ہے جو ہر طرف سے ۱۳۵ قدم لمبا ہے۔ یہ سکھوں کا اصل مندر اور مقام عبادت ہے۔ اس میں ایک پُل کے ذریعہ آمدورفت ہوتی ہے۔ مندر کا گنبد طلائی ہے اور دیواروں پر سنگ مرمر لگا کر اس میں انواع و اقسام کی تصویریں اور کئی قسم کے بیل بوٹے پچی کاری کے بنے ہوئے ہیں۔ نوجوان لڑکوں کو سکھ بنانے کی رسم جسے ان کی اصطلاح میں پُوہل دینا کہتے ہیں

اسی جگہ ادا ہوتی ہے۔ ہر تہوار خصوصاً سال میں دو مرتبہ دیوالی اور بیساکھی کے موقع پر دور دراز مقامات کے جاتری مندر کی زیارت اور تالاب میں غسل کرنے کو آتے ہیں۔ اس زمانہ میں دربار صاحب کی رونق قابلِ دید ہوتی ہے +

تالاب کے چاروں طرف سہ منزلہ چہار منزلہ عمارتیں ہیں جو بُنگہ کے نام سے موسوم ہیں۔ یہ بُنگے سکھ سرداروں اور رئیسوں نے اپنے اور اپنے دوستوں اور دیگر جاتریوں کے آرام و قیام کے واسطے بنوائے ہیں۔ ان میں سے چند ایک اپنے اپنے بانیوں کے نام سے مشہور ہیں۔ اکال بُنگہ خصوصیت کی جگہ ہے۔ اس میں سکھوں کے دسویں گرو گوبند سنگھ صاحب کی تلوار اور بعض ایسے ہتھیار رکھے ہیں جو کسی نہ کسی تاریخی واقعہ سے متعلق ہیں۔ بنگوں کے اصل راستے تو شہر کے کوچوں میں سے ہیں۔ تاکہ زائرین مع اسباب و سامان یہاں آکر قیام کریں۔ مگر مزید سہولت کے واسطے ایک ایک دروازہ دربار صاحب کے اندر کو بھی بنا ہوا ہے تاکہ مندر کی زیارت اور تالاب میں غسل کرنے کے واسطے لوگ بلا تکلف آ جا سکیں +

دربار صاحب کے قریب بابا اٹل ایک اور عمارت ہے۔ اس کا مینار ۱۳۱ فٹ بلند ہے اور اس پر چڑھنے سے تمام شہر کا منظر نہایت خوشنما معلوم ہوتا ہے +

دربار صاحب کے آس پاس ہندو فقیروں کے عالیشان مکانات ہیں جو اکھاڑوں کے نام سے مشہور ہیں۔ اور ان کے سرگروہ لوگ مہنت کہلاتے ہیں۔ دربار صاحب اور اکھاڑوں کے متعلق سرکار کی طرف سے علیحدہ علیحدہ جاگیریں مقرر ہیں جن سے ہر قسم کے مصارف ادا ہوتے ہیں۔

سکھ رئیسوں اور سرداروں کے نذرانے اس کے علاوہ ہیں - غرض مالی حیثیّت سے دربار صاحب اور اکھاڑوں کی خوشحالی کی نظیر پنجاب بھر میں کہیں نہیں ملتی +

شہر کے باہر نئی اور پُرانی جتنی عمارتیں ہیں اُن میں رام باغ اور قلعۂ گوبند گڑھ قابل دید اور مہاراجہ رنجیت سنگھ کی یادگار ہیں - رام باغ کا رقبہ چالیس ایکڑ کے قریب ہے - اس کی روشیں مصفّا - سڑکیں وسیع - دونو طرف سرو کی قطاریں باقرینہ اور موقع موقع پر متعدد عمارتیں عمدہ قسم کی بنی ہوئی ہیں - یہ باغ فرانسیسی باغبانوں کی تجویز سے صرف کثیر کے بعد تیار ہوا تھا - اس حیثیت کا باغ ساری پنجاب میں کہیں نہیں - قلعہ زمین دوز بنایا گیا ہے اور اپنی وضع کے لحاظ سے خصوصیت کا ہے +

امرتسر میں شال نہایت عمدہ تیار ہوتی ہے جس کی مثال کشمیر کے بعد دوسری جگہ نہیں ملتی - کچھ عرصہ سے قالین بافی کے کام کو بھی ترقی ہے ریشمی گلبدن بہت اچھا بنتا اور بکثرت باہر جاتا ہے - ہاتھی دانت کی کئی قسم کی چیزیں یہاں عمدہ بنتی ہیں - تجارتی مقاصد کے لحاظ سے یہ شہر پنجاب کا مرکز ہے - ایک طرف وسط ایشیا اور دوسری طرف یورپ تک بیوپار کا سلسلہ جاری ہے - لاکھوں من غلّہ اور بیشمار چمڑا یورپ کو جاتا ہے اور وہاں سے لاکھوں روپے کی صنعتی چیزیں یہاں آتی ہیں - لنڈن - پیرس - برلن اور نیو یارک کے بڑے بڑے ایجنٹ خرید و فروخت کی غرض سے ہمیشہ یہاں موجود رہتے ہیں - بلخ - بخارا - تبت اور افغانستان کے بیوپاری جو مال لاتے ہیں - اس کی قیمت کے معاوضے میں کلکتہ - بمبئی - مانچسٹر اور برمنگھم کا مال یہاں سے لے جاتے ہیں - کچھ عرصہ سے یہاں کے باشندوں

کی توجہ مشینوں کی طرف مائل ہے۔ چنانچہ بیرون شہر مشترکہ سرمایہ سے ایک کارخانہ جاری ہؤا ہے جس میں سوت بنانے کا کام ہوتا ہے +

اس تجارت کے علاوہ امرتسر کی رونق کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہر سال بساکھی اور دیوالی کے موقع پر ماہ اپریل اور اکتوبر میں مویشیوں اور گھوڑوں کی منڈی لگتی ہے۔ اس موقع پر بیوپاری صدہا میل سے مویشی اور گھوڑے لاکر فروخت کرتے ہیں۔ میونسپل کمیٹی بڑی توجہ سے ان میلوں کی سرپرستی کرتی ہے +

اُنیسویں صدی کے آخری حصّہ میں صنعتی ترقیات کے لحاظ سے امرتسر کو یہ خصوصیت حاصل ہوئی ہے کہ ملکہ معظمہ کا ہندوستانی وضع کا شاہی محل بنانے کے واسطے ۱۸۹۲ء میں بھائی رام سنگھ جو تمام ہندوستان سے منتخب ہوکر ولایت بلوایا گیا۔ وہ اسی شہر کا باشندہ ہے۔ بھائی صاحب اس وقت سردار صاحب کے لقب سے ملقب اور لاہور میو سکول آف آرٹ میں پرنسپل کے عہدے پر مامور ہیں +

تعلیم کے لحاظ سے امرتسر کی حالت اچھی ہے۔ گورنمنٹ سکول۔ مشن سکول اور ہندو مسلمانوں کے متعدد قومی سکول انٹرنس تک موجود ہیں۔ ان کے علاوہ حال میں سکھوں کا ایک خالصہ کالج بیرون شہر بنایا گیا ہے۔ اس میں پنجاب کے تمام سکھ والیانِ ملک اور سکھ سرداروں نے بڑی فراخ حوصلگی سے ۲۱ لاکھ روپے چندہ دیا ہے +

ہندؤں۔ سکھوں اور مسلمانوں کی متعدد مذہبی اور قومی انجمنیں ہیں۔ جن میں ہندو سبھا۔ سنگھ سبھا۔ آریہ سماج اور انجمن اسلامیہ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ انجمن اسلامیہ مستقل آمدنی اور خوش انتظامی کے لحاظ

سے تمام پنجاب میں ممتاز ہے - امرتسر کے رئیس اعظم خان محمد شاہ مرحوم نے اس کی بنیاد قائم کی تھی - انہیں کے زمانہ میں آنریبل سر سید احمد خاں مرحوم امرتسر میں تشریف لائے تھے جن کی مہمان نوازی اور خاطرداری کا انتظام شاہ صاحب نے بہت سرگرمی سے کیا - انجمن کے موجودہ پریزیڈنٹ خان بہادر شیخ غلام صادق بڑے معزز اور قومی کاموں سے انہیں نہایت دلچسپی ہے - انہوں نے گزشتہ سالوں میں ندوۃ العلما اور محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے جلسے بڑی دھوم دھام سے امرتسر میں کئے تھے - مذہبی علوم خصوصاً قرآن اور حدیث کے اس میں مولوی سید عبد الجبار صاحب غزنوی بڑے پایہ کے عالم ہیں - یہ مولوی سید عبد اللہ مرحوم کے بیٹے ہیں جو اپنے وقت میں علوم ظاہری و باطنی میں بہت کمال رکھتے تھے ؞

یہاں کا پریس دن بدن ترقی کر رہا ہے - کئی ایک اردو اخبار اور دو تین رسالے شائع ہوتے ہیں - اخبار وکیل جو مسلمانوں کا مشہور اخبار ہے اپنے مالک شیخ غلام محمد صاحب کے حسن اہتمام سے قومی اور ملکی خدمتیں عمدگی سے انجام دے رہا ہے - اہل حدیث کی طرف سے ایک اخبار بسرپرستی مولوی ثناء اللہ صاحب مولوی فاضل اور حنفیوں کی طرف سے ایک اخبار اہل فقہ کے نام سے ہفتہ وار شائع ہوتا ہے - مولوی ثناء اللہ صاحب کو عیسائیوں اور آریوں کے مناظرہ میں خوب مہارت ہے ؞

انگریزی عملداری کی ابتدا میں یہاں ایک چھاؤنی تھی - تھوڑی سی فوج اب بھی اس چھاؤنی اور نیز قلعہ گوبند گڑھ میں موجود ہے ؞

امرتسر ایک اوسط درجے کا جنکشن ہے - یہاں سے ایک لائن ۶۷ میل لمبی بٹالہ - گورداسپور اور دینا نگر ہوتی ہوئی پٹھان کوٹ جاتی ہے جو ڈلہوزی

اور وھرم سالہ کی سڑکوں کا ناکہ ہے - دوسری لائن ۲۸ میل براہ ترنتارن پٹی کو جاتی ہے - اور امید ہے کہ کچھ عرصہ بعد قصور تک جا پہنچیگی +

قادیان

امرتسر سے ہم نے قادیان کا عزم کیا - جہاں مرزا غلام احمد صاحب رئیس قادیان نے چند سالوں سے مسلمانوں کے مذہبی خیالات میں ایک خاص قسم کی حرکت پیدا کی ہے - بٹالہ تک ۲۴ میل - ریل کے ذریعے اور وہاں سے قادیان تک - سات کوس یکے پر راستہ طے کرنا پڑا کل مسافت پانچ چھ گھنٹے سے زیادہ نہ تھی +

قادیان ایک چھوٹا سا قصبہ ہے اور اس کی موجودہ شہرت صرف مرزا صاحب کے وجود سے ہے کسی قسم کی تاریخی یا تجارتی خصوصیت اس کو حاصل نہیں - مجھے کئی مرتبہ قادیان جانے اور نیز لاہور و امرتسر میں مرزا صاحب سے ملنے اور ان کی تقریریں سُننے کا اتفاق ہوتا رہا ہے +

مرزا صاحب پنجاب کے ایک معزز خاندان کے رُکن ہیں - آپ کے والد مرزا غلام مرتضےٰ دنیاوی جاہ و ثروت کے علاوہ بہت بڑے طبیب حاذق تھے - آپ نے اپنے والد کے سایۂ عاطفت میں مشہور اساتذہ سے علوم متداولہ کی تکمیل کی - ابتدا میں کچھ عرصہ تک سرکاری ملازمت کی اور پھر دفعتہً اس سے دست بردار ہو کر کتب علوم دینیہ کے مطالعہ پر متوجہ ہوئے - آج سے تقریباً تیس سال بیشتر صداقت اسلام کے اثبات میں آریوں اور عیسائیوں سے مختلف مقامات پر بڑے بڑے تحریری اور تقریری مباحثے نہایت کامیابی سے کئے - اور بعض اوقات اپنے الہامات کا اظہار بھی

کرتے رہے۔ سب سے پہلے براہین احمدیہ کے نام سے ایک کتاب چار جلدوں میں شائع کی۔ جس سے ہندوستان میں آپ کے مذہبی معلومات کا بہت چرچا ہؤا۔ اور مسلمانوں نے آپ کی درخواست پر پیشگی چندوں سے مدد کی۔ مگر افسوس ہے کہ یہ کتاب تکمیل کو نہ پہنچی۔ کچھ عرصہ بعد بعض حدیثوں کے استناد اور اپنے کشف والہامات کی بنیاد پر مثیل مسیح ہونیکا دعویٰ کیا۔ پھر اپنے آپ کو مسیح موعود اور مہدی معہود بھی قرار دیا +

اِس عرصے میں مرزا صاحب کے حُسن بیان اور پرزور عربی نظم و نثر اور اُردو تصنیفات کا یہ اثر ہؤا کہ بہت سے لوگ ان کی طرف جھک پڑے رفتہ رفتہ اس قدر ترقی ہوئی کہ ان کی صدا کی گونج ہندوستان کے اکثر حصّوں تک جا پہنچی۔ اِن کے مریدوں کی تعداد میں جو اضافہ ہؤا۔ آج ہم اس کو دیکھ رہے ہیں۔ بعض مریدوں کو تو آپ سے اس قدر حُسنِ عقیدت ہے کہ اُنھوں نے ترک وطن کر کے یہیں ڈیرے آجمائے ہیں۔ ان میں سے مولوی حکیم نورالدین صاحب خصوصیّت سے قابل ذکر ہیں جو علوم مشرقیہ کے عالم۔ نامور طبیب اور اس سے پیشتر ریاست جمّوں وکشمیر کے مہاراجگان کے معالج تھے +

علمائے اسلام نے مرزا صاحب کے یہ حالات دیکھ کر اُن کی بہت مخالفت کی۔ کسی نے تردید دعاوی پر رسالے لکھے۔ کسی نے ذاتی معاملات پر بحث کی۔ کسی نے کفر کا فتوےٰ دیا۔ غرض جو جس سے بن آیا کسر نہیں اُٹھا رکھی۔ آپ نے بھی مخالفین۔ منکرین اور مکفّرین کو اپنی تحریروں اور تقریروں میں ترکی بہ ترکی جواب دئے۔ مخالفین میں مولوی ابوسعید محمد حسین بٹالوی ایک مشہور عالم ہیں۔ جنھوں نے آپ کی مذہبی اور ادبی تحریروں پر

وقتاً فوقتاً نکتہ چینی کرنے کو فرض منصبی قرار دے رکھا تھا۔ ان سے بڑھ کر آپ کے مخالف ڈاکٹر عبدالحکیم صاحب میڈیکل آفیسر ریاست پٹیالہ ہیں جو پہلے آپ کے بہت مخلص معتقد تھے۔ مگر آخر میں بالکل منحرف ہو گئے۔ ڈاکٹر صاحب کی مخالفت سے یہاں تک نوبت پہنچی کہ ایک دوسرے نے زور قلم کے بعد الہامی طاقت آزمائی بھی کی۔ اگرچہ پبلک میں مرزا صاحب کی نسبت یہ شور و غل برپا رہا۔ مگر مرید اپنے کمال خلوص اور انتہا عقیدت پر قائم رہے حتٰے کہ آپ کے نام کے ساتھ انبیا کی طرح "علیہ الصلوٰۃ والسّلام" کا استعمال کرتے ہیں۔ چنانچہ مرزا صاحب کی جو عکسی تصویر شائع ہوئی ہے اس پر یہ الفاظ موجود ہیں "حضرت اقدس میرزا غلام احمد مسیح زمان مہدی دوران علیہ الصلوٰۃ والسلام"۔ اسی مناسبت سے یہ لوگ آپ کی دہلی والی بیوی کو "اُم المومنین" کے لقب سے پکارتے ہیں +

آپ نے اپنے مریدوں کو باہمی میل ملاپ پر توجہ دلا کر ایک جداگانہ جماعت قائم کی اور "فرقۂ احمدیہ" اس کا نام رکھا۔ مگر عام لوگ "مرزائی" کے لفظ سے پکارتے ہیں۔ مرزائی اپنے دینی و دنیوی کاروبار میں مرزا صاحب کے احکام کے پابند ہیں۔ اور انہوں نے اپنے عزیزوں کو چھوڑ کر ایک نئی برادری بنا لی ہے۔ دیگر مسلمانوں کے ساتھ اس مخالفت کو یہاں تک ترقی ہوئی کہ قطع رحم کے ساتھ ایک دوسرے کے پیچھے نماز پڑھنی بھی چھوڑ دی +

مرزا صاحب کی عمر اگرچہ ستّر سال سے متجاوز ہو گئی تھی۔ مگر قوا ے خوب مضبوط تھے۔ لباس سادہ۔ نشست و برخاست میں بے تکلفی اور گفتگو میں متانت پائی جاتی تھی۔ دینی امور کے ساتھ دنیاوی معاملات میں بھی بڑے مدبّر تھے۔ مذہبی مقاصد کی اشاعت کے واسطے ان کی تالیف کردہ کتابیں اُردو اخبار۔ انگریزی رسالہ ریویو آف ریلیجن قادیان سے شائع ہوتے ہیں۔

ایک مدرسہ بھی انٹرنس کلاس تک قائم ہے۔ ان تمام کاروبار کے انصرام کے واسطے مریدوں کی طرف سے ماہوار چندے۔ خیرات اور زکوٰۃ آتی رہتی ہے۔ تالیفات۔ لنگرخانہ۔ مدرسہ۔ اخبار اور انگریزی رسالہ کے ساتھ ساتھ "منارۃ المسیح" و "مقبرہ بہشتی" کے چندوں کا بھی خاص اہتمام اور ہر مد کی جمع و خرچ کا پورا انتظام ہے۔ اس کے علاوہ معقول تعداد کے نذرانے اور بیش قیمت ہدیئے مریدوں کی طرف سے وقتاً فوقتاً آتے رہتے ہیں۔

+ + + + + + + + + + + + + +

مرزا صاحب نے وفات سے چند سال پیشتر مثیل کرشن ہونے کا بھی دعوے کیا تھا۔ سنہ ۱۹۰۸ء میں ہندو مسلمانوں کی باہمی مصالحت پر متوجہ ہو کر لاہور تشریف لائے اور ایک لیکچر "پیغام صلح" کے نام سے لکھا۔ یہ لیکچر شائع ہونے ہی کو تھا کہ ۲۶ مئی کی شب کو یک بیک بیمار ہوئے اور چند ہی گھنٹوں میں انتقال کیا۔ ان کا جسد لاہور سے قادیان میں پہنچایا گیا +

مرزا صاحب کی دو بیویاں ہیں اور دونوں صاحب اولاد۔ برادری کی بیوی سے انکے فرزند خانصاحب مرزا سلطان احمد صاحب اعلے درجے کے مضمون نگار اور گورنمنٹ پنجاب میں اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر کے معزز عہدے پر ممتاز ہیں +

آپ کی جانشینی کا اعزاز مولوی حکیم نورالدین صاحب کو ملا ہے جن کے علم و فضل کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ مرزا صاحب کے مریدوں نے آپ کا لقب "خلیفۃ المسیح" قرار دیا ہے اور قادیان کے اخبار نویس "امیرالمومنین" سے مخاطب کرتے ہیں +

کہتے ہیں کہ ہندوستان میں چار احمد ہو گزرے ہیں۔ جنہوں نے دینی تعلیم و تلقین سے شہرت حاصل کی اور صاحب رتبہ شمار ہوئے (۱) شیخ احمد سرہندی (مجدد الف ثانی) (۲) سید احمد بریلوی۔ (۳) سر سید احمد خاں علیگڑھی۔ (۴) یہی مرزا غلام احمد قادیانی +

لاہور

امرتسر سے ۳۲ میل کا فاصلہ طے کر کے ہم بہ سواری ریل لاہور پہنچے۔ یہ شہر دریائے راوی کے کنارے واقع ہے۔ قدیم زمانے میں یہاں راجپوت فرمانرواؤں کی راجدھانی تھی۔ چوتھی صدی ہجری کے اخیر میں مسلمانوں کی حکومت مستحکم ہوئی۔ یہ وہ زمانہ ہے جبکہ سلطان محمود غزنوی ہندوستان پر حملہ آور ہؤا۔ چھٹی صدی ہجری میں اُس کی اولاد میں سے خسرو شاہ نے پنجاب پر قابض ہو کر لاہور کو اپنا دارالسلطنت قرار دیا۔ خسرو ملک اُس کے بیٹے تک غزنوی خاندان کی حکومت رہی۔ سندھ کے بعد ہندوستان میں یہ پہلا شہر ہے جس میں ابتداءً اسلامی حکومت نے نشو نما پایا۔ اس زمانے میں بعض ایسے زبردست علما پیدا ہوئے کہ پھر ہندوستان میں اُن کا ہم پلہ نہیں ہؤا۔ غوریوں کے عہد میں جب دہلی دارالخلافہ قرار پایا تو لاہور بے رونق ہو گیا۔ مگر لودھیوں کے عہد میں پھر صوبہ کا دارالحکومت مقرر ہؤا اور بابر کے بیٹے کامران مرزا نے کچھ عرصہ یہاں سکونت اختیار کی جس سے اس کی آبادی بڑھنی شروع ہوئی +

لاہور کی موجودہ آبادی کی ابتدا شہنشاہ اکبر سے ہے جس نے دسویں صدی ہجری میں پختہ فصیل اور ایک خوبصورت قلعہ بنا کر اس کو رونق دی اور صوبہ پنجاب* کا پایہ تخت تجویز کیا۔ جہانگیر اور شاہجہان نے اپنے باپ دادا کی تقلید میں بڑی بڑی عالیشان عمارتیں بنوائیں جو اب تک شہر اور

* بادشاہی زمانے میں صوبہ لاہور کے متعلق یہ شہر تھے۔ لاہور - جالندھر - بجواڑہ - بٹالہ - مسانیاں - ڈیرہ بابا نانک - قلعہ کانگڑہ جس کا پُرانا نام نگرکوٹ ہے - جوالا مکھی - سیالکوٹ - دھونکل - جموں - گجرات - ایمن آباد - نمک سار سیانی - رہتاس گڑھ +

اطراف شہر میں اپنے بانیوں کی یاد دلا رہی ہیں۔ شہنشاہ عالمگیر کے زمانے تک ہر قسم کے علما اور اہل ہنر یہاں موجود تھے۔ مگر مغلوں کے ضعف کے زمانے میں لاہور پھر حملہ آوروں کا گزرگاہ بن گیا۔ یہاں تک کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی حکومت کی نوبت آئی جس نے فی الجملہ اس کی حالت کو درست کیا۔ ۱۲۶۶ھ (۱۸۴۹ء) میں انگریزی حکومت کے اقبال نے اس پر سایہ ڈالا۔ جس کی برکت سے اب میدان ترقی میں بہت بڑھ گیا ہے۔ اور روز بروز بڑھ رہا ہے۔ اس وقت نواب لفٹنٹ گورنر پنجاب و حکام سول کا صدر مقام ہے۔ اور پنجاب نارتھ ویسٹرن ریلوے کا بڑا بھاری جنکشن ہے جس سے ہندوستان کے مختلف اطراف کو سڑکیں نکلتی ہیں۔ سنہ ۱۹۰۱ء کی مردم شماری کے مطابق اس کی آبادی دو لاکھ ہے +

عمارات و اندرون شہر

شہر لاہور اور اس کے اردگرد شاہی زمانے میں اس کثرت سے عمارتیں تھیں کہ اُن کے کھنڈر اب بھی میلوں تک دکھائی دیتے ہیں۔ اُن میں سے چند مسجدیں۔ مقبرے اور باغات باوجود انقلاب سلطنت کے اب تک ایسی حالت میں ہیں کہ سیاح اُنہیں دیکھ کر خاص لطف اُٹھاتے ہیں۔ جب ہم دہلی دروازہ سے قلعہ کو جائیں تو راستہ میں مفصلہ ذیل عمارتیں آتی ہیں :-

مسجد وزیر خاں

وزیر خاں کی مسجد جسے شاہجہاں کے ایک امیر نواب وزیر خاں صوبہ لاہور نے سنہ ۱۰۴۴ھ (۱۶۳۴ء) میں تعمیر کرایا تھا۔ یہ مسجد فن تعمیر کے اصول کے لحاظ سے بہت اعلےٰ درجے کی ہے۔ اس کے بیرونی دروازہ کی دیوار پر کاشانی نقش و نگار آیات قرآنی اور فارسی کے اشعار اس خوبی سے کئے اور لکھے ہیں کہ پونے تین سو برس سے اُن کی آب و تاب میں اب تک کچھ فرق نہیں آیا۔ دور دراز ملکوں کے سیاح جو لاہور میں آتے ہیں۔ اس

کی اعلےٰ صناعی کی داد دیتے ہیں ٭

سنہری مسجد

سنہری مسجد - یہ وسط شہر میں دو منزلہ پر بنی ہوئی ہے اور نواب سید بھکاری خاں کی یادگار ہے جس نے ۱۱۶۳ھ / ۱۷۴۹ء میں بعہد محمد شاہ اسے تعمیر کرایا تھا - مسجد کی عمارت اگرچہ اینٹ پتھر کی ہے مگر گنبد و مینار طلائی ہیں موقع کی عمدگی اور طلائی چمک دمک سے بحیثیت مجموعی بہت خوشنما معلوم ہوتی ہے - اس کے چاروں طرف بہت آباد بازار ہیں خصوصاً ڈبی بازار شہر کا سب سے زیادہ بارونق حصہ ہے - یہاں سے واٹر ورکس ہوتے ہوئے ہیرا منڈی کے چوک میں گزر ہوتا ہے جہاں سے شہر کے چاروں طرف سڑکیں نکلتی ہیں ٭

حضوری باغ

قلعہ اور بادشاہی مسجد کے درمیان حضوری باغ ہے - اس کے وسط میں ایک بہت خوبصورت بارہ دری مہاراجہ رنجیت سنگھ کی بنوائی ہوئی ہے - اس کا پتھر زیب النسا بیگم کے باغ سے جو چوبرجی میں ہے مہاراجہ نے اُکھڑوا کر لگوایا تھا - اس باغ اور بارہ دری کی سیر کے واسطے اکثر لوگ صبح و شام آتے رہتے ہیں ٭

بادشاہی مسجد

بادشاہی مسجد شہنشاہ عالمگیر نے ۱۰۸۴ھ / ۱۶۷۳ء میں تعمیر کرائی تھی - یہ ایسی وسیع ہے کہ سارے پنجاب میں اس کا جواب نہیں - اس کی تمام عمارت سنگ سرخ کی اور گنبد سنگ مرمر کے ہیں - کام بہت سادہ ہے - مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اپنے عہد حکومت میں اس مسجد کو اسلحہ خانہ بنا رکھا تھا - جب انگریزوں کا قبضہ ہوا تو انہوں نے مسلمانوں کی استدعا پر اس کو واگزار کر دیا - عیدین کی نماز پر اس مسجد میں بہت رونق ہوتی ہے - مسجد کی عمارت مرور زمانہ اور نیز سکھوں کی بے پروائی سے قابل مرمت ہو گئی تھی -

خان بہادر محمدؐ برکت علی خان صاحب سکرٹری انجمن اسلامیہ نے نہایت کثیر رقم چندہ فراہم کرکے اپنے اہتمام سے اس کی مرمت کرائی - اور گورنمنٹ نے بھی نہایت فیاضی سے امداد دی +

تبرکات

تبرّکات نبویؐ کا ذخیرہ جو بعہد مہاراجہ رنجیت سنگھ قلعہ میں تھا - گورنمنٹ نے ۱۳۰۲ھ ۱۸۸۴ء میں انجمن اسلامیہ کے سپرد کردیا - اور اب اس مسجد کے بیرونی دروازے پر بہت حفاظت سے رکھا ہوا ہے - اس کی زیارت انجمن اسلامیہ کی زیر نگرانی زائرین کو اوقات مقررہ پر کرائی جاتی ہے +

مستشار العلما

مسجد کے شمالی حُجروں میں مشرقی علوم کا ایک کتب خانہ انجمن مستشار العلما کے سکرٹری شمس العلما مفتی محمدؐ عبداللہ صاحب ٹونکی ہیڈ پروفیسر اورینٹل کالج کی حُسن سعی سے ۱۳۲۳ھ ۱۹۰۵ء میں قائم ہوا ہے - اس میں ہر قسم کی دینی و دنیاوی کتابوں کا ذخیرہ عربی - فارسی - اُردو زبانوں میں بہت محنت سے مہیّا کیا گیا ہے +

قلعہ

مسجد کی مشرقی جانب قلعہ ہے جو شہنشاہ اکبر کے زمانے میں تعمیر ہوا تھا - اور اپنے وقت میں جنگی اہمیّت کے لحاظ سے دہلی اور آگرہ کے قلعوں کا ہم پایہ سمجھا جاتا تھا - اس میں شیش محل اور ثمن برج دیکھنے کے لائق ہیں - اس کے علاوہ قدیم زمانے کے ہتھیاروں کا ذخیرہ بھی بہت عجیب اور قابل دید ہے +

سمادھ مہاراجہ رنجیت سنگھ

قلعہ کے سامنے مہاراجہ رنجیت سنگھ کی سمادھ (قبر) ہے - جس کا بیرونی حصہ سنگ سُرخ کا اور اندرونی عمارت چونے کی ہے - یہ عمارت اپنی عمدگی اور خوبی کے لحاظ سے سکھوں کی عمارتوں کا اچھا نمونہ ہے - شہر کے گرد شاہی زمانے میں جو خندق تھی وہ انگریزی عملداری کے شروع میں میونسپل کمیٹی نے پٹوا کر اس پر باغات بنوا دئے - اس قسم کے باغات پنجاب کے کسی دوسرے شہر

میں نہیں ہیں +

آبادی بیرون شہر

شہر کی آبادی بہت گنجان ہے ۔ زمین کم ہونے کی وجہ سے اکثر مکانوں میں صحن نہیں ۔ بازار بھی عموماً تنگ اور ٹیڑھے ہیں ۔ تازہ ہوا مکانوں میں کم آتی ہے ۔ ان وجوہات سے نئی عمارتیں روز بروز بیرون شہر بنتی چلی جاتی ہیں جو شہر کی جنوبی جانب میلوں تک پھیلی ہوئی ہیں ۔ گویا آبادی کی کثرت سے ایک نیا شہر بن گیا ہے جس میں ہزاروں مکانات ۔ کوٹھیاں ۔ سرکاری دفاتر ۔ کالج اور ہوٹل ہیں ۔ اس آبادی میں سب سے زیادہ مشہور اور بارونق انارکلی وٹھنڈی سڑک ہے +

انارکلی

انارکلی* کا بازار بہت وسیع ۔ خوشنما اور اس کے مکانات کشادہ وہوادار ہیں ۔ یہاں محمد شفیع کی ایک بڑی وسیع سرائے ہے جس میں اطراف وجوانب کے مسافر آکر ٹھیرتے ہیں ۔ بازار میں سوداگروں کی بڑی بڑی دکانیں ہیں جن میں ہر قسم کا تجارتی مال موجود اور لاکھوں روپے کا بیوپار ہوتا ہے ۔ چار پانچ بنک بھی ہیں جو دیسیوں کے اہتمام سے چل رہے ہیں +

اس تمام آبادی میں بعض عمارتیں خاص وجوہات سے قابل دید ہیں ۔ ان میں حضرت علی ہجویری المعروف داتا گنج بخش صاحب کی خانقاہ ۔ حضرات شیعہ کا امام باڑہ ۔ گورنمنٹ کالج ۔ گول باغ ۔ عجائب خانہ ۔ پبلک لائبریری ۔ یونیورسٹی ہال

---

* انارکلی شہنشاہ اکبر کی ایک کنیز تھی ۔ اس کا مقبرہ لاٹ صاحب کے دفتر کے قریب ہے کچھ مدت تک یہ سینٹ جیمس کا گرجا رہا ہے جس کی صلیب ہنوز دور سے دکھائی دیتی ہے ۔ مگر اب کچھ عرصے سے بطور کتب خانہ سرکاری مستعمل ہوتا ہے ۔ مزار کا تعویذ ایک طرف رکھ دیا گیا ہے ۔ کہتے ہیں کہ جہانگیر کو اس سے تعشق تھا ۔ جب اکبر کو اطلاع ہوئی تو انارکلی کو زندہ دفن کرا دیا ۔ جہانگیر نے اپنے زمانے میں یہ مقبرہ تعمیر کرایا اور تعویذ پر اسی کا یہ شعر لکھوایا ؎

آہ گر من باز بینم روے یار خویش را ۔۔۔ تا قیامت شکر گویم کردگار خویش را

خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ حضرت علی ہجویری وہ بزرگ ہیں جو سلطان مسعود غزنوی کے ہمراہ ہندوستان آئے تھے۔ آپ کے حالات ضمیمہ میں درج ہیں۔ امام باڑہ میں ہر سال عزاداری ہوتی ہے۔ ذوالجناح کا جلوس جو عشرۂ محرم میں مرثیہ خوانوں کی جماعتوں کے ہمراہ آنریبل نواب حاجی فتح علی خاں صاحب قزلباش سی۔ آئی۔ ای رئیس اعظم لاہور و تعلقدار اودھ کی حویلی سے نکلتا ہے شہر کا ایک مقررہ راستہ طے کرتا ہوا اس جگہ آکر ختم ہو جاتا ہے۔ اسی کو کربلا بھی کہتے ہیں۔ عجائب خانہ میں انواع و اقسام کی عمدہ عمدہ قدیم چیزیں خصوصاً جن کو پنجاب سے تعلق ہے رکھی ہیں۔ پبلک لائبریری میں انگریزی۔ عربی۔ فارسی اُردو اور ہندی کتابوں کا ایک معقول ذخیرہ ہے۔ مگر عربی کتابیں منتشار العلما کی لائبریری کے مقابلہ میں کم ہیں۔ یونیورسٹی ہال کا کمرہ اس قدر وسیع ہے کہ کل پنجاب میں کہیں اس کی نظیر نہیں ÷

ٹھنڈی سڑک

انارکلی کے چوک سے ٹھنڈی سڑک چڑیا گھر تک چلی گئی ہے جو صفائی اور آراستگی کے لحاظ سے بہت پُرفضا اور تمام پنجاب میں اپنی نظیر آپ ہی ہے۔ مشن کالج۔ بینک آف بنگال۔ جنرل پوسٹ آفس۔ تار گھر۔ چیف کورٹ۔ انگریزی روزانہ اخبار سول اینڈ ملٹری گزٹ کا دفتر۔ انگریزی اور بڑے بڑے دیسی تاجروں کی خوشنما دکانیں۔ اعلےٰ درجے کے ہوٹل۔ لارڈ لارنس کا آہنی بت۔ ملکہ معظمہ کی کانسی کی مورت۔ نیڈو ہوٹل اور چڑیا گھر اسی سڑک کے ارد گرد ہیں۔ نیڈو ہوٹل لاہور کے سب ہوٹلوں سے بڑا اور اس میں ساٹھ کمرے معزز مسافروں کے آرام کے واسطے موجود ہیں۔ یہاں سے ایک سڑک لارنس ہال۔ گورنمنٹ ہؤس اور چیفس کالج ہوتی ہوئی میاں میر چلی گئی ہے ÷

میانمیر

میانمیر لاہور سے جنوب مشرق کی طرف تقریباً تین میل کے فاصلے پر ہے۔ اس کی مغربی جانب ملتان ریلوے لائن اور مشرقی جانب امرتسر ریلوے لائن ہے۔ پہلے اس کی آبادی بہت تھوڑی تھی۔ مگر جب سے انگریزی فوجوں کا قیامگاہ قرار پایا اس کی رونق بہت بڑھ گئی ہے۔ ابتدا میں فوج بکثرت یہاں رہتی تھی۔ مگر اب وہ بات نہیں۔ شیخ محمد میر المعروف میانمیر صاحب اور آپ کے مرید شیخ محمد المشہور مُلّا شاہ اسی جگہ مدفون ہیں۔ یہ دونو بزرگوار شاہجہان کے عہد میں بڑے مشہور ولی ہوئے ہیں۔ ان کے حالات ضمیمہ میں درج ہیں +

باشندوں کے حالات

لاہور کے باشندے بالعموم نہایت سادہ زندگی بسر کرنے کے خوگر ہیں۔ ان کی اصلی زبان اگرچہ پنجابی ہے لیکن اُردو اپنی روزافزوں ترقی سے اس پر قابو جماتی اور اس کے الفاظ کی جگہ لیتی جاتی ہے۔ تعلیم یافتہ عموماً اُردو بولتے ہیں۔ انگریزی تعلیم کی کثرت نے یہاں کے تعلیم یافتوں کے تمدّن پر بھی خاص اثر کیا ہے۔ اور ایسے لوگ زیادہ تر انگریزی لباس اور انگریزی طریق کی ماند و بود کو بہت پسند کرتے ہیں۔ یہاں کی آب و ہوا کی عمدگی اور قدرتاً قوی الجُثّہ ہونے کے باعث لوگ عام طور پر جفاکش اور محنتی ہیں۔ باوجود تجارتی کاروبار کو پسند کرنے اور اس میں مشغول رہنے کے انگریزی تعلیم میں بھی اچھی ترقی کر رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہندوستان میں لاہور ایک بڑا تعلیمی مرکز ہے۔ مسلمان اور ہندو دونو اپنے قومی کاموں سے پوری دلچسپی رکھنے کے علاوہ ملکی پولیٹکس کی جانب بھی مائل اور موقع موقع پر اس میں کافی حصّہ لینے کے لئے نہ صرف تیار بلکہ عملی طور پر کاربند ہیں +

حرفت و صنعت

لاہور کے ریشمی کپڑے - سوتی کھیس - ازاربند اور گلبدن یہ چار چیزیں بہت مشہور ہیں - بید مشک بھی عمدہ ہوتا اور دور دور تک جاتا ہے - کچھ دنوں سے سوت کاتنے کے کئی کارخانے لالہ ہرکشن لال صاحب بیرسٹرایٹ لا کے اہتمام سے شاہدرہ ہیں - اور رائے میلارام کا کارخانہ بھاٹی دروازے کے باہر جاری ہے - انہیں اس کام سے خاص دلچسپی ہے - ریلوے ورک شاپ بہت بڑا ہے اور اس میں بھی لوگ کام سیکھتے ہیں +

تعلیم

تعلیمی ترقی کے لحاظ سے یہ شہر مشرقی اور مغربی علوم کا بڑا مرکز ہے - اور اس حیثیت سے بمبئی - کلکتہ اور مدراس کے سوا اور کہیں اس کی نظیر نہیں - آرٹس کی تعلیم کے واسطے چار کالج - گورنمنٹ کالج - مشن کالج - دیانند اینگلو ویدک کالج اور اسلامیہ کالج ہیں - مشرقی زبانوں کی تعلیم کے واسطے اورینٹل کالج ہے - علاوہ بریں لا کالج - میڈیکل کالج - ویٹرنیری کالج - آرٹ سکول - انجینیرنگ سکول گورنمنٹ ٹیکنیکل سکول - ہندو ٹیکنیکل انسٹیٹیوٹ اور چیفس کالج اپنا اپنا کام بہت خوبی سے کر رہے ہیں - چیفس کالج میں صرف والیان ریاست اور بڑے بڑے امرا کے لڑکے پڑھتے ہیں +

اس صوبہ کی یونیورسٹی کو جو پنجاب یونیورسٹی کے نام سے مشہور ہے - ہندوستان کی دیگر یونیورسٹیوں کے مقابلے میں یہ خاص امتیاز حاصل ہے کہ اس کے ماتحت علوم جدیدہ کی تعلیم انگریزی کے علاوہ دیسی زبانوں کے ذریعے بھی دی جاتی ہے - مشرقی زبانوں کی تعلیم اورینٹل کالج میں اعلےٰ درجے کی ہوتی ہے - اور نتائج امتحان پر مولوی فاضل منشی فاضل اور شاستری تک کی سندیں دی جاتی ہیں +

اس کالج میں مولوی فیض الحسن صاحب سہارنپوری ایک عرصہ تک

عربی کے ہیڈ پروفیسر رہے اور آپ کے فیض تربیت سے مختلف صوبجات
کے لوگوں نے عربی میں ایسی قابلیت حاصل کی کہ مشاہیر ہندوستان
میں شمار ہونے لگے۔ شمس العلما شبلی نعمانی۔ مولوی حمید الدین بی اے۔ مولوی
وحید الدین سلیم۔ شمس العلما مفتی محمد عبداللہ ٹونکی۔ شمس العلما مولوی عبدالحکیم کلانوری
مولوی قاضی ظفر الدین۔ مولوی اصغر علی روحی۔ مولوی عبدالجبار اور بہت سے اہل علم
کو اُن کی شاگردی کا فخر حاصل ہے۔ مولوی صاحب موصوف کا انتقال ۱۹۰۸ء
میں ہؤا۔ اب شمس العلما مفتی محمد عبداللہ آپ کے جانشین ہیں +

انجمنیں

اس شہر میں ہندو مسلمانوں کی متعدد مذہبی اور قومی سوسائیٹیاں بہت
عمدگی سے کام کر رہی ہیں جن میں انجمن حمایت اسلام۔ انجمن نعمانیہ۔ انجمن اسلامیہ
آریہ سماج۔ برہمو سماج خاصکر مشہور ہیں۔ ان کے سالانہ جلسے بڑی دھوم دھام
سے ہوتے ہیں اور شائقین صدہا کوس سے آکر لطف اٹھاتے ہیں +

انجمن حمایت اسلام ابتداءً غریب مسلمانوں کی چٹکی چٹکی آٹے کی مدد سے
۱۳۰۲ھ / ۱۸۸۵ء میں قائم ہوئی تھی۔ مگر اب ۱۹۱۰ء میں خدا کے فضل سے اس کا
سالانہ خرچ ساٹھ ستر ہزار روپے کے قریب اور دو لاکھ روپے کی عمارتیں اس
کی ملکیت ہیں۔ اس کے کارکنوں نے مسلمان بچّوں کے واسطے یتیم خانہ قائم
کیا۔ لڑکیوں اور لڑکوں کی دینی اور دنیوی تعلیم کے لئے مدرسے جاری کئے
مبتدیوں کی تعلیم کا ایک ایسا سلسلۂ کتب تالیف کیا جو تمام ہندوستان
کے دیسی مدارس میں رائج ہے۔ اعلےٰ تعلیم کے واسطے ایک انگریزی کالج
بنایا جو تمام ہندوستان میں علیگڈھ کالج کے بعد مسلمانوں کی ذاتی کوششوں
کی دوسری مثال ہے۔ انجمن کی مستقل امداد میں ہز میجسٹی امیر حبیب اللہ خاں
فرمانروائے دولت خداداد افغانستان کی طرف سے ایک ہزار روپیہ ماہوار

ملتا ہے اور پچاس ہزار کا یکمشت عطیہ کالج کی عمارت کے واسطے دولت خداداد پہلے دے چکی ہے۔حال میں پچھتر ہزار روپے کی امداد حاجی مولوی رحیم بخش صاحب سی۔آئی۔ای پریزیڈنٹ کونسل کی توجہ سے کالج کی عمارت کے واسطے ریاست بہاولپور سے منظور ہوئی ہے +

آریہ سماج کے علمی کارنامے بھی کچھ کم عزت کے لائق نہیں۔ان کا قومی کالج بہت اعلےٰ درجے کا ہے۔دنیاوی تعلیم کے ساتھ مذہبی تعلیم کا عمدہ انتظام ہے۔اسکول کی جماعتوں میں اردو فارسی کے عوض ناگری کی تعلیم لازم ہے۔شاید اسی وجہ سے کوئی مسلمان طالب علم یہاں نہیں پڑھتا۔کئی لاکھ روپے کا سرمایہ اور سکول کالج کی عمدہ عمارتیں ان کے قبضہ میں ہیں۔اور سب سے زیادہ لائق تعریف یہ بات ہے کہ کالج کے پرنسپل لالہ ہنسراج صاحب بی اے نے اپنی زندگی قومی خدمات کے واسطے وقف کر دی ہے۔ان کے بھائی پچاس روپے ماہوار ذاتی مصارف کے واسطے انہیں دیتے ہیں۔افسوس کہ اسلامیہ کالج کو اب تک کوئی آدمی اس پایہ کا نہیں ملا +

انجمن اسلامیہ ان سب سے پُرانی ہے اور لاہور و پنجاب کے مسلمانوں کی صدر انجمن مانی گئی ہے۔خان بہادر محمد برکت علی خاں نے ۱۸۶۹ء میں اس کی بنیاد قائم کی۔اور بحیثیت سکرٹری مسلمانان لاہور کی قومی اور ملکی خدمات کو اپنی وجاہت اور حُسن تدبیر سے عمدگی کے ساتھ انجام دیا۔شاہی مسجد کو آباد کیا۔بیشمار روپیہ فراہم کر کے اُس کی مرمت کرائی۔سُنہری مسجد کی آمدنی کا انتظام کیا۔آنریبل سر سید احمد خاں مرحوم جو چار مرتبہ لاہور تشریف لائے ہر مرتبہ اُن کے استقبال اور مہمان نوازی پر ہزارہا روپے زر چندہ سے فراہم کر کے صرف کئے اور مسلمانوں کی عزت اور آبرو کو قائم رکھا۔خان بہادر شاہجہانپور

کے رئیس اور ایک مدت تک لاہور میں اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر کے عہدے پر ممتاز رہ چکے ہیں۔ آپ نے اپنی عمر کا زیادہ حصّہ قومی کاموں میں صرف کیا۔ موچی دروازہ کے باہر محمڈن ہال کی عمارت آپ کی یاد تازہ کرتی رہتی ہے۔ آپ نے ۸۲ برس کی عمر پاکر ۵ بتاریخ ۲۳ ۱۹ء میں انتقال کیا +

پریس — یہاں کا چھاپہ خانہ خوب ترقی پر ہے۔ متعدد اردو انگریزی اخبار۔ ماہواری رسالے اور مختلف علوم کی کتابیں شائع ہوتی اور تمام ہندوستان میں بڑے شوق سے پڑھی جاتی ہیں۔ اخبار عام۔ پیسہ اخبار۔ وطن اور ہندوستان یہاں کے مشہور اردو اخبار ہیں۔ ہندوؤں کا ایک انگریزی اخبار ٹریبیون روزانہ اور وطن پنجابی ہفتے میں دو بار شائع ہوتا ہے۔ مسلمانوں کا ایک انگریزی اخبار آبزرور ہفتے میں دو بار نکلتا ہے۔ بحیثیت مجموعی لاہور سے جس قدر اخبار۔ رسالے اور کتابیں شائع ہوتی ہیں۔ بنگال اور دکن کے سوا ہندوستان کے اور کسی حصہ سے نہیں ہوتیں۔ انگریزوں کا سب سے سر برآوردہ انگریزی روزانہ اخبار سول اینڈ ملٹری گزٹ ہے جو پاؤنیر اور ٹائمز آف انڈیا کا ہم پلہ شمار کیا جاتا ہے +

ملکی شورش — ملکی شورش کے متعلق جو واقعات ۱۹۰۷ء میں پیش آئے لاہور اُن کا بڑا مرکز تھا۔ اس شورش کے مختصر واقعات پنجاب کی اجمالی حالت میں درج ہو چکے ہیں٭۔ لالہ لاجپت رائے کی گرفتاری کے دن اخبار سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور نے یہاں تک چھاپ دیا تھا کہ یہ شخص ایک لاکھ آدمیوں کی جمعیت سے ۱۰ مئی کو قلعۂ لاہور پر حملہ کرنا چاہتا ہے۔ لیکن گرفتاری کے بعد اس افواہ کا کچھ بھی وجود نہ پایا گیا۔ ایک لاکھ کیا ایک متنفس نے بھی کان تک نہ ہلایا۔ واقعات کے ضمن میں یہ بات قابل بیان ہے کہ گرفتاری کی خبر سے لالہ لاجپت رائے

٭ دیکھو صفحہ ۱۴

کو کسی طرح کی گھبراہٹ نہیں ہوئی۔ مگر بھائی اجیت سنگھ چپکے سے کہیں چلدیا اور پانسو روپے کے انعام سے اُس کی گرفتاری عمل میں آئی۔ جب گرفتاری اور جلاوطنی کی کارروائی ہوچکی تو جو لوگ پہلے اُن کے مدّاح تھے۔ اُنہوں نے بحفظ ماتقدم اپنی ناراضی کی تحریری اطلاعیں گورنمنٹ میں بھیجنی شروع کیں۔ آریا کمیٹی نے لکھا کہ لالہ لاجپت رائے ہماری جماعت کا ممبر نہیں۔ سکھوں نے رپورٹ کی کہ اجیت سنگھ سکھ ہی نہیں۔ غرض بُرا وقت دیکھ کر سب الگ ہوگئے ۔

سلاطین مغلیہ کی عمارتیں اگرچہ بیرون شہر جگہ جگہ پھیلی ہوئی ہیں۔ مگر اس وقت ان میں سے صرف دو عمارتیں اپنی عمدگی اور خوبی کے لحاظ سے قابل دید ہیں :۔

شالامار باغ

(۱) شالامار باغ۔ یہ عمارت لاہور سے مشرق کی طرف تقریباً تین میل کے فاصلے پر موضع باغبانپورہ کے پاس واقع ہے۔ شالامار جاتے ہوئے راستے میں گلابی باغ وغیرہ بعض ایسی قدیم عمارتیں نظر سے گزرتی ہیں جن سے شاہی زمانے کی لاہور کی عظمت و شوکت کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ اس باغ کو شاہجہاں نے ۱۰۴۷ھ (۱۶۳۷ء) میں تعمیر کرایا تھا۔ یہ ایک بڑی فصیل سے محدود ہے جس میں تقریباً اسی ایکڑ زمین ہے۔ اس میں آمد و رفت کے واسطے تین طرف تین بڑے بڑے دروازے بنے ہوئے ہیں۔ باغ کے تین طبقے ہیں۔ ہر طبقہ کی سطح دوسرے طبقہ سے اونچی ہے۔ پہلا طبقہ دوسرے سے ۱۳ فٹ اور دوسرا تیسرے سے ۱۰ فٹ بلند ہے۔ مگر باہر سے دیکھو تو اس نشیب و فراز کا خیال تک پیدا نہیں ہوتا۔ باغ کے بیچوں بیچ ایک نہر ایک سرے سے دوسرے سرے تک جاری ہے۔

اس نہر کو بادشاہی حکم کے موافق نواب علی مردان خاں مادھوپور سے لائے تھے۔ دائیں بائیں مختلف موقعوں پر بادشاہ اور بیگمات کے رہنے کے مکانات بڑے خوش قطع بنے ہوئے ہیں۔ پہلے طبقہ کے خاتمے پر سنگ مرمر کی بارہ دری ہے۔ پانی اس کی سطح زیریں سے نکل کر سنگ مرمر کی آبشار سے ہوتا ہؤا مقابل کے حوض میں گرتا ہے جو دوسرے طبقہ میں واقع ہے۔ حوض بھی سنگ مرمر کا ہے اور اس میں صدہا فوارے لگے ہوئے ہیں۔ لکھا ہے کہ اورنگ زیب کی بیٹی زیب النسا بیگم ایک دن اس بارہ دری میں بیٹھی تھی۔ آبشار کا پانی دلفریب انداز سے بہ رہا تھا۔ اس منظر سے شہزادی کے دل پر کچھ ایسا اثر ہؤا کہ اس نے فوراً یہ قطعہ نظم کیا ؎

اے آبشار نوحہ گر از بہر چیستی؟ چیں بر جبیں فگندہ ز اندوہ کیستی؟
درد تو چہ درد بود کہ چوں من تمام شب سر را بسنگ مے زدی و مے گریستی

تیسرے درجے میں اس وقت خصوصیت کی کوئی چیز نہیں +

شاہی زمانے میں عمارتوں کی آرائش اور آبشار اور فواروں کی رونق سے یہ باغ بہشت کا نمونہ معلوم ہوتا تھا۔ اس کے بعد بھی کچھ مدت تک اچھی حالت میں رہا۔ مگر سکھوں کے زمانے کی باد صرصر نے اس کو بے رونق کر دیا۔ بڑے بڑے بیش قیمت پتھر اکھڑوا کر انہوں نے بیچ ڈالے۔ اور کچھ امرتسر کے دربار صاحب کی نذر کئے※۔ لیکن باوجود انقلاب اس کی موجودہ حالت

※ شالامار باغ اور مقبرہ جہانگیر کی عمارتوں میں سکھوں نے جو تصرفات کئے اُس کی تصدیق رائے کنہیا لال صاحب کی تاریخ سے ہوتی ہے۔ رائے صاحب لاہور میں انگریزی ڈسٹرکٹ انجنیر کے عہدے پر سالہا سال ممتاز رہے۔ ان عمارتوں کی مرمت اُنہی کی رپورٹوں پر ہوئی۔ سکھوں کا زمانہ اُن کے قریب العہد تھا۔ سن رسیدہ اشخاص کی چشم دید معلومات سے بھی انہوں نے بہت کچھ اطلاعیں حاصل کی تھیں +

اب بھی خاصی ہے +

میلہ چراغاں

ہر سال اخیر مارچ میں یہاں بڑی دھوم دھام سے میلہ چراغان ہوتا ہے۔ لاہور امرتسر کے علاوہ سو سو کوس تک کے شائقین چلے آتے ہیں۔ اس موقع پر سوداگر لوگ تجارتی مال لاتے ہیں۔ گھوڑوں کی نمائش کئی روز تک رہتی ہے۔ گورنمنٹ کی طرف سے گھوڑوں کے مالکوں کو انعام ملتے ہیں۔ ان وجوہات سے میلہ کی رونق خوب ہو جاتی ہے +

مادھو لال حسین

یہ میلہ دراصل ایک بزرگ مادھو لال حسین کے عرس کی یادگار ہے۔ جو شہنشاہ اکبر کے زمانے میں مشہور مجذوب فقیر گزرا ہے۔ ان کا نام سُرخ کپڑے پہننے کی وجہ سے لال حسین مشہور ہو گیا تھا۔ مادھو ایک نوجوان برہمن زادہ آپ کا مرید تھا۔ آپ کو بھی اس سے بہت محبت تھی۔ مرید کے حُسنِ عقیدت کے سبب سے پیر اور مرید کے نام میں ایسا اتصال ہُوا کہ فقیر صاحب کا نام مادھو لال حسین پکارا جانے لگا۔ فقیر صاحب نے ۱۰۰۸ھ (۱۵۹۹ء) میں انتقال کیا۔ اور شالامار کے قریب موضع باغبانپورہ میں دفن ہوئے۔ شائقین عرس کی تقریب سے رات بھر ان کی خانقاہ میں ٹھیرتے ہیں۔ یہاں چراغوں کی روشنی بڑی دھوم دھام سے ہوتی ہے۔ پھر اگلا دن شالامار میں بسر کرتے ہیں۔ اس خانقاہ پر ایک دوسرا میلہ بسنت کے دن ہوتا ہے۔ اس موقع پر بھی لاہور کے اکثر ہندو مسلمان شریک ہوتے اور صبح سے شام تک پتنگ بازی میں مشغول رہتے ہیں +

میاں فیملی

باغبان پورہ کو ہمارے زمانے میں یہ خصوصیت حاصل ہوئی ہے کہ یہاں کے ایک خاندان نے جو میاں فیملی کے نام سے مشہور ہے۔ علمی قابلیت اور سرکاری عہدے حاصل کرنے میں بڑی ترقی کی ہے۔ آنریبل جسٹس

شاہ دین جج چیف کورٹ اور خان بہادر میاں محمد شفیع بیرسٹرایٹ لا اسی خاندان کے معزز رکن ہیں۔ میاں محمد شفیع کو قومی کاموں سے بڑی دلچسپی ہے۔ آپ اسلامیہ کالج کی کمیٹی کے چیرمین اور پنجاب مسلم لیگ کے سکرٹری ہیں اور امور رفاہ عام میں ہمیشہ دل کھولکر چندے دیتے ہیں +

مقبرہ جہانگیر

(۲) مقبرہ جہانگیر۔ یہ عمارت لاہور سے چار میل کے فاصلے پر دریائے راوی کے بائیں کنارے موضع شاہدرہ میں ہے۔ شہر سے دریا تک سڑک کی دو طرفہ سرسبز درختوں کے جھنڈ اس کثرت سے ہیں کہ دھوپ کا گزر نہیں ہوتا۔ دریا پر ریل کا پُل بندھا ہُوا ہے۔ اس سے گزر کر تھوڑی دور پر مقبرہ آجاتا ہے۔ یہ مقبرہ شاہجہاں بادشاہ نے اپنے والد جہانگیر کی یادگار میں ۱۰۳۷ھ ۱۶۲۷ء میں تعمیر کرایا تھا۔ مقبرے کے گرد ایک بڑی وسیع فصیل ہنکر اس میں متعدد بارہ دریاں۔ باغات اور حوض بنائے ہیں۔ وسط میں ۲۶۰ فٹ مربع چبوترہ پر سنگ مرمر کا مقبرہ ہے جس کی عمارت کی عمدگی وخوبی اور اعلےٰ درجے کی پچی کاری قابل دید ہے۔ شاہی زمانے میں لوازم آبادی اور آراستگی کے متعلق لکھوکھا روپے کے جھاڑ فانوس اور فرش فروش بہم پہنچائے گئے تھے۔ مگر سکھوں نے اُن کو لوٹ لیا۔ اور مہاراجہ رنجیت سنگھ نے سنگ مرمر کا معقول حصہ اُکھڑوا کرامرتسر کے دربار میں بھجوا دیا۔ اس گئی گزری حالت میں بھی یہ عمارت مغلوں کے جاہ وجلال کا اعلےٰ نمونہ ہے +

اس مقبرے کی مغربی جانب شاہجہاں کے وزیر اعظم آصف جاہ کا مقبرہ ہے جو بادشاہ کے حکم سے تعمیر ہُوا تھا۔ یہ مقبرہ عمارتی خوبیوں اور لوازم آراستگی کے لحاظ سے حسب تحریر رائے کنہیالال صاحب اگزکٹو انجینیر لاہور جہانگیر کے مقبرے سے کچھ ہی کم تھا۔ مگر مہاراجہ رنجیت سنگھ کے عہد

ہیں بالکل برباد ہو گیا ⁂

اس سے تھوڑی دور جہانگیر بادشاہ کی مشہور ملکہ نورجہاں بیگم کا مقبرہ ہے جو شاہجہاں کے شوق تعمیر کی یادگار ہے۔ سکھوں کی دستبرد سے اس کو بھی وہی تباہی دیکھنی پڑی جو اس کے بھائی آصف جاہ کے مقبرے کو پیش آئی۔ ان تینوں مقبروں کی افسوسناک حالت دیکھکر بے اختیار یہ اشعار یاد آتے ہیں ؎

آں قصر کہ بر چرخ ہمے زد پہلو ۔۔۔ بر درگہ او شہاں نہادندے رُو
دیدیم کہ بر کنگرہ اش فاختۂ ۔۔۔ بنشستہ ہمے گفت کہ کُوکُو کُوکُو

گوجرانوالہ

لاہور سے ہم گوجرانوالہ پہنچے۔ ان دو نو شہروں میں ۴۲ میل کا فاصلہ ہے۔ یہ ایک متوسط درجے کا شہر ریلوے لائن پر واقع ہے۔ قدامت یا حرفت اور صنعت کے لحاظ سے اس میں کوئی خصوصیت نہیں۔ اٹھارھویں صدی مسیحی تک ایک معمولی قصبہ تھا۔ پہلے مہاراجہ رنجیت سنگھ کے والد سردار مہاں سنگھ نے اس کی آبادی میں کوشش کی۔ پھر انگریزی عہد میں ضلع کا صدر مقام قرار پانے سے اس کی ترقی شروع ہوئی۔ اس وقت اچھی خاصی رونق پر ہے۔ دن بدن پختہ عمارتیں بنتی جاتی ہیں۔ مگر شہریت کے درجے کو اب تک نہیں پہنچا ⁂

یہاں کے لوگوں نے انگریزی تعلیم میں خوب ترقی کی ہے۔ گورنمنٹ سکول۔ مشن سکول اور خالصہ سکول میں انٹرنس تک پڑھائی ہوتی ہے۔ خالصہ سکول کا بورڈنگ ہوس ایسے بڑے پیمانے پر بنایا گیا ہے کہ پنجاب کے پرائیویٹ مدرسوں میں اسکی نظیر نہیں۔ اس کا احاطہ تقریباً

آٹھ ایکڑ میں ہے۔ ایک اسلامیہ سکول بھی ہے جو پہلے انٹرنس تک تھا مگر اب مسلمانوں کی کم ہمتی سے پرائمری ہو گیا ہے۔ یہاں چند شخص اخبار نویسی میں مشہور ہیں +

شہر کے چاروں طرف درخت اور باغات بکثرت ہیں۔ مالٹا۔ سنگترہ جیسا عمدہ یہاں ہوتا ہے ہندوستان میں کسی دوسری جگہ شاید کم ہوتا ہوگا۔ چنانچہ دور دور تحفہ بھیجا جاتا ہے۔ غلے اور برتنوں کی تجارت بہت ترقی پر ہے +

وزیر آباد

گوجرانوالہ سے دس میل طے کرنے کے بعد ہم وزیر آباد پہنچے۔ یہ شہر سکھوں کے زمانے میں خوب ترقی پر تھا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے ایک فرانسیسی ملازم ابوطبیلہ نے اس کو بہت رونق دی تھی۔ چوپڑ کا بازار اور شہر پناہ اسی کی تیار کی ہوئی ہے۔ پلکو ندی کے کنارے ایک مثمن برج بہت نفیس اور دلچسپ عمارت ہے۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ اپنے دوران سفر میں یہاں ٹھہرا کرتے تھے۔ بالفعل یہ عمارت راجہ اکرام اللہ خاں صاحب کے قبضہ میں ہے جو راجگان راجوری کے ایک معزز رکن اور سرکاری خدمات کی وجہ سے بہت مشہور ہیں +

وزیر آباد کے قریب دو مقامات قابل دید ہیں۔ (۱) دھونکل جو شہر سے دو کوس ہے اور سلطان سرور کی یادگار میں وہاں ہر سال بڑا میلہ ہوتا ہے (۲) سودھرہ جو شہر سے تین کوس پر سلطان محمود غزنوی کے مشہور غلام ایاز کا آباد کیا ہوا ہے۔ اس قصبہ میں اُس زمانے کے کئی پختہ مقبرے اب تک باقی ہیں +

وزیر آباد سے ریلوے کی دو شاخیں نکلتی ہیں۔ پہلی سڑک سیالکوٹ ہوتی ہوئی جموں تک جاتی ہے۔ اس کا طول ۵۲ میل ہے اور دوسری شاخ لائل پور

ہوئی ہوئی ملتان کو۔ اس کا طول ۲۳۱ میل ہے ؞

سیالکوٹ

وزیر آباد سے ۲۷ میل طے کرنے کے بعد ہمارا گزر سیالکوٹ میں ہؤا۔ یہ شہر راجہ سالباہن کا بسایا ہؤا ہے جو حضرت مسیح کے قبل ایک مشہور راجا ہو گزرا ہے۔ اس کے زمانے کا ٹوٹا پھوٹا قلعہ اور پُرانے کھنڈر شہر کی قدامت کا ثبوت دے رہے ہیں۔ مسلمان بادشاہوں کے زمانے میں بڑے پایہ کا شہر تھا۔ موجودہ آبادی اب بھی خوب رونق پر ہے۔ یہاں کاغذ بہت عمدہ و مضبوط بنتا اور پنجاب کے دفاتر میں علے العموم برتا جاتا ہے۔ گیند بلے کا سامان خوب تیار ہوتا اور تمام ہندوستان میں استعمال کیا جاتا ہے۔ موضع کوٹلی کا لوہے کا کام بہت نفیس اور دور دور اس کا دساور ہوتا ہے ؞

اس شہر میں انگریزی تعلیم خوب ترقی پر ہے اور اس کی تعریف کے مستحق خاصکر مشنری ہیں جن کی سعی سے دو ہائی سکول اور ایک کالج جاری ہے۔ ایک ہائی سکول گورنمنٹ کی طرف سے بھی ہے ؞

مولوی عبدالحکیم

ہسپتال سے دو سو گز کے فاصلے پر مشہور فاضل مولوی عبدالحکیم صاحب سیالکوٹی کا مقبرہ ہے۔ موجودہ آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی زمانے میں بڑی شان و شوکت کی عمارت تھی۔ مگر اب بالکل شکستہ ہو گئی ہے۔ مولوی صاحب شاہجہان بادشاہ کے زمانے میں ایک زبردست عالم اور صاحب تصانیف گزرے ہیں۔ آپ نواب سعداللہ خاں وزیر اعظم کے ہم سبق تھے عراق۔ شام اور استنبول کی متعدد درس گاہوں میں مجھے آپ کی تصانیف داخل درس دیکھنے کا موقع ملا۔ اگرچہ نواب سعداللہ خاں کو ہندوستان کی وزارت

کا رتبہ حاصل ہوا۔ مگر ہندوستان سے باہر بلاد اسلامیہ میں علمی حیثیت سے
جو شہرت مولوی عبد الحکیم صاحب کو حاصل ہوئی۔ اُسے کوئی ہندوستانی مصنّف
حاصل نہیں کر سکا۔ آپ کا انتقال ۱۰۶۷ھ ۱۶۵۶ء میں اسی جگہ ہوا +

شہر سے دو میل کے فاصلے پر انگریزی چھاؤنی ہے جو ریاست جموں و کشمیر
کے سرحد پر واقع ہونے سے اچھی ترقی پر ہے۔ سیالکوٹ سے جموں ۲۵ میل
اور لاہور ۷۹ میل ہے +

گجرات

سیالکوٹ سے وزیرآباد ہوتے ہوئے ہم گجرات پہنچے۔ لاہور یہاں سے
۷۰ میل اور پشاور ۲۱۶ میل ہے۔ یہ شہر دریائے چناب سے پانچ میل
کے فاصلے پر شہنشاہ اکبر کا آباد کیا ہوا ہے۔ شاہی زمانے کا ایک قلعہ۔ حمام
اور باؤلی اس کی قدامت کو یاد دلاتی ہے۔ نئی عمارتیں روز بروز تعمیر ہو رہی
ہیں۔ آبادی کے باہر شمالی جانب ایک بارہ دری راجہ دھیان سنگھ کی اور
دوسری مہاراجہ رنجیت سنگھ کی بنائی ہوئی ہے +

انگریزی تعلیم ترقی پر ہے اور انٹرنس تک پڑھائی ہوتی ہے۔
حرفت و صنعت کے لحاظ سے اس شہر کو بالخصوص شہرت ہے۔
پشمینے کی چادریں۔ کارچوبی اور زردوزی کا کام۔ دیسی اور اُونی کپڑے۔
کرسیاں اور کوفت کا سامان بہت اچھا بنتا ہے۔ اور دور دور
تک جاتا ہے۔ یہاں کی تلواریں بھی مشہور ہیں۔ باشندے خصوصاً "قانونگو
شیخ" بڑے ذکی اور جدت طرازی میں مشہور ہیں +

شہر کے مشرقی جانب شاہ دوﻻ صاحب کی خانقاہ ایک مشہور جگہ ہے۔

جہاں سال میں دو دفعہ بڑا بھاری میلہ ہوتا ہے۔ مشہور ہے کہ جو بے اولاد
اُن کی مَنّت مانے اُس کے ہاں پہلا بچہ ایسا پیدا ہوتا ہے جس کا چھوٹا سر۔
بڑے بڑے کان اور دیوانہ سا ہوتا ہے۔ ایسے بچّے بطور نذرانہ خانقاہ پر
چڑھائے جاتے ہیں اور "شاہ دَولا کے چُوہے" کہلاتے ہیں۔ خانقاہ کے فقیر
اِن کو ہمراہ لئے ہوئے جگہ جگہ بھیک مانگتے پھرتے ہیں۔ اس عجیب وغریب
روایت کی تحقیقات کرنے سے معلوم ہُوا کہ شاہ دَولا ایک بہت باثروت
اور مخیّر شخص تھے۔ اُنہوں نے اپنے زمانے میں فاترالعقل۔ مخبوط الحواس اور
ناقص الخلقت اشخاص کے واسطے ایک خیراتی شفاخانہ گجرات میں قائم کیا تھا
جس میں چار طرف کے مریض علاج کے واسطے آتے تھے۔ رفتہ رفتہ یہ امر
لوگوں کے ذہن نشین ہو گیا کہ مریض شاہ صاحب کی برکت سے شفا پاتے ہیں۔
مرورِ زمانے سے شفاخانہ تو معدوم ہو گیا۔ مگر عام لوگوں کا اعتقاد بدستور قائم رہا۔
اور جس کے ہاں ناقص الخلقت بچہ پیدا ہوتا۔ اُس کو شاہ صاحب کی خانقاہ کی
نذر کر دیتا۔ پھر وہ اضافہ ہُوا جس کی شہرت کا حال اوپر لکھا جا چکا ہے۔ ورنہ
اس قسم کی مخلوق اَور ملکوں میں بھی پائی جاتی ہے +

شاہ دَولا صاحب کا اصل نام دَولا اور سلسلۂ نسب سلاطین لودھی
سے ملتا ہے۔ آپ نے ۹۵ برس کی عمر پائی۔ مغلئی خاندان کے چار بادشاہوں
کا زمانہ دیکھنے کے بعد ۱۰۸۶ھ مطابق ۱۶۷۵ء میں بعہد شہنشاہ اورنگ زیب انتقال کیا +

اِس ضلع میں چیلیانوالی کا میدان ایک مشہور رزمگاہ ہے۔ جہاں
سکھوں اور انگریزوں کے درمیان ۱۸۴۹ء میں ایک فیصلہ کُن جنگ
ہوئی تھی۔ یہ میدان اُس ریلوے لائن پر واقع ہے جو لالہ موسیٰ سے بھیرہ
خوشاب اور نمکسار میانی کو جاتی ہے۔ اس کا جنکشن لالہ موسیٰ ہے جو

گجرات اور جہلم کے درمیان لاہور سے ۸۴ میل کے فاصلے پر ہے +

جہلم

گجرات سے ۳۲ میل سفر کرنے کے بعد ہم جہلم پہنچے - یہاں سے لاہور ۱۰۲ میل اور پشاور ۱۸۴ میل ہے - جہلم کوئی بڑا شہر نہیں - مگر اس کا محل وقوع بہت اچھا ہے - جہاں تک نگاہ ڈالو - سبزہ زار ہی نظر آتا ہے - مشرق میں دریائے جہلم بہتا ہے - گرمیوں کے موسم میں یہاں بڑا لطف ہوتا ہے - تمام گھاٹ پختہ بنا ہؤا ہے جو بطاہر لوگوں کے نہانے دھونے اور سیر کے کام آتا ہے - درحقیقت شہر کی پناہ ہے یعنی اسی نے شہر کو دریا کی زد سے محفوظ کر رکھا ہے - دریا کے کنارے روز بروز نئی عمارتیں بن رہی ہیں جو بڑی خوشنما معلوم ہوتی ہیں - شہر سے تھوڑے فاصلے پر ایک انگریزی چھاؤنی ہے +

راولپنڈی اور جہلم کے درمیان دینا ایک اسٹیشن ہے جس کے قریب سلطان شیرشاہ سوری کا بنایا ہؤا قلعہ رُہتاس ہے - یہ قلعہ ایک پہاڑ کی چوٹی پر ہے - اس کا طول ایک میل اور عرض آدھا میل ہے - اس وقت ایک چھوٹا سا گاؤں اس میں آباد ہے +

راولپنڈی

جہلم سے ۶۷ میل طے کرنے کے بعد ہم راولپنڈی پہنچے - لاہور یہاں سے ۱۷۷ میل اور پشاور ۱۰۹ میل ہے - راولپنڈی پہلے کوئی بڑا شہر نہ تھا - اس کی موجودہ رونق اُنیسویں صدی مسیحی کے آخری حصے میں شروع ہوئی ہے

بازار وسیع - عمارتیں پختہ اور آبادی روزافزوں ترقی پر ہے - حکام سول کا صدر مقام اور ۱۹۰۱ء کی مردم شماری کے مطابق اسکی آبادی ۸۷ ہزار ۶۸۸ آدمیوں کی ہے - یہ شہر پنجاب کے شہروں میں چوتھے درجے پر ہے - اسکے باشندے قوی ہیکل - مضبوط اور تجارت پیشہ ہیں - ریلوے کا جنکشن ہونے سے کشمیر اور سرحدی تجارت کا زیادہ حصہ یہیں سے گزرتا ہے +

انگریزی تعلیم دن بدن ترقی پر ہے - گورنمنٹ ہائی سکول - مشن ہائی سکول اور اسلامیہ ہائی سکول کے علاوہ ایک مشن کالج بھی ہے - مختلف مقامات کے وکیلوں اور بیرسٹروں کا ایک زبردست آزاد رائے مجمع یہاں ایسا جمع ہوگیا ہے جس کی نظیر پنجاب کے دوسرے مقام پر نہ ہوگی - چنانچہ ۱۹۰۷ء میں جب گورنمنٹ پنجاب نے لائل پور کی اراضیات پر ناقابل برداشت مالگزاری کا قانون منظور کیا تو لالہ ہنسراج اور چند دیگر ہندو وکلا نے بڑی آزادی اور استقلال سے اسکی مخالفت کی اور باوجود سرکاری دارو گیر کے اپنی بات پر قائم رہے +

شہر سے تین میل کے فاصلے پر چھاؤنی ہے جو کثرت آبادی کی وجہ سے شہر تک ملی ہوئی ہے - اسکے بازار وسیع - بارونق اور ان میں چند انگریزوں اور پارسیوں کی بڑی بڑی دکانیں ہیں - ایک مارکیٹ جو سردار سُجان سنگھ نے دو لاکھ روپے کے صرف سے تعمیر کرایا ہے بہت خوبصورت ہے - یہ چھاؤنی ہندوستان کی سب سے بڑی فوجی جمعیت کوئٹہ کے ہم پلہ اور سرحدی فوجوں کا صدر مقام ہے - قلعہ میں جنگی سامان کا کثیر المقدار ذخیرہ اور اسکے برجوں پر بھاری بھاری توپیں چڑھا کر اس کو مستحکم کر دیا ہے +

۱۸۷۵ء میں جب ریل راولپنڈی نہیں پہنچی تھی - مجھے شاہی سڑک

کے راستے سفر کرنا پڑا - اور مارگلہ گھاٹ سے میرا گزر ہوُا - یہ گھاٹ دو پہاڑوں کے درمیان واقع ہے - اس کی عمارت پتھر کی بنی ہوئی ہے اور کتبہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۰۲۳ھ ۱۶۱۴ء کی تعمیر ہے - اس کے قریب جنرل نکلسن فاتح دہلی کی یادگار میں ایک مینار بنا ہوُا ہے ✣

مسافران کشمیر یہاں سے براہ کوہ مری سفر کرتے ہیں یہ پہاڑ عمدگی آب وہوا کی وجہ سے مشہور اور ٹانگے کے ذریعے ۴۰ میل کی مسافت پر ہے ✣

راولپنڈی بڑا بھاری جنکشن ہے - یہاں سے ریل کی دو سڑکیں نکلتی ہیں (۱) تھل چھپالی کو براہ خوشحال گڑھ و کوہاٹ - (۲) غازی گھاٹ کو براہ دریاخاں - یہ دونو اسٹیشن دریائے سندھ کے اس طرف ڈیرہ جات کے ریلوے اسٹیشن ہیں ✣

حسن ابدال

راولپنڈی سے ۳۰ میل طے کرنے کے بعد ہم حسن ابدال پہنچے یہ مقام ایک بزرگ بابا حسن ابدال کے نام سے مشہور ہے - سکھ اس کو پنجہ صاحب کہتے ہیں - اُن کا ایک دھرم سالہ اور تالاب بیرون قصبہ موجود ہے - تالاب کی دیوار پر پنجہ کا جو نقش نمودار ہے - سکھ لوگ اس کو بابا نانک صاحب کی کرامت سے منسوب کرتے ہیں ✣

حسن ابدال اب تو ایک معمولی قصبہ ہے مگر اس کے چاروں طرف کھنڈروں کا سلسلہ دور تک چلا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی زمانے میں یہ شہر خوب آباد ہوگا - بعض لوگوں کا خیال ہے کہ بہت مدت پیشتر بُدھ مذہب کے لوگوں کا مقدس مقام تھا - اور چین تک کے لوگ اس کی

زیارت کو آتے تھے ✦

قصبہ سے دو میل کے فاصلے پر موضع واہ میں شہنشاہ جہانگیر کے زمانے کی ایک بارہ دری اور باغ ہے جو اُن کے سفر کشمیر میں شاہی فرودگاہ کا کام دیتا تھا۔ ان مقامات کے تالابوں اور پہاڑی نالوں کا پانی بلامبالغہ ایسا مصفّا ہے کہ ریت کے دانے اُس میں سے دکھائی دیتے ہیں۔ چنانچہ ایک شاعر نے اس کے حسب حال یہ شعر کہا ہے ؎

درتہ آبش زصفا ریگ شمرد کور تواند بدلِ شب شمرد

یہاں سے ایبٹ آباد تک ۴۲ میل کا فاصلہ ہے۔ جو بہت صحت بخش مقام ہے۔ سواری کے واسطے یکے اور ٹانگے ہر وقت حسن ابدال میں ملتے رہتے ہیں ✦

اٹک

حسن ابدال سے ۳۲ میل شمال مغرب کی جانب چلنے کے بعد ہم اٹک میں پہنچے۔ یہ شہر ایک زمانے میں جنگی اہمیت کے لحاظ سے بہت مشہور تھا۔ اور افغان فرمانروا اس میں رہا کرتے تھے ۱۵۸۱ء ۹۸۹ھ میں شہنشاہ اکبر نے ایک بڑا مستحکم قلعہ اس جگہ تعمیر کرایا تھا۔ قلعہ کے کھنڈر دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنے وقت میں خوب آباد ہوگا اب حکام سول کا سب ڈویژن اور تھوڑی سی فوج کا قیام گاہ ہے ✦

یہاں کے پراچے سوداگر مشہور ہیں۔ جو کابل قندھار اور دور دور تک تجارت کرنے جاتے ہیں۔ اٹک میں سب سے زیادہ دلچسپ اور قابل دید دریائے سندھ اور اُس کا پُل ہے۔ اس دریا کو مقامی آبادی کے لحاظ سے

اٹک بھی کہتے ہیں۔ یہ ہندوستان کے سب دریاؤں سے لمبائی اور تیزروی میں مشہور ہے۔ ہمالیہ پہاڑ سے نکلکر سترہ سو میل طے کرنے کے بعد بحیرۂ عرب میں جاگرتا ہے۔ اٹک کے قریب جس جگہ دریائے کابل اس سے ملتا ہے اُس مقام پر کمالیہ اور جمالیہ دو سنگین چٹانیں دریا کے بیچ میں اُوپر کو اٹھی ہوئی ہیں جن کی ٹکھٹی میں سخت بھنور پڑنے سے کبھی کبھی کشتیاں ڈوب جایا کرتی ہیں۔ اور جو کشتی ان پتھروں سے ٹکرا جائے۔ وہ تو چور چور ہی ہو جاتی ہے۔ مگر یہ عجیب اتفاق ہے کہ یہ دونو پتھر جو پہلے کشتیوں کی تباہی کا باعث ہُوا کرتے تھے۔ اب اُن پر پیل پائے قائم کر کے ریل کا پُل بنایا گیا ہے۔ میں ۱۸۷۸ء میں کوہاٹ جاتے ہوئے اسی خطرناک گھاٹ سے کشتی کے ذریعے پار اُترا تھا۔ مگر سفر ہا ے مابعد میں ریل کے پل سے عبور کیا جو بالکل سہل اور بے خوف وخطر ہے +

پشاور

اٹک سے ۴۴ میل چلنے کے بعد ہم پشاور پہنچے۔ یہ شہر ہندوستان کی شمال مغربی سرحد پر لاہور سے ۲۸۶ میل ریل کے راستے سے ہے۔ اس کی آبادی حضرت مسیح سے پہلے کی معلوم ہوتی ہے۔ چنانچہ بدھ مذہب کے آثار قدیمہ اس میں اب تک پائے جاتے ہیں۔ اسلامی تاریخ میں اس کا نام سب سے پہلے چوتھی صدی ہجری میں ملتا ہے۔ جب سے غزنی کے بادشاہ سبکتگین نے لاہور کے فرمانروا راجہ جیپال کو شکست دی ہے۔ یہ شہر افغانستان اور وسط ایشیا کے حملہ آوروں کا برابر رزمگاہ رہا ہے اور کم سے کم بیس فرمانروا اس پر حکومت کر چکے ہیں۔ ۱۸۴۹ء سے گورنمنٹ انگریزی کا اس پر قبضہ ہُوا

لارڈ کرزن گورنر جنرل کے عہد (۱۹۰۱ء) میں جب شمال مغربی سرحدی صوبہ علیحدہ قرار پایا۔ تو موقع کی اہمیت کے لحاظ سے یہی شہر صوبہ سرحدی کا دارالحکومت تجویز ہُوا۔ چنانچہ اُس زمانہ سے چیف کمشنر یہاں رہتا ہے۔ اس کی آبادی ۱۹۰۱ء کے موافق ۹۵ ہزار ۱۴۷ ہے جس میں مسلمانوں کی تعداد غالباً تین چوتھائی ہوگی باقی ایک چوتھائی میں ہندو۔ عیسائی۔ سکھ وغیرہ ہیں۔ یہاں کے باشندوں کی اصلی زبان پشتو ہے۔ مگر مختلف فرقوں کے میل ملاپ سے پشتو کے علاوہ فارسی۔ پنجابی اور اُردو زبانیں بھی بولی جاتی ہیں ٭

شہر کے گرد سکھوں کے زمانے کی ایک کچّی شہر پناہ بنی ہوئی ہے۔ اس میں سولہ دروازے ہیں جو ملحق الحدود یاغستانی علاقے کے آفریدی اور خیبریوں کی دست درازی کے خوف سے شام کے آٹھ نو بجے بند کردئے جاتے ہیں۔ دروازے بند ہونے سے پیشتر توپ چلتی ہے تاکہ عام و خاص کو معلوم ہوجائے کہ شہر کے دروازے بند ہونے والے ہیں ٭

ہم شہر میں کچہری دروازے سے داخل ہوئے اور ہندو نیشنل سکول و گورنمنٹ سکول کے پاس سے گزر کر ایک چوک میں پہنچے۔ جہاں کسی انگریز کی یادگار بنی ہوئی ہے۔ یہاں سے اندر محلّہ اور گورکھٹڑی کو دو راستے نکلتے ہیں۔ اندر محلہ ہندو تاجروں کی شاندار آبادی ہے جس میں کئی کئی منزل اُونچے لکڑی کے مکان بہت خوبصورت بنے ہوئے ہیں۔ گورکھٹڑی بُدھ مذہب والوں کی تاریخی عمارت ہے۔ اس میں کئی سو برس سے گرو گورکھ ناتھ کا استھان ہے۔ یہ گرو صاحب غالباً بابا نانک صاحب کے ہم عصر ہوئے ہیں۔ شہر کا سب سے بڑا بازار قصہ خوانی پچاس فٹ چوڑا اور بہت بارونق ہے۔ یہ بازار وسعت اور خوشنمائی کے لحاظ سے ہندوستان کے بڑے بڑے بازاروں میں شمار کیا جاتا

ہے - یہاں ہر وقت آدمیوں کا ہجوم رہتا ہے - بعض دکانوں میں افغانستان اور وسط ایشیا کی عمدہ عمدہ چیزیں موجود رہتی ہیں جن کو یورپین سیاح بڑی دلچسپی سے خریدتے ہیں - اسی بازار میں دولت خدا داد افغانستان کا ڈاک خانہ ہے جہاں کابل جانے والے خط ڈالے جاتے ہیں - امیر صاحب کے قواعد کے مطابق ہر ایک خط پر اس ڈاک خانہ کا ٹکٹ لگایا جانا چاہیئے - ورنہ پوسٹ ماسٹر بلا ٹکٹ خط کو روانہ نہیں کریگا +

مسلمانوں کی پرانی یادگاروں میں نواب مہابت خاں کی مسجد قابل دید ہے اور نئی عمارتوں میں سے فرانٹیر اسلامیہ کلب سرحدی مسلمانوں کے باہمی میل ملاپ کا عمدہ وقابل ذکر نمونہ ہے - یہ کلب گھر کابلی دروازے کے باہر تعمیر ہؤا ہے - انجمن اسلامیہ کے سکرٹری مفتی فدا محمد صاحب بیرسٹر ایٹ لا نے سرحدی علاقے سے ایک لاکھ روپیہ جمع کر کے اس پر صرف کیا ہے +

یہ شہر پنجاب - افغانستان - ایران اور ترکستان کی تجارت کا مرکز ہے - گیہوں - گھی - چاے اور انگریزی ساخت کا اسباب یہاں سے ہوکر بکثرت باہر جاتا ہے - بخارا اور کابل سے نقرئی تار - قیطون - دباغت شدہ چمڑے - بڑے اور سمور وسنجاب کی بیش قیمت پوستینیں - شتری چغے - کابلی گھوڑے - انواع واقسام کے میوہ جات مثل بادام - انگور - سیب - انار - پستہ - چلغوزہ - اور سردا وغیرہ یہاں بکثرت آتے ہیں - مال کی اس درآمد برآمد کی وجہ سے مختلف ممالک کے لوگ اپنے اپنے ملکی اور قومی لباس میں دکھائی دیتے ہیں +

اصلی باشندے دستکاری وصناعت میں بہت ہوشیار ہیں - لوہے کے اوزار - تانبے کے برتن - زردوزی کام - لنگیاں - کلاہ اور چمڑے کے صندوق یہاں کی مشہور چیزیں ہیں - بالخصوص سادہ لنگیاں بہت قیمت

پاتی ہیں۔ چرمی صندوق سفر کے واسطے بہت عمدہ تیار ہوتے ہیں۔ پشاوری ان کو یخدان کہتے ہیں۔ جو غالباً رخت دان کا بگڑا ہُوا ہے۔ پنکھے بہت سُبک اور نفیس بُنتے ہیں اور دور دور تک جاتے ہیں +

چاول یہاں کا بہت خوشبودار اور خوش ذائقہ ہوتا ہے۔ اور تحفہ کے طور پر ہندوستان میں دور دور تک بھیجا جاتا ہے۔ یہ چاول صرف اُن قطعات میں پیدا ہوتا ہے جو ایک برساتی نالہ باڑہ نام سے سیراب ہوتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ اس باڑہ کی پیداوار کا بڑا حصہ امیر کابل کو جاتا ہے۔ اور تھوڑی مقدار سے جو باقی رہتا ہے وہ ہندوستان میں بھیجا جاتا ہے +

پشاور کا پانی شیریں اور ہاضم ہے۔ باشندے قوی اور دلیر اور عموماً خوش خوراک و خوش پوشاک ہیں۔ ان کی گزراوقات کا بڑا ذریعہ دستکاری ہے۔ فی الجملہ مہمان نواز بھی ہیں۔ قہوہ کی تواضع یہاں عام ہے اور جس سلیقہ و حُسن انتظام سے دکاندار اسے پیش کرتے ہیں۔ وہ قابل تعریف ہے۔ یہ لوگ ہر جمعہ کے دن سیر و تفریح کی غرض سے باغات میں جاتے ہیں جو شہر کے قریب اور میوہ جات سے پُر ہیں۔ ان میں سے وزیر باغ اور شاہی باغ مشہور ہیں۔ چونکہ نہر باڑہ کا پانی شہر کے چاروں طرف پھرتا ہے۔ اِس سے باشندگان شہر اور بالخصوص سیر کرنے والوں کو بڑا لطف حاصل ہوتا ہے۔ مسلمانوں میں دینداری کا چرچا بھی ہے۔ جیسے خیالات قدیمہ کا رنگ بہت مضبوطی سے جما ہُوا ہے۔ مسلمانوں کی عورتیں ہمیشہ بُرقع اوڑھ کر نکلتی ہیں۔ مگر دیگر قوموں میں یہ پابندی نہیں +

اخوند علی احمد

اب سے کچھ مدت پیشتر علماے پشاور مشرقی علوم میں بہت مشہور تھے۔ اخوند علی احمد گزشتہ صدی میں ریاضی اور نجوم کے بہت بڑے اُستاد

ہو گزرے ہیں - سردار لہنا سنگھ صاحب رئیس و جاگیردار مجیٹھا نے بڑے اعزاز کے ساتھ انہیں امرتسر بلایا - اور نجوم و ہیئت کی کتابیں ان سے فارسی میں ترجمہ کرا کر پڑھنی شروع کی تھیں - نجوم کے آلات بنانے میں ان سے بڑی مدد ملی - دربار صاحب امرتسر کی دھوپ گھڑی جو سردار لہنا سنگھ کے نام سے مشہور ہے - وہ دراصل اخوند صاحب ہی کی علمی قابلیت کی یادگار ہے - پشاور کے ملّا لوگ گو اب بھی تعلیم و تعلّم میں مشغول ہیں - مگر علوم عربیہ کی حالت یوماً فیوماً تنزّل پر رہے - البتہ انگریزی تعلیم آہستہ آہستہ ترقی کرتی جاتی ہے - مسلمانوں - عیسائیوں اور ہندوؤں کی طرف سے علیحدہ علیحدہ مدرسے جاری ہیں جن میں انٹرنس تک تعلیم کا اچھا انتظام ہے - ایک گورنمنٹ ہائی سکول بھی ہے - شہر سے ۲ میل کے فاصلے پر انگریزی چھاؤنی ریل کے کنارے پر ہے - ایک زمانے میں یہ چھاؤنی ہندوستان کی سرحدی چھاؤنیوں میں سب سے بڑی شمار ہوتی تھی - مگر افغانستان اور بلوچستان کی جانب ملکی حدود کے وسیع ہونے سے فوجی مقامات کی حالت میں تغیر ہو کر سرحدی فوجوں کے دو بڑے صدر مقام کوئٹہ اور راولپنڈی قرار پائے ہیں - اِس وجہ سے پشاور کی فوجی حیثیت پہلے کی سی نہیں رہی - اِس وقت بھی فوجوں کی کافی تعداد یہاں موجود رہتی ہے ٭

میرے پُرانے دوستوں میں سے جو ۱۹۱۰ء میں اس جگہ مقیم تھے میر نذر الباقر صاحب کمسریٹ اجنٹ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں - یہ مراد آباد کے ایک معزز خاندان سادات کے رُکن اور خلیق و مہمان نواز دوست ہیں - پشاور کے بعض مفصّل حالات معلوم کرنے میں ان سے بڑی مدد ملی ٭

چھاؤنی پشاور سے ہندوستان کے تمام بڑے بڑے شہروں تک ریل کے ذریعے آمد و رفت جاری ہے :-

	مسافت	کرایہ درجہ سوم	کرایہ درجہ دوم
پشاور سے لاہور	۲۸۸ میل	۳ روپے ۱۴/	۹ روپے
〃 〃 شملہ	۵۸۵ میل	۹ 〃 ۳ـ	۲۸ 〃 ۱۰/
〃 〃 کلکتہ براہ انبالہ	۱۵۰۱ میل	۱۵ 〃 ۵/	۵۲ 〃 ۱۴/
〃 〃 مدراس براہ رائچور	۲۱۶۷ میل	۲۸ 〃	۶۹ 〃 ۱/
〃 〃 بمبئی براہ انبالہ	۱۵۹۴ میل	۲۸ 〃 ۱۳/	۴۸ 〃 ۴/
〃 〃 کراچی براہ لاہور	۱۰۶۲ میل	۱۲ 〃 ۹/	۳۳ 〃 ۶/
〃 〃 کوئٹہ براہ لاہور	۱۰۱۵ میل	۱۲ 〃 ۴ـ	۳۳ 〃 ۲/

درۂ خیبر

پشاور سے ۱۲ میل مغرب کی طرف ایک مقام جمرود ہے - اس جگہ ایک بہت بلند و مضبوط قلعہ اور نیز ایک وسیع سرائے بنی ہوئی ہے - ریلوے کی آمد و رفت بھی یہاں تک ہے - کابل جانے والے مسافروں کا قافلہ پہلے روز اسی جگہ ٹھیرتا ہے - یہ قافلہ پشاور سے ہفتہ میں دو مرتبہ دوشنبہ اور پنجشنبہ کو نکلتا ہے - جمرود سے تین میل طے کرنے کے بعد موضع قدم آتا ہے جو درۂ خیبر کا آغاز ہے یہ درہ ۳۳ میل لمبا اور چھ سات ہزار فٹ اونچی پہاڑیوں سے گھرا ہوا ہے - اس کا راستہ اکثر مقامات سے تنگ بلکہ بعض جگہ بہت ہی تنگ ہے - چنانچہ ایک جگہ پر اس کی چوڑائی تین گز سے زیادہ نہیں - ہندوستان پر شمال و مغرب کی جانب

سے جس قدر حملہ آوروں نے چڑھائی کی۔ چونکہ ان کی فوجیں اسی راستہ سے ہو کر گزرتی رہی ہیں۔ اسلئے خیبر کو تاریخی حیثیت سے بڑی عظمت حاصل ہے۔ علی مسجد اور لنڈی کوتل اس درہ کے دو مشہور مقام ہیں۔ پہلا جمرود سے دس میل اور دوسرا ۲۰ میل ہے۔ افغانستان کی حد لنڈی کوتل سے پانچ میل طے کرنے کے بعد شروع ہو جاتی ہے +

لاہور سے پاک پٹن - ملتان - بہاولپور - اُچ -
سکھر - بھکر - روڑھی - خیرپور - حیدرآباد - کراچی
اور وہاں سے کوئٹہ براہ سیہوان و شکارپور +

(سندھ کی گزشتہ اور موجودہ حالت پر ایک نظر)

محل وقوع

یہ تمام مذکورہ بالا شہر دراصل اُس سرزمین میں ہیں جو پنجاب کے جنوب کی طرف دریائے ستلج کے کنارے کنارے اور نیز دریائے سندھ کی نشیبی وادی میں واقع ہے - شاہی زمانے میں یہ تمام ملک سندھ کہلاتا تھا اور ملتان و ٹھٹھ اس کے دو بڑے صوبے تھے - سرکار انگریزی نے اپنے

* سندھ - یہ سنسکرت کے ایک لفظ سندھو سے نکلا ہؤا ہے جس کے معنی دریا کے ہیں - جب آریا لوگ مغرب کی طرف سے ہندوستان میں آئے اور سب سے پہلے اپنی فتوحات کا جھنڈا اس دریا پر گاڑا تو اس کا نام سندھو رکھا - پھر دریا کے نام سے ملک کا نام بھی سندھو مشہور ہو گیا - ایرانیوں نے اپنے عہد حکومت میں سندھو کو بگاڑ کر سندھ کہا اور سندھ سے ہند بنالیا - کیونکہ ان کے ہاں س و ھ کا ادل بدل ہوجاتا ہے - اس وقت سے یہ تفریق بھی قائم ہو گئی کہ جو ممالک دریا سے ملحق تھے - ان کا نام بدستور سندھ قائم رہا مگر باقی ملک کا نام ہند قرار پاگیا - سندھ کا ملک قدیم زمانے میں بہت دور تک پھیلا ہؤا تھا - شمالی ہند کا سارا مغربی حصہ جس میں کشمیر اور بلوچستان شامل تھے سندھ ہی شمار ہوتا تھا - اور اسی وجہ سے غیر قوموں نے سندھ اور ہند دو علیحدہ علیحدہ ملک قرار دے رکھے تھے جو مؤرخ ہند اور سندھ کو حضرت نوحؑ کے بیٹے بتلاتے ہیں - یہ محض خیال ہی خیال ہے +

(ملخص از ترجمہ ابن بطوطہ و تاریخ سندھ مصنفہ مولوی عبدالحلیم شرر)

عہد حکومت میں ملتان سے بہاولپور تک کا علاقہ پنجاب میں ملا دیا۔ اور بہاولپور سے کراچی تک کا علاقہ بمبئی پریزیڈنسی میں شامل کرکے بدستور سندھ کا نام قائم رکھا۔ اس کی مغربی حد بلوچستان سے اور شرقی جیسلمیر و جودھ پور سے ملی ہوئی ہے۔ گورنر بمبئی کی طرف سے ایک کمشنر اس پر حکمراں ہے جس کا صدر مقام کراچی ہے ٭

رقبہ آبادی

صوبہ سندھ کا رقبہ ۴۷ ہزار مربع میل اور آبادی ۳۲ لاکھ دس ہزار ہے۔ اس میں سے تین چوتھائی کے قریب مسلمان اور باقی ہندو وغیرہ ہیں۔ یہ آبادی اگر میلوں کے لحاظ سے پھیلائی جائے تو فی میل ۶۸ آدمی اس میں بستے ہیں۔ ان لوگوں کی اصلی زبان سندھی ہے مگر اُردو بھی سمجھی جاتی ہے ٭

دریائے سندھ سے ملک کی سرسبزی

دریائے سندھ اس ملک کے بیچوں بیچ بہتا چلا گیا ہے۔ اس دریا سے زمین سندھ کو جو رونق و شادابی حاصل ہے۔ اس اعتبار سے تمام جغرافیہ نویس ملک سندھ کو مصر کے مشابہ بیان کرتے آئے ہیں۔ کیونکہ جس طرح مصر کی ساری رونق و آبادی بلکہ وہاں کے لوگوں کی زندگی اور سرزمین کی سرسبزی و شادابی کا دارومدار دریائے نیل پر ہے۔ اسی طرح سندھ کی رونق و آبادی کا انحصار دریائے سندھ پر ہے۔ جو زمینیں اس دریا کے کنارے پر ہیں وہ بہت زرخیز اور سیر حاصل ہیں۔ مگر ملک کا زیادہ حصہ ریگستان اور ناقابل زراعت ہے۔ جہاں بالو کے ٹیلوں کے سوا اور کچھ نہیں۔ جدھر دیکھو ان کی تہ در تہ لہریں حد نظر تک پھیلی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ بارش بھی بہت کم ہوتی ہے اور اس کی سالانہ اوسط آٹھ انچ سے زیادہ نہیں۔ چند سال سے گورنمنٹ نے دریا سے پانی لیکر ایک بڑا بند تیار کیا ہے جس کی بدولت کاشتکاری میں دن بدن ترقی ہوتی جاتی ہے۔ اور بہت سی غیر مزروعہ زمینیں مزروعہ ہو گئی ہیں۔ مصری کپاس کی کاشت کے جو تجربے

یہاں کئے گئے۔ ان میں خاطر خواہ کامیابی ہوئی۔ اس وقت یہاں کی مصری کپاس دور نزدیک مشہور ہے۔ عربی کھجوروں کے درخت لگانے کا تجربہ بھی گورنمنٹ سندھ کی تجویز سے کیا گیا ہے۔ مگر اب تک اس میں کامیابی کے آثار نظر نہیں آتے ٭

آب و ہوا

یہاں کی آب و ہوا گرم و خشک ہے اور گرمی تمام ملک میں عموماً ایسی شدت سے پڑتی ہے کہ افغان اور شمالی ہند کے لوگ یہاں آتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ اس گرمی کے متعلق ان میں یہ مثل مشہور ہے۔ "سندھ کی دھوپ گورے کو کالا کر دیتی ہے اور ایسی تیز ہے کہ اس میں انڈا بھون سکتے ہیں"۔ کراچی کی آب و ہوا ساحل سمندر کے باعث بہت صحت بخش ہے ٭

صنعت و حرفت

سندھ کے لوگ اگرچہ زراعت پیشہ ہیں مگر کئی قسم کی دستکاری میں انہیں خاص شہرت ہے۔ غالیچے۔ ریشمی لنگیاں۔ ریشمی کشیدہ کاری۔ کمبل۔ گھوڑوں کے ساز اور لکڑی کا کھدا ہوا کام یہاں اچھا بنتا ہے۔ ایک قسم کا دھاریدار کپڑا جو ریشم اور سوت سے بنایا جاتا ہے اور جسے یہ لوگ سوسی کہتے ہیں خاص کر عمدہ ہوتا ہے۔ سنہرے اور رپہلے کام بہت نفیس تیار ہوتے ہیں۔ مٹی کے روغنی برتن بھی بعض مقامات پر عمدہ بنائے جاتے ہیں۔ چند سال سے کلوں کے ذریعے بڑے بڑے شہروں میں کام شروع ہو گیا ہے۔ سب سے بڑا کارخانہ کراچی میں ہے اور اس سے اتر کر حیدر آباد و لاڑکانہ میں۔ ان کارخانوں کی بدولت ہزاروں آدمیوں کی پرورش ہوتی ہے ٭

تجارت

اس ملک سے کپاس۔ اون۔ گندم اور جو ممالک غیر کو جاتے ہیں اور ممالک غیر سے جو مال آتا ہے اس میں زیادہ مقدار سوتی اور اونی کپڑے کی ہے تجارت کا بڑا مرکز کراچی ہے۔ تمام درآمد برآمد اسی بندر سے ہوتی ہے اس

سے دوسرے درجہ پر حیدرآباد ہے۔ تجارت کا بڑا حصہ ہندؤں اور پارسیوں کے ہاتھ میں ہے۔ انگریزی عملداری کے ابتدا میں تجارتی مال دخانی کشتیوں کے ذریعے ملتان سے کراچی تک آتا جاتا تھا۔ مگر اب ریل جاری ہونے سے دریائی تجارت کم ہوگئی ہے۔ سنہ ۱۹۰۳-۴ء میں کراچی بندر کے ذریعے جو مال بیرونجات سے آیا۔ اس کی مالیت پونے دس کروڑ روپیہ تھی اور جو مال یہاں سے باہر گیا اس کی مقدار پندرہ کروڑ روپیہ +

ریلوے لائن

پنجاب نارتھ ویسٹرن ریلوے تمام ملک میں سے گزرتی ہے۔ بڑی لائن لاہور سے کراچی تک ۷۵۴ میل لمبی جاری ہے۔ اسکی ایک شاخ شیر شاہ سے ڈیرہ جات کو۔ دوسری سماسٹہ سے بھٹنڈہ کو اور تیسری روڑھی سے کوئٹہ کو جاتی ہے۔ حیدرآباد سے ایک لائن مارواڑ ہوتی ہوئی بمبئی کو چلی گئی ہے +

باشندوں کی حالت

یہاں کے لوگ بہت قوی ہوتے ہیں مسلمان زیادہ تر زراعت پیشہ اور دیہات میں رہتے ہیں۔ ہندؤں کی آبادی بیشتر شہروں میں ہے اور تجارت و ملازمت میں انہوں نے خوب ترقی کی ہے۔ شکارپور کے باشندوں کا کام خاصکر بخارا اور وسط ایشیا میں ہے۔ حیدرآباد کے لوگ زیادہ تر ملک مصر اور بحیرہ روم کے بندرگاہوں پر تجارت کرتے ہیں۔ ممالک غیر کے ساتھ آمد و رفت کرنے میں پنجاب کے بعد سندھیوں سے زیادہ کسی قوم نے شہرت نہیں پائی۔ مجھے اپنے سفر افریقہ اور یورپ میں جہاں تک ان کے حالات دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ انہیں اپنے ہم قوموں کی پرورش اور ان کے بڑھانے پر بڑی ہمدردی ہے +

تعلیمی حالت

یہاں کی عام تعلیمی حالت اور بالخصوص مسلمانوں کی پستی بہت قابل افسوس ہے

تمام لکھے پڑھوں کی تعداد بمشکل پانچ فی صدی ہوگی - اس صوبے میں صرف ایک کالج اور شکارپور، حیدرآباد اور کراچی وغیرہ میں چند ہائی سکول ہیں - کراچی کا مدرسۃ المسلمین جو خان بہادر مسٹر حسن علی مرحوم نے قائم کیا تھا - لڑکوں کی تعلیم اور تربیت دونو حیثیتوں سے اچھا ثابت ہوا ہے - مگر مسلمانوں کی کثرت آبادی کے مقابلے میں اگر ایسے بیس مدرسے اور ہوں تو اُس وقت بہتری کی کچھ توقع کی جا سکتی ہے - ۱۹۰۷ء میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا جو اجلاس کراچی میں ہوا اُس کے افتتاحی اڈریس میں شمس العلما خواجہ الطاف حسین صاحب حالی نے سردار محمد یعقوب خاں صاحب مرحوم سابق وزیراعظم ریاست خیرپور سندھ کی رپورٹ کا کچھ خلاصہ پڑھکر سنایا تھا - اس سے مسلمانان سندھ کی تعلیمی حالت کا حسب ذیل اندازہ ہوتا ہے :-

"سندھ میں مسلمانوں کی آبادی بمقابلہ دیگر اقوام کے تین چوتھائی سے زیادہ ہے - مگر کسی صوبہ کے مسلمانوں کی تعلیمی حالت اس قدر ابتر نہ ہوگی جیسی کہ یہاں کے مسلمانوں کی ہے - دوسو ہندو گریجوایٹوں کے مقابلے میں صرف دس مسلمان بی اے ہیں - ڈاکٹری سائنس اور انجینئرنگ میں بیس ہندوؤں کے مقابلے میں صرف ایک مسلمان ڈگری یافتہ ہے - بیرسٹر - ایل ایل بی اور پلیڈر اس صوبے میں دوسو سے زائد ہیں جن میں مسلمان صرف بیس ہیں - اور منجملہ ۱۲۰ طلبا کے جو گزشتہ سال انٹرنس کے امتحان میں کامیاب ہوئے صرف ۱۲ مسلمان تھے" +

چھاپے خانے

اس صوبہ سے چند اخبار قابل قدر شائع ہوتے ہیں جو بیشتر سندھی زبان میں ہیں - مسلمانوں کے چند اخبار بھی ہیں مگر ان کا عدم و وجود برابر ہے - ہاں الحق سکھر جو بعد میں حیدرآباد اور آخر کار کراچی منتقل ہوگیا البتہ قومی اخبار

کی شان لئے ہوئے ہے ٭

ملکی تغیرات

سلطنتوں کے تغیرات سے جو انقلابات ملک سندھ کو پیش آئے پنجاب کی طرح ان کی تاریخ بھی نہایت قدیم ہے۔ حضرت مسیح سے بہت مدت پیشتر قوم آریا۔ ایرانی۔ سکندر اعظم اور بدھ مذہب والے اس ملک پر حملہ آور ہوئے اور ایک عرصہ دراز تک ان کی فتوحات کے نشان قائم رہے۔ عربوں نے حضرت مسیح سے سات سو برس بعد اس ملک پر قبضہ کیا۔ عرب فاتحین میں سب سے زیادہ مشہور محمدؐ بن قاسم ثقفی ہے۔ جس کی فتوحات کی ابتدا ۹۲؁ھ ۷۱۲؁ع سے شروع ہوتی ہے۔ چوتھی صدی ہجری میں سلطان محمود غزنوی نے اس پر تسلط جمایا۔ پھر خراسان و ترکستان کے بادشاہوں کا گزرگاہ رہا۔ شہنشاہ اکبر نے دسویں صدی ہجری میں سلطنت دہلی سے اس کو ملحق کیا بارھویں صدی میں کابل کا باجگزار رہا اور ۱۸۴۳؁ع سے گورنمنٹ انگریزی کے زیر حکم ہے۔ ان حملہ آوروں کی دستبرد سے سرزمین سندھ کے ٹکڑے کئی ناموں سے مشہور ہو کر علیحدہ علیحدہ ملک بن گئے۔ چنانچہ بلوچستان اور کشمیر جو اس وقت ہندوستان کے مشہور حصے ہیں۔ اسی سندھ کی سرزمین سے نکل کر بنے ہیں۔ حملہ آور قوم کے جو آثار باقی رہے سندھ کی سرزمین ان کی ایک عمدہ یادگار ہے۔ قدیم شہروں کے نشان جابجا موجود ہیں ٭

مذہبی خیالات

یہ ملک گیارہ سو برس سے کچھ زیادہ عرصہ مسلمانوں کے قبضے میں رہا۔ ہندوستان میں سب سے پہلے علمائے اسلام کے حلقۂ درس یہاں قائم ہوئے۔ اسلامی فتوحات سے کے بعد ایک صدی ہجری میں تمام خطہ محدثین

٭ ان مصنفین کے حالات کتاب سبحۃ المرجان مصنفہ سید غلام علی آزو بلگرامی اور تذکرۂ علمائے ہند مصنفہ مولانا رحمان علی صاحب ممبر کونسل ریاست ریوان سے بخوبی معلوم ہو سکتے ہیں ٭

اور فقہا کی کثرت سے عراق اور شام کا نمونہ بن گیا۔ عربی لٹریچر میں جس کثرت سے سندھ کا نام آتا ہے ہندوستان کے کسی دوسرے حصے کا نام نہیں آتا۔ مگر اس وقت ان تمام ترقیات کی یادگار صرف بزرگوں کی خانقاہیں اور سادات کا وجود ہے۔ باشندگان سندھ کو خانقاہوں کی آبادی اور پیروں کی خدمتگزاری میں جو عقیدت ہے ریاست نظام حیدرآباد کے سوا ہندوستان میں اور جگہ نہ ہوگی۔ سندھیوں کی مذہبی خوش اعتقادی کے متعلق مولوی عبدالحلیم شرر نے ایک انگریز کے حوالہ سے یہ دلچسپ فقرہ نقل کیا ہے "سندھی کسی بات میں اتنی فیاضی نہیں دکھاتا جتنی سیدوں کے کھلانے میں۔ کسی امر پر اتنی مستعدی نہیں ظاہر کرتا جتنی مذہبی معاملات میں۔ کسی امر پر اتنا جوش نمایاں نہیں کرتا جس قدر عید کی خوشی میں۔ اس کا ذوق کسی اور چیز میں اتنا نظر نہیں آتا جتنا مقبروں کی آرایش میں"۔ مجھے اپنے دوران سفر میں ان کی خوش اعتقادی کا مزید یہ قصہ معلوم ہوا کہ سکھر کے قریب موضع کنگری میں ایک پیر صاحب رہتے ہیں جن کو بعض لوگ خدا کا اوتار سمجھتے ہیں۔ ان کا نام پیر مردان شاہ اور لقب پیر پگارا (دستار بند پیر) ہے۔

مشہور شہر

سندھ تین بڑے حصوں پر منقسم ہے۔ کراچی۔ حیدرآباد۔ اور شکارپور۔ ان میں مشہور مقامات یہ ہیں:-

(۱) کراچی۔ یہ سندھ کا بندرگاہ اور سب سے بڑا تجارتی شہر ہے۔

(۲) ٹھٹھ۔ یہ شہر مغلوں کے زمانہ میں صوبہ کا دارالحکومت تھا۔

(۳) حیدرآباد۔ یہ شہر انگریزی عملداری سے پیشتر میران سندھ کا صدر مقام تھا۔

(۴) امرکوٹ۔ یہ قصبہ شہنشاہ اکبر کی جائے ولادت۔ تھرو پارکر کے اضلاع میں ہے۔

(۵) سیہوان - یہ شہر دریائے سندھ کے کنارے پر سکندر اعظم کے محاربات کی یادگار ہے +

(۶) شکارپور - جہاں کے باشندے حسن وجمال اور تجارت میں مشہور ہیں +

(۷) قلعہ بھکّر - دریائے سندھ کے وسط میں تاریخی واقعات کے لحاظ سے عربی فتوحات کی یادگار ہے +

اب شہروں کے مفصل حالات لکھے جاتے ہیں +

پاک پٹن

میں لاہور سے شام کے چھ بجے روانہ ہوکر آدھی رات کو منٹگمری کے اسٹیشن پر پہنچا - بقیہ شب ویٹنگ روم میں بسر کی - یہ شہر لاہور اور ملتان کے درمیان مسٹر مونٹ گمری صاحب لفٹنٹ گورنر کا آباد کیا ہوا ہے - پانی کی کمی اور گرد وگرما کی زیادتی کی وجہ سے کوئی دلچسپ جگہ نہیں ہے البتہ حکام سول کا صدر مقام قرار پانے سے اسکی آبادی فی الجملہ ترقی پر ہے +

یہاں سے یکے پر سوار ہوکر ۲۹ میل کی مسافت سات گھنٹے میں طے کرکے پاک پٹن پہنچا - راستے میں کوسوں تک جنگل پھیلا ہوا ہے - جس میں جنڈ - کریر اور پیلو کے درختوں کی کثرت اور پانی کی قلت ہے لاہور سے منٹگمری تک ۱۰۳ میل اور یہاں سے پاک پٹن تک ۲۹ میل کل ۱۳۲ میل کی مسافت ہے +

پاک پٹن ایک پرانا قصبہ ہے جہاں چشتی صوفیوں کے بزرگ پیشوا حضرت شیخ فریدالدین گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ کا مزار ہے - جن کو عوام الناس

"باوا فرید صاحب" یا صرف "باوا صاحب" کہتے ہیں۔ ہندؤں کے زمانے میں اس کو اجودھن اور سلاطین دہلی کے عہد میں پٹن کہتے تھے۔ شہنشاہ اکبر کے عہد میں باوا فرید صاحب کی درگاہ کی وجہ سے پاک پٹن (مقدّس گھاٹ) اس کا نام رکھا گیا۔ کسی زمانے میں دریائے ستلج اس کے نیچے بہتا تھا۔ مگر اب اپنے اصلی موقع سے دس میل جنوب کی طرف ہٹ گیا ہے۔ وسط ایشیا کے بعض حملہ آور اسی گھاٹ سے گزر کر شمالی ہند میں داخل ہوتے رہے ہیں۔ چنانچہ سلطان محمود غزنوی اور امیر تیمور گورگانی نے اسی موقع سے ستلج کو عبور کیا تھا۔

قصبہ کی آبادی چھ ہزار آدمیوں سے زیادہ نہیں۔ اس کی موجودہ شہرت کا باعث صرف باوا فرید صاحب کا مزار ہے جس کی زیارت کے لئے زائرین ہمیشہ آمد و رفت رکھتے ہیں۔ مزار کے متعلق ایک دروازہ ہے جس کو بہشتی دروازہ کہتے ہیں۔ تمام زائرین اس میں سے گزرنا بہشت میں داخل ہونا سمجھتے ہیں محرم کے مہینے میں یہاں بڑا بھاری ہجوم ہوتا ہے جس میں ساٹھ ستر ہزار آدمی جمع ہوتے ہیں۔ باوا صاحب کے حالات ضمیمہ میں درج ہیں۔

پاک پٹن میں لاکھ کا کام بہت عمدہ بنتا ہے۔ کچھ مدت پیشتر سرحدی تجارت ترقی پر تھی۔ افغانستان اور بلوچستان کے سوداگر اسی راستے سے اپنا مال ہندوستان لاتے تھے۔ ڈیرہ غازیخاں اور ڈیرہ اسمٰعیلخاں کی سڑکیں یہاں آکر ملتی تھیں۔

ملتان

میں پاک پٹن سے منٹگمری ہوتا ہوا ملتان آیا۔ ملتان اور منٹگمری میں ۱۰۴ میل کا فاصلہ ہے۔ اس کی قدیمی عمارتوں اور تاریخی روایات سے

معلوم ہوتا ہے کہ یہ شہر بہت پرانا اور حضرت مسیح سے پہلے کا آباد ہے کئی دفعہ اُجڑا اور پھر بسا۔ اس کے کھنڈر میلوں تک ملتے ہیں۔ محمد بن قاسم کی فتوحات سے یہ پہلی مرتبہ ۹۵ھ ۷۱۲ء میں مسلمانوں کے قبضہ میں آیا۔ اس وقت شہر کے تین طرف فصیل تھی اور چوتھی طرف دریا ے راوی بہتا تھا فصیل تو اب تک موجود ہے مگر راوی کے بہاؤ کا راستہ خشک پڑا ہُوا ہے۔ اس وقت دریاے چناب اس سے چار میل کے فاصلے پر ہے۔ ۳۹۵ھ ۱۰۰۵ء میں سلطان محمود غزنوی نے یہاں کے حاکم ابوالفتح لودھی پر حملہ کرکے اس کو مطیع کیا۔ سلاطین دہلی کے زمانے میں یہ شہر ہمیشہ صوبہ ملتان[*] کا مستقر اور مغربی حملہ آوروں کا مطمح نظر رہا ہے۔ چنگیزیوں نے کئی مرتبہ اس پر حملہ کیا۔ مغلیہ خاندان کے زمانے ضعف میں مہاراجہ رنجیت سنگھ اس پر قابض ہوئے۔ سب سے آخری لڑائی اس جگہ سکھوں کے صوبہ دار دیوان مولراج اور گورنمنٹ انگریزی کے درمیان ۱۲۶۶ھ ۱۸۴۹ء میں ہوئی تھی۔ اس لڑائی کے خاتمہ پر صوبہ ملتان انگریزی علاقے میں شامل ہُوا۔ اس وقت یہ مقام حکام سول کا صدر اور ایک فوجی اسٹیشن ہے۔ آبادی کے لحاظ سے یہ شہر پنجاب میں پانچویں درجے پر ہے۔ شہر اور مضافات کی آبادی ملاکر ۸۷ ہزار ۳۸۹ ہے +

یہ شہر خوب آباد اور یہاں کی سڑکیں اکثر پختہ ہیں۔ شہر کے بیچوں بیچ پکّے فرش کا ایک وسیع بازار برابر آدھ میل تک چلا گیا ہے۔ جس کو چوک بازار کہتے ہیں۔ یہ بازار بہت بارونق ہے۔ اس میں دو رویہ عمدہ عمدہ دُکانیں بنی ہوئی ہیں۔ شام کو یہاں خوب رونق ہوتی ہے۔ کاریگر ہر قسم کی

[*] بادشاہی زمانے میں اس صوبے کے متعلق یہ شہر تھے۔ ملتان۔ دیپالپور۔ اوچ۔ اجودھن (پاک پٹن)۔ بھکر +

چیزیں لاکر یہاں بیچتے ہیں۔ چوک کے خاتمہ پر ولی محمد خاں کی ایک
بہت خوبصورت اور عالیشان مسجد ہے۔ چوک بازار کے پاس نرسنگھ پوری
کا مندر ہے۔ اس کی عمارت زرکثیر صرف کرکے بہت عمدہ بنائی گئی ہے
کہتے ہیں کہ ایک لاکھ روپیہ اس پر خرچ ہوچکا ہے۔ مگر اب تک تعمیر
کا کام جاری ہے ✦

ملتان ہمیشہ سے تجارتی مقام رہا ہے۔ ریل جاری ہونے سے
پہلے وسط پنجاب کی پیداوار کشتیوں پر کراچی اور وہاں سے جہازوں کے
ذریعے یورپ جاتی تھی۔ ریل سے اس کی تجارت کو اور بھی ترقی ہوگئی ہے
ولایتی اسباب کراچی کے راستہ سے پہلے یہاں آتا ہے اور پھر یہاں
سے باہر جاتا ہے۔ یہاں کے باشندے عموماً محنتی اور ہوشیار ہیں۔
ریشمی اور اُونی اسباب بہت نفیس بنتا ہے۔ ریشمی کپڑے۔ سوتی اور اُونی
قالین۔ ریشمی کھیس۔ دریائی۔ لُنگیاں۔ کھجوریں۔ آم یہاں عمدہ ہوتے ہیں
اور دور دور تک باہر جاتے ہیں۔ مینا کاری کے زیور اور مٹی کے روغنی
برتن بھی خوب بنتے ہیں۔ ان برتنوں کی دستکاری کا کام یہاں کی قدیم
صنعت کی یادگار ہے۔ انگریز سیّاح اس کے نمونے ولایت کو لیجاتے
ہیں۔ روئی کے کارخانے اور روئی کی گٹھڑیاں باندھنے کے پریس۔ آٹا
پیسنے کی کلیں جاری ہیں ✦

تعلیم کو یہاں خاصی ترقی ہے۔ گورنمنٹ سکول۔ مشن سکول۔
اینگلو ویدک سکول کے علاوہ مسلمانوں کا ایک مدرسہ بھی ہے۔ پہلے
تینوں مدرسوں میں انٹرنس کلاس تک اور چوتھے مدرسے میں پرائمری
تک پڑھائی ہوتی ہے ✦

شہر کے باہر ایک گول سڑک بنی ہوئی ہے۔ اس کے باہر متعدد بستیاں آباد ہیں۔ ان کی آبادی اتنی ہی ہے جتنی شہر کی۔ یہاں گرد بہت اُڑتی ہے۔ گرمی شدت سے ہوتی ہے۔ قبرستان کثرت سے ہیں اور فقیر بھی بہتیرے پڑے پھرتے ہیں۔ کسی شاعر نے ان چاروں چیزوں کو ملتان کی خصوصیات قرار دیکر یہ شعر کہا ہے۔ ؎

چار چیز است تحفۂ ملتان   گرد و گرما گدا و گورستان

عمارات قدیمہ کی یادگار میں ایک خستہ قلعہ ہے جس میں مسلمانوں اور ہندوؤں کی چند قابل دید عمارتیں ہیں۔ ان میں سے شیخ بہاء الدین زکریا المعروف شاہ بہاء الحق اور ان کے پوتے شیخ رکن الدین المعروف شاہ رکن عالم کے مقبرے بہت مشہور ہیں۔ یہ دونو بزرگ ساتویں صدی ہجری میں بہت باکمال گزرے ہیں۔ شاہ رکن عالم کے مقبرے کی بلندی سو فٹ ہے ہندوؤں کا مندر پھیلاد پوری بہت قدیم اور متبرک ہے +

بیرون شہر شاہی زمانے کی عیدگاہ ہے۔ مسٹر اگنو اور انڈرسن سکھوں کی فوج کے ہاتھ سے اسی جگہ ۱۲۶۶ھ ۱۸۴۹ء میں مارے گئے تھے۔ ان کی یادگار کا کتبہ مسجد کی محراب میں لگا ہؤا ہے +

شہر سے ایک میل کے فاصلے پر انگریزی چھاؤنی ریلوے لائن پر واقع ہے اور ریاست بہاولپور کی حدود پر ہونے سے اچھی حالت میں ہے +

بہاولپور

ملتان سے ۶۵ میل طے کرنے کے بعد میں بہاولپور پہنچا۔ یہ شہر ریلوے لائن کے کنارے پر اسی نام کی ریاست کا دارالحکومت اور

متوسط درجے کا شہر ہے۔ اس میں پختہ عمارتیں کم اور کچی زیادہ ہیں۔ بازار تنگ مگر خوب آباد و بارونق ہیں۔ ریاست کے تمام دفاتر اور معزز اہلکار سب اسی جگہ رہتے ہیں۔ مگر خود نواب صاحب کا قیام اور اُن کے عالیشان محلات احمد پور میں ہیں جو "ڈیرہ نواب صاحب" کے نام سے مشہور اور بہاولپور سے ۲۹ میل دور ہے۔ ریاست کی زبان عدالت اُردو ہے +

اُنیسویں صدی مسیحی کے آخری حصہ میں اس ریاست کے مالی اور ملکی انتظام میں اچھی ترقی ہوئی۔ عدالت۔ پولیس۔ ہسپتال اور تعلیم۔ غرض انتظام کے ہر شعبہ میں بہت خوش اسلوبی سے اصلاحیں عمل میں آئیں۔ بہاولپور خاص میں ریاست کی طرف سے ایک ہائی سکول اور ایک کالج قائم ہے۔ ایک ہائی سکول مشن کی طرف سے بھی ہے۔ علوم مشرقیہ کی ترقی کے واسطے ایک مدرسہ علیحدہ جاری ہے۔ دیسی صنعت و حرفت کی ترقی کے متعلق البتہ کوئی خاص کوشش نہیں ہوئی۔ طلائی لنگیاں اور قالین جو یہاں کی قدیم دستکاری ہے خاصی چل رہی ہے۔ کانسی کے کٹورے بالخصوص لطافت اور سُبکی کے باعث بہت مشہور ہیں +

موجودہ فرمانروا نواب صادق محمد خان نواب محمد بہاول خاں پنجم کے صغیر السن صاحبزادے ہیں اور ریاست کا نظم و نسق ایک کونسل کے ہاتھ میں ہے جس کے پریزیڈنٹ حاجی مولوی رحیم بخش ہیں۔ انتظامی قابلیت کے باعث انہیں حال میں سی۔ آئی۔ ای کا خطاب گورنمنٹ انگریزی سے ملا ہے +

مولوی صاحب بہت علم دوست اور دیندار ہیں۔ ان کی حسن سعی سے پچھتر ہزار روپے ریاست نے اسلامیہ کالج لاہور کی عمارت کے واسطے اور پچاس ہزار روپے نواب صاحب مرحوم کی والدہ نے اپنی جیب خاص سے ندوۃ العلما لکھنؤ کی اعانت کے واسطے عطا کئے ہیں +

تاریخی حالات

بہاول پور پنجاب کی ریاستوں میں بہت جلیل القدر اور ملکی حیثیت سے کشمیر اور پٹیالہ کے بعد دوسرے درجے پر ہے - نواب صاحب کے مورث اعلےٰ رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباسؓ کی اولاد سے ہیں جو ساتویں صدی ہجری میں تباہی بغداد کے بعد مصر اور وہاں سے ہندوستان آکر دریائے سندھ کے قرب و جوار میں مقیم ہوئے تھے - ان کی اولاد میں سے حسین خان نامی ایک شخص نے شہنشاہ اکبر کے عہد میں ملازمت شاہی کا شرف حاصل کیا اور رفتہ رفتہ اپنا اقتدار بڑھایا - موجودہ ریاست کی بنیاد داؤد خاں سے شروع ہوتی ہے جس نے محمد شاہ فرمانروائے دہلی کے عہد میں استقلال حاصل کیا - اسی بہادر کے نام سے یہ خاندان داؤد پوترہ (داؤد کی اولاد) مشہور ہوا +

گورنمنٹ انگریزی کے ساتھ ۱۲۲۴ھ / ۱۸۰۹ء سے اس ریاست کا تعلق شروع ہوتا ہے ۱۲۴۹ھ / ۱۸۳۳ء میں ریاست اور گورنمنٹ انگریزی میں باہمی عہد و پیمان ہوئے اس وقت سے والیان ریاست ہمیشہ سرکار کے خیرخواہ رہے - کابل کی پہلی لڑائی اور ملتان کے ہنگامہ ۱۲۶۵ھ / ۱۸۴۸ء میں اس ریاست نے گورنمنٹ کی بیش قیمت مدد کی - ان خدمات کے عوض میں اضافہ جاگیر اور ایک لاکھ روپیہ سالانہ کی پنشن نواب بہاول خاں ثالث کے نام تا حیات عطا ہوئی - اس کے بعد مفسدہ ۱۲۷۴ھ / ۱۸۵۷ء کے وقت نواب فتح خاں نے پھر فوج سے مدد کی - نواب محمد بہاول خاں پنجم اس ریاست کے آخری فرمانروا ہیں جو چیفس کالج لاہور کے تعلیم یافتہ اور ایک لائق رئیس تھے - یہ ۱۹۰۶ء میں کعبۃ اللہ کی زیارت کرنے گئے تھے - واپسی کے وقت بمقام عدن

فوت ہوگئے۔ اس وقت ان کے فرزند بعمر چار سال ریاست کے مالک ہیں +
ریاست کی وسعت ایک زمانے میں ڈیرہ جات اور شکارپور تک تھی۔
اب بھی اس کے حدود ایک طرف جیسلمیر اور دوسری طرف سکھر تک ہیں۔
رقبہ ۱۵ ہزار مربع میل ہے جس میں سے چھٹے حصے کے قریب قابل زراعت
اور باقی ریگستان و جنگل ہے۔ ریاست کی توجہ اسکی آبادی پر بہت مائل ہے
انہار طغیانی سے آبپاشی کا عمدہ انتظام کیا گیا ہے۔ آبادی تقریباً سات
لاکھ ۲۰ ہزار۔ محاصل ملکی بائیس لاکھ۔ فوجی جمعیت بھی اچھی ہے۔

اُچ

میں بہاولپور سے روانہ ہو کر احمد پور آیا اور پھر اونٹ کی سواری سے
اُچ پہنچا۔ بہاولپور سے اُچ تک ۴۳ میل کی مسافت ہے جس میں سے
۲۹ میل ریل کے ذریعے اور ۱۴ میل اونٹ پر طے کرنے پڑے +
یہ شہر پنج ند (پانچ دریا) کے کنارے ریاست بہاولپور کے علاقے میں
ہے۔ زمانہ قدیم میں دریائے سندھ اور پنجاب کے پانچوں دریا اس جگہ آکر
ملتے تھے۔ مگر اب اس سے چالیس میل جنوب کی طرف مٹھن کوٹ کے
قریب بہتے ہیں۔ یہ شہر تاریخی یادگاروں کا مجموعہ اور سندھ کے بہت پرانے
شہروں میں سے ہے۔ ایک انگریزی مؤرخ کی تحقیقات کے مطابق یہ شہر
سکندر اعظم کا آباد کیا ہوا ہے۔ اسلامی زمانے میں بھی بہت بڑا شہر تھا۔
سلطان محمود غزنوی اور شہاب الدین غوری کو یہاں معرکہ آزمائی کی ضرورت
پیش آئی۔ ناصر الدین قباچہ کے وقت یہ سندھ کا دار الخلافہ تھا۔ حضرت

سید جلال بخاری اور مخدوم جہانیاں جہاں گشت جو آٹھویں صدی ہجری میں بڑے اولیائے کامل گزرے ہیں۔ ان کے مزار اسی شہر میں ہیں۔ بالفعل اس کو جو شہرت ہے وہ انہیں حضرات کے مزارات پُرانوار کی وجہ سے ہے۔ مخدوم جہانیاں کے عُرس پر ہر سال بڑا ہجوم ہوتا ہے۔ اور دور دور سے ہندو مسلمان زائرین آتے ہیں۔ (مخدوم صاحب کے حالات ضمیمہ میں درج ہیں)۔

سکھّر

بہاول پور سے ۲۱۸ میل طے کرنے کے بعد ٹرین روڑھی پہنچی اور دریائے سندھ سے عبور کرنے کے بعد سندھ کا مشہور شہر سکھّر آیا۔ اس شہر کی پُرانی آبادی تو کچھ زیادہ بارونق نہیں ہے۔ البتہ نئی آبادی بہت رونق پر ہے۔ حکام سول کے دفاتر۔ ریلوے اسٹیشن وغیرہ سب اسی حصہ میں ہیں۔ آثار قدیمہ میں سے میر محمد معصوم جو شہنشاہ اکبر کے عہد میں سندھ کے حاکم تھے۔ ان کا مینار اور قدما کی چند قبریں عمارتی خوبیوں کے لحاظ سے بہت عمدہ ہیں۔ پُرانے سکھّر میں شاہ خیرالدین کی خانقاہ قابل دید ہے جس کا گنبد سبز اور منقش ہے۔ شاہ خیرالدین جہانگیر کے عہد سلطنت میں تھے۔ ان کا انتقال ۱۷ء ۱۶ء ۲۷ء میں ہوا۔ سکھّر کا پُل بھی دیکھنے کے لائق ہے یہ پُل صرف آہنی کمانوں کے سہارے ٹھیرا ہوا ہے اور دریا میں کوئی ستون نہیں بنایا گیا۔ یہ جدید فن انجنیری کے انتہائی ترقی کی بے نظیر مثال ہے۔ سکھّر اُن ریلوے لائنوں کا سب سے بڑا صدر مقام ہے جن کا تعلق کراچی کوئٹہ۔ لاہور اور بھٹنڈے سے ہے۔ غلہ اور لکڑی کی یہاں بڑی منڈی ہے۔ غلہ کراچی کو اور عمارتی لکڑی تمام سندھ میں جاتی ہے۔ اس روز افزوں

ترقی کے باعث کلکٹر کا صدر مقام شکارپور سے سکھر میں آگیا ہے۔ موجودہ حالت سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک دن سندھ میں۔ یہ شہر تجارت کی بڑی منڈی مانا جائیگا۔ یہاں کی آب و ہوا بہت گرم ہے +

اس جگہ تین مدرسے ہیں۔ ایک سندھی کا۔ ایک انگریزی کا اور ایک حرفت وصنعت کا۔ مگر مسلمانوں میں شوق تعلیم کم ہے۔ شیخ محمد سلیمان مرحوم مالک وکٹوریہ پریس جو ایک صاحب عزم با خبر اور مسلمانوں کے ہمدرد تھے۔ ان کو اس پر بڑی توجہ تھی۔ سندھ کا سب سے پہلا اسلامی اخبار "الحق" نام انہی کے اہتمام سے جاری ہوا تھا جو بعد میں حیدرآباد اور پھر کراچی منتقل ہوگیا +

چند کابلی سردار امیر عبدالرحمٰن خان مرحوم کے زمانے سے اس جگہ مقیم تھے۔ سنہ ۱۹۰۷ء کے سفر میں جبکہ مولوی ابوالنصر غلام یٰسین صاحب دہلوی مرحوم متخلص آہ میرے ہمراہ تھے۔ سردار محمدؐ علی خان اور سردار غلام حیدر خان سے خوب ملاقاتیں ہوئیں۔ یہ دونو سردار بہت با اخلاق اور مہمان دوست ہیں۔ غلام حیدر خان کو شعر وسخن میں اچھا دخل ہے۔ شدت گرما کے باعث یہ لوگ گرمیوں میں کراچی چلے جایا کرتے تھے۔ امیر صاحب حال نے ان کے حال پر توجہ مبذول فرماکر سندھ کی گرمیوں سے انہیں نجات دی اور اب یہ دونو صاحب کابل کی ٹھنڈی ہوائیں کھا رہے ہیں +

بھکر[1]

یہ ایک جزیرہ سکھر کے قریب دریائے سندھ کے اُس موقع پر ہے

---

[1] شیخ ابن بطوطہ کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ آٹھویں صدی ہجری میں بھکر اور سکھر دونو ایک

جہاں پنج ند (پنجاب کے پانچوں دریا) اور دریائے سندھ ملکر بہتے ہیں۔ اس وقت بھکر کی شکل ایک ویران قلعہ کی ہے۔ اور سکھر سے جو ریلوے لائن روڑھی جاتی ہے۔ اس میں سے ہوتی ہوئی گزرتی ہے۔ اس موقع پر دریا کی شمالی دھار تقریباً دوسو گز اور جنوبی دھار تقریباً چار سو گز چوڑی ہے۔ قلعہ ایک مستحکم دیوار سے گھرا ہُوا ہے جس کی ۳۰ فٹ چوڑی فصیل کے آثار اب تک باقی ہیں۔ تاریخی لحاظ سے یہ ایک مشہور مقام ہے۔ کسی زمانے میں سندھ کی ریاستیں اس پر قابض ہونے کے لئے ہمیشہ حملہ آور رہتی تھیں فصیل کے کنارے کنارے کھجور کے درخت بکثرت ہیں۔ ایک موقع پر مقیاس الما بنا ہُوا ہے جس سے دریائے سندھ کے اُتار چڑھاؤ کی روزانہ کیفیت معلوم ہوتی ہے اور زمینداران سندھ کی اطلاع کے واسطے مشتہر کی جاتی ہے ۔

اس قلعہ کے قریب دو جزیرے اور ہیں جو مذہبی عظمت کے لحاظ سے مشہور ہیں۔ ان میں سے جند پیر شمال کی طرف ہے۔ جسے عام لوگ خواجہ خضر کا مقام بھی کہتے ہیں۔ غالباً یہ وہی جزیرہ ہے جس کی نسبت شیخ ابن بطوطہ نے لکھا ہے کہ دریائے سندھ کی شاخ کے وسط میں ایک خانقاہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۸۹) ہی شہر سمجھے جاتے تھے۔ دریائے سندھ کی ایک شاخ اس کے درمیان سے گزرتی تھی۔ اس وقت بھکر کی حیثیت صرف ایک قلعہ کی ہے اور دریائے سندھ اس کے شمال میں بدستور بہتا ہے۔ علامی ابو الفضل نے آئین اکبری میں لکھا ہے کہ زمانہ سابق میں قلعہ بھکر کا نام منصورہ تھا۔ مشہور مؤرخ ابو الفدا بھی اس کا مؤید ہے وہ لکھتا ہے کہ منصورہ وہ شہر ہے جو دریائے سندھ کی ایک شاخ سے جزیرے کی مانند گھرا ہوا ہے۔ عمر بن حفص ایک امیر عرب نے ابو جعفر منصور خلیفہ عباسی کے عہد میں اس شہر کی بنیاد قائم کی اور خلیفہ وقت کے نام پر منصورہ موسوم کیا۔ اس زمانے میں ملتان سے منصورہ تک بارہ پڑاؤ کی مسافت سمجھی جاتی تھی۔ اس وقت ملتان سے روڑھی تک ۲۸۰ میل کا فاصلہ ہے۔ اگر ایک پڑاؤ کی مسافت تقریباً ۲۰ میل قرار دی جائے تو منصورہ اور بھکر کے ایک موقع پر ہونے کا مسئلہ آسانی سے طے ہو سکتا ہے۔

ہے۔ جہاں مسافروں کو کھانا ملتا ہے۔ یہ خانقاہ کشلو خاں حاکم سندھ کی تعمیر کرائی ہوئی ہے۔ دوسرا جزیرہ جنوب کی طرف اور سعد بیلا کے نام سے مشہور ہے۔ عام لوگ اسے سادہ بیلا کہتے ہیں۔ یہاں ہندوؤں کا ایک قدیمی مندر ہے۔ ان دونو جزیروں میں کشتی کے ذریعے آمد و رفت ہوتی ہے اور ہر سال تین میلے ہوتے ہیں جن میں باہر کے لوگ کثرت سے آتے ہیں ÷

روہڑی

یہ شہر دریائے سندھ کے جنوب اور سکھر کے بالمقابل واقع ہے۔
یہاں ریلوے کا جنکشن ہے۔ مسافران کوئٹہ کو براہ سکھر اور مسافران حیدرآباد کو براہ خیرپور سفر کرنا ہوتا ہے +

اس شہر کی آبادی چالیس فٹ بلند چٹان پر ہے جو دریا کے کنارے کنارے پیچ و خم کھاتی ہوئی دور تک چلی گئی ہے۔ ابتدائی بنیاد سید رکن الدین شاہ نے ۶۹۷ھ (۱۲۹۷ء) قائم کی تھی۔ شاہی زمانے میں یہاں اچھی اچھی عمارتیں تھیں +

(۱) مسجد جو شہنشاہ اکبر نے ۹۸۲ھ (۱۵۷۴ء) میں تعمیر کرائی تھی۔ یہ مسجد دریا کے کنارے بہت خوشنما ہے +

(۲) مقام وال مبارک جس میں رسول خدا کا موے مبارک رکھا ہوا ہے۔ یہ عمارت یہاں کے حاکم میر محمدؐ نے ۹۵۲ھ (۱۵۴۵ء) میں بنوائی تھی۔ سندھ کے لوگ اکثر اس کی زیارت کو آتے ہیں اور سال میں ایک مرتبہ بہت بڑا میلہ ہوتا ہے ÷

(۳) بیرون شہر ریل کے پرلی طرف ایک بلندی پر چند قبریں ہیں۔ عام

لوگ ان کو ستیاں کہتے ہیں اور محمدؐ قاسم فاتح سندھ کے زمانے تک ان کا سلسلہ پہنچاتے ہیں۔ مگر کتبوں کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قبریں امرائے عہد اکبر اور جہانگیر کی ہیں۔ غالباً یہ لوگ کسی لڑائی میں شہید ہوئے ہونگے۔ عام لوگوں نے شہیداں سے ستیاں بنالیا۔ اصل قبریں زیر زمین اور سطح بالا پر تعویذ بنے ہوئے ہیں۔ اِن تعویذوں کا کام بہت عمدہ اور قابل دید ہے +

اس شہر میں بعض خاندانی اہل علم موجود ہیں جن کے نام کچھ اوقاف بھی واگزار ہیں۔ انہی میں سے سید سُویَل شاہ ایک شیعی المذہب جاگیردار ہیں جن کے پاس بہت اچھا کتب خانہ اب تک محفوظ ہے۔ سیّد صاحب با اخلاق اور مہمان نواز آدمی ہیں +

خیرپور

یہ شہر سکھر سے ۱۴ میل کے فاصلے پر ریلوے لائن کے کنارے اسی نام کی ریاست کا دار الحکومت ہے۔ شہر کی عمارتیں بیشتر خام اور کچھ پختہ ہیں۔ بازار تنگ اور ٹیڑھے۔ ریاست کے تمام دفاتر اسی جگہ ہیں۔ مگر والئے ریاست کا قیام کوٹ دیجی میں ہے جو خیرپور سے ۶-۷ میل کے فاصلے پر ہے۔ دونو مقامات میں سڑک بنی ہوئی ہے۔ مسافر کو ہر قسم کی سواری خیرپور میں مل جاتی ہے +

اس ریاست میں جنگلات بکثرت اور والیان ملک کو شکار کا بیحد شوق ہے۔ اس واسطے ان کا زیادہ وقت اسی کام میں صرف ہوتا ہے۔ ریاست کا نظم و نسق کچھ عرصہ سے وزیر کے متعلق ہے جو گورنمنٹ انگریزی کے

ڈپٹی کلکٹروں سے منتخب ہوکر آتا ہے۔ پہلے وزیر خاں بہادر فاردار خاں اور پھر ان کے جانشین آنریبل سردار محمد یعقوب سی۔ایس۔آئی تھے۔ ان دونو صاحبوں کے عہد میں ریاست نے مالی و ملکی انتظام میں خوب ترقی کی۔ سردار صاحب نے سب سے بڑا کام یہ کیا کہ مسلمانان سندھ کو دیگر صوبجات کے مسلمانوں سے جو طبعی بیگانگت تھی ۱۹۰۷ء میں آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کو کراچی میں مدعو کرنے سے ایک حد تک دور کیا۔ اگرچہ افسوس ہے کہ سردار صاحب انعقاد جلسہ سے پیشتر فوت ہو گئے۔ مگر مقام مسرت ہے کہ موجودہ وزیر آنریبل شیخ صادق علی صاحب نے ان کی اس تجویز کو بڑی محنت سے سرسبز کیا۔ اور قومی جوش کو یہاں تک حرکت دی کہ مسلمانان سندھ کی ترقی میں حصہ لینے کے علاوہ ۱۹۰۸ء کی امرتسر کانفرنس میں شریک ہوئے۔ کئی ہزار روپے اپنی جیب خاص سے اور کئی ہزار روپے ریاست سے علیگڈھ کالج کی امداد کے واسطے دئے۔

خیرپور میں ایک ہائی سکول اور اس کے ساتھ ایک بورڈنگ ہوس ہے۔

تاریخی حالات تمام صوبہ سندھ میں صرف خیرپور ایک دیسی ریاست ہے۔ احمد شاہ کے عہد تک اس ریاست بلکہ تمام ملک سندھ کا حکمران نور محمد کلہوڑا کابل کا باجگزار تھا۔ ۱۱۹۸ھ؁ ۱۷۸۴ء میں تالپور بلوچوں کے سردار میر فتح علی خاں نے کلہوڑا خاندان کو شکست دے کر سندھ پر تسلط کیا۔ اور حیدرآباد کو اپنا دارالخلافہ قرار دیا۔ یہ پہلا شخص ہے جس نے موجودہ خاندان میں ریاست کی بنیاد قائم کی۔ اس کے بھتیجے نواب میر سہراب خاں کے زمانے میں فتوحات کا دائرہ وسیع ہوا اور رفتہ رفتہ اس کے حدود جیسلمیر سے کچھ گنڈاوا تک پہنچ گئے۔ جو ملک بلوچستان میں ہے۔ مگر ۱۲۲۹ھ؁ ۱۸۱۳ء کے قریب جبکہ بارک زئی خاندان میں خانہ جنگی ہو رہی تھی۔ والئے خیرپور نے آزادی کا علم

بلند کر کے خراج دینا بند کر دیا۔ ۱۲۴۸ھ ۱۸۳۲ء میں برٹش گورنمنٹ کے ساتھ
ایک معاہدہ ہو کر خیرپور کی ریاست جداگانہ تسلیم کی گئی۔ مگر تھوڑے
عرصے میں اس قسم کے خانگی جھگڑے ورثائے ریاست میں شروع ہوئے
کہ ۱۲۵۴ھ ۱۸۳۸ء کی مہم افغانستان میں برٹش گورنمنٹ کو معاملات سندھ میں مداخلت
کرنی پڑی۔ اس وقت ریاست کے فرمانروا نواب میر علی مراد خاں تھے ۱۲۵۹ھ ۱۸۴۳ء
میں میانی کے مقام پر ایک بڑے سخت معرکے کے بعد سندھ پر انگریزوں
کا دخل ہو گیا۔ اور جس قدر ملک میران سندھ کے قبضے میں رہا۔ نواب
میر علی مراد خاں اس کے فرمانروا تسلیم کئے گئے جو ایک عرصہ دراز کی حکمرانی
کے بعد ۱۸۹۴ء میں فوت ہوئے۔ ان کی فیاضی اور علما و فقرا کی قدردانی
سندھ کے علاوہ دور دور کے علاقوں میں مشہور ہے۔ ان کے بعد نواب
میر فیض محمد خاں جانشین ہوئے۔ ریاست کا رقبہ ۶ ہزار ۵۰ مربع
میل ہے۔ مگر اکثر حصہ ریگستان اور جنگل ہے۔ ان جنگلوں میں بڑی بڑی
شکارگاہیں ہیں جن میں عمارتی لکڑی خصوصاً شیشم کثرت سے ہوتی ہے۔

حیدرآباد سندھ

یہ شہر دریائے سندھ کے کنارے خیرپور سے ۱۷۰ میل کے فاصلے
پر واقع ہے اور حیدرآباد سندھ کے نام سے مشہور ہے۔ مؤرخوں کا خیال
ہے کہ شہر نیرا کوٹ جس کو محمد ابن قاسم نے آٹھویں صدی مسیحی میں فتح کیا۔
اسی جگہ تھا۔ ایک ہزار برس بعد غلام شاہ کلہوڑا حاکم سندھ نے ۱۱۸۲ھ ۱۷۶۸ء
میں ایک نیا شہر بسایا اور حیدرآباد سے موسوم کیا۔ اُس وقت سے لیکر
۱۲۵۹ھ ۱۸۴۳ء تک جبکہ انگریز سندھ پر قابض ہوئے فرمانروایان ملک سندھ کا

یہی دارالسلطنت تھا۔ اب بھی سول اور فوج کے افسر یہاں رہتے ہیں۔
حیدر آباد کا موسم خوشگوار ہے اور گرمیوں میں ایسی فرحت بخش ہوائیں چلتی ہیں کہ گرد و نواح کے لوگ ایام گرما بسر کرنے یہاں چلے آتے ہیں۔ ڈاکٹروں کی رائے میں سل اور دق کے مریضوں کو یہاں کی آب و ہوا بہت مفید ہے سنہ ۱۹۰۱ء کی مردم شماری کے مطابق اس کی آبادی ۶۹ ہزار ۳۷۸ ہے۔

اسٹیشن سے شہر تک کوئی ایک میل کا فاصلہ ہوگا۔ اس کی آبادی نہایت گنجان۔ چند سڑکیں اچھی خاصی وسیع مگر بیشتر گلیاں تنگ اور بعض متعفن ہیں۔ تجارتی کاروبار کو خوب ترقی ہے۔ سینکڑوں دکانیں انواع و اقسام کے مال سے بھرپور ہیں۔

عمارات قدیمہ میں سے یہاں کا قلعہ قابل دید ہے۔ اس کا رقبہ ۳۶ ایکڑ اور صوبے کا اسلحہ خانہ اس میں موجود ہے۔ یہ اسلحہ خانہ سنہ ۱۸۶۱ء میں کراچی سے تبدیل ہوکر یہاں آیا۔ قلعہ کے اندر چند مسجدیں اور کئی قسم کی عمدہ عمدہ عمارتیں تھیں جو سب مسمار ہوگئیں۔ صرف میر ناصر خاں کا ایک محل باقی ہے جس میں سندھ کے صاحب کمشنر رہا کرتے تھے۔ اس محل کا ایک باتصویر کمرہ ہندوستان کی صنعت نقاشی کا عجیب و غریب نمونہ ہے۔

نئی مارکٹ سے تھوڑے فاصلے پر غلام شاہ کلہوڑا اور تالپور خاندان کے لوگوں کے زرد پتھر کے نہایت خوشنما مقبرے ہیں۔

حرفت و صنعت کو خاصی ترقی ہے۔ یہاں کا زرین تار کا کپڑا تمام ہندوستان میں مشہور ہے۔ زردوزی اور ریشم کا کام بھی اچھا ہوتا ہے۔ کاغذ کے قلمدان اور طشتریوں پر نقش و نگار اور روغنی کام بہت عمدہ ہوتا ہے۔ انہی خوبیوں کے ساتھ صندوق۔ کرسیوں اور پلنگ کے پایوں پر

رنگ سازی ہوتی ہے +

تجارت میں یہاں کے ہندو سوداگر بہت تجربہ کار اور مستعد ہیں۔ مجھے افریقہ اور یورپ کے دوران سفر میں معلوم ہوا کہ حیدرآبادیوں کی چند تجارتی کمپنیاں ممالک بیرونی میں کام کر رہی ہیں۔ سب سے بڑی کمپنی سیٹھ چیلارام کی ہے جس کا صدر مقام قاہرہ ملک مصر میں ہے۔ کمپنیوں کی شاخیں سمندر کے کنارے کنارے مغرب کی طرف جبرالٹر تک اور مشرق کی طرف ہونگ کونگ تک پھیلی ہوئی ہیں۔ کمپنیوں کے ادنے اعلےٰ نوکر سب ملک سندھ کے رہنے والے اور مالکان کمپنی کے ہم مذہب ہیں +

اگرچہ سندھ کی تعلیمی حالت عام طور پر اچھی نہیں لیکن حیدرآباد کے لوگوں بالخصوص ہندؤں نے تعلیم میں کسی قدر ترقی کی ہے۔ چار ہائی سکول ایک ٹریننگ کالج۔ ایک نورمل سکول۔ ایک میڈیکل سکول اور ایک زراعتی سکول یہاں موجود ہیں۔ ٹریننگ کالج کے ساتھ ایک ٹیکنیکل کلاس اور زراعتی سکول کے ساتھ ایک انجینیرنگ کلاس بھی قائم کی گئی ہے۔ اس عام ترقی پر مسلمانوں کی حالت افسوسناک ہے۔ باوجودیکہ ملک سندھ مدت سے مسلمانوں کے قبضے میں اور خاص حیدرآباد ایک عرصے تک ان کا دارالخلافہ رہا۔ اور اب بھی بڑے بڑے زمیندار مسلمان ہیں اور موجودہ مردم شماری کے لحاظ سے بھی مسلمانوں کی تعداد جملہ اقوام کے مقابلہ میں اسی فیصدی کے قریب ہے۔ مگر باوجود ان سب باتوں کے تعلیم میں سب سے پیچھے اس کمی تعلیم کا سبب ان کی بے پروائی اور غفلت کے سوا اور کچھ نہیں +

یہاں کا ورنیکلر پریس تعلیمی حالت کے مطابق اچھا ہے۔ مسلمانوں کا ایک اخبار الحق جو پہلے سکھر سے شائع ہوتا تھا۔ اب اس کا دفتر منتقل ہوکر

یہاں آگیا ہے اور سندھی کے علاوہ اس کا ایک حصہ انگریزی میں بھی چھپتا ہے۔ تاکہ مسلمانوں کی ضروریات براہ راست حکام انگریزی کے گوشگزار ہوتی رہیں۔ سندھی کے اڈیٹر ماسٹر عبدالوہاب اور انگریزی کے اڈیٹر مولوی سید محمدؐ صاحب ہیں۔ ماسٹر صاحب سندھ کے رہنے والے اور سید صاحب شمالی ہند کے متوطن اور علیگڈھ کالج کے تعلیم یافتہ ہیں۔ دونو صاحبوں کو قومی معاملات سے بہت دلچسپی اور فی الجملہ آزادنویس ہیں۔ اس اخبار کا دفتر چھاؤنی میں ہے جو غالباً شہر سے دو میل کے فاصلے پر ہوگی۔ یہ چھاؤنی خوب آباد اور اس میں فوج کی ایک معقول تعداد رہتی ہے ٭

الحق کو تمام سندھ میں یہ عزت حاصل ہے کہ حضور پرنس آف ویلز کے سفر ہندوستان ۱۹۰۵ء میں چھ ہندوستانی اخبار نویس جو سرکاری طور پر نامہ نگاری کے واسطے مقرر ہوئے۔ ان میں اس اخبار کے اڈیٹر مولوی سید محمدؐ بھی تھے ٭

میں ایک سفر میں سید صاحب کے ہاں ٹھیرا تھا اور دوسرے سفر میں اُن کے دوست منشی امجد اللہ خاں صاحب کا مہمان تھا۔ خان صاحب رامپور کے ایک شریف اور تعلیم یافتہ خاندان کے ممبر ہیں۔ آپ نے انگریزی کی تعلیم علیگڈھ کالج میں پائی ہے۔ اس وقت ریاست خیرپور کے انگریزی دفتر میں ملازم تھے۔ اور وزیر صاحب کے ساتھ حیدرآباد میں تشریف لائے ہوئے تھے۔ سید صاحب کے ذریعہ مسٹر حامد علی معزالدین اسسٹنٹ کلکٹر سے ملاقات ہوئی۔ جو بدرالدین طیب جی کے خاندان سے ایک با اخلاق اور بہت سلجھی ہوئی طبیعت کے نوجوان ہیں ٭

حیدرآباد بڑا بھاری جنکشن ہے۔ یہاں سے کراچی۔ بمبئی۔ کوئٹہ اور بھٹنڈہ کو سڑکیں نکلتی ہیں ٭

کراچی

یہ شہر حیدر آباد سے ۱۰۰ میل کے فاصلے پر سمندر کے کنارے واقع ہے۔ آج سے ستر برس پیشتر چند ماہی گیروں کی جھونپڑیاں یہاں ہُوا کرتی تھیں ۱۸۴۳ء میں جب انگریزوں کے قبضے میں آیا اور تجارتی و جنگی اعتبار سے موقع کی اہمیت معلوم ہوئی تو اس وقت سے اس کی آبادی و رونق میں ترقی شروع ہوئی۔ اس کی آب و ہوا قرب سمندر کے باعث نہایت خوشگوار اور صحت افزا ہے۔ سندھ کے صاحب کمشنر اور دیگر ملکی و قومی عہدہ دار سب اس جگہ رہتے ہیں۔ پنجاب اور بالخصوص سندھ کے امراو شوقین موسم گرما گزارنے کے واسطے یہاں آجاتے ہیں۔ سنہ ۱۹۰۱ء کی مردم شماری کے مطابق اس کی آبادی ایک لاکھ ۱۶ ہزار ۶۶۳ ہے۔

شہر کی آبادی خوشنما - بازار وسیع - تاجروں کی بڑی بڑی دکانیں اور کئی بنک اس جگہ موجود ہیں - اس تجارت میں میمن مسلمان سوداگروں کا بھی معقول حصہ ہے - دہلی کے مشہور سوداگر شیخ بخش الٰہی صاحب کی ایک دکان کلکتہ اور بمبئی کی طرح یہاں بھی ہے - گزشتہ صدی کے آخر میں وادی سندھ کی ریل جاری ہونے سے اس کی اہمیت بہت بڑھ گئی ہے پنجاب کا تجارتی مال جو پہلے بمبئی ہوکر ولایت جاتا تھا کمی مسافت کے باعث اب کراچی سے جاتا ہے - اس درآمد برآمد سے یہ شہر شمالی ہند کا سب سے بڑا بندرگاہ قرار پاگیا ہے۔

یہاں کی عمارات حسب ذیل قابل دید ہیں - فریئر ہال جس کے ساتھ ایک لائبریری اور عجائب خانہ بھی ہے نیپیر بارکیں - وکٹوریا مارکیٹ

بولٹن مارکیٹ ۔ گھنٹہ گھر ۔ کیماری سے شہر تک سمندر کے ایک حصّہ پر جو دو میل کا بند لگایا گیا ہے اور جسے نیپیر مول کے نام سے پکارتے ہیں قابل دید اور صنعت و انجینیری کا ایک اعلےٰ نمونہ ہے ۔ کلفٹن سمندر کا وہ پُر فضا کنارہ ہے جس کی نظیر بمبئی میں بھی نہیں ۔ یہاں اکثر لوگ شام کے وقت ہوا خوری کو آتے ہیں ۔ زوالوجیکل گارڈن (دار الحیوانات) کا موقع بہت پُر فضا اور اس میں انواع و اقسام کے جانور موجود ہیں ؞

یہاں ایک اسلامی ہائی سکول ہے جس کی بنیاد مرحوم خان بہادر میر حسن علی آفندی نے قائم کی تھی ۔ آفندی صاحب حیدر آباد سندھ کے رہنے والے اور سلطنت عثمانی کے وائس کونسل تھے ۔ میں اور ابو النصر مرحوم حاجی مولا ڈینا تاجر کے ہمراہ جو اس وقت وائس کونسل کی خدمات سرانجام دیتے تھے ۔ مدرسہ دیکھنے گئے ۔ اس زمانے میں مولانا حمید الدین[+] صاحب مدرسہ کے عربی پروفیسر تھے ۔ ان کی وجہ سے عمارت اور تعلیمی حالات دریافت کرنے کا اچھا موقع ملا ۔ مدرسے کی عمارت بہت شاندار ہے ۔ چاروں طرف سکول اور بورڈنگ ہاؤس کی عظیم الشان عمارتیں ہیں ۔ بیچ میں ایک فراخ میدان چھُٹا ہوُا ہے ۔ سُنّی اور شیعہ کی دو علیحدہ علیحدہ مسجدیں ہیں ۔ سندھ کے امیرزادے اور معزز زمینداروں کے لڑکے سب اسی جگہ تعلیم پاتے ہیں ۔ تعلیم کا انتظام انٹرنس کلاس تک ہے

سیٹھ عمر یہاں کے سوداگروں میں علم دوست اور مسافر نواز شخص ہیں ۔ ان کے زیر اہتمام چھاؤنی میں ایک مدرسہ جاری ہے جس میں زیادہ تر یتیموں کے لڑکے پڑھتے ہیں ۔ ان کے ذریعہ مفصلہ ذیل اشخاص سے ملاقاتیں ہوئیں :-

+ میرے سفر سال گزشتہ میں مولانا صاحب الہ آباد میور سنٹرل کالج کی عربی پروفیسری کے معزز عہدہ پر ممتاز تھے

(۱) شیخ رحمت اللہ۔ یہ سروے ڈیپارٹمنٹ میں ایک اچھے عہدے پر ممتاز ہیں۔ دیگر خوبیوں کے علاوہ ان میں یہ وصف ہے کہ پچاس ساٹھ روپے ماہوار کی دوائیں گھر میں تیار کرا کر بیماروں کو مفت تقسیم کرتے ہیں ۔

(۲) میرزا قلیچ بیگ۔ یہ لڑکانہ کے ڈپٹی کلکٹر اور بہت علم دوست ہیں۔ آپ نے فارسی کی مستند کتابوں سے سندھ کی ایک تاریخ انگریزی میں لکھی ہے۔ ان دونو صاحبوں کی خوش خلقی اور مسافر نوازی سے ہمیں بہت مسرت ہوئی ۔

کراچی میں بمبئی اور یورپ کے جہازوں کی آمد و رفت کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ برٹش انڈیا سٹیم نیوی گیشن کمپنی کے دو جہاز ہفتہ وار بمبئی سے آتے ہیں جو مسقط۔ بوشہر۔ بندر عباس اور بحرین سے گزرتے ہوئے بصرہ تک چلے جاتے ہیں۔ کراچی سے بمبئی تک ۵۰۰ میل کا فاصلہ ہے اور تین دن میں جہاز کے ذریعے طے ہو جاتا ہے ۔

ہندوستان کے بڑے مشہور مقاموں کا فاصلہ کراچی سے حسب ذیل ہے :۔

مسافت		کرایہ درجہ سوم	کرایہ درجہ دوم
کوئٹہ براہ رُکھ	۵۳۶ میل	۶ روپے ۱۰/	۱۸ روپے ۲/
لاہور براہ رُہڑی	۷۸۴ میل	۹ ؍ ۳/	۲۴ ؍ ۸/
شملہ براہ لاہور	۱۰۸۱ میل	۱۵ ؍ ۹/	۴۴ ؍ ۲/
دہلی براہ سماسٹھا	۹۰۷ میل	۱۰ ؍	۲۸ ؍ ۶/
بمبئی براہ مارواڑ	۹۹۲ میل	۱۰ ؍ ۱۱/	۳۲ ؍ ۹/
مدراس براہ بمبئی	۱۷۸۶ میل	۱۹ ؍	۵۳ ؍ ۱۰/
کلکتہ براہ دہلی	۱۸۱۰ میل	۱۸ ؍ ۱۲/	۶۱ ؍ ۵/

سیہوان

کراچی سے براہ کوٹڑی میں سیہوان آیا - جو کراچی سے ۱۹۵ میل کے فاصلے پر واقع ہے - محمدؒ بن قاسم کے عہد میں یہ بہت بڑا شہر تھا آٹھویں صدی ہجری میں جب مشہور سیاح ابن بطوطہ یہاں آیا تو اس وقت بھی خوب آباد تھا - تاریخی کتابوں میں اس کو سیوستان لکھا ہے +

اسکی موجودہ حیثیت ایک چھوٹے سے قصبے کی ہے - آبادی تقریباً پانچ چھ ہزار اور عمارتیں خام ہیں - ایک پرانے قلعہ کے کھنڈر بھی ہیں - جن کی نسبت مؤرخوں کا خیال ہے کہ سکندر اعظم کی فتوحات کی یادگار ہیں - اس شہر کے چاروں طرف ریگستان ہے اور اس میں ایک بہت بڑی جھیل کوسوں تک پھیلی ہوئی ہے - جس کو منچر کہتے ہیں +

سیہوان کی موجودہ شہرت کی وجہ لال شہباز قلندر ایک نامور بزرگ کا مقبرہ ہے - جس کی زیارت کو سندھ اور اطراف و جوانب کے لوگ دور دور سے آتے ہیں - یہ بزرگ ساتویں صدی ہجری میں گزرے ہیں - ان کے حالات ضمیمہ میں درج ہیں +

شکارپور

سیہوان سے میں شکارپور پہنچا - دونو مقامات میں ۲۱۵ میل کی مسافت ہے - جس زمانے میں ریاست بہاولپور اوج ترقی پر تھی - وہاں کے فرمانروا اس جگہ شکار کھیلا کرتے تھے - اسی مناسبت سے شکارپور اس کا نام مشہور ہوا خراسان کے جانے والے مسافر جو درہ بولان سے ہو کر جاتے تھے - یہ شہر

اُن کا گزر گاہ تھا - ابتدائے عملداری انگریزی میں کچھ مدت تک ضلع کا صدر مقام بھی رہا - مگر ریل کے اجرا سے جب سکھر کی آبادی بڑھنی شروع ہوئی تو صاحب کلکٹر کا دفتر یہاں سے سکھر کو منتقل ہو گیا - اسکی آبادی بروئے مردم شماری ۱۹۰۱ء تقریباً پچاس ہزار ہے +

اندرون شہر کی عمارتیں اکثر خام اور بازار تنگ ہیں - ایک بازار اوپر سے پٹا ہوا ہے جو آمد و رفت کرنے والوں کو دھوپ سے محفوظ رکھتا ہے - یہاں کے آثار قدیمہ کی یادگار صرف حاجی فقیر اللہ صاحب کا روضہ ہے جو قندھار کے رہنے والے تھے - آپ نے ۱۱۹۵ھ میں وفات پائی - حکیم میر علی نواز آپ کی یادگار اور طبابت و علمی قابلیت کی وجہ سے معزز اور مشہور ہیں +

اس شہر کو تجارت کی وجہ سے بڑی شہرت ہے - ہندو لوگ عموماً تجارت پیشہ ہیں - ان کی تجارت ایک طرف بخارا تک اور دوسری طرف یورپ تک پھیلی ہوئی ہے - مسلمان اکثر زراعت پیشہ - گھروں سے قدم باہر رکھنا اور ممالک بعیدہ کا سفر کرنا پسند نہیں کرتے +

گورنمنٹ کی طرف سے ایک ہائی سکول جاری ہے جس میں سکھر اور روہڑی تک کے لڑکے پڑھنے جاتے ہیں - میونسپل کمیٹی کے مصارف سے عربی اور سنسکرت کے دو مدرسے جیوبلی کی یادگار میں قائم ہیں - سکرٹری انجمن اسلامیہ نے ۱۹۰۵ء میں ہم سے بیان کیا کہ سولہ سال کے عرصے میں سولہ ہزار روپے خرچ ہونے پر ایک طالب علم نے بھی عربی زبان میں قابلیت نہیں پیدا کی - اس انجمن کے سکرٹری منشی علی بخش صاحب ایک بااخلاق - علم دوست اور مسافر نواز ہیں - انہوں نے اپنی قابلیت سے شکارپور میں اچھی عزت حاصل کی ہے - اور تمول کے لحاظ سے یہاں کے مشاہیر میں شمار ہوتے ہیں +

کوئٹہ (بلوچستان)

شکارپور سے ۲۱۰ میل طے کرنیکے بعد میں کوئٹہ پہنچا۔ پشاور کے بعد ہندوستان کی شمال مغربی سرحد پر یہ دوسرا شہر ہے جو پولٹیکل تعلقات کی وجہ سے بہت اہم سمجھا گیا ہے۔ کوئٹہ سے گورنمنٹ انگریزی کے ابتدائی تعلقات تو اُس وقت سے شروع ہوتے ہیں جبکہ گورنمنٹ نے ۱۸۳۹ء و ۱۸۴۲ء میں افغانستان پر یکے بعد دیگرے دو حملے کیئے مگر حاکمانہ حیثیت کی بنیاد سر رابرٹ سنڈمن کے مشن سے ۱۸۷۶ء میں پڑی جبکہ خان قلات نے پچیس ہزار روپے سالانہ کے عوض کوئٹہ اور اُس کے نواح کا انتظام ۹۹ سال کے واسطے سرکار انگریزی کی سپرد کیا۔ اب یہ شہر برٹش بلوچستان کا صدر مقام اور ایجنٹ گورنر جنرل کی جائے قیام ہے۔ اسکی آبادی ۱۹۰۱ء کی مردم شماری کے مطابق ۲۴ ہزار ۵۸۴ ہے جس میں بیرونجات کے ملازمت اور تجارت پیشہ بیشتر شامل ہیں +

کوئٹہ کی آبادی اکثر انگریزی وضع کی ہے۔ بازار سیدھے اور فراخ۔ سڑکیں مصفّا اور خوشنما۔ اس سے شمال کی طرف جیب نالہ ہے۔ جہاں سے چھاؤنی کی آبادی شروع ہوتی ہے اور تقریباً پندرہ مربع میل میں پھیلی ہوئی ہے۔ فوجیں اس کثرت سے یہاں رہتی ہیں کہ ہندوستان کے کسی دوسرے حصے میں نہ ہونگی۔ قلعہ بہت مضبوط اور بھاری بھاری توپوں سے مستحکم ہے۔ چھاؤنی میں انگریزی فوجی افسروں کو جنگی تعلیم دینے کے واسطے ایک سٹاف کالج ہے جس کی نظیر تمام برٹش انڈیا میں کہیں نہیں +

کوئٹہ کے نواح میں باغات بکثرت ہیں جن میں کئی قسم کے انگور سیب ۔۔۔

خربزے۔ انار اور بادام بافراط پیدا ہوتے ہیں۔ اور تمام ہندوستان میں تجارت کے طور پر جاتے ہیں۔ آب و ہوا کی عمدگی کی وجہ سے شمالی ہند کے لوگ تبدیل آب و ہوا کے واسطے موسم گرما میں یہاں آجاتے ہیں ٭

یہاں کے باشندے بیشتر زراعت پیشہ ہیں۔ دستکاریوں میں سے ریشمی سوزنی کام نہایت نفیس ہوتا ہے جو خاصکر بلوچوں کی ایک قوم (بروہی) کی عورتیں تیار کرتی ہیں۔ نمدے اور برتن بھی اچھے بنتے ہیں۔ تجارت کو خوب ترقی ہے۔ بیشتر سوداگر شکارپور و کراچی کے ہندو و بمبئی کے مسلمان و پارسی اور پشاور کے میوہ فروش ہیں ٭

تعلیم ابھی ابتدائی حالت میں ہے۔ گورنمنٹ کی طرف سے سنڈیمن ہائی سکول اور آریوں سکھوں۔ و پارسیوں کی طرف سے ایک ایک مدرسہ مڈل سکول تک ہے۔ انجمن اسلامیہ بھی ایک مدرسہ جاری کرنے اور ایک محمڈن ہال بنانے کے واسطے کوشش کر رہی ہے ٭

یہ شہر افغانستان اور ایران کی سڑکوں کا ناکہ ہے۔ ایک سڑک چمن سے ہوتی ہوئی قندھار کو اور دوسری نوشکی سے گزرتی ہوئی سیستان کو جاتی ہے۔ ان اطراف میں ریل کی سڑکیں دن بدن ترقی پر ہیں۔ ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں کی مسافت اور کرایہ حسب ذیل ہے :-

	مسافت	کرایہ درجہ سوم	کرایہ درجہ دوم
کراچی براہ رکھ	۵۳۶ میل	۶ روپے ۱۰ر	۱۸ روپے ۲ر
بمبئی براہ ماروار	۱۳۲۰ میل	۱۴ روپے ۱۴ر	۴۴ روپے ۴ر
دہلی براہ سماسٹہ	۸۵۰ میل	۸ روپے ۹ر	۲۵ روپے ۱۵ر
لاہور براہ روہڑی	۶۲۷ میل	۹ " ۲ر	۲۴ " ۲ر
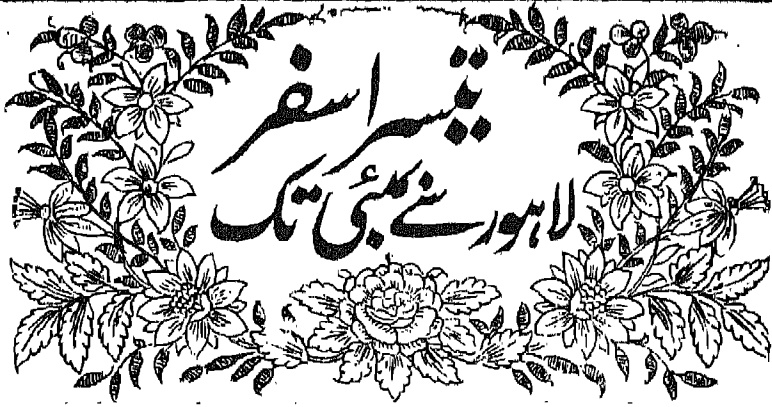
روانگی براہ تھانیسر - پانی پت - دہلی - متھرا -
آگرہ - دھولپور - گوالیر - بھوپال - برہانپور - بمبئی ۔

مذکورۂ بالا دس شہر ہندوستان کے چھ مختلف حصوں میں واقع ہیں - تھانیسر - پانی پت اور دہلی صوبۂ پنجاب میں ، متھرا و آگرہ ممالک متحدہ آگرہ واودھ میں ، دھولپور راجپوتانے میں ، گوالیر و بھوپال ایجنسی وسط ہند میں برہانپور ممالک متوسط میں اور بمبئی احاطۂ بمبئی میں - اجمالی تمہید ہر حصے کے متعلق اپنے اپنے موقع پر علیحدہ لکھی گئی ہے - یہاں اُس کے اعادہ کی ضرورت نہیں ۔

تھانیسر

میں لاہور سے انبالہ‡ ہوتا ہُوا تھانیسر پہنچا - لاہور یہاں سے ۲۱۰ میل اور دہلی ۷۸ میل ہے - یہ شہر اسٹیشن سے دو میل کے فاصلے پر دریائے سرستی کے کنارے پر آباد ہے - سرستی قدیم زمانے میں بہت بڑا دریا تھا - مگر اب ایک معمولی ندی ہے - قدیم آریا جب وسط ایشیا سے ہندوستان آئے تو انہوں نے اسی دریا کے کنارے اپنی چھاؤنی ڈالی اور یہیں سے اپنے مذہب کی اشاعت شروع کی تھی - گویا تھانیسر ہندوستان میں پہلا شہر ہے جہاں ہندو مذہب نے جنم لیا تھا - یہ شہر آریوں کی قوت اور شوکت کے زمانے

‡ انبالہ سے لاہور تک کے حالات صفحہ ۲۵ لغایت ۶۵ میں درج ہیں

ہیں کچھ مدت تک ہندوستان کی ایک سلطنت کا دارالحکومت مانا جاتا تھا۔ انقلاب زمانے سے سلطنتی تعلقات اگرچہ قطعاً زائل ہو گئے۔ مگر مذہبی حیثیت سے اب تک مقدس مانا جاتا ہے اور ہندوستان کے تمام ہندوؤں کا زیارتگاہ ہے۔ اسلامی تاریخ میں سب سے اوّل تھانیسر کا ذکر غالباً پانچویں صدی ہجری کے شروع میں ملتا ہے جبکہ سلطان محمود غزنوی نے ۴۰۲ھ ۱۰۱۱ء میں اس پر حملہ کیا تھا۔

شہر کی عمارتیں پرانی اور اکثر جگہ کھنڈر ہیں۔ ایک سرے سے دوسرے سرے تک کوئی عالیشان عمارت میری نظر سے نہیں گزری۔ خاتمہ شہر پر اسلامی عمارتوں میں سے شاہی زمانے کی ایک کرسی دار مسجد اور شیخ چلی کا سہ منزلہ مقبرہ سیاحوں کے دیکھنے کے لائق ہے۔ یہ مقبرہ شہنشاہ اکبر کے عہد کا بنا ہؤا ہے۔ گنبد ہشت پہلو اور اس پر سنگ سفید کا کام بہت لطافت اور عمدگی سے کیا ہؤا ہے۔ اس وقت دوسری منزل کے مکانات مدرسہ اور بورڈنگ ہؤس کے کام آتے ہیں۔ شیخ چلی کا اصل نام عبدالرزّاق ہے مگر کثرت سے چلہ کشی کرنے کے باعث ان کا نام شیخ چلی مشہور ہو گیا۔ عام لوگوں میں ان کے بھولے پن کی جو کہانیاں اور چٹکلے مشہور ہیں۔ وہ سب یاران مجلس کے تراشے ہوئے ہیں ❖

مقبرے کے مغرب اور بستی کے جنوب کی طرف مسلمانوں کی ایک مختصر سی آبادی محلہ کوٹ کے نام سے مشہور ہے۔ آبادی کا یہ حصہ ایک ٹیکری پر ہے۔ جو انواع و اقسام کے درختوں کے اُگنے سے جنگل نما بن گیا ہے۔ شاہی زمانے کے قلعہ اور عمارتوں کے کھنڈروں سے معلوم ہوتا ہے کہ سلاطین کے عہد میں آبادی کا میلان اسی طرف تھا۔ یہاں شیخ جلال الدین تھانیسری کا روضہ اور اس کے ساتھ ایک مسجد بنی ہوئی ہے۔ شیخ صاحب

کا انتقال ۹۷۹ھ / ۱۵۷۱ء میں ہؤا تھا۔ مسلمانوں کی تعداد بہت کم اور دنیاوی عزت وعلمی قابلیت کے لحاظ سے ان کی حالت نہایت پست ہے +

ہندؤں کا مقدس تالاب (کُلچھیتر) جس میں یہ لوگ غسل کرنا باعث ثواب سمجھتے ہیں۔ بیرون شہر ریلوے اسٹیشن سے تقریباً ایک میل کے فاصلے پر ہے۔ اس کا طول ایک میل اور عرض چوتھائی میل کے قریب ہے۔ اس کی شمالی جانب مسلسل گھاٹ بنے ہوئے ہیں۔ ہندوستان کے مختلف حصوں کے لوگ صدہا میل کی مسافت طے کرکے وقتاً فوقتاً غسل کرنے کے واسطے یہاں آتے رہتے ہیں۔ وسط تالاب میں ایک محرابدار پل آمدورفت کے واسطے بنا ہؤا ہے۔ اور اس کے کنارے پر ایک بڑا مندر ہے۔ گھاٹوں کے اطراف وجوانب میں مختلف زمانوں کے تعمیر شدہ خوشنما مندر ہیں۔ زائرین کو یہاں بہت آرام ملتا ہے +

اس تیرتھ کی عظمت کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ ۶۔ اپریل ۱۸۹۴ء کو سورج گرہن کے موقع پر جو مجمع ہؤا سرکاری تخمینہ کے موافق زائرین کی تعداد ساڑھے سات لاکھ تھی۔ یہ کثرت صرف ریل کے اجرا سے ہوئی ہے۔ اسٹیشن کے باہر مسافروں کو ٹکٹ تقسیم کرنے کے واسطے متعدد ٹکٹ گھر اور ریل پر سوار کرانے کے واسطے متعدد احاطے بنے ہوئے ہیں۔ تاکہ زائرین کے ہجوم سے دقّت نہ ہو +

تھانیسر کے گردونواح میں ایک قطعہ زمین نتر میل لمبا اور بیس میل چوڑا ہے جو سب کا سب ہندؤں کے نزدیک مقدس اور قابل زیارت ہے۔ کہتے ہیں کہ اس میں ۳۶۵ مندر بنے ہوئے ہیں۔ ان میں سے تھانیسر اور پہوا خصوصیت کے مقام ہیں۔ اور دونوں میں تقریباً بیس میل

کا فاصلہ ہے۔ کوروں اور پانڈؤں کا عظیم الشان محاربہ جس کی تفاصیل سے مہابھارت پُر ہے۔ اسی سرزمین میں ہوُا تھا۔ ہندوؤں کا اعتقاد ہے کہ جو شخص اس قطعہ زمین میں مرے وہ سرگباشی ہے +

پانی پت

تھانیسر سے ۴۲ میل طے کرنے کے بعد میں پانی پت پہنچا۔ لاہور یہاں سے ۲۵۲ میل اور دہلی ۵۳ میل ہے۔ راستے میں تراوڑی اور کرنال جیسے تاریخی مقامات سے گزرنے کا اتفاق ہوُا۔ پانی پت دریائے جمنا کے قدیمی کنارے پر بہت پُرانا شہر۔ اور پانڈوں وکوروں کے وقت سے پہلے کا آباد ہے۔ شاہان اسلام کے زمانے میں تین[1] معرکۃ الآرا لڑائیاں جن سے تین مرتبہ ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ ہوُا۔ اسی شہر کے میدانوں

---

[1] اِن لڑائیوں کا مختصر بیان یہ ہے۔ پہلی لڑائی ۹۳۲ھ / ۱۵۲۶ء میں ہوئی تھی۔ اس میں سلطان بابر نے ابراہیم لودھی شاہ ہند کو اپنی تھوڑی سی جمعیت کے ساتھ شکست دی۔ اس فتحیابی سے مغلوں کی سلطنت کی بنیاد ہندوستان میں قائم ہوگئی +

دوسری لڑائی ۹۶۴ھ / ۱۵۵۶ء میں ہوئی اس میں اکبر بادشاہ نے عادل شاہ سوری کے سپہ سالار ہیموں بقّال کی کثیر التعداد فوج کو شکست دے کر سلطنت مغلیہ کو مستحکم کیا +

تیسری لڑائی ۱۱۷۴ھ / ۱۷۶۱ء میں ہوئی۔ اس عظیم الشان جنگ میں ایک طرف احمد شاہ دُرّانی اور دوسری طرف شیوداس بہاؤ۔ سندھیا اور ہُلکر تین بڑے بڑے مرہٹے والیان ریاست تھے۔ مرہٹوں کی فوج کا شمار اگرچہ دو لاکھ سے زیادہ اور دُرّانی کے لشکر کا تخمینہ ایک لاکھ سے کم تھا۔ مگر احمد شاہ نے مرہٹوں کو ایسی شکست دی۔ جس سے ان کی جمعیت کا شیرازہ بکھر گیا۔ اور تمام ہندوستان پر سلطنت کرنے کی جو امید اُنہیں لگ رہی تھی۔ بالکل ٹوٹ گئی + مؤلف

میں واقع ہوئی تھیں - بابر بادشاہ کی ایک عالیشان مسجد جو بیرون شہر بنی ہوئی ہے - سب سے پہلی لڑائی کی یادگار ہے +

شہر کی آبادی مختصر اور عمارتیں سب پختہ ہیں - وسط شہر میں شاہ شرف الدین بوعلی قلندر کا روضہ مرجع عام وخاص اور بہت عمدہ عمارت کا بنا ہوا ہے - سنگ کسوٹی کے آٹھ ستون جن پر روضہ کی چھت قائم ہے - شمالی ہند کی عمارتوں میں خصوصیت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں - عمارات قدیمہ سے مسمار شدہ قلعہ کے کھنڈر ایک ٹیکری پر اب تک باقی ہیں - اس پر چڑھنے سے شہر اور نواح کا نظارہ بہت اچھا معلوم ہوتا ہے - اس وقت ٹیکری پر پولیس سٹیشن - مدرسہ اور لائبریری موجود ہے - ریل کے اجراء سے آبادی اور تجارت دن بدن ترقی پر ہے - پیتل کے برتن اس جگہ عمدہ بنتے ہیں - قلم تراش - قینچی اور سروتے بھی خوبصورت ہوتے ہیں +

اسلامی علوم و فنون کا چرچا گزشتہ صدی تک اس جگہ بہت ترقی پر تھا - خاصکر فن تجوید (علم قراءت) کے لحاظ سے شمالی ہند میں اسکی بڑی شہرت تھی - اب بھی اس کا بقیہ کم و بیش موجود ہے - یہاں کے باشندوں میں سے شمس العلما خواجہ الطاف حسین صاحب حالی ہندوستان کے مشاہیر شعرا اور نامور مصنفین میں سے ہیں - ہندوستان کی اُردو خواں جماعت میں بہت تھوڑے ایسے اشخاص ہونگے جن کی نظر سے "مسدس حالی" نہ گزرا ہو - یہاں کے باشندے قدیم خاندانوں کی یادگار - مذہبی امور میں بہت راسخ الاعتقاد اور انگریزی تعلیم کی طرف فی الجملہ کم راغب ہیں +

اس شہر میں بزرگان دین کے چند ایسے مقبرے ہیں کہ اطراف و جوانب کے مسلمان اوقات مقررہ پر ان کی زیارت کو آتے رہتے ہیں - سب سے پہلے

بزرگوار حضرت امام بدرالدین ہیں جن کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہ امام زین العابدین کے پوتے اور اسلام کی اشاعت کرتے کرتے یہیں شہید ہوئے تھے۔ ان کی قبر کا موقع شہر کی مغربی جانب شہیدوں کی بلندی کے نام سے مشہور ہے۔

ساتویں صدی ہجری کے مشاہیر صوفیائے میں سے شاہ شرف الدین بوعلی قلندر اور شیخ شمس الدین ترک ہیں۔ انہی کے ہمعصر خواجہ ملک علی انصاری حضرت عبداللہ انصاری کی اولاد سے ایک فاضل اجل ہوئے ہیں۔ ان کے بعد شیخ جلال الدین کبیر الاولیا اور دیگر متعدد بزرگوار باکمال گزرے ہیں۔ تیرھویں صدی ہجری کے شروع میں قاضی ثناءاللہ صاحب نے علما میں اور خاتمہ صدی پر سید غوث علی شاہ صاحب نے فقرا میں بڑا فروغ پایا۔ شاہ شرف بوعلی قلندر۔ شیخ شمس الدین ترک اور شیخ جلال الدین کے حالات ضمیمہ میں درج ہیں +

میں نواب شکور احمد خاں صاحب انصاری کی مہربانی اور مہمان نوازی کا ممنون ہوں کہ ان کے ذریعے شہر کی سیر اور تاریخی حالات دریافت کرنے کا اچھا موقع ملا۔ نواب صاحب۔ خواجہ ملک علی انصاری کی اولاد سے ہیں +

دہلی (شاہ جہان آباد)

پانی پت سے روانہ ہو کر ۵۴ میل طے کرنے کے بعد میں دہلی پہنچا۔ لاہور یہاں سے براہ انبالہ ۲۹۷ میل ہے۔ یہ شہر دریائے جمنا کے کنارے پر آباد اور ہندوستان کے نامور بادشاہ شاہجہاں کی یادگار ہے۔ اصل میں اس کا نام اپنے بانی کے نام پر شاہ جہان آباد تھا۔[1] پرانی دہلی جو ساڑھے

[1] پرانی دہلی کے مفصل حالات صفحہ ۱۲۳ پر درج ہیں +

چارسو برس تک وسط ایشیا کے حملہ آور سلاطین اسلام کا پایہ تخت رہی ہے۔ اگرچہ اُس نئے شہر کے دارالخلافہ ہو جانے سے رفتہ رفتہ کس مپرسی کی حالت کو پہنچ گئی تھی۔ مگر اُس کی شہرت دیرینہ کے باعث شاہجہاں آباد بھی دہلی ہی کہلایا۔ اس شہر کو ایک عرصہ دراز تک پایہ تخت رہنے سے علم و فضل۔ حرفت و صنعت۔ تجارت و تمدن اور عمارت کی عمدگی و دلفریبی سے وہ رونق حاصل ہوئی کہ ہندوستان بھر میں سب سے اوّل درجے کا شہر مانا جاتا تھا۔ اگرچہ انقلابات زمانے سے وہ خوبی جاتی رہی۔ مگر پھر بھی شاہجہاں کے عہد کی چند ایسی شاندار اور عجوبۂ روزگار عمارتیں اب تک باقی ہیں جو اپنی شان و شوکت سے آج تک سیاحانِ عالم کا مرجع بنی ہوئی ہیں۔ یورپ و امریکہ غرض دنیا کے کسی حصے سے کوئی سیاح ہندوستان میں آئے ممکن نہیں کہ دہلی کی سیر کئے بغیر واپس جائے۔ شاہی زمانے میں یہ شہر تمام ہندوستان کا پایہ تخت اور صوبہ[1] دہلی کا صدر مقام تھا۔ مگر اس وقت حکام سول کا صدر مقام ہے۔ اس کی آبادی ۱۹۰۱ء کی مردم شماری کے مطابق ۲ لاکھ ۸ ہزار ۵۷۵ ہے +

مسجد فتحپوری - ریلوے اسٹیشن سے شہر کو جاتے ہوئے اول احمد پائی کی سرائے اُس کے بعد فتحپوری کی عظیم الشان مسجد آتی ہے۔ سرائے اور مسجد کے چوک میں کئی دیسی ہوٹل ہیں۔ یہ مسجد شاہجہاں کی پیاری بیوی فتحپوری بیگم کی تعمیر کرائی ہوئی ہے۔ اس کے اطراف میں دُکانیں اور بالاخانے اس کثرت سے ہیں کہ اُن کی آمدنی تقریباً پانسو روپے ماہوار ہے۔ یہاں سے ایک سیدھا بازار قلعہ کے لاہوری دروازے تک چالیس گز چوڑا اور تقریباً ایک میل لمبا چلا گیا ہے۔ جس میں ایک مسقّف نہر

[1] شاہی زمانے میں صوبہ شاہجہاں آباد کے متعلق بڑے بڑے شہر یہ تھے۔ شاہجہاں آباد۔ پانی پت۔ تھانیسر۔ سرہند۔ حصار۔ فیروزہ۔ نارنول۔ ریواڑی۔ سہارنپور۔ سنبھل اور بدایوں +

بھی بہہ رہی ہے۔ اس کے دو رویہ درختوں کی قطار کچھ دور تک اپنا حسن دکھاتی ہے۔ میں نے اپنے طولانی سفر میں اس قسم کا بازار ہندوستان کے کسی شہر میں نہیں دیکھا۔ البتہ فرانس کے بعض شہروں میں ایسے بازار میری نظر سے گزرے ہیں +

چاندنی چوک

بازار کے پہلے حصے کا نام چاندنی چوک ہے۔ اس کے دونو جانب دو منزلہ دُکانیں بہت خوشنما وضع بنی ہوئی ہیں جن میں انواع و اقسام کا دیسی اور انگریزی مال فروخت ہوتا ہے۔ نہر کی پٹڑی پر ہر قسم کے میوہ جات مختلف اقسام کی بقولات اور اور کئی طرح کی چیزیں بکتی ہیں۔ بازار کے دائیں ہاتھ بلّی ماروں کا کوچہ ہے جس میں دہلی کے نامور طبیب حکیم محمود خاں صاحب مرحوم کے مکانات ہیں۔ بائیں جانب نیل کا کٹرہ ہے جس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ اس کے اکثر باشندے لکھ پتی ہیں۔ اسی بازار میں گھنٹہ گھر کی عمارت ہے۔ اس کے دائیں ہاتھ کو نو تعمیر بازار ہے۔ جسے نئی سڑک کہتے ہیں۔ یہ بازار غدر کے بعد بنایا گیا ہے۔ بائیں ہاتھ کو ملکہ کا آہنی بُت اور ٹون ہال ہے یہ عمارت شاہی باغ میں واقع ہے۔ باغ میں نہر ہونے سے ہر وقت سبزی رہتی ہے۔ اکثر لوگ صبح و شام سیر کے واسطے یہاں چلے آتے ہیں۔ چاندنی چوک کی اسی سڑک پر تھوڑی دور آگے چل کر دائیں جانب نواب روشن الدولہ ظفر خاں کی سُنہری مسجد ہے جو باوجود مختصر ہونے کے بہت خوشنما ہے۔ مسجد کے ساتھ کوتوالی اور اسی سمت میں سکھوں کا ایک گُردوارہ ہے۔ جس کو ڈیرہ گُرو تیغ بہادر کہتے ہیں۔ سکھوں کا نواں گُرو تیغ بہادر اسی جگہ ۱۰۸۶ھ ۱۶۷۵ء میں بحکم شہنشاہ عالمگیر مارا گیا تھا۔ اس عمارت کا ایک حصہ پہلے مسجد تھی جو غدر ۱۸۵۷ء میں سکھوں کو مل گئی۔ اور انہوں نے ڈیرے میں ملاکر

جامع مسجد ۔ دہلی
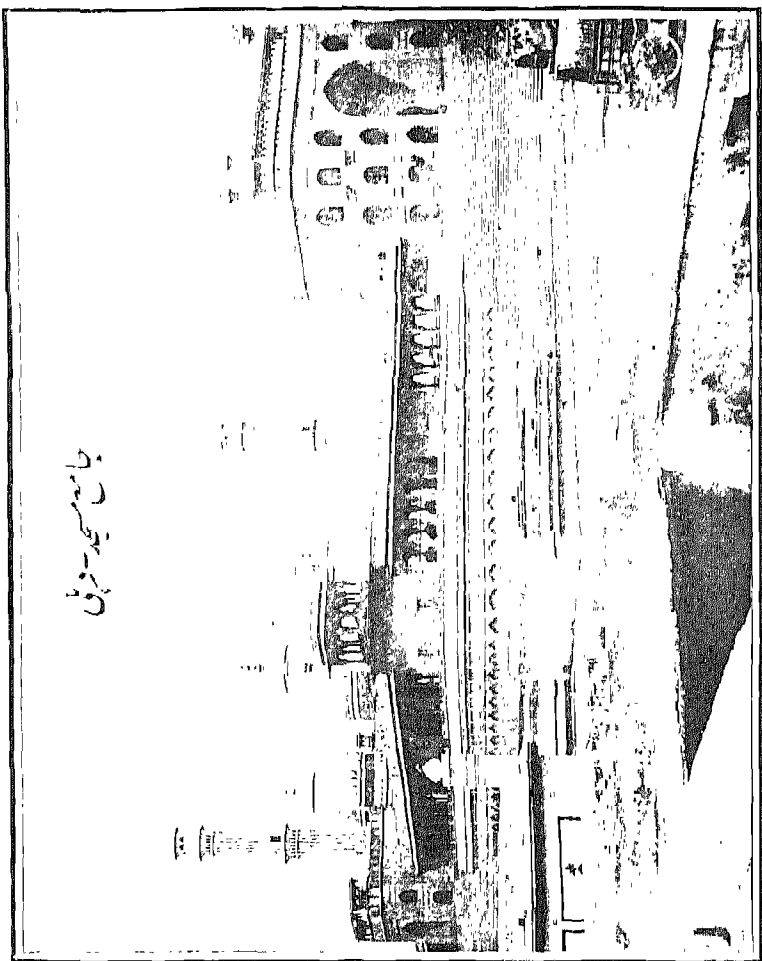
گردوارہ کی عمارت کو بڑھا لیا۔ کوتوالی کے محاذ ایک بہت بڑا فوارہ چوک
میں بنا ہوا ہے جو غالباً لارڈ نارتھ بروک کی یادگار ہے۔ اس سے آگے قلعہ
تک باقی حصہ کو اُردو بازار کہتے ہیں۔ اس بازار میں تھوڑی دور آگے چل کر
دائیں جانب دریبہ کا دروازہ آتا ہے جس کا نام خونی دروازہ مشہور ہے۔ اس
دروازہ سے ایک تنگ مگر لمبا بازار نکلتا ہے جس میں حلوائیوں۔ کتب فروشوں
ٹوپی بیچنے والوں۔ نقرئی سامان اور ہاتھی دانت کی چیزوں کی دکانیں ہیں۔ اس
کا خاتمہ ہسپتال کے چوک پر ہوتا ہے جس جگہ سے جامع مسجد کی عمارت
شروع ہو جاتی ہے ۔

جامع مسجد

جامع مسجد۔ وسط شہر میں یہ عظیم الشان جامع مسجد شاہجہاں کی یادگار ہے۔
اس کا فرش سطح زمین سے اس قدر اونچا ہے کہ پتھر کی بہت سی سیڑھیاں چڑھ کر
مسجد میں داخل ہوتے ہیں۔ آمد و رفت کے لیے تین دروازے ہیں۔ جن میں
سے جنوبی دروازہ کی ۳۳ سیڑھیاں۔ شمالی کی ۳۹ اور مشرقی کی ۳۵ ہیں۔ مسجد
کا صحن ۹۰ گز لمبا اور ۳۰ گز چوڑا ہے۔ وسط میں سنگ مرمر کا ایک حوض ہے
صحن کے تین طرف خوشنما دالان اور چار کونوں پر چار برج اور نفس مسجد میں گیارہ در
ہیں۔ بیچ کے در کی پیشانی پر یا ہادی بخط طغرا لکھا ہے۔ اور باقی دروں
پر بادشاہ کے نام کا کتبہ۔ تاریخ تعمیر اور زر مصارف کھدا ہوا ہے۔ سنگ سرخ
میں جابجا سنگ مرمر کی دھاریاں اور سنگ موسیٰ کی بہت نفیس پچی کاری کی
ہوئی ہے۔ یہ مسجد کسی ایسے لائق مہندس نے بنائی ہے کہ اس کا کوئی در و
دیوار۔ طاق و محراب۔ مرغول و کنگرہ تناسب سے خالی نہیں۔ ایسی وسیع اور
خوش قطع مسجد اس تناسب اجزا کے ساتھ ہندوستان بھر میں دوسری جگہ کہیں
نہیں مؤرخوں نے لکھا ہے کہ زمانہ تعمیر میں پانچ ہزار راج مزدور۔ بیلدار اور

سنگتراش ہر روز کام کرتے تھے۔ باوجود اس اہتمام کے چھ برس کے عرصے میں دس لاکھ روپیہ خرچ ہو کر یہ مسجد تیار ہوئی +

شاہی زمانے میں مسجد کے مصارف سلطنت کی طرف سے ادا ہوتے تھے۔ غدر ۱۸۵۷ء کے بعد گورنمنٹ انگریزی نے اس پر قبضہ کر لیا تھا۔ مگر ۱۸۶۲ء میں مسلمانوں کی استدعا سے یہ واگزار ہوئی۔ اب اس کے مصارف کو گورنمنٹ سے کچھ تعلق نہیں۔ مسجد کے ماتحت دکانوں کے کرائے اور چوک کی تہ بازاری کی آمدنیاں مل کر دو سو روپے کی رقم ہو جاتی ہے۔ اور بھی کئی قسم کے عطیات باہر سے آتے رہتے ہیں جن سے مسجد کے مصارف چلتے ہیں۔ امام مسجد کو دو سو روپے ماہوار گورنمنٹ نظام سے اور کچھ کچھ وظیفہ ریاست بھوپال و رام پور سے بھی ملتا ہے۔ غرض مسجد کی حالت بہت تسلی بخش ہے نمازی کثرت سے آتے ہیں۔ خصوصاً جمعۃ الوداع اور عیدین کی نمازوں میں دور دور کے لوگ شریک ہوتے ہیں +

مرور زمانہ سے مسجد میں فرسودگی کے آثار نمودار ہونے شروع ہو گئے تھے۔ نواب کلب علی خاں مرحوم و مغفور والئے ریاست رام پور کا خدا بھلا کرے کہ اُنہوں نے انجمن اسلامیہ دہلی کی درخواست پر ڈیڑھ لاکھ روپے عطا کئے۔ جن سے مسجد کی مرمت ایسی عمدہ ہو گئی ہے کہ مدت دراز تک اس کی آب و تاب بدستور قائم رہیگی +

گزری — تیسرے پہر مسجد کی سیڑھیوں کے گرد ایک عام مجمع ہوتا ہے۔ ایک طرف کی سیڑھیوں پر مختلف قسم کا سودا سلف اور پرندے بکتے ہیں۔ دوسری طرف کی سیڑھیوں پر کئی قسم کے تماشے اور قصہ خوانی ہوتی ہے اور تیسری طرف انواع و اقسام کے کپڑے فروخت ہوتے ہیں۔ شہر کے لوگ

کچھ خرید و فروخت اور کچھ تفریح طبع کی غرض سے سرِشام یہاں روز جمع ہوتے ہیں اور اسی کو گزری بازار کہتے ہیں۔ اُستاد ذوق نے ایک جگہ کہا ہے ؎

دن ڈھلتے ہی ہوتا ہے تماشا گزری کا

مسجد کے مشرقی جانب ایک بہت بڑا بھاری میدان ہے۔ جس میں حضرت کلیم اللہ شاہ صاحب جہاں آبادی کی خانقاہ ہے۔ شاہی زمانے میں خانم کا بازار۔ خاص بازار اور کئی محلے اس جگہ آباد تھے۔ مگر ایام غدر میں یہ سب برباد ہو کر میدان بن گیا +

شاہ سرمد

شاہ سرمد۔ جامع مسجد کے مشرقی دروازہ کے قریب شاہ سرمد کی قبر ایک چار دیواری کے اندر ہے۔ یہاں ہر جمعرات کو خوب ہجوم ہوتا ہے۔ بسنت کا میلہ بڑی دھوم دھام سے لگتا ہے۔ سرمد ۱۰۷۰ھ مطابق ۱۶۵۹ء میں شہنشاہ عالمگیر کے حکم سے قتل کیا گیا تھا۔ مفصل حالات ضمیمہ میں مذکور ہیں +

مسجد کی جنوبی جانب ایک چوک ہے جس میں سے ایک راستہ چتلی قبر کو اور چوک سے ذرا اوپر ہو کر دوسرا راستہ چاوڑی بازار کو جاتا ہے۔ چتلی قبر میں نقشبندی خاندان کی ایک مشہور گدّی ہے +

لال قلعہ

لال قلعہ۔ مسجد کے مشرقی دروازہ کے سامنے دریائے جمنا کے کنارے لال قلعہ واقع ہے۔ جسے کسی زمانے میں قلعۂ معلےٰ کہتے تھے۔ یہ قلعہ بھی شاہجہاں کی یادگار ہے۔ اس کی شکل ہشت پہلو اور عمارت بالکل سنگ سُرخ کی ہے۔ طول ایک ہزار گز عرض چھ سو گز اور بلندی ۲۵ گز ہے۔ اس کے گرد ایک خندق ۲۴ گز چوڑی اور دس گز گہری بنی ہوئی ہے۔ جس کا محیط تین ہزار چھ سو گز ہے۔ خندق کے کنارے کنارے ایک چھوٹی سی نہر جاری ہے۔ جس کا پانی فیض بازار سے نکل کر جمنا میں جا گرتا ہے۔ قلعہ

کے لاہوری دروازہ سے ہو کر اندر جانے میں سب سے پہلے ایک لمبی سڑک سے گزر ہوتا ہے۔ جس پر لداؤ کی چھت بنی ہوئی ہے۔ اس سڑک پر سودا سلف بیچنے والوں کی چند دکانیں ہیں۔ پھر میدان میں شاہی عمارتیں دکھائی دیتی ہیں۔ جس میں نقار خانہ۔ دیوان عام۔ نشیمن ظل الٰہی۔ دیوان خاص۔ حمام اور موتی مسجد قابل دید ہیں۔ ڈاکٹر برنیر فرانسیسی سیاح جس نے عالمگیر کے عہد میں قلعہ کو بارہا دیکھا تھا۔ لکھتا ہے کہ اس زمانے میں شاہی محلسرا اور بہت عمدہ عمدہ نفیس عمارتیں۔ امیروں۔ فوجی عہدہ داروں۔ مختلف قسم کے پیشہ وروں اور نوکروں چاکروں کے لئے موجود تھیں۔ شاہی محلوں میں نہریں چلتی تھیں۔ متعدد باغ لگے ہوئے تھے۔ مگر اس وقت ان عمارتوں کا بہت سا حصہ ملیا میٹ ہو چکا ہے۔ نہریں پٹ گئیں۔ باغ اجڑ گئے۔ عمارتیں منہدم ہو گئیں۔ جدھر دیکھو فوجی گوروں اور انگریزوں کے رہنے کی بارکیں بنی ہوئی ہیں۔ نہروں۔ فواروں اور سرسبز باغوں کے عوض کھلا میدان نظر آتا ہے۔ مؤرخوں نے لکھا ہے کہ یہ عالیشان قلعہ اور اس کی بے نظیر عمارتیں ایک کروڑ روپے کی لاگت سے ۹ سال میں تیار ہوئی تھیں۔ جس میں سے نصف روپیہ قلعہ کے بننے میں اور نصف عمارتوں کی تعمیر میں صرف ہوا تھا۔

دیوان خاص

عمارت کی حالت میں اگرچہ صد درجہ کی کایا پلٹ ہو گئی ہے۔ مگر پھر بھی دیوان خاص کی عمارت کچھ ایسی خوش وضع اور عمارتی خوبیوں کے لحاظ سے ایسی عمدہ ہے کہ اس وقت تک دنیا میں ایک اعلےٰ درجہ کی عمارت خیال کی جاتی ہے۔ یہ عمارت نشیمن ظل الٰہی اور حمام کے درمیان فصیل قلعہ سے پیوستہ ہے۔ اور دریائے جمنا اس کے نیچے بہتا ہے۔ دیوان خاص کے در و دیوار۔ ستون۔ مرغول۔ محراب اور فرش سب سنگ مرمر کے بنے ہوئے

دیوان خاص (اندرون قلعہ) — دہلی
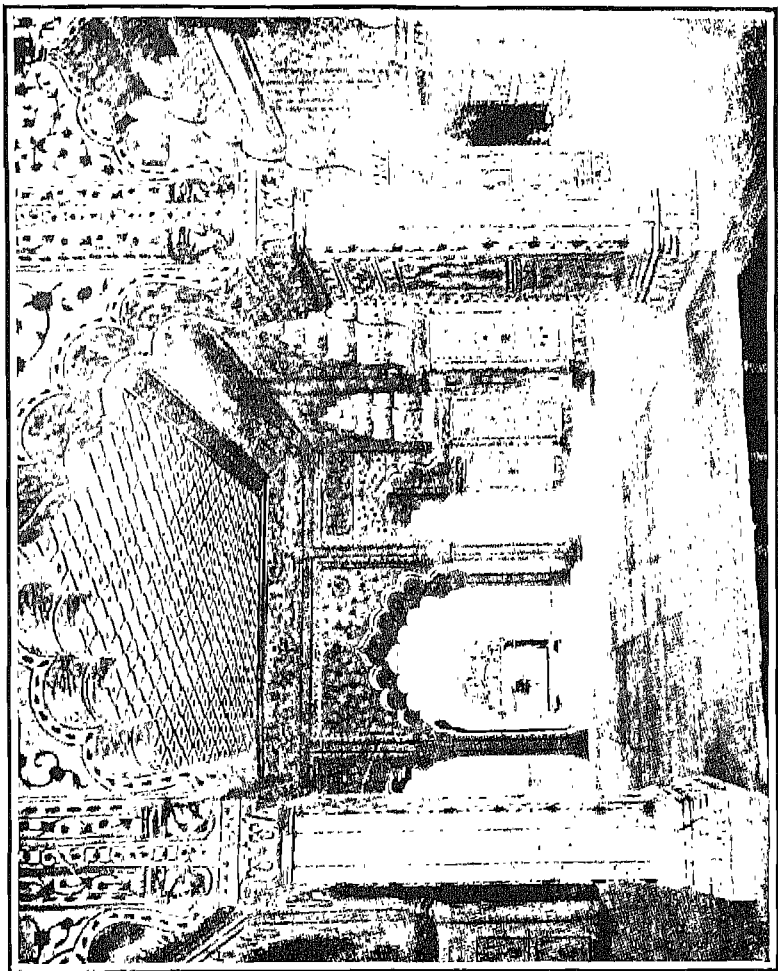
ہیں - اجارہ تک عقیق مرجان اور احجار بیش قیمت سے پچی کاری کی ہوئی ہے اور بیل بوٹے پھول پتے ایسے بنائے ہیں کہ ان کے دیکھنے سے شان الٰہی یاد آتی ہے - اجارہ سے اوپر چھت تک طلائی کام کیا ہوا ہے - اندر کی محرابوں کے اوپر سونے کے پانی سے یہ شعر تحریر ہے ؎

اگر فردوس بر روئے زمین است　　ہمین ست و ہمین ست و ہمین ست

مغلیہ سلطنت کے ضعف کے زمانے میں مرہٹوں اور جاٹوں نے اس کی چھت کو جو نہایت اعلےٰ درجہ کی تھی - اکھاڑ دیا - گزشتہ صدی میں گورنمنٹ انگریزی نے لکڑی کی طلاکار چھت لگا کر اس عیب کو چھپا دیا ہے ؀

موتی مسجد

حمّام کے پیچھے موتی مسجد ہے جو سر سے پاؤں تک سنگ مرمر کی بنی ہوئی ہے - اس پر منبّت کاری اور گل بوٹے - بیل پتے ایسے نفیس بنائے ہیں کہ قلعہ کی تمام عمارتوں میں اس کی نظیر نہیں - یہ عمارت شہنشاہ اورنگ زیب کے حکم سے تعمیر ہوئی تھی - عاقل خاں نے اس کا مادہ تاریخ آیت قرآنی سے یہ نکالا ہے - اِنَّ الْمَسَاجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا ؀

فصیل

فصیل - شہر کے گرداگرد پانچ چھ میل لمبی شہر پناہ بنی ہوئی ہے جو چار گز چوڑی اور ۹ گز اونچی ہے - اس میں سو سو قدم کے فاصلہ پر دشمن کی فوج سے مقابلہ کرنے کے واسطے ۲۷ گرگچ بنے ہوئے ہیں - شہر پناہ کے نیچے خندق کھدی ہوئی ہے - اس وقت ریل فصیل کے اندر سے ہو کر گزرتی ہے - اور اس وجہ سے فصیل کا سلسلہ کہیں کہیں سے ٹوٹ گیا ہے - مجھے ہندوستان کی تمام سیاحت میں اس قسم کی شہر پناہ دیکھنے کا موقع نہیں ملا - البتہ عراق عرب میں دریائے دجلہ کے کنارے پر شہر موصل کی فصیل اسی وضع کی اور دہلی کی فصیل سے زیادہ بلند اور مستحکم ہے - اگرچہ افسوس ہے کہ زمانہ کی دست برد سے وہ بھی معرض خطر

میں ہے ✤

شاہی درباروں کا مرکز

شاہی درباروں کا مرکز - اٹھارھویں صدی عیسوی میں سلطنت مغلیہ کے ضعف اور رفتہ رفتہ زوال پذیر ہونے سے دہلی کو بڑے بڑے حادثات کا مقابلہ کرنا پڑا۔ نادرشاہی قتل عام - مرہٹوں - جاٹوں اور رُہیلوں کی دستبرد سے تو اس شہر کو اُجڑے دیار کا لقب ملا تھا - مگر غدر ۱۸۵۷ء کی بادِ صرصر نے مغلیہ خاندان کا نام ونشان مٹانے کے ساتھ امرا وعلما و باکمال لوگوں کا بھی ستیاناس کر دیا۔ اور گورنمنٹ نے دہلی کو غدر کا مرکز ہونے کے باعث تحصیر پنجاب کے ماتحت قرار دیا - اگرچہ اس وقت دہلی صدارت کی سب خصوصیتیں کھو چکا ہے - تاہم موقع کی عمدگی اور سلاطین اسلام کا دیر تک دارالحکومت رہنے سے یہ عزت اس کو اب تک حاصل ہے کہ برٹش گورنمنٹ کی طرف سے ملکہ معظمہ کے خطاب قیصرہ ہند کے اعلان کرنے پر ۱۸۷۷ء میں اور ملک معظم کی تقریب تاجپوشی پر ۱۹۰۳ء میں جو دربار ہوئے - وہ دہلی ہی میں منعقد ہوئے تھے - آخری دربار میں سیاحتی خصوصیت کے باعث گورنمنٹ کی مہربانی سے مجھے بھی شریک ہونے کا موقع ملا تھا - حاضرین دربار کی تعداد بارہ ہزار تھی جس میں ہندوستان کے تمام حصوں کے یورپین حکام - والیان ریاست غیر ممالک کے سفیر اور یورپ و امریکہ سے آئے ہوئے بیسنکڑوں مہمان شریک تھے - والیان ملک کے ساتھ ہیرو نگاہ کی یہ کثرت تھی کہ کیمپ میں ڈیروں - خیموں کا پھیلاؤ پندرہ بیس میل کے اندر تھا - لارڈ کرزن گورنر جنرل کشور ہند کے حسن انتظام سے اس دربار کو وہ عظمت و رونق حاصل ہوئی کہ انگریزی عہد حکومت میں اس شان وشوکت کا دربار غالباً کبھی نہیں ہوا ہوگا - اس کے حالات پر انگریزی اور اُردو زبان میں متعدد کتابیں شائع ہو چکی ہیں ✤

باکمال لوگ

باکمال لوگ - یہ شہر سلاطین کی قدردانی سے ایک مدت تک علمائے کرام - صوفیائے عظام - اطبّا - شعرا اور ہر قسم کے باکمالوں کا مجمع تھا - غدر سے پیشتر جو باکمال دلّی میں موجود تھے - ان میں سے مولانا شاہ احمد سعید و مولانا شاہ عبد الغنی عرفانِ خداشناسی میں یگانۂ روزگار - حکیم احسن اللہ خاں اور حکیم غلام نجف خاں مسیحائے عصر - مفتی صدر الدین خاں بہادر معقول و منقول کے عالم متبحر اور دہلی کے صدر الصدور تھے - مرزا غالب - شیخ ابراہیم ذوق - مومن خاں اور نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ نے اُردو شعر و سخن میں جو شہرت حاصل کی - وہ کسی مزید تعریف کی محتاج نہیں - گزشتہ صدی کے آخری حصہ میں علما میں سے مولوی سید نذیر حسین مرحوم فن حدیث میں؛ حاذق الملک حکیم عبد المجید خاں مرحوم و حاذق الملک حکیم حافظ محمد اجمل خاں فن طبابت میں؛ مولانا مولوی عبد الحق مصنف تفسیر حقانی علوم عقلیہ و نقلیہ میں؛ شمس العلما مولوی نذیر احمد صاحب ایل - ایل - ڈی عربی علم ادب - اُردو انشا پردازی اور حُسن تقریر میں؛ خان بہادر مولوی ضیاء الدین ایل - ایل - ڈی مرحوم عربی زباندانی میں؛ شمس العلما خان بہادر مولوی ذکاء اللہ ریاضی اور تاریخ میں؛ مولوی ابو المنصور مرحوم فن مناظرہ اہل کتاب میں؛ مرزا داغ مرحوم اردو شاعری کے روزمرہ میں؛ مولوی سید احمد دہلوی مصنف فرہنگ آصفیہ نے اردو زباندانی میں بڑی شہرت حاصل کی - مجھے کئی مرتبہ ان بزرگوں کی ملاقات کا موقع حاصل ہوا ہے - مولوی سید نذیر حسین صاحب مرحوم سے تو کچھ دنوں حدیث شریف پڑھنے کا بھی اتفاق ہوا ہے - چونکہ فن حدیث میں مولانا کا کوئی سہیم و عدیل ان کے زمانے میں نہ تھا - اور ہندوستان کے اکثر علما اس فن میں آپ کے خوشہ چین ہیں - اس واسطے آپ کا حال تبرکاً اس جگہ لکھا جاتا ہے۔

مولوی سید نذیر حسین صاحب

سید محمد نذیر حسین صاحب محدث دہلوی - آپ صوبہ بہار کے سادات صحیح النسب میں

سنہ ۱۲۲۰ھ/۱۸۰۵ء میں ضلع مونگیر کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے اور سولہ برس کی عمر میں بارادہ تحصیل علم دہلی کا قصد کیا۔ راستہ میں بمقام عظیم آباد (پٹنہ) غازیپور۔ الہ آباد۔ کانپور اور فرخ آباد صرف و نحو کی ابتدائی کتابیں پڑھتے آئے چھ برس کے عرصہ میں دہلی پہنچے۔ یہاں صرف و نحو معانی۔ بیان۔ منطق ادب۔ اصول فقہ۔ علم کلام۔ تفسیر۔ فلسفہ۔ ریاضی اور طب کی درسی کتابیں پڑھیں اور پھر مولانا شاہ محمد اسحاق صاحب سے علم حدیث کی تحصیل شروع کی۔ شاہ صاحب مولانا شاہ عبدالعزیز کے نواسے اور ان کا حلقہ درس حدیث تمام ہندوستان کا مرکز تھا۔

سنہ ۱۲۵۸ھ/۱۸۴۲ء میں جب شاہ صاحب نے مکہ معظمہ کو ہجرت کی تو آپ درس حدیث میں مشغول ہوئے اور باقی عمر اسی دینی خدمت میں بسر کر دی۔ باوجودیکہ اس وقت شاہ صاحب کے بڑے بڑے شاگرد دہلی اور اطراف ہند میں موجود تھے۔ مگر آپ کے حلقہ درس کو وہ فروغ ہوا کہ ہندوستان کے علاوہ افغانستان۔ ترکستان۔ ایران۔ عرب۔ الجزائر اور چین تک کے طالب علم آنے شروع ہوئے جن کی تعداد پانسو تک بیان کی گئی ہے۔

شرک و بدعت کی تردید اور عمل بالحدیث کی ترغیب کا جو بیج شاہ ولی اللہ صاحب نے بویا اور شاہ محمد اسمٰعیل شہید کی آبیاری سے سرسبز ہوا آپ کی سعی بار آور ہو کر اس کے پھل پھول تمام ہندوستان میں پھیل گئے۔ مقلدین نے ان مسئلوں سے ناراض ہو کر کئی قسم کے مذہبی الزام لگائے اور وہابی کہنا شروع کیا مگر آپ نے کبھی ان باتوں کی پرواہ نہ کی۔ سنہ ۱۳۰۰ھ میں جب آپ مکہ معظمہ پہنچے تو تقلید پسند ہندوستانیوں نے پاشائے مکہ معظمہ سے آپ کے معتزلی اور وہابی ہونے کی تحریری شکایت کی اور چند جھوٹے عقائد آپ کی طرف منسوب کئے۔ پاشائے موصوف نے سب کی تحقیقات کی اور آپ کی دینداری اور علمی فضل و کمال دیکھ کر بہت احترام سے پیش آیا۔

آپ نے غدر سنہ ۱۸۵۷ء میں ایک میم کی جان بچائی تھی۔ اس کے عوض پنجابی کٹڑہ جس میں آپ رہتے تھے قتل و غارت سے محفوظ رہا۔ سنہ ۱۸۹۷ء میں آپ کو شمس العلماء کا خطاب ملا۔ آخر کار سنہ ۱۹۰۲ء میں ایک سو برس کچھ زیادہ عمر پا کر دہلی میں انتقال کیا۔ ان کے پوتے مولوی حافظ عبدالسلام اور مولوی سید نور الحسن دہلی میں موجود اور درس تدریس میں مشغول ہیں۔

؎ دیکھو الحیات بعد الممات صفحہ ۳۴۰۔

باشندوں کی حالت

باشندوں کی حالت - یہاں کے باشندے علی العموم خوش پوش اور خوش کلام ہیں۔ دہلی کا ان پڑھ آدمی بھی اپنی خوش بیانی سے دیگر صوبجات کے پڑھے ہوؤں کے مقابلے میں فصیح البیان اور طلیق اللسان معلوم ہوتا ہے۔ اُردو جو اس وقت کئی کروڑ سے زیادہ آدمیوں کی زبان ہے۔ وہ اسی شہر کی سرزمین سے نشوونما پاکر ہندوستان کے مختلف حصّوں میں پھیلی ہے۔ شاہی زمانے کی بُو یہاں کے باشندوں کے دماغوں میں اب تک ایسی بسی ہے کہ انگریزی تعلیم کی طرف کما حقہٗ راغب نہیں ہوتے۔ پنجابی سوداگروں کو چھوڑکر جن کا دلّی کی تجارت میں بڑا حصہ ہے اور جن کی ہمّت و محنت سے اس وقت دلّی تجارت کا مرکز بنا ہوا ہے۔ وہاں کے مسلمان باشندے انگریزی تعلیم کے فوائد کے مقابلے میں اپنی چھوٹی موٹی دستکاری اور تجارت سے روٹی کما لینے کو زیادہ پسند کرتے ہیں ٭

صنعت و تجارت

صنعت و تجارت - یہ شہر باوجود بربادی بخش انقلابات کے اب تک شمالی ہند کے نامور شہروں میں شمار ہوتا ہے۔ اس کی بقا اور موجودہ تمول تجارت او صنّاعی کی بدولت سے ہے۔ کراچی۔ بمبئی۔ کلکتہ۔ حرمین شریفین اور لندن تک یہاں کے تاجروں کا لین دین ہے۔ صنعت و حرفت میں یہاں کے لوگوں کو وہ کمال ہے کہ چاندی سونے کے زردوزی کا کام۔ ہاتھی دانت کی تصویریں اور بہت سی عجیب عجیب چیزیں یہاں کی بنی ہوئی دور دور جاتی ہیں۔ تین کپڑا بُننے کی اور گیارہ دیگر قسم کی کلیں جاری ہیں ٭

تعلیم

تعلیم - ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں میں انگریزی تعلیم کو جو ترقی ہے اُس کے اعتبار سے دہلی بہت پیچھے۔ اس وقت یہاں چار ہائی سکول ہیں۔ گورنمنٹ ہائی سکول کے علاوہ مسلمانوں کا اینگلو عربک سکول ہے جو پُرانے

دہلی کالج کے اوقاف سے چلتا ہے - اور اُسی عمارت میں ہے جہاں کالج مذکور تھا۔ ہندوؤں کی طرف سے ایک اینگلو سنسکرت سکول جاری ہے۔ مشنریوں اور ہندوؤں کی طرف سے دو کالج بھی ہیں ٭

علوم عربیہ اور مذہبی تعلیم کے واسطے مسلمانوں کے مصارف سے کئی مدرسے جاری ہیں۔ خصوصاً مسجد فتحپوری کا مدرسہ جس کی آمدنی پانسو روپے ماہوار کے قریب ہے مگر افسوس کہ عام طور پر ایسے مدارس میں تعلیم کا انتظام تسلی بخش نہیں ہے مسلمانوں کا ایک یتیم خانہ بھی ہے جو فی الجملہ خاصی طرح چل رہا ہے - کچھ ملکی اور قومی انجمنیں بھی ہیں - اور آہستہ آہستہ کام کر رہی ہیں ٭

مدرسہ طبیہ

مدرسۂ طبیہ خصوصیت سے قابل ذکر ہے - اس مدرسہ کی بنیاد حکیم محمود خاں مرحوم کے خلف اکبر حاذق الملک حکیم عبدالمجید خاں مرحوم نے قائم کی اور اب اس کا اہتمام اُن کے خلف اصغر حاذق الملک حکیم حافظ محمد اجمل خاں صاحب کے ہاتھ میں ہے اس مدرسے میں یونانی طب کی پڑھائی کا انتظام بڑے اعلےٰ پیمانے پر ہے - اور تشریح الاعضا کے واسطے ڈاکٹری کی عملی تعلیم بھی دی جاتی ہے ٭

پریس

پریس - یہاں کا ورنیکلر پریس اچھی ترقی پر ہے - عربی - فارسی اور اُردو کی عمدہ عمدہ کتابیں مولوی عبدالاحد صاحب کے مطبع سے شائع ہوتی رہتی ہیں - تین چار اُردو اخبار اور علمی رسالے بھی شائع ہوتے ہیں - ان میں اخبار کرزن گزٹ کی اشاعت بہت ہے

دہلی سے چند مشہور مقامات کے فاصلے اور کرایۂ ریل حسب ذیل ہے :-

	مسافت	کرایہ درجہ سوم	کرایہ درجہ دوم
لاہور براہ بھٹنڈا	۲۹۸ میل	۳ روپے ۸/	۹ روپے ۵/
شملہ براہ انبالہ	۲۳۲ میل	۵ " ۱۵/	۱۸ " ۱۳/
ڈیرہ دون براہ سہارنپور	۱۹۳ میل	۲ " ۹/	۶ " ۹/
کلکتہ براہ الہ آباد	۹۰۳ میل	۱۰ " ۶/	۳۲ " ۱۴/
بمبئی براہ جھانسی	۹۵۷ میل	۱۱ " ۱۰/	۲۹ " ۱۵/

دہلی قدیم (پُرانی دلی)

اس شہر کی آبادی بہت پُرانی اور حضرت مسیح سے پہلے کی ہے۔ ہندو اور مسلمان حکمرانوں کے زمانے میں آبادی کا موقع بار بار تبدیل ہونے سے متعدد شہر بن گئے۔ شاہجہان آباد کے جنوب اور جنوب مشرقی سمت میں ایک طرف اجمیری دروازہ سے قطب صاحب تک اور دوسری طرف دہلی دروازہ سے تغلق آباد تک جو حیرت انگیز اور قابل دید کھنڈر موجود ہیں وہ ان شہروں کے تغیرات اور قدامت کو ظاہر کر رہے ہیں۔ قطب صاحب شاہجہان آباد سے گیارہ میل۔ تغلق آباد بارہ میل۔ اور ان دونو کا درمیانی فاصلہ پانچ میل ہے۔ تاریخی حیثیت سے جو دلچسپی ان کھنڈروں کو ہے اس کی نسبت مسٹر کارسٹیفن مصنف مناظر قدیمۂ دہلی لکھتے ہیں "دہلی کے کھنڈروں کو جو فضیلت حاصل ہے وہ اٹلی کے پایۂ تخت روم کے کھنڈروں کو نہیں ہے"۔ آج سے دو سال پیشتر مجھے رُوم کی سیر کرنے کا اتفاق ہُوا ہے۔ دونو مقامات کی عمارتوں کا مقابلہ کرنے سے مسٹر کارسٹیفن کی رائے بہت درست معلوم ہوتی ہے۔

دہلی قدیم کا وہ حصہ جو قطب صاحب کی لاٹھ کے اردگرد ہے۔ ہندو راجاؤں کے آخری دور حکومت میں پرتھی راج المعروف رائے پتھورا کے زیر حکم اور لال کوٹ کے نام سے مشہور تھا۔ سلطان شہاب الدین محمد غوری نے ۵۸۹ھ (۱۱۹۳ء) میں رائے پتھورا پر فتحیاب ہوکر اس حصہ کو ہندوستان کا اسلامی دارالسلطنت قرار دیا۔ سلطان کی وفات کے بعد قطب الدین ایبک اور اُس کے جانشینوں کا یہی دارالخلافہ رہا۔ سلطان غیاث الدین بلبن نے ۶۶۴ھ (۱۲۶۶ء) میں اس شہر کو خوب رونق دی۔ دہلی کو جو عروج اس کے زمانے میں ہُوا اُس کا اندازہ تاریخ فرشتہ کی روایت کے

مطابق اس سے ہو سکتا ہے کہ چنگیزی مغلوں کے جور و ستم سے ترکستان ماوراءالنہر خراسان عراق آذربائجان فارس روم و شام کے پندرہ شہزادے جو بھاگ کر دہلی آئے تھے سلطان نے ان کی عزت افزائی اور آرام کے واسطے ہر ایک کے نام پر ایک علیحدہ محلہ مقرر کر دیا تھا۔ ان محلوں کے یہ نام تھے۔ عباسی۔ سنجری۔ خوارزم شاہی۔ دیلمی۔ علوی۔ اتابکی۔ غوری۔ چنگیزی۔ رومی۔ سنقری۔ یمنی۔ موصلی۔ سمرقندی۔ کاشغری اور خطائی +

معزالدین کیقباد نے سنہ ۶۸۶ھ ۱۲۸۷ع میں جمنا کے کنارے ایک شہر کیلوگڑھی کی زمین میں آباد کیا تھا۔ اس شہر کی آب و ہوا اور عمارتوں کی خوبی کا نقشہ حضرت امیر خسرو دہلوی مثنوی قران السعدین میں یوں کھینچتے ہیں ؎

حضرت دہلی کنف دین و داد — جنت عدن است کہ آباد باد
ہست چو ذات ارم اندر صفات — حرسہا اللہ عن الحادثات
ملک ز دروازۂ او فتحیاب — سیزدہ دروازۂ و صد فتح باب
ابر بلندش رہ بالا گرفت — تا بفلک شد رہ و یغما گرفت

سلطان علاءالدین خلجی نے اپنے عہد میں شہر سیری اور کوشک سبز تعمیر کرا کے اس کو دارالسلطنت قرار دیا تھا۔ شاہجہان آباد سے قطب صاحب جاتے ہوئے اس کے نشان بائیں ہاتھ کو اب تک دکھائی دیتے ہیں۔ یہ عمارتیں نوبت بہ نوبت لاٹھ سے شمال مشرق کی طرف بڑھتی گئی تھیں۔ مگر جب تغلق خاندان کا زمانہ آیا تو ان کے وقت میں آبادی نے مشرق کی طرف رخ کیا۔ اور سلطان غیاث الدین تغلق نے سنہ ۷۲۱ھ ۱۳۲۱ع میں تغلق آباد بڑی شان و شوکت سے تعمیر کرایا۔ پھر فیروز شاہ تغلق نے سنہ ۷۵۵ھ ۱۳۵۴ع میں شمال کی طرف فیروز آباد کی بنیاد ڈالی جس کے کھنڈر شاہجہان آباد کے دہلی دروازہ کے باہر اب تک باقی ہیں۔ اس وقت سے عمارتوں کا پھیلاؤ

ہمیشہ کے واسطے شمال کی طرف قائم ہوگیا - ہمایوں بادشاہ نے ۹۳۸ھ / ۱۵۳۱ء میں قلعہ اندرپت کی مرمت اور تعمیر کرکے "دین پناہ" اس کا نام رکھا اور اپنا دارالسلطنت قرار دیا - سلیم شاہ بن سلطان شیر شاہ نے ۹۵۳ھ / ۱۵۴۶ء میں سلیم گڑھ بنایا - جو جمنا کے کنارے لال قلعہ سے ملا ہوا ہے - ۱۰۵۸ھ / ۱۶۴۸ء میں شاہجہاں آباد کی بنیاد پڑنے پر تعمیر جدید کا سلسلہ جو "ہر کہ آمد عمارتِ نو ساخت" کا مصداق تھا - ہمیشہ کے واسطے ختم ہوگیا ٭

یہ کثیر الاضلاع رقبہ جس کا محیط چالیس پینتالیس میل سے کسی طرح کم نہ تھا - اگرچہ مختلف زمانوں میں آباد ہوا - مگر اس کی آبادی مسلسل تھی - آٹھویں صدی ہجری کا مشہور سیاح ابن بطوطہ جو سلطان محمد تغلق کے عہد میں دہلی آیا تھا - اس شہر کی نسبت اپنے سفرنامہ میں یوں لکھتا ہے "یہ ایک عظیم الشان شہر ہے اور اس کی عمارت میں خوبصورتی و مضبوطی دونوں پائی جاتی ہیں - اس کی فصیل ایسی مضبوط ہے کہ دنیا بھر میں اس کی نظیر نہیں - اور مشرق کا کوئی اسلامی اور غیر اسلامی شہر اس کی عظمت کا مقابلہ نہیں کرسکتا - یہ بڑا فراخ اور تمام آباد ہے - اصل میں چار شہر ہیں جو ایک دوسرے کے متصل واقع ہیں - (۱) دہلی جو ہنود کے وقت کا پرانا شہر ہے اور ۵۸۴ھ میں فتح ہوا تھا - (۲) شہر سیری جس کو دارالخلافہ بھی کہتے ہیں - (۳) تغلق آباد - (۴) جہاں پناہ[٭] جس میں سلطان محمد تغلق شاہ حال رہتے ہیں" - اس سفرنامہ کے مترجم خان صاحب مولوی محمد حسین صاحب ایم اے نے دہلی قدیم کی نسبت مسالک الابصار کے مصنف کے حوالہ سے جو دمشق کا رہنے والا اور ابن بطوطہ کا ہمعصر تھا ایک روایت نقل کی ہے - اس سے بھی دہلی کی مسلسل آبادی اور عظمت و شان کا بخوبی اندازہ

٭ جہاں پناہ کی آبادی شہر سیری اور قطب صاحب کی لاٹھ کے درمیان تھی ٭ مؤلف

ہوتا ہے۔ وہ لکھتا ہے۔ "دہلی کا شہر کئی شہروں کو ملا کر بنایا گیا ہے۔ ان شہروں کے نام علحدہ علحدہ بھی ہیں لیکن سب کو ملا کر دہلی کہتے ہیں۔ شہر کا محیط چالیس پینتالیس میل ہے۔ اس کے تین طرف بارہ بارہ ہزار قدم تک باغات ہیں اور مغرب کی طرف پہاڑی ہے۔ ایک ہزار مدرسے دو ہزار چھوٹی چھوٹی مسجدیں اور ستر دار الشفا ہیں"۔ غرض یہ شہر ساڑھے چار سو برس تک یکے بعد دیگرے سلاطین ہند کا پایۂ تخت رہنے سے علم و فضل۔ حرفت و صنعت۔ تجارت و تمدن کا مرکز بن گیا۔ ایران عراق شام عرب اور مصر تک کے علما صوفیا اور ہر قسم کے باکمال و تاجر یہاں چلے آتے تھے۔ عمارات کی عمدگی اور دلفریبی سے ہندوستان بھر میں اس کو خصوصیت حاصل تھی۔ اگر کوئی شخص یہاں کے کھنڈروں کو غور سے دیکھے تو اسے اس اجڑے شہر کی چپہ چپہ زمین تاریخی واقعات سے پُر نظر آئیگی۔ سرسید احمد خاں مرحوم نے غدر سے پیشتر ان عمارتوں کے تاریخی حالات لکھے اور عکس کتاب آثار الصنادید میں بہت تحقیق سے درج کئے ہیں۔ اس کے بعد مسٹر کارسٹیفن نے اس موضوع پر نہایت اچھی کتاب لکھی۔ اب تھوڑا عرصہ ہوا کہ دہلی کے سابق کمشنر مسٹر فنشا نے ان عمارتوں کے حالات انگریزی میں لکھے ہیں ان کے علاوہ اور یورپین مصنفین نے بھی یہاں کے حالات۔ یا بالفاظ دیگر پرانی دلی کے مرثیے لکھے ہیں۔ میں ان کتابی تفاصیل کو چھوڑ کر ناظرین کے لئے اس عبرت بخش منظر کی سیر کا وہ مختصر طریق لکھتا ہوں جو میرے نزدیک سہل اور زیادہ مفید ہے تفصیلی حالات اور کتابوں کے مطالعہ سے انہیں خود معلوم ہو سکینگے۔

کوٹلہ فیروز شاہ

کوٹلہ فیروز شاہ - دہلی دروازہ کے باہر متصل ایک سڑک پر فیروز شاہ تغلق کے کوٹلہ کے کھنڈر نظر آتے ہیں۔ سب سے پہلے ایک اڈھ ڈھائی بنتی ہے۔

جس کو فیروز شاہ نے آٹھویں صدی ہجری میں کوہ کماؤں سے لاکر نصب کیا تھا۔ یہ لاٹھ پتھر کے ایک ڈال کی ہے۔ اس لاٹھ کا طول ۴۸ فٹ اور جڑ پر سے موٹائی دس فٹ ہے۔ اس قسم کے ستون قاہرہ۔ اسکندریہ اور استنبول میں بھی قدیم زمانہ کے بنائے ہوئے میری نظر سے گزرے ہیں۔ کوٹلہ کے جنوب اور مغرب کی جانب شہر فیروز آباد بستا تھا جس کی شہرپناہ کے آثار سڑک کے دائیں ہاتھ جیل خانہ کے قریب اب تک موجود ہیں۔ شہر اندرپت کی تمام آبادی اس میں شامل تھی۔ امیر تیمور نے ۸۰۱ھ/۱۳۹۸ء میں جس دہلی کو تاخت و تاراج کر کے بے چراغ چھوڑا تھا وہ یہی بدنصیب مگر خوش منظر شہر تھا ؛

مہندیاں

مہندیاں - سڑک کے دائیں ہاتھ ایک عمارت "مہندیاں" کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے قریب ایک میدان میں شاہ ولی اللہ صاحب شاہ عبدالعزیز صاحب اور ان کے خاندان کی قبریں ہیں۔ اس خاندان نے بارھویں اور تیرھویں صدی ہجری میں علمی فضل و کمال اور خصوصاً علم حدیث میں جو شہرت حاصل کی ہندوستان میں کوئی ان کا ہم پلہ نہ تھا۔ شاہ ولی اللہ صاحب کا انتقال ۱۱۷۶ھ/۱۷۶۲ء اور شاہ عبدالعزیز کا انتقال ۱۲۳۹ھ/۱۸۲۴ء میں ہوا ؛

پرانا قلعہ

پرانا قلعہ - اسی سڑک پر ڈیڑھ میل چلنے کے بعد بائیں ہاتھ کو ایک پرانا قلعہ آتا ہے جسے مسلمانوں کی حکومت سے پہلے اندرپت کہتے تھے۔ ہمایوں بادشاہ نے اس کی سابقہ بنیاد پر نئی تعمیر کر کے "دین پناہ" اس کا نام رکھا تھا۔ لب دریا ایک مسجد بہت خوشنما اور شیر منڈل کی عمارت ہے۔ ہمایوں بادشاہ اسی کی چھت پر سے گر کر مرا تھا ؛

مقبرہ عیسےٰ خاں

مقبرہ عیسےٰ خاں - قلعہ دین پناہ سے کچھ آگے بڑھنے کے بعد سڑک کی بائیں جانب موضع عرب سرا نظر آتا ہے۔ اس کے مغرب کی جانب سلطان

شیر شاہ کے امیر عیسیٰ خاں کا مقبرہ بہت اچھی وضع کا بنا ہُوا ہے ✦

مقبرہ ہمایوں

مقبرہ ہمایوں - عرب سرائے کی مشرقی سمت جمنا کے کنارے سلطان ہمایوں کا مقبرہ ہے جو دہلی سے تقریباً تین میل کے فاصلہ پر ہے - یہ مقبرہ اُسی رقبہ میں ہے جہاں سلطان معزالدین کیقباد کی کیلوگڑھی تھی - اس کا بُرج خالص سنگ مرمر کا اور اس قدر خوبصورت بنا ہُوا ہے کہ ہندوستان میں کوئی برج اس سے زیادہ خوشنما نہ ہوگا - اس کی عمارت ہمایوں بادشاہ کی ملکہ نواب حمیدہ بانو عرف حاجی بیگم والدہ شہنشاہ جلال الدین اکبر نے سولہ برس میں پندرہ لاکھ روپے کے صرف سے بنوائی تھی - صحن میں ایک پُرفضا باغ کے آثار ہیں جس میں نہریں چلتی اور حوضوں سے پانی کے فوارے چھوٹتے تھے - مرورِ زمانہ سے اس کی حالت خراب ہوگئی تھی مگر گورنمنٹ انگریزی کے محکمہ آثارِ قدیمہ نے اس کی مرمت کرادی ہے - حاجی بیگم نے ہمایوں کی فاتحہ خوانی کے واسطے تین سو علما اور زاہد عرب سے منگوا کر مقبرہ کے ساتھ بسائے تھے جن کے باعث سے اس آبادی کا نام عرب سرائے پڑ گیا ✦

مقبرہ خانخاناں

مقبرہ خانخاناں - اس کے جنوب کی طرف ذرا فاصلہ پر اکبر کے سپہ سالار عبدالرحیم خاں خانخاناں ولد بیرم خاں کا مقبرہ ہے - اس کی عمارت اس قدر خستہ حالت میں ہے کہ عام لوگوں میں "گنجہ گنبد" کے نام سے مشہور ہوگیا ہے ✦

درگاہ سلطان نظام الدین

درگاہ سلطان نظام الدین اولیا - اب متھرا کی سڑک قطع کر کے مغرب کی طرف جائیں تو حضرت سلطان المشائخ نظام الدین اولیا قدس سرہٗ کی درگاہ آتی ہے جو ساتویں صدی ہجری کے نامور صوفیا میں سے گزرے ہیں - اس درگاہ کے صحن میں تین مجرّ ہیں - پہلا شاہ جہاں کی بیٹی جہاں آرا بیگم کا - دوسرا محمد شاہ بادشاہ کا اور تیسرا مرزا جہانگیر کا - صحن سے جنوب کی طرف

مقبرہ ہمایوں - دہلی (قدیم)
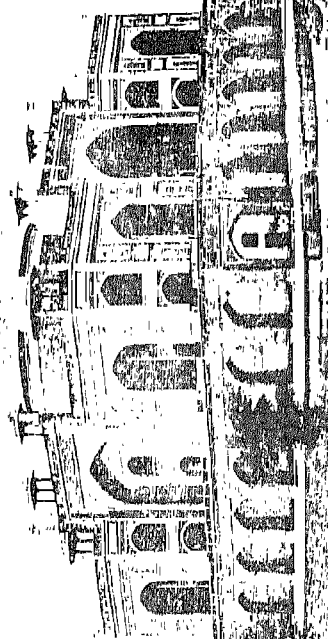
حضرت امیر خسرو طوطی ہند کا مزار ہے۔ یہ درگاہ کسی زمانے میں غیاث پور کی آبادی کا ایک محلہ شمار ہوتی تھی (سلطان نظام الدین اور امیر خسرو کے حالات ضمیمہ میں درج ہیں) ٭

دہلی سے ایک ریلوے لائن جو متھرا کو گئی ہے اُسکے پہلے اسٹیشن کا نام اس درگاہ کی مناسبت سے نظام الدین ہے۔ اگر کوئی شخص دہلی سے ریل کے راستے نظام الدین جائے تو اس تین چار میل کے سفر میں ہندو اور مسلمانوں کی قدیم عمارتوں کا ایک سرسری نظارہ اسکی نظر سے گزریگا ٭

چونسٹھ کھمبا

چونسٹھ کھمبا - درگاہ سے مشرق کی جانب سنگ مرمر کے چونسٹھ ستونوں کا ایک ہال ہے جس میں شہنشاہ اکبر کے کوکہ مرزا عزیز کوکلتاش کا مقبرہ ہے۔ یہ مقبرہ سنگ مرمر سے عجب صنعت کے ساتھ بنایا گیا ہے۔ اس سے شمال کی جانب سو پچاس قدم کے فاصلہ پر دہلی کے نامور شاعر مرزا غالب کی دائمی آرامگاہ ہے ٭

روشن چراغ دہلی

روشن چراغ دہلی - سلطان المشائخ کی درگاہ سے چار میل کے فاصلہ پر حضرت شیخ نصیر الدین محمود روشن چراغ دہلی قدس سرہٗ کا مزار ہے جو آپ کے مشہور خلفا میں سے گزرے ہیں۔ مزار کے صحن میں چند قبریں اور احاطہ کے پچھواڑے سلطان بہلول لودھی کا مقبرہ ہے (شیخ نصیر الدین کے حالات ضمیمہ میں درج ہیں) ٭

ست پلہ

ست پُلہ - روشن چراغ دہلی کے قریب فیروز شاہ کے زمانے کی ایک شکارگاہ ہے۔ اس کے گرد جو دیواریں کئی میل کی مسافت پر بنائی گئی تھیں۔ اُن میں سے ایک دیوار کو ست پُلہ کہتے ہیں۔ قطب صاحب کی اُتر یوں اور تمام نالوں کا پانی اس دیوار کے نیچے بہتا ہے۔ نالے کا پانی بہنے کے واسطے دیوار میں پُل کے طور پر کئی در بنے ہوئے ہیں اور اسی وجہ سے ست پُلہ اس کا نام مشہور ہو گیا ہے ٭

مسجد کھڑکی

مسجد کھڑکی - یہ مسجد ست پُلہ کے قریب آٹھویں صدی ہجری کی بنی ہوئی ہے - اس کی چھت چار پانسو ستونوں پر قائم ہے - جن میں اسّی نوّے کے قریب گنبد ہیں - اس وضع کی مسجد شمالی ہند میں کہیں نہیں مدت سے گوجروں کا مسکن بنا ہوا تھا - مگر لارڈ کرزن نے انہیں نکالکر پھر مسجد کی اصلی حالت قائم کردی ہے - یہ امر البتہ قابل افسوس ہے کہ نماز پڑھنے والا کوئی نہیں +

تغلق آباد

تغلق آباد - کھڑکی سے تین میل جنوب مشرق کی طرف قطب صاحب اور متھرا کی سڑک کے متصل تغلق آباد آتا ہے - نظام الدین سے یہاں تک کا راستہ فی الجملہ دشوارگزار اور صرف پا پیادہ یا گھوڑے کی سواری سے بآسانی طے ہوسکتا ہے - اگر کوئی شخص متھرا لین کے ذریعے تغلق آباد اسٹیشن پر آئے جو آبادی سے دو میل اور دہلی سے بارہ میل ہے تو اس کو اس سفر میں سہولت ہوسکتی ہے مگر روشن چراغ دہلی - ست پُلہ اور کھڑکی کی سیر کا موقع اُسے نہیں ملیگا +

تغلق آباد ایک پہاڑی پر نیم دائرے کی شکل کا بنا ہوا ہے جس کا محیط تقریباً چار میل ہوگا - شہر کی عمارتوں میں سے قلعہ اور غیاث الدین تغلق کا مقبرہ قابل دید ہے - یہ دونو عمارتیں سلطان تغلق کی یادگار اور آٹھویں صدی ہجری کی بنی ہوئی ہیں - کسی زمانے میں یہ عمارتیں بہت اعلٰے درجہ کی تھیں اور عمارتی خوبیوں کے لحاظ سے بےنظیر مانی جاتی تھیں - مگر اب بالکل ویران ہیں - قلعہ میں گوجر اور مقبرہ میں مسلمان زمیندار آباد ہیں آخرالذکر اپنے تئیں تغلق کی اولاد بتاتے ہیں - ان کے جاہلانہ غرور یا سڑی ہوئی پُرانی رسیوں کے بل نہ جلنے کا اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ گو لکڑیاں بیچنے پر ان کا گزارہ تھا - مگر پیشتر جب یہ لوگ دہلی میں لکڑیاں بیچنے جاتے تو قلعہ دہلی میں جانے کی آن بتلاتے تھے اور کہتے تھے کہ ہم بھی بادشاہ کی اولاد ہیں - ان نودولت شاہزادوں کے ہاتھ
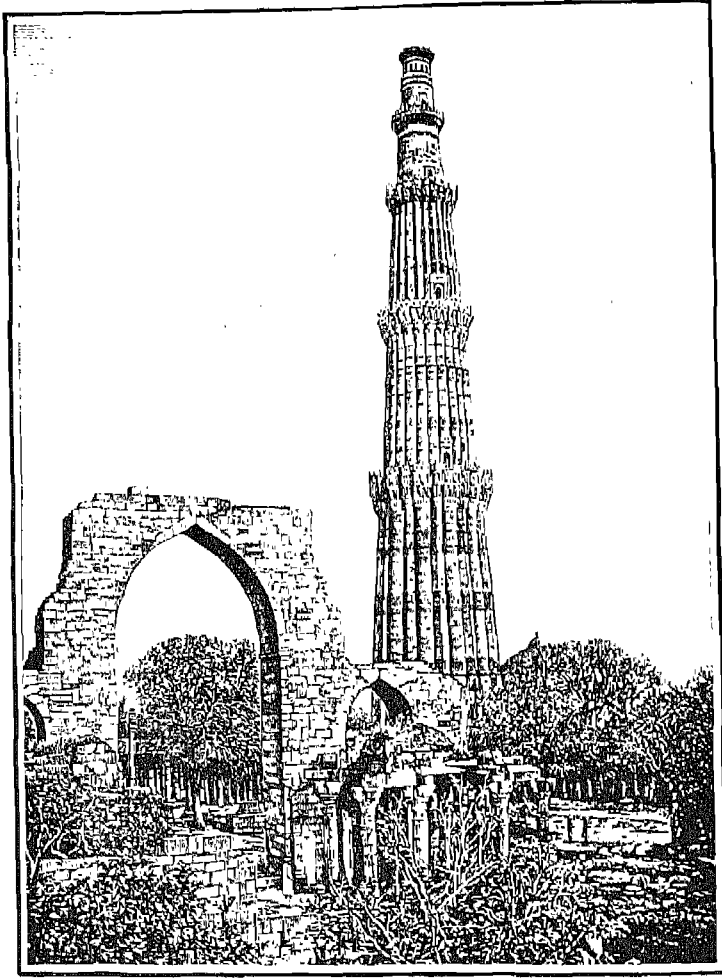
قطب مینار — دہلی (قدیم)

لکڑیاں بیچنا ہمارے واسطے باعث ننگ و شرم ہے۔ ہم قلعہ میں جائیں تو فاتح بن کر نہ کہ لکڑہارے ہو کر ۔

قطب مینار

قطب صاحب کی لاٹھ یا قطب مینار ۔ تغلق آباد سے متھرا والی سڑک پر شمال مغرب کی جانب پانچ میل کے فاصلہ پر قطب صاحب کی لاٹھ آتی ہے جو اپنی قدامت ۔ بلندی اور عمارتی خوبیوں کے لحاظ سے سیاحوں کی خاص دلچسپی کا باعث ہے ۔ اس لاٹھ کی پانچ منزلیں ہیں سب سے نیچے کی منزل کا دور پچاس گز ہے جو رفتہ رفتہ اس قدر کم ہوتا گیا ہے کہ آخری منزل صرف دس گز مدور رہ جاتی ہے ۔ ۳۷۸ سیڑھیاں یا ۲۳۸ فٹ بلندی پر چڑھنے کے بعد چوٹی تک رسائی ہوتی ہے ۔ ہر منزل کے باہر آیات قرآنی کھدی ہوئی اور جابجا منبت کاری کی ہوئی ہے ۔ اس لاٹھ کی بنیاد سلطان شہاب الدین محمد غوری فاتح دہلی کے حکم سے اُس کے سپہ سالار قطب الدین ایبک نے ڈالی اور شمس الدین التمش کے زمانے میں خاتمہ کو پہنچی ۔ یہ لاٹھ مسجد قوت الاسلام کے ساتھ جس کا ابھی ذکر کیا جائیگا ماذنہ (محل اذان) کا کام دیتی تھی ۔ اس لاٹھ سے زیادہ اونچی کوئی عمارت ہندوستان میں نہیں ۔ بعض لوگوں میں جو مشہور ہے کہ رائے پتھورا نے یہ مینار اس غرض سے بنایا تھا کہ اس کی چوٹی پر سے ہر صبح جمنا کا درشن کیا کرے تاریخی تحقیقات سے پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچا ۔

مسجد قوت الاسلام

مسجد قوت الاسلام ۔ سلطان شہاب الدین محمد غوری نے فتح دہلی کے بعد اس کی تعمیر کا حکم دیا ۔ ۵۹۴ھ میں اصل مسجد قطب الدین ایبک کی زیر نگرانی تیار ہوئی ۔ پھر شمس الدین التمش کے زمانے میں اس پر اضافہ ہوا ۔ یہ مسجد قدامت وسعت اور حسن صنعت کے باعث دہلی میں سب سے زیادہ عمدہ تھی ۔ اس کی عمارت میں سے گیارہ محرابوں کی ایک قطار ۳۸۵ فٹ لمبی اب تک باقی ہے

جس میں سے بڑی محراب ۵۳ فٹ بلند اور ۲۲ فٹ چوڑی ہے۔ محرابوں پر زمانۂ تعمیر کے کتبے خط نسخ میں لکھے ہوئے ہیں۔ مسجد کے ایک طرف بُت خانہ کے ستون موجود ہیں جن پر سنگتراشی کاری کی ہوئی ہے اور بیل بوٹے پھول پتّے کی جگہ بتوں کی مورتیں بنی ہوئی ہیں۔ اب یہ مسجد بالکل اوجڑ پڑی ہے۔ گیارہ محرابوں کی لین کے سوا مسجد کی کوئی علامت اس میں باقی نہیں۔ اس کے چاروں طرف سڑکیں بنی ہوئی ہیں۔ جنوب مشرقی سڑک قطب صاحب کی لاٹھ اور اس مسجد کے درمیان سے گزرتی ہے +

لوہے کی لاٹھ

لوہے کی لاٹھ۔ یہ لاٹھ مسجد قوت الاسلام کے صحن میں ڈھلے ہوئے لوہے کی اور مسلمانوں سے پہلے کی بنی ہوئی ہے۔ جڑ میں اس کا محیط سوا پانچ فٹ اور بلندی ساڑھے اٹھارہ فٹ ہے۔ باوجودیکہ اس کو بنے ہوئے عرصہ دراز ہوگیا ہے۔ مگر اب تک زنگ کی کوئی علامت اس پر نمودار نہیں ہوئی۔ اس کی تعمیر کے متعلق بڑی بڑی عجیب روایتیں زبان زد ہیں۔ مگر غالباً یہ لاٹھ کسی فتح کی یادگار میں بنائی گئی ہے +

مقبرہائے سلاطین

مقبرہائے سلاطین۔ مسجد کے متصل سلطان شمس الدین التمش کا مقبرہ اور لاٹھ کے قریب دو چار میں سلطان غیاث الدین بلبن اور سلطان علاءالدین خلجی کے مقبرے ہیں۔ ان کی خستہ حالت دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ عمارتیں کسی زمانے میں بہت اعلےٰ درجہ کی تھیں +

مندر جوگ مایا

مندر جوگ مایا۔ مسجد قوت الاسلام سے مغرب کی طرف ذرا فاصلہ پر جوگ مایا کا مندر راجا پرتھی راج کی یادگار اور ہندوؤں کی بڑی پرستشگاہ ہے +

درگاہ خواجہ صاحب۔ مندر سے تھوڑی دور جانے کے بعد موضع مہرولی میں حضرت خواجہ قطب الدین صاحب بختیار کاکی قدس سرہٗ کا مزار ہے۔ جو چھٹی

مقبرہ صفدر جنگ ۔ دہلی (قدیم)
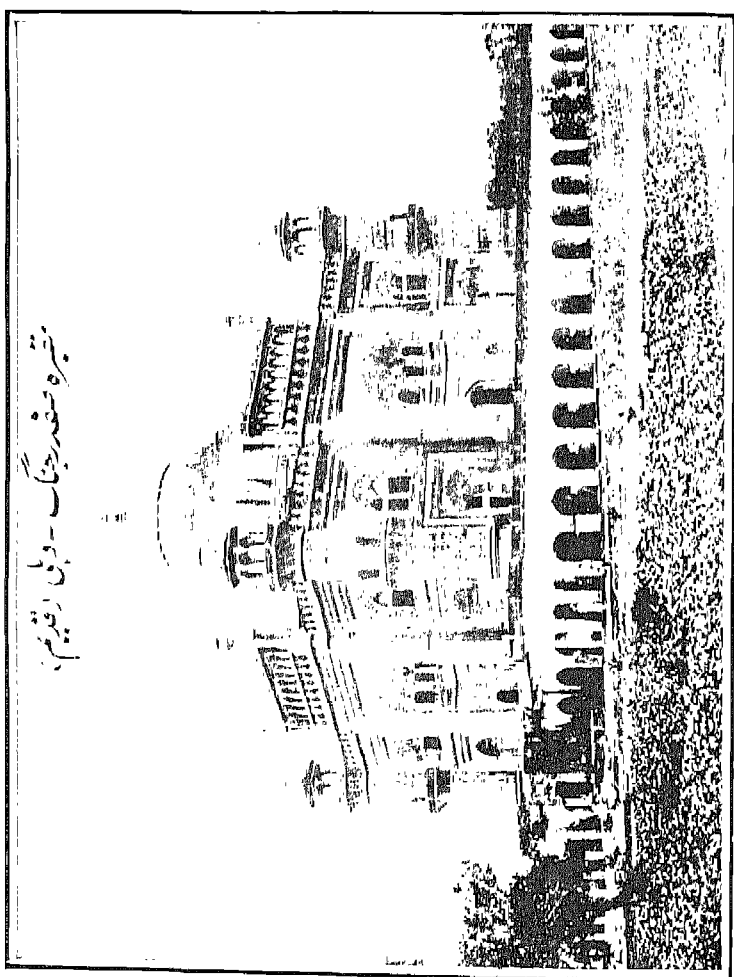
صدی ہجری کے مشاہیر اولیا او چشتیہ طریق کے بڑے رہنما گزرے ہیں۔
اس مزار پر کوئی گنبد نہیں۔ بلکہ رحمت آسمانی کا سائبان ہر وقت سایہ افگن رہتا ہے درگاہ کے احاطہ میں قاضی حمید الدین صاحب ناگوری رح کی قبر ایک بلند چبوترے پر بنی ہوئی ہے۔ قاضی صاحب بہت بڑے فاضل اور خواجہ صاحب کے صادق ارادتمند تھے (خواجہ صاحب اور قاضی صاحب کے حالات ضمیمہ میں درج ہیں)

جھرنہ

جھرنہ۔ مہرولی کی آبادی کے باہر ایک بہت فرحت بخش مکان ہے جس کو قطب صاحب کا جھرنہ کہتے ہیں۔ یہاں ہر سال موسم برسات میں پھول والوں کی سیر کا میلہ ہوتا ہے۔ دہلی اور اس کے نواح کے باشندے ہزاروں کی تعداد سے جمع ہوتے ہیں اور خوب چہل پہل رہتی ہے۔ دہلی میں جو وقعت اس میلہ کو حاصل ہے اس کا اندازہ اس سے لگ سکتا ہے کہ آخر زمانے میں خود بادشاہ وقت یہاں کئی روز مع بیگمات و شہزادوں کے مقیم رہتے تھے۔

اس کے قریب شیخ عبدالحق محدث دہلوی کا مقبرہ ہے جو علوم ظاہری اور باطنی میں مشہور و معروف بزرگوار گزرے ہیں۔ آپ کی تصنیفات سو کے قریب اور علما میں بہت مقبول ہیں۔ شہنشاہ اکبر۔ جہانگیر اور شاہجہاں کا عہد حکومت دیکھنے کے بعد ۱۰۵۲ھ میں انتقال فرمایا۔

مقبرۂ منصور

مقبرۂ منصور۔ قطب صاحب سے اجمیری دروازہ جاتے ہوئے نصف راہ میں نواب منصور علی خاں صفدر جنگ کا مقبرہ آتا ہے۔ نواب صاحب احمد شاہ فرمانروائے دہلی کے وزیر اور خاندان نوابان اودھ کے مورث اعلےٰ تھے۔ مقبرہ کی عمارت تین لاکھ روپے کے صرف سے تیار ہوئی ہے۔ اور فن تعمیر کا بہت اعلےٰ نمونہ ہے۔

جنتر منتر

جنتر منتر۔ مقبرہ اور اجمیری دروازہ کے درمیان علم ہیئت کے متعلق اینٹ چونہ کے بڑے بڑے آلات بنے ہوئے ہیں۔ جس کو جنتر منتر (آلاتِ رصدیہ) کہتے ہیں۔ یہ آلات راجہ جے سنگھ نے بعہد محمد شاہ ۱۱۴۳ھ میں بنوائے تھے۔ بڑے بڑے ہندو اور مسلمان ریاضی دان ان کے بنانے میں شریک تھے۔ مگر افسوس کہ اس وقت یہ علمی ذخیرہ بہت خستہ حالت میں ہے۔

قدم شریف

قدم شریف۔ اجمیری دروازہ کے باہر ایک درگاہ قدم شریف کے نام سے مشہور ہے۔ اس میں شاہزادہ فتح خاں کی قبر اور اس پر رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم کا سنگ نقش قدم مبارک لگا ہوا ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ قدم شریف فیروز شاہ کے عہد میں آیا تھا اور ۷۷۵ھ میں جب شاہزادہ مذکور کا انتقال ہوا تو بادشاہ نے فرط محبت سے یہ قدم ان کی قبر پر لگایا اور عمدہ عمدہ عمارتیں اس درگاہ کے متعلق بنوائیں۔ اس کے احاطہ میں خواجہ مستان شاہ صاحب کابلی کا مزار ہے۔

درگاہ خواجہ باقی باللہ

درگاہ خواجہ باقی باللہ۔ اجمیری دروازہ سے مشرق کی طرف کچھ فاصلہ پر حضرت خواجہ باقی باللہ صاحب کی درگاہ ہے۔ خواجہ صاحب گیارھویں صدی ہجری کے مشاہیر صوفیا اور نقشبندیہ طریق کے بڑے پیشوا گزرے ہیں۔ خواجہ صاحب کے حالات ضمیمہ میں درج ہیں۔

یہ تمام عمارتیں خصوصاً شاہی مسجدیں سلاطین کے عالیشان مقبرے۔ اور سربفلک قلعے جو کروڑوں روپے کے صرف سے بنائے گئے تھے۔ اور کسی زمانے میں عجوبۂ روزگار سمجھے جاتے تھے۔ اب ویران پڑے ہیں۔ اُلو اور چمگادڑ وہاں عبرت کی منادی کرتے ہیں۔ جو گوش دل پر کچھ اثر نہیں کرتی۔ سرد مہر دیکھنے والے دیکھتے ہیں اور آہ سرد تک نہیں بھرتے۔ وہ سیر خرابہ کرتے ہیں۔ مگر ان کے خرابۂ دل پر جوں نہیں رینگتی۔ کروڑوں روپیہ پامال اور ایک خراج ملک

خوان لغما ہے - برخلاف اس کے صوفیائے کرام کے مزارات میں باوجودیکہ اُن کا عشر عشیر بھی صرف نہیں ہوا مگر صاحب مزار کا رُوحانی اثر اب تک ہزاروں بندگان خدا کو صدہا میل کی مسافت طے کرا کے زیارت وحصول برکت کے لئے یہاں کھینچ لاتا ہے اور سر عقیدت جھکوا دیتا ہے - اس سے نہ وریوزہ گر مستثنےٰ ہے نہ بادشاہ گردنکش ۔۔

متھرا

دہلی سے ۹۰ میل طے کرنے کے بعد میں متھرا پہنچا - یہ شہر دریائے جمنا کے کنارے آباد ہے - اور ہندوستان کے قدیم مشہور معبدوں میں شمار کیا جاتا ہے - سری کرشن جی جو ہندو مذہب کے بڑے فلاسفر اور اوتار (مظہر حق) مانے جاتے ہیں - اسی شہر میں پیدا ہوئے تھے - اسی وجہ سے ہندو اس کو نہایت مقدس سمجھ کر زیارت کی غرض سے آتے ہیں - حضرت مسیح سے چار سو برس پیشتر پیروان بُدھ مذہب کا یہ مرکز تھا - اُن کی بیس خانقاہیں یہاں ایسی تھیں جن میں بدھ مذہب کے تقریباً تیس ہزار مُنی اور راہب رہا کرتے تھے - چنانچہ اُن کی بعض یادگاریں اب تک متھرا کے گردو نواح میں موجود ہیں - اسلامی تاریخ میں سب سے پہلے متھرا کا ذکر محمود غزنوی کے حملات میں ملتا ہے مگر سلطنتوں کے تغیرات سے اس پر بڑے بڑے حوادث گزر چکے ہیں جس سے اس کی پہلی سی رونق اور عمارات قدیمہ کی وہ شان وشوکت اپنی حالت پر نہیں رہی - اس وقت اس کی آبادی ستر ہزار کے قریب ہے جس میں ہندو بکثرت اور مسلمان بہت تھوڑے ہیں ۔۔

بھرت پور دروازہ سے داخل ہونے کے بعد کچھ دور ایک چوک

آتا ہے جو نہایت آباد اور بارونق ہے۔ وسط چوک میں ایک دو منزلہ مسجد بڑی عالیشان بنی ہوئی ہے اور نبی جی کی مسجد کے نام سے مشہور ہے۔ شہنشاہ عالمگیر کے زمانے میں نواب عبدالنبی خاں فوجدار متھرا نے اس کو تعمیر کروایا تھا۔ اس کے مینار بڑے اونچے ہیں۔ ان پر چڑھنے سے سارے شہر کی کیفیت ایک نگاہ میں معلوم ہو جاتی ہے۔ اس کی مشرقی سمت کا بازار بہت بارونق اور اس حصہ میں کئی نو تعمیر مندر بڑے شاندار ہیں۔ خاتمہ بازار پر دریا کے کنارے کنارے بہت سے پختہ گھاٹ بنے ہوئے ہیں جہاں ہندو اشنان کرنا باعث ثواب سمجھتے ہیں۔ ان میں سے بسرام گھاٹ پر زیادہ بھیڑ رہتی ہے یہ وہ جگہ ہے جہاں کرشن جی نے کنس کے مارنے کے بعد بسرام کیا تھا۔ کنارے پر دریائی سیر کے لئے کثرت سے کشتیاں ملتی ہیں جن میں سوار ہو کر ان گھاٹوں کی سیر کا پورا لطف حاصل ہوتا ہے۔

بسرام گھاٹ سے واپسی پر جب چوک سے سیدھے چلے جائیں۔ تو بیرون شہر ایک جگہ کٹرہ آتی ہے۔ اس کا طول آٹھ سو فٹ اور عرض ساڑھے چھ سو فٹ ہے۔ وسط میں ایک ٹیکرے پر شہنشاہ عالمگیر کی مسجد بنی ہوئی ہے کہتے ہیں کہ پہلے یہاں ایک مندر تھا۔ سنگ سرخ کی ایک دیوار جو اب تک موجود ہے۔ وہ اسی مندر کا بقیہ بیان کی جاتی ہے۔ عالمگیری مسجد بالکل ویران ہے۔ سنا ہے کہ عیدین کی نماز کے وقت البتہ ابھی رونق ہو جاتی ہے۔

اس شہر کے ہندو بڑے مالدار ہیں۔ کچھ مدت پیشتر سیٹھ لکھمی چند یہاں ایک ایسا متمول ہو گزرا ہے کہ ہندوستان بھر کے بیوپاریوں میں کوئی اس کا ہم پلہ نہ تھا۔

یہاں کے پجاری (چوبے برہمن) بہت کھانے میں مشہور ہیں۔

عنک ز ـــ بند زابن
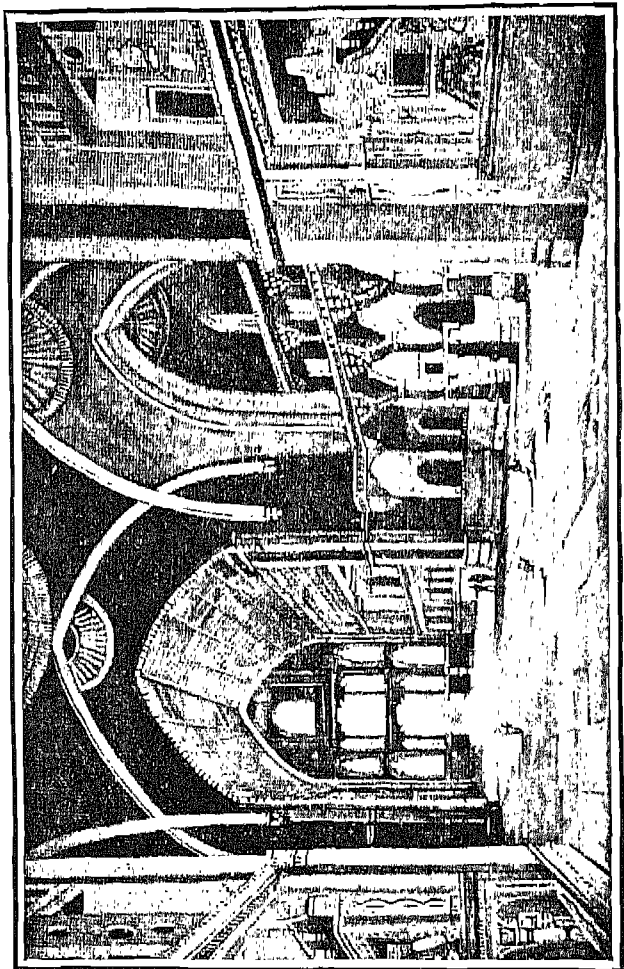
جو لوگ جاترا (زیارت) کرنے آتے ہیں - وہ کوشش کرتے ہیں کہ جہاں تک ممکن ہو ان کو لڈو پیڑے پیٹ بھر کر کھلائیں - اس غرض سے یہ لوگ بھنگ کے نشے میں اکثر مست رہتے ہیں تاکہ زیادہ خوراک کھاسکیں - متھرا کے پیڑے خصوصیت سے مشہور ہیں - جاتری لوگ خرید کر تبرک کے طور پر اپنے گھروں کو لے جاتے ہیں ۔

شہر سے دو میل کے فاصلے پر انگریزی چھاؤنی ہے - بھرت پور وغیرہ ریاستوں کا ناکہ ہونے سے فوج کی کافی تعداد اس میں رہتی ہے ۔

بندرابن

یہ قصبہ متھرا سے ۶ میل کے فاصلہ پر دریائے جمنا کے کنارے ہندوؤں کا متبرک مقام ہے - سری کرشن جی گوپیوں کے ساتھ یہاں راس کیا کرتے تھے ایک دفعہ گوپیوں کے کپڑے اُٹھا کر جس درخت پر آپ چڑھ گئے تھے اُس کے آثار اب تک باقی ہیں - غرض اس قصبہ کو جو تقدیس ہے - وہ سری کرشن جی کے باعث سے ہے - سرکار نے زائرین کی سہولیت کے واسطے متھرا سے یہاں تک ریل جاری کردی ہے - مگر یکے اور گاڑیاں بھی بکثرت چلتے رہتے ہیں ۔

بندرابن میں متھرا کی نسبت مندر بکثرت اور بعض بہت شاندار ہیں - قصبہ کا کوئی گلی کوچہ ایسا ہوگا جہاں ایک آدھ مندر نہ ہو - سب سے بڑا مندر سڑک کے کنارے راجہ جے پور کا بنا یا ہُوا ہے - اس کی عمارت سنگ سُرخ کی اور کام بہت نفیس ہے - مگر اس وقت یہ مندر ویران پڑا ہے - سرکار کی طرف سے ایک چوکیدار اُسکی حفاظت پر مامور ہے - نئے مندروں میں سے سیٹھ لکھمی چند کا مندر بڑا وسیع اور عظیم الشان ہے - اس میں ایک بہت اونچی لاٹھ

بنی ہوئی ہے جو دور سے دکھائی دیتی ہے۔ اس پر سونے کا کام کیا ہوا ہے قصبہ کی دوسری طرف سنگ مرمر کا ایک جدید التعمیر مندر ہے۔ سنگ مرمر کے چکردار ستونوں اور عمارت کا نقش و نگار بہت دلفریب ہے۔ برامدہ میں بانئے مندر کی مورت سطح فرش کے ہموار بنی ہوئی ہے۔ لوگ اس پر سے گزرتے ہوئے مندر میں جاتے ہیں۔ مدعا اس سے یہ ہے کہ زائرین کی پامالی سے بانی کو نجات حاصل ہو ॥

دریائے جمنا کے کنارے کنارے بہت سے رئیسوں اور ساہوکاروں کے مکان اپنے اپنے نام سے بنے ہوئے ہیں۔ اور کئی جگہ فقرا اور مساکین کے واسطے سدابرت جاری ہیں ✦

آگرہ (اکبرآباد)

مَیں متھرا سے ۳۳ میل طے کرنے کے بعد آگرہ پہنچا۔ یہ شہر دریائے جمنا کے کنارے پر آباد اور دہلی قدیم کے بعد دوسرا شہر ہے جسے ہندوستان کا دارالخلافہ ہونے کی عزت حاصل ہو چکی ہے۔ اس شہر کی ابتدائی آبادی سلطان سکندر لودھی کی یادگار ہے جس نے پندرھویں صدی مسیحی میں دہلی کے عوض اس کو ہندوستان کا دارالسلطنت قرار دیا تھا۔ اس کی موجودہ صورت شہنشاہ اکبر کی یادگار ہے۔ جس نے ۹۷۳ھ (۱۵۶۶ء) میں اکبرآباد کے نام سے اسے فخر بخشا۔ شہنشاہ موصوف۔ جہانگیر اور شاہجہاں کے زمانے میں تقریباً سو برس تک یہ شہر ہندوستان کا پایۂ تخت رہا۔ آخر شاہجہاں آباد کے آباد ہونے سے اس کی رونق دہلی کو منتقل ہو گئی۔ مغلوں کے عہد میں یہ شہر صوبۂ [1] اکبرآباد

[1] شاہی زمانے میں صوبہ اکبرآباد کے متعلق بڑے بڑے شہر یہ تھے۔ اکبرآباد۔ بیانا۔ سیکری۔ گوالیار۔ کالپی۔ متھرا۔ قنوج۔ لکھن پور۔ بھرت پور اور الور ✦

جامع مسجد۔ آگرہ
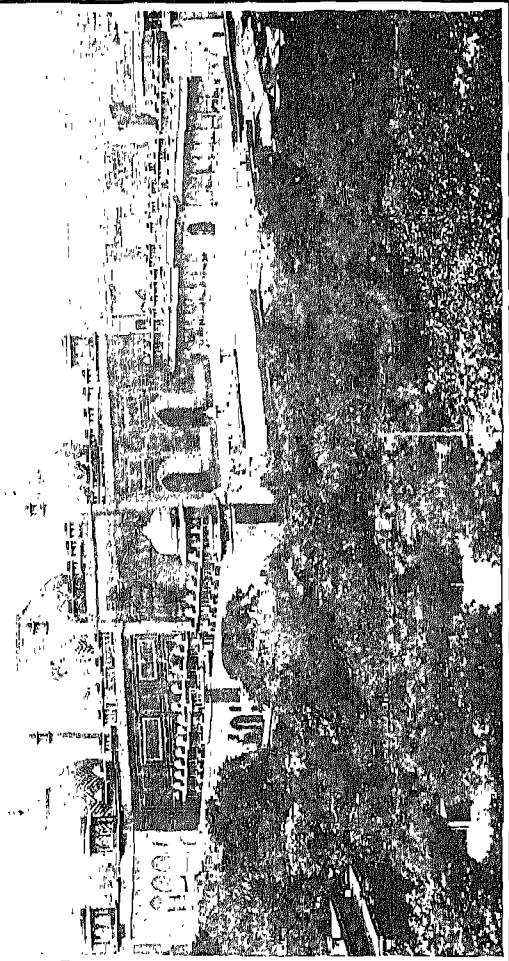
کا دار الحکومت تھا۔ اٹھارھویں صدی مسیحی میں جبکہ مغلیہ خاندان ضعیف ہو گیا۔ تو جاٹ اور مرہٹے اس پر قابض ہوئے۔ سنہ ۱۸۰۳ء میں انگریزوں کے قبضے میں آیا۔ اور کچھ عرصے تک ممالک مغربی و شمالی کے لفٹنٹ گورنر کا صدر مقام رہا۔

آگرہ کے گرد دہلی کی طرح کوئی فصیل نہیں اور نہ چاندنی چوک جیسا کوئی وسیع بازار ہے۔ مگر شاہی زمانے کی چند ایسی شاندار اور عجوبۂ روزگار عمارتیں یہاں موجود ہیں کہ یورپ و امریکہ کے سیاح بڑے شوق سے ان کو دیکھنے آتے ہیں۔ اس وقت یہ شہر حکام سول کا صدر مقام ہے۔ اس کی آبادی سنہ ۱۹۰۱ء کی مردم شماری کے مطابق ایک لاکھ اٹھاسی ہزار ہے۔ یہاں کی زبان اُردو ہے۔

ریل سے جب لکڑی کے پُل پر سے ہو کر شہر کو جائیں تو پہلے ایک دو منزلہ جامع مسجد آتی ہے جسے شاہجہاں نے اپنی بیٹی جہاں آرا بیگم کے نام پر سنہ ۱۰۵۷ھ مطابق ۱۶۴۷ء میں تعمیر کرایا تھا۔ یہ مسجد بہت وسیع اور عمارتی خوبیوں کے لحاظ سے اعلےٰ درجے کی ہے۔ اس کے منارے مسافران ریل کو دُور سے دکھائی دیتے ہیں۔ اس کی دُکانوں کے کرایہ کی آمدنی معقول ہے۔ اور اس سے عربی کا ایک مدرسہ اسی مسجد میں جاری ہے۔ یہاں سے دائیں ہاتھ چند لمبے لمبے اور شاندار بازار دور تک چلے جاتے ہیں۔ ان میں سے جوہری بازار۔ کناری بازار اور سیب بازار بہت آباد اور ان کی عمارتیں خوشنما ہیں۔ یہاں ہر قسم کا تجارتی سامان بکثرت موجود رہتا ہے کناری بازار سے ایک راستہ مٹھائی کے پُل تک چلا گیا ہے۔ اس راستہ کے دائیں ہاتھ مشن کالج اور بائیں جانب گورنمنٹ ہسپتال ہے۔ یہ راستہ راجا کی منڈی

کے جوڑا ہے بس جا ملتا ہے جو آگرہ کی ایک مستقل آبادی اور شہر سے ملی ہوئی ہے۔ یہاں ایک چھوٹا سا ریلوے اسٹیشن بھی ہے +

اس جگہ صنعت و حرفت کا کام اچھا ہوتا ہے۔ یہاں کے لوگ سنہری لیس۔ قالین۔ دریاں اور بوٹ بنانے میں مشہور ہیں۔ یہ چیزیں درحقیقت عمدہ بھی ہوتی ہیں۔ اور دور دور ان کا دساور جاتا ہے۔ پتھر کا تجارتی سامان بھی خوب بنتا ہے۔ یہاں سے کئی طرف کو ریل کی سڑکیں نکلتی ہیں۔ اور اس سے تجارت کو خوب ترقی ہے +

ایک زمانے میں یہ شہر علمی حیثیت سے بہت ممتاز تھا۔ شہنشاہ اکبر کا وزیراعظم شیخ ابوالفضل اور ملک الشعرا شیخ فیضی جیسے جوہر تاباں اسی سرزمین سے پیدا ہوئے تھے۔ اخیر زمانے میں فارسی کے مسلم الثبوت استاد سراج الدین علی خاں آرزو اور اردو کے مشہور شاعر نظیر نے اس کی شہرت کو تازہ کیا۔ ہمارے زمانے میں آگرہ کو یہ خصوصیت حاصل ہوئی۔ کہ ملکہ معظمہ قیصرہ ہند کو اردو زبان سکھانے کے واسطے جو شخص تمام ہندوستان سے منتخب ہو کر ولایت بھیجے گئے۔ وہ منشی حافظ عبدالکریم اسی جگہ کے رہنے والے ہیں +

غدر سے پیشتر یہاں کا گورنمنٹ کالج مشرقی اور مغربی علوم کی ترقی کے لحاظ سے بہت مشہور تھا۔ یہ کالج اب بھی موجود ہے۔ اور بہت عمدہ حالت میں ہے۔ مگر مشرقی ترقیات کا حصہ جاتا رہا۔ اس کے علاوہ دو کالج مشنریوں کے ہیں۔ ان میں سے سینٹ پیٹرس کالج ہیں صرف یورپین اور یوریشین طالب علم پڑھتے ہیں۔ ایک میڈیکل سکول بھی ہے۔ مسلمانوں کا ایک یتیم خانہ معمولی طور سے چل رہا ہے۔ چند دیسی چھاپے خانے ہیں
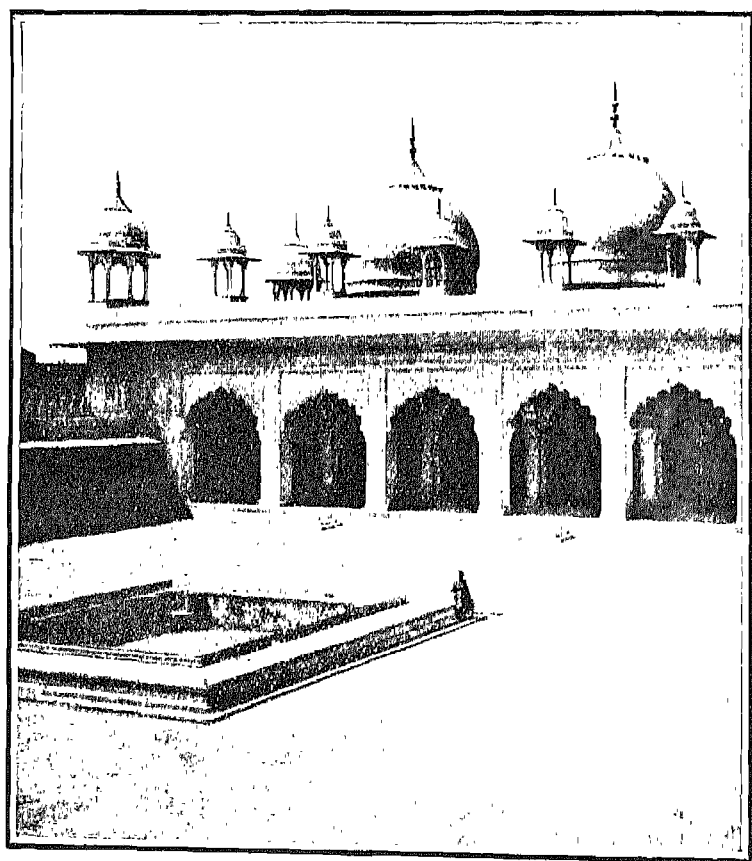
موتی مسجد (اندرون قلعہ) — آگرہ

اور اُردو اخبار بھی نکلتے ہیں - اخبار تو کچھ باوقعت نہیں مگر چھپوائی کتب کا انتظام بہت عمدہ ہے - خصوصاً صوفی قادر علی خاں کا "مطبع مفید عام" اپنے حُسنِ انتظام اور عمدگی طبع کے باعث بہت مشہور ہے ÷

شہر سے دو میل کے فاصلے پر انگریزی چھاؤنی ہے - اور موجودہ ضروریات کے لحاظ سے اس میں کافی فوج رہتی ہے ÷

آگرہ کی بیرونی عمارتیں

دہلی کے بعد ہندوستان کے جن شہروں کو اسلامی آثار قدیمہ کے باعث شہرت حاصل ہے - اُن میں سے آگرہ نہایت خصوصیت کی جگہ ہے - مغلوں کے زمانے میں یہاں ایسی ایسی عمدہ عمدہ عمارتیں موجود تھیں جن کے ٹوٹے پھوٹے گنبد - بارہ دریاں اور باغات اب تک اپنے بانیان کی عظمت و شوکت کو یاد دلاتے ہیں - جو عمارتیں دستبرد زمانہ سے محفوظ اور اعلےٰ درجہ کی صناعی کے باعث بے نظیر ہیں - ان میں سے چند عمارتوں کا مختصر حال ذیل میں درج کیا جاتا ہے ÷

قلعہ

قلعہ - شہر سے باہر اور ریلوے اسٹیشن کے دوسری طرف شہنشاہ اکبر کا قلعہ ہے - اسکی عمارت سنگ سُرخ کی اور چار طرف خندق بنی ہوئی ہے - اسکی دیواریں ۷۰ فٹ بلند اور قلعہ کا دور کم و بیش دو میل ہوگا - شاہی محل سرا - دیوان عام - دیوان خاص - مثمن برج - انگوری باغ - حوض شیش محل وغیرہ عمارتوں کی مسلسل موجودگی سے اُن مکانات کی اصل کیفیت کا اندازہ ہوتا ہے جو شاہی زمانے میں بنائی گئی تھیں - یہ عمارتیں خصوصاً موتی مسجد جسے شاہجہاں نے ۱۰۵۶ھ مطابق ۱۶۴۸ء میں تعمیر کرایا تھا - اپنی عمدگی اور خوبی کے باعث بہت اعلےٰ درجے کی ہیں - موتی مسجد کی نسبت ڈاکٹر ہنٹر صاحب نے لکھا ہے کہ یہ مسجد غالباً دنیا بھر کے تمام معبدوں میں سب سے زیادہ نفیس

اور دلکش ہے قلعہ دہلی کی عمارتیں اگرچہ صنعت اور لطافت میں اس سے بڑھکر
تھیں۔ مگر غدر ۱۸۵۷ء کے حوادث سے ان کا اکثر حصہ پامال ہوگیا ہے۔ یہ
آگرہ ہی کی خوش قسمتی ہے کہ یہاں کی عمارتیں اب تک اپنی اصلی حالت پر
قائم ہیں۔ یہ قلعہ جو شاہی شان و شوکت کے اظہار کی غرض سے بنایا گیا تھا۔
آخرکار انقلاب زمانہ سے سلاطین ہند اور اُن کی اولاد کا قیدخانہ قرار پایا۔
اورنگ زیب عالمگیر نے اپنے باپ شاہجہاں کو اسی قلعہ میں نظربند کیا۔
پھر اپنے بھائیوں کی اولاد کو بطور اسیرانِ شاہی اس میں رکھا۔ اُنیسویں صدی
میں بھائی رام سنگھ کوکا بھی اوّل اسی جگہ محبوس کیا گیا تھا ٭

تاج گنج

تاج گنج۔ ریلوے اسٹیشن سے مغرب کی طرف دو میل کے فاصلہ پر تاج گنج
کا روضہ دریائے جمنا کے کنارے دُنیا کے سیاحوں کی خاص دلچسپی اور
آگرہ کی شہرت کا باعث ہے۔ یہ روضہ شاہجہاں نے اپنی پیاری ملکہ ممتاز محل
کی یادگار میں (۱۰۵۸ھ ۱۶۴۸ء) بنایا تھا۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ موت کے بعد شاہجہاں
کو بھی اسی روضہ میں جگہ ملی۔ ملکہ کا اصل نام تو ممتاز محل تھا۔ مگر کثرت استعمال
سے بگڑتے بگڑتے تاج محل ہوگیا۔ یورپین سیاح اکثر اسے تاج گنج اور کبھی
صرف تاج کہتے ہیں ٭

یہ عمارت ایک بڑے سرسبز اور دلکشا باغ میں واقع ہے۔ ایک بڑے
عظیم الشان دروازے سے میں اس میں داخل ہوا۔ یہاں چند ایسے لوگ دکھائی
دیئے جو سنگ مرمر کے چھوٹے چھوٹے تاج محل کے نمونے اور پتھر کی دیگر
خوشنما چیزیں فروخت کی غرض سے لئے بیٹھے تھے۔ روضہ کی عمارت ایک
نہایت خوشنما اور بلند چبوترے پر واقع ہے اور تمام سنگ مرمر کی
بنی ہوئی ہے۔ چبوترے کے چاروں کونوں پر چار بلند و خوبصورت مینارے

روضہ تاج محل - آگرہ

اندرون روضہ تاج محل — آگرہ
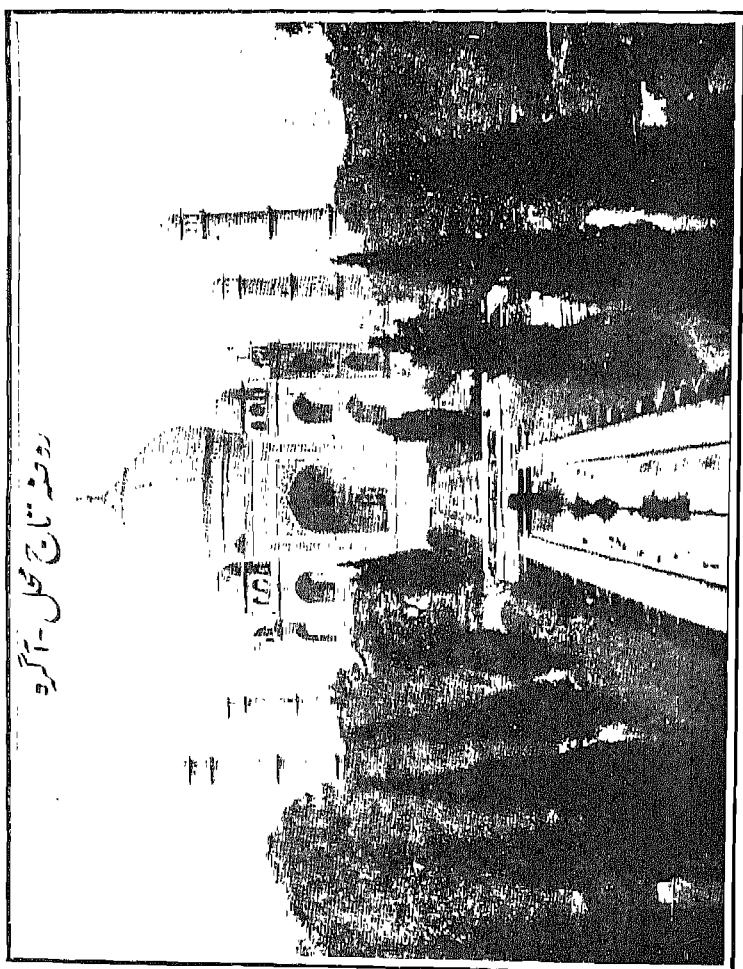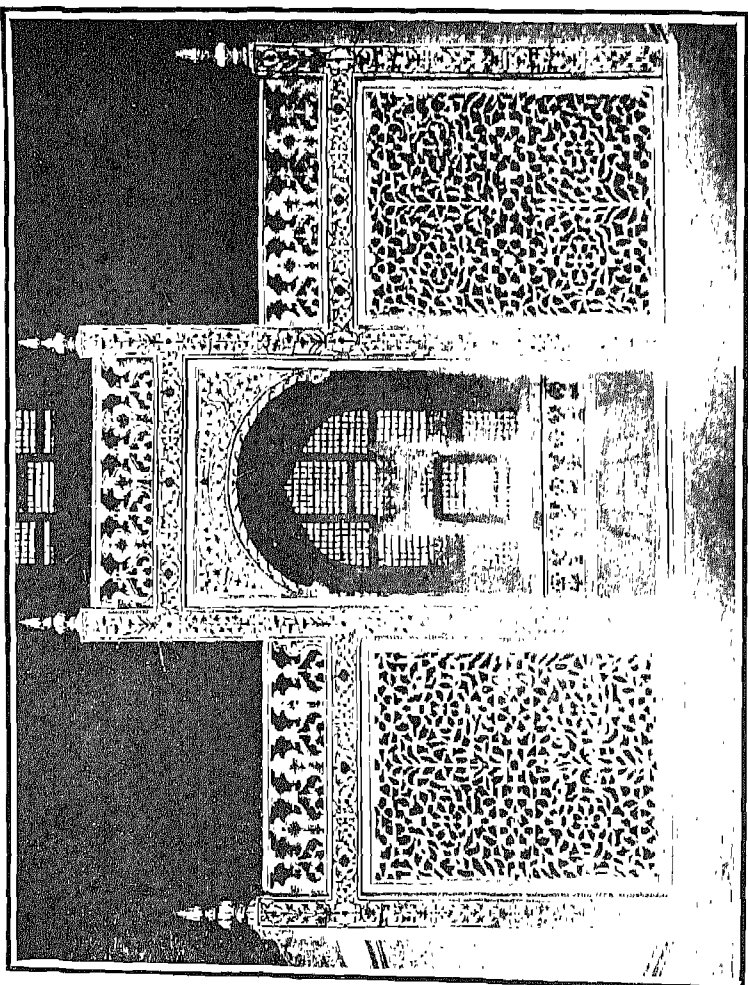
ہیں۔ جن پر سے شہر اور اس کے گرد و نواح کا منظر بہت دور تک دکھائی دیتا ہے۔ مقبرہ پر بہت عمدہ اور شاندار گنبد ہے۔ جس کے نیچے تاج محل اور شاہجہاں کی قبریں ہیں۔ ان قبروں کے اردگرد سنگ مرمر کی نہایت خوشنما جالیاں لگی ہوئی ہیں۔ عمارت کے اندر باہر اعلےٰ درجے کے بیل بوٹوں اور مختلف اقسام کے نقش و نگار کے سوا پچی کاری کا جو حیرت انگیز کام کیا ہؤا ہے۔ اُس کی نظیر دُنیا کی کسی عمارت میں نہیں ملتی۔ مبصرین فن تعمیر کی رائے ہے کہ اس دلفریب عمارت کے بنانے والوں نے معماری کے متعلق وہ کام دکھایا ہے۔ جو زیورات پر باریک نقش و نگار کرنے والے اُستاد کیا کرتے ہیں۔ یہ عجیب و غریب عمارت جو عجائبات دنیا میں شمار کی گئی ہے۔ ہندوستانی یگانہ روزگار معماروں کی اٹھارہ سالہ محنت و قابلیت کا نتیجہ ہے۔ جس نے آج اس ترقی کے زمانے میں بڑے بڑے ماہر اور تجربہ کار انجنیروں کو حیرت میں ڈال دیا ہے۔

فرانس کے مشہور سیّاح ڈاکٹر برنیر نے جو اورنگ زیب کے زمانے میں اس جگہ تھا۔ اپنے ایک سوداگر دوست کو لکھا ہے "تمام فرنگستان میں ایسا حیرت افزا اور عظمت و شان کا کوئی مکان میں نے نہیں دیکھا"۔ اس سیّاح کے ڈھائی سو برس بعد اس زمانے میں کہ نئی اور پُرانی دُنیا کے تمام براعظموں میں آمد و رفت کے راستے کُھل گئے ہیں۔ بمبئی کے سابق گورنر سر رچرڈ ٹیمپل عمارت کی عمدگی اور خوبی کو ان الفاظ سے تعبیر کرتے ہیں "دنیا کی تمام عمارتوں میں باعتبار حُسن و خوبی کے تاج محل ایک ملکہ ہے"۔

مقبرہ اعتماد الدولہ ۔ نواب اعتماد الدولہ مرزا غیاث الدین نورجہاں کا والد

مقبرہ اعتماد الدولہ

اور شہنشاہ جہانگیر کا وزیر اعظم تھا۔ یہ مقبرہ دریائے جمنا کے پرلی جانب ایک باغ میں بنا ہؤا ہے۔ اور مشرقی طرز کی عمارت کا ایک اعلےٰ ترین نمونہ ہے۔ اس کی عمارت سنگ مرمر کی اور نقش و نگار، پچی کاری کے کام سے مزین ہے۔ اس کی تعمیر شہنشاہ جہانگیر کے حکم سے ہوئی تھی +

مقبرہ اکبر

مقبرہ اکبر۔ آگرہ سے چار پانچ میل متھرا کی سڑک پر جائیں۔ تو موضع سکندرہ میں شہنشاہ اکبر کا عظیم الشان مقبرہ آتا ہے جو ایک باغ کے وسط میں بنایا گیا ہے۔ باغ کی چار دیواری کے کونوں پر چار مینار بنے ہوئے ہیں۔ شہنشاہ اکبر کی اصل قبر تو نیچے کے تہ خانے میں ہے۔ مگر اس پر دو منزلہ عمارت بنا کر قبر کا تعویذ چھت کی بلندی پر بنایا گیا ہے جو آسمان کے سائبان کے نیچے شان ایزدی دکھا رہا ہے۔ مقبرہ کی عمارت سنگ سرخ سنگ مرمر اور سنگ موسے کی ہے۔ اس میں مسلمانوں کی طرز تعمیر اور ہندوؤں کی قدیم طرز عمارت کا نہایت خوبی سے پیوند لگایا گیا ہے۔ یہ مقبرہ بھی شہنشاہ جہانگیر کا بنوایا ہؤا ہے +

لاڈلی

لاڈلی۔ بیرون شہر اور بھی بہت علما اور باکمال لوگوں کے مزار ہیں۔ جو مرور زمانہ سے عالم بےخبری میں پڑے ہیں۔ بعض مزار زمینداروں کے حرص و طمع سے سطح زمین سے برابر ہو کر نابود ہو گئے ہیں منجملہ مزارات قدیمہ کے ایک مزار لاڈلی کے نام سے موسوم اور شہنشاہ اکبر کے روضہ سے میل ڈیڑھ میل کے فاصلہ پر ہے۔ کہتے ہیں کہ ملک الشعرا شیخ فیضی اور ان کے والد شیخ مبارک کا مقبرہ اس جگہ تھا۔ اب قبروں کی تو کوئی علامت نہیں۔ مگر ایک شکستہ چار دیواری کے احاطے میں گنبد کے آثار قدیمہ موجود ہیں۔ لاڈلی بیگم شیخ مبارک کی بیٹی کا نام ہے جس کی شادی علاء الدین

اسلام خاں نبیرۂ حضرت سلیم چشتی سے ہوئی تھی - چونکہ آخر زمانے میں مقبرہ کا اہتمام ان بیگم صاحب کے سپرد تھا - اور وہ بھی اسی مقبرہ میں دفن ہوئیں - اس واسطے یہ جگہ لاڈلی کے نام سے مشہور ہے +

نور اللہ شوستری - اس مقبرہ سے تھوڑے فاصلے پر بعض اور مشاہیر کی قبریں ہیں جن کی علمی یادگاریں اُن کے نام کو اب تک زندہ کر رہی ہیں - ان میں سے نہر کے پُل اور دیوانی کچہری کے قریب قاضی نور اللہ صاحب شوستری کا مقبرہ خصوصیت سے قابل ذکر ہے - قاضی صاحب شہنشاہ اکبر کے زمانے میں شیعہ مذہب کے بہت بڑے مجتہد تھے - ان کے مقبرہ کی چاردیواری پختہ اور آگرہ کے سب مقبروں سے عمدہ حالت میں ہے - مرثیہ خوانی کی مجلسیں وقتاً فوقتاً یہاں ہوتی رہتی ہیں +

فتح پور سیکری - یہ آگرے سے ۱۹ میل کے فاصلہ پر ہے - اس میں بڑی بڑی عالیشان عمارتیں ہیں - جن کی سیر ایک سیاح کے لئے دلچسپی سے خالی نہیں - اس کی بنا شہنشاہ اکبر نے ڈالی تھی اور اسے اپنا پایۂ تخت بنانا چاہتا تھا - مگر بعد میں اُس کی رائے تبدیل ہو گئی - اور اس وجہ سے عمارتیں مکمل نہ ہو سکیں - افسوس ہے کہ قلت وقت کے باعث مجھے یہاں جانے کا موقع نہیں ملا +

دَھولپور

مَیں آگرہ سے ۳۴ میل طے کرنے کے بعد دَھولپور آیا - یہ شہر ریلوے لائن پر اسی نام کی ریاست کا دارالحکومت ہے - اس کی آبادی دریائے چنبل کے کنارے راجہ دھولن کی یادگار ہے - جس نے گیارھویں صدی عیسوی کے آغاز میں اس کی بنیاد ڈالی تھی - سلطان سکندر لودھی کی

فتوحات ۹۰۱ھ / ۱۵۰۱ء سے یہ شہر مسلمانوں کے قبضے میں آیا - سولھویں صدی مسیحی میں شہنشاہ ہمایوں نے دریائے چنبل کے حملوں سے محفوظ رہنے کی وجہ سے آبادی کا رُخ شمال کی طرف منتقل کر دیا - شاہی زمانے میں یہ شہر صوبۂ آگرہ کے متعلق تھا - اور اب راجپوتانہ کی ریاست میں شمار ہوتا ہے - اس کی موجودہ حیثیت ایک قصبہ کی ہے اور آبادی تقریباً ۱۹ ہزار - باشندوں کی اصل زبان ہندی - مگر اُردو بھی سمجھی جاتی ہے ؎

ریلوے اسٹیشن سے تھوڑے ہی فاصلہ پر نئی آبادی شروع ہو جاتی ہے جس کی سڑکیں وسیع ، صاف اور آبادی خوشنما ہے - خصوصاً باغوں سے اس کی رونق اور بھی بڑھ گئی ہے - ریاست کے دفتر اور محلات اسی حصے میں ہیں - یہ آبادی گزشتہ چند سالوں سے شروع ہوئی ہے - قدیمی آبادی اس سے ذرا فاصلہ پر ہے - اس کے بازار اور سڑکیں پرانی وضع کی اور معمولی حالت میں ہیں - شہر کے اس طرف شاہی زمانہ کی چند مسجدیں - سرائیں اور مقبرے ویرانہ میں کس مپرسی کی حالت میں پڑے ہوئے ہیں - ان میں سے چند عمارتیں قابل دید ہیں - خصوصاً صادق محمد خاں کے مقبرہ کی عمارت قدیمی صناعی کا ایک نمونہ ہے - صادق محمد خاں شہنشاہ اکبر کا جرنیل اور ۱۰۰۶ھ / ۱۵۹۷ء میں فوت ہوا تھا - شہر سے دو میل کے فاصلہ پر جھیل مچ کنڈ ہے جس کے اردگرد چند مندر بہت عمدہ بنے ہوئے ہیں - یہاں ہر سال مئی اور ستمبر میں میلے لگتے ہیں - ریاست کے فرمانروا رانا رام سنگھ صاحب میو کالج اجمیر کے تعلیم یافتہ اور امپیریل کیڈٹ کور میں فوجی قابلیت عمدہ حاصل کر چکے ہیں ؎

ریلوے اسٹیشن کے باعث تجارت کو دن بدن ترقی ہے خصوصاً

میلہ سرادھولپور میں جو ہر سال اکتوبر میں ہوتا اور پندرہ دن تک رہتا ہے۔ مویشیوں۔گھوڑوں اور کئی قسم کی تجارت ہوتی ہے۔تعلیم ابھی ابتدائی حالت میں ہے۔صرف ایک مدرسہ ہے جس میں انگریزی اردو اور ہندی مڈل کلاس تک پڑھائی جاتی ہے +

میں اپنے قدیمی شفیق پنڈت سروپ نرائن صاحب افسر محکمہ بندوبست کا ممنون ہوں کہ ان کی وجہ سے شہر کی سیر اور مقامی حالات دریافت کرنے میں اچھی مدد ملی +

تاریخی حالات - ڈھولپور کا حکمران خاندان بمرولیا گوت کے جاٹ ہیں جو زمانہ سابق میں گوہد کے رانا کہلاتے تھے۔اس وقت گوالیر بھی ان کی عملداری میں تھا۔مگر مرہٹوں کی فتوحات میں وہ ریاست ان کے ہاتھ سے جاتی رہی۔موجودہ ریاست گورنمنٹ انگریزی کی مدد سے قائم ہوئی ہے۔اس کے بانی رانا کیرت سنگھ ہیں۔ان کے بیٹے رانا بھگونت سنگھ نے مفسدہ ۱۸۵۷ء میں گورنمنٹ انگریزی کی بڑی بڑی خدمات کیں۔ ۱۸۷۳ء میں ان کے پوتے رانا نہال سنگھ جانشین ہوئے۔آپ سنٹرل انڈیا ہارس کے رسالہ میں آنریری میجر تھے۔اور تیراہ کی لڑائی میں کئی تمغے حاصل کئے۔موجودہ فرمانروا ان کے بیٹے رانا رام سنگھ ہیں جن کی علمی قابلیت کا حال پہلے تحریر ہو چکا ہے +

ریاست کا رقبہ ایک ہزار ۱۹۷ مربع میل۔آبادی ۲ لاکھ ۷۰ ہزار ۹۷۳ آدمیوں کی ہے۔اس میں سے ۶ فیصدی مسلمان اور باقی ہندو وغیرہ ہیں۔آمدنی نو لاکھ روپے سالانہ۔یہاں سنگ سرخ بہت عمدہ ہوتا ہے اور عمارتی ضروریات کے واسطے دور دور تک جاتا ہے +

گوالیر

ڈھولپور سے ۴۰ میل طے کرنے کے بعد ہم گوالیر آیا۔ راستہ میں دریائے چمبل سے عبور کرنا پڑا جو ڈھولپور سے نزدیک اور دونو ریاستوں میں حدفاصل ہے۔ شہر گوالیر ریلوے لائن کے کنارے اسی نام کی ریاست کا دارالحکومت ہے۔ یہاں کا قلعہ قدامت اور تاریخی حیثیت سے بہت مشہور ہے۔ یہ قلعہ ایک ایسی اونچی پہاڑی پر بنایا گیا ہے کہ ریل کے مسافروں کو کئی میل دور سے دکھائی دیتا ہے۔ بالفعل شہر کی دو علٰحدہ علٰحدہ آبادیاں ایک دوسرے سے تھوڑے فاصلے پر واقع ہیں۔ نئی آبادی کو لشکر اور پرانی کو گوالیر کہتے ہیں۔ ان دونو کی مجموعی آبادی ایک لاکھ ۱۹ ہزار ہے۔

لشکر۔ یہ حصہ قلعہ کے جنوب کی طرف ہے۔ ابتداءً مہاراجہ سندھیا کی فوج یہاں رہا کرتی تھی۔ اور اسی مناسبت سے اس کو لشکر کہتے تھے۔ ۱۸۱۰ء میں جب مہاراجہ صاحب نے اپنا دارالحکومت اُجین سے یہاں منتقل کیا تو شہرت سابقہ سے لشکر ہی اس کا نام قائم رہا۔ والیٔ ریاست اور امیروں نے عمدہ عمدہ عمارتیں بنوائیں۔ اس سے اس کی آبادی میں ترقی شروع ہوئی۔ ریلوے اسٹیشن سے لشکر تک تمام راستہ باغات کی وجہ سے سرسبز ہے۔ آبادی کا زیادہ حصہ خاسکر باڑہ کے چوک میں ہے جہاں ریاست کی کچہریاں ہیں۔ شہر کا یہ حصہ بہت وسیع اور عمارتی خوبیوں کے لحاظ سے بہت بارونق ہے۔ تمام بڑے بڑے آدمیوں کی دکانیں اسی موقع پر ہیں۔

اکثر لوگ ملازمت پیشہ ہیں - حرفت و صنعت کے لحاظ سے
چنداں ترقی نہیں - کپڑے کی رنگائی - چھپائی اور اُتو کا کام البتہ اچھا
ہوتا ہے ملک کی ضروریات کے واسطے باہر کی بنی ہوئی چیزیں آتی
ہیں +

اس وقت یہاں کے فرمانروا مہاراجہ سر مادھو راؤ صاحب بہادر
سندھیا ہیں - ان کو انگریزی - مرہٹی اور اُردو زبانوں میں اچھی مہارت
اور زمانہ حال کے طریق حکمرانی سے خوب واقفیت ہے - ان کی وسعت خیالی
اور خوش انتظامی سے جو تمدنی ترقیات اس ریاست کو حاصل ہوئی ہیں -
اُن کے لحاظ سے گوالیر ہندوستان کے ممتاز شہروں میں شمار کیا جاتا
ہے - مسلمانوں کی آبادی اگرچہ چھ فیصدی سے زیادہ نہیں - مگر اس پر
بھی چند لائق تعلیم یافتہ مسلمان اچھے اچھے عہدوں پر سرفراز ہیں - مسلمانوں
کی بعض پُرانی مراسم کے ادا کرنے میں جو رعایتیں بانیان ریاست کے
زمانے میں مدنظر تھیں - اب تک اُن کا لحاظ کیا جاتا ہے - محرم کی
تقریب پر جس قدر خرچ خزانہ ریاست سے ہوتا ہے - اور جس عظمت
اور شان سے یہ تیوہار منایا جاتا ہے - یہاں سے بڑھکر شاید لکھنؤ میں
ہوتا ہو - اور ہندو ریاست میں تو کہیں اس کی نظیر نہیں +

مہاراجہ صاحب نے رعایا کی بہتری اور بہبودی کی غرض سے تعلیمی
حالت کو بہت ترقی دی ہے - مختصر کیفیت موجودہ درس گاہوں کی
حسب ذیل ہے :-

(۱) کالج جس کی پڑھائی بی - اے تک ہے - اس کے ساتھ عربی فارسی
اور سنسکرت کی تعلیم کے واسطے ایک علیحدہ ڈیپارٹمنٹ ہے جس میں

مولوی فاضل اور منشی فاضل تک تعلیم دی جاتی ہے۔ مولوی محمد تراب علی صاحب مشرقی زبانوں کے پروفیسر اور متعدد کتابوں کے مشہور مصنف ہیں +

(۲) کلریکل سکول جس میں اس قدر تعلیم دی جاتی ہے کہ دفتر کی منشی گری انجام دینے کی لیاقت حاصل ہو سکے +

(۳) سروس سکول جس کی تعلیم سے محکمہ مال کے عہدہ داروں کا بہم پہنچانا مدِنظر ہے +

(۴) سردار سکول جو صرف ریاست کے رئیس زادوں کی تعلیم کے واسطے کھولا گیا ہے +

(۵) پولیس ٹریننگ - ملازمان پولیس کے واسطے +

(۶) ملٹری سکول - فوجی تعلیم کے واسطے +

(۷) آرٹ سکول - حرفت وصنعت کی تعلیم کے واسطے +

خاص خاص علوم وفنون کی تعلیم کے واسطے طالب علموں کو وظائف دیکر ہندوستان کے مشہور مدارس میں بھیجنے کا انتظام بھی ہے۔ چنانچہ یہاں کے متعدد طالب علم اجمیر - پونہ - ڈیرہ دون - رڑکی اور لاہور میں بھیجے گئے ہیں۔ لڑکیوں کی تعلیم کے واسطے ایک مدرسہ مہارانی گرلز سکول کے نام سے جاری ہے۔ اس میں ہندی - مرہٹی - اردو لکھنا پڑھنا - حساب - سینا - کشیدہ کاڑھنا - کھانا پکانا سکھلایا جاتا ہے۔ مہاراجہ صاحب کی عالی حوصلگی اور ہنر پسندی کی ایک روشن مثال چھوٹی پٹڑی کی ریل ہے جو قلمرو کے بڑے بڑے مقامات میں بچھائی گئی ہے۔ مجھے آخری سفر میں معلوم ہوا کہ مہاراجہ صاحب شہر میں ٹریموے جاری کرنے کا ارادہ بھی

کر رہے ہیں ۔

گوالیر

گوالیر قلعہ کے شمال کی طرف گوالیر کی قدیم آبادی ہے۔ ٹیمک صاحب کے باغ اور پھول باغ کی سڑک سے ہوتے ہوئے تقریباً تین میل کی مسافت طے کرنے کے بعد گوالیر آتا ہے۔ پہلے اس راستہ میں ڈفرن سرائے اور ایک ہوٹل ملتا ہے۔ پھر ایک کھلے میدان میں شیخ محمد غوثؒ کا مقبرہ دکھائی دیتا ہے۔ شیخ صاحب شہنشاہ اکبر کے زمانے میں ایک مشہور بزرگ گزرے ہیں۔ عام خیال ہے کہ اعمال کواکب خصوصاً مریخ کے عمل میں انہیں بہت دخل تھا۔ سنہ ۹۷۰ھ ۱۵۶۲ء ہجری میں اسی برس کی عمر میں فوت ہوئے۔ مقبرہ کی عمارت ہشت پہلو بہت اعلےٰ درجے کی بنی ہوئی ہے۔ اور اس میں سنگ سفید کا کام خوب کیا ہے۔ مرور زمانہ سے اس کی عمارت میں فرسودگی کے علامات نمودار ہو گئے تھے۔ مہاراجہ صاحب کے حکم سے اس کی مرمت ہو گئی ہے۔

شیخ صاحب کے مقبرہ سے کوئی چالیس پچاس قدم کے فاصلہ پر تان سین کی قبر ہے جس کی چھت بارہ ستونوں کی عمارت پر قائم ہے۔ تان سین ہندوستان کے ایسے مشہور موسیقی دانوں میں گزرا ہے کہ جس کے نام سے گویّے اب تک اپنا کان پکڑ لیتے ہیں۔

یہاں سے گوالیر کی پرانی آبادی کے آثار شروع ہو جاتے ہیں۔ قلعہ کے قریب پہنچکر ایک دو بازار ملتے ہیں جو گوالیر کی قدیم آبادی کی عظمت کو اس خستہ حالی میں ظاہر کر رہے ہیں۔ مسلمانوں کی یادگار اس وقت صرف شہنشاہ عالمگیر کی جامع مسجد ہے۔ جو چوک بازار میں قلعہ کے پائیں بنی ہوئی ہے۔ یہ مسجد معتمد خاں نے سنہ ۱۰۷۶ھ ۱۶۶۵ء میں بنوائی تھی۔ اس ...

کے نیچے کی دکانیں کچھ مدت سے ریاست کے قبضہ میں تھیں جو مہاراجہ صاحب حال نے انجمن اسلامیہ کی درخواست پر واگزار کر دیں +

قلعہ گوالیر۔ یہ قلعہ شہر گوالیر سے جنوب کی طرف ہے۔ راجا سورسین نے ساتویں صدی مسیحی میں اسے تعمیر کرایا تھا۔ مضبوطی اور استحکام کے لحاظ سے ہندوستان کے مشہور قلعوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ سلطان محمود غزنوی کے زمانے سے مسلمانوں نے اس کو اپنی فتوحات کا نشانہ بنایا۔ آخر سلطان شمس الدین التمش کے عہد ۶۳۰ھ میں مستقل طور سے اُن کے قبضہ میں آیا۔ تاج الدین ریزہ دبیر مملکت نے اس فتح کی تاریخ میں یہ قطعہ فی البدیہ کہا تھا جو بادشاہ کے حکم سے قلعہ کے دروازے پر کندہ کروایا گیا ؎

ہر قلعہ کہ سلطانِ سلاطیں بگرفت ۔۔۔ از عونِ خدا و نصرت دیں بگرفت

واں قلعۂ گوالیار و آں حصنِ حصیں ۔۔۔ در ستمائۂ سنہ ثلثین بگرفت

سلاطین دہلی کے زمانے میں اسیرانِ شاہی اس جگہ بند رہا کرتے تھے۔ غالباً سلطان علاء الدین خلجی نے سب سے پہلے اپنے بیٹوں کو اس جگہ قید کیا تھا۔ اکبر کے زمانے میں بہادر نظام شاہ والئے احمد نگر یہاں مقید کیا گیا۔ پھر جہانگیر بادشاہ کے زمانے میں حضرت امام ربانی شیخ احمد سرہندی اور سکھوں کے چھٹے گرو ہرگوبند کچھ مدت اس میں مقید رہے اٹھارھویں ۔ ۔ ۔ اور انیسویں صدی مسیحی میں یہ قلعہ سنٹرل انڈیا کی لڑائیوں کا بڑا دنگل تھا۔ ۱۷۴۳ء میں مہاراجی سندھیا نے اس کو فتح کیا۔ ۱۸۴۴ء میں گورنمنٹ انگریزی اس پر قابض ہوئی۔ پھر لارڈ ڈفرن نے ۱۸۸۵ء میں جھانسی کے عوض میں مہاراجہ سندھیا کو دے دیا۔ ریاست گوالیر

قلعہ گوالیر
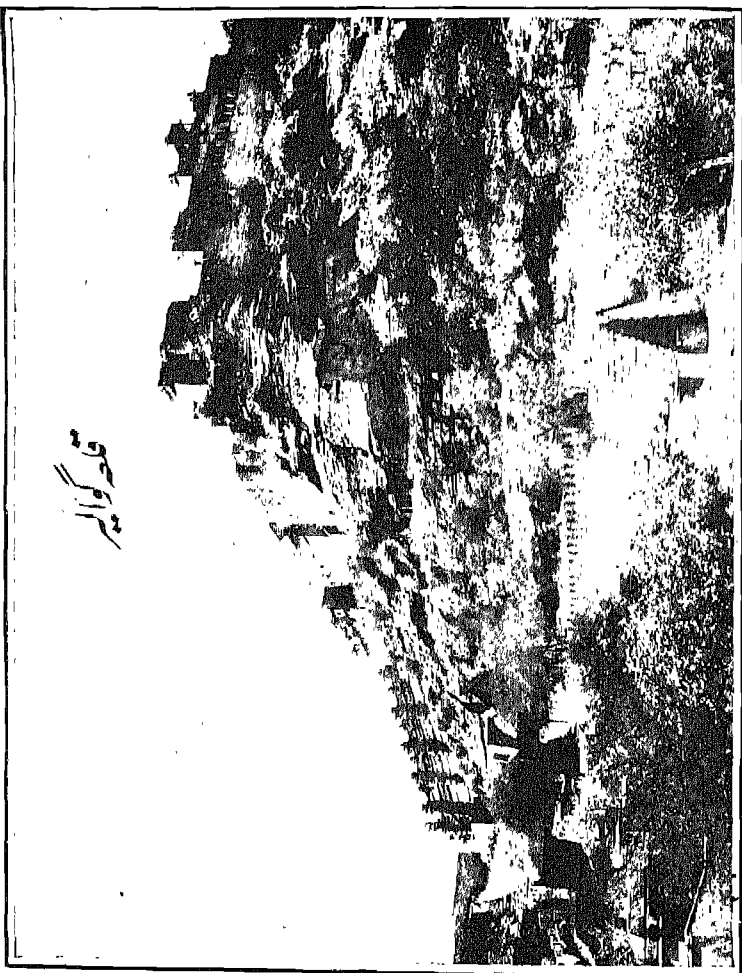
اس کے ملنے سے ایک ایسے قلعہ پر قابض ہوگئی ہے جو ہمیشہ سے فرمانروایان صوبۂ مالوہ کی شان وشوکت کا باعث سمجھا گیا ہے ۔

یہ قلعہ سطح زمین سے تقریباً تین چار سو فٹ بلند پتھر کی چٹان پر آباد ہے۔ لائق مہندسوں نے چٹان کا حصۂ زیرین اس خوبی سے تراشا ہے کہ سطح زمین سے اوپر تک ایک قدرتی دیوار بن گئی ہے ۔ اوپر کی دیواریں ۳۰ سے ۳۵ فٹ تک اونچی ہیں۔ قلعہ پر چڑھنے کا راستہ عالمگیری مسجد کے پاس سے شروع ہوتا ہے ۔ پہلے ایک عظیم الشان دروازہ آتا ہے ۔ پھر لمبی چکّر دار سڑک طے کرنے کے بعد چوٹی تک رسائی ہوتی ہے ۔ اس چڑھائی کی حفاظت کے واسطے بیرونی جانب کو ایک بڑی مستحکم فصیل اور موقع موقع پر مزید حفاظت کی غرض سے چھ دروازے بنے ہوئے ہیں ۔ پانچویں دروازے پر ایک مندر ہے ۔ جس کے کتبے سے تعمیر کا زمانہ ۲۶۳ھ ۸۷۶ء دریافت ہوا ہے ۔ چڑھائی کے خاتمے پر ایک ہموار سطح ڈیڑھ میل لمبی چلی گئی ہے ۔ جس کا عرض مختلف مقامات پر تین سو گز سے نو سو گز تک ہے ۔ اس سطح پر ہندوؤں کے پُرانے مندر اور سلاطین مغلیہ کی چند عالیشان عمارتیں موجود ہیں ۔ یہ عمارتیں اس وقت سب کی سب خالی اور کہیں کہیں شکستہ ہو رہی ہیں ۔ منجملہ عمارتوں کے راجامان سنگھ کا بنایا ہوا مندر اس اعتبار سے دلچسپ ہے کہ ہندوستان میں ہندوؤں کی تعمیر کا بہترین اور نہایت قدیم نمونہ ہے ۔ جنوب کی طرف کچھ عمارات جدید بھی ہیں جو صرف فوجی مقاصد کی غرض سے بنائی گئی ہیں ۔ ان میں توپ خانہ اور فوجی لوگ رہتے ہیں ۔ جنوب کو اور آگے بڑھیں تو ہندوؤں اور جینیوں کے کئی مندر ملتے ہیں ۔ جن میں سے

بائیں ہاتھ کو ساس اور بہو کے دو مندر خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ پہلے مندر کی نسبت لوگوں کا خیال ہے کہ پدم ناتھ کی یادگار راور ۴۸۶ھ / ۱۰۹۳ء کی تعمیر ہے۔ یہاں سے ایک کنڈ (تالاب) پر گزرتے ہوئے دائیں ہاتھ کو تیلی مندر آتا ہے۔ جس کے صحن میں جینیوں کی حیرت انگیز سنگین مورتیں بنی ہوئی ہیں۔ اس مندر کی جو مرمت گورنمنٹ انگریزی کی زیر نگرانی ۱۸۸۱-۸۳ء میں ہوئی تھی۔ اُس کے مصارف کی تفصیل ایک پتھر پر کندہ کر کے دروازہ صحن کی دیوار میں لگائی ہوئی ہے +

قلعہ میں پانی کا ذخیرہ بہت کافی ہے۔ مغرب کی جانب ایک گھاٹی ہے جس کو اروای کہتے ہیں۔ اُس میں آٹھ کوئیں اور نو باؤلیاں میٹھے پانی کی ہیں۔ سلطان شمس الدین نے ایک دیوار بنا کر ان چاہات اور باؤلیوں کو قلعہ کے اندر لے لیا تھا۔ ان کے علاوہ بھی قلعہ کے اندر چند تالاب ہیں ان میں سب سے پُرانا سورج کنڈ ہے۔ جس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ راجا بسواپتی نے سورج کے ایک مندر کے ساتھ اُسے تعمیر کرایا تھا۔ بعض تالاب اس وقت خشک و شکستہ ہو رہے ہیں +

وسط قلعہ سے ایک راستہ جنوب کی طرف چلا گیا ہے جو لشکر کی آبادی کے قریب سڑک سے جا ملتا ہے۔ قلعہ کی مشرقی جانب جینیوں کے غار ہیں جو پہاڑ کاٹ کاٹ کر بنائے گئے ہیں۔ یہ غار اپنی صنعت اور خوبیوں کے لحاظ سے بہت عجیب و غریب ہیں۔ میک صاحب کے باغ کے کنارے سے جو راستہ قلعہ کے نیچے نیچے گوالیر کو جاتا ہے وہاں سے ان مندروں کی سیر بہت عمدگی کے ساتھ ہو سکتی ہے +

مُرار

مُرار۔ ریلوے اسٹیشن کے مشرق کی طرف مُرار کی آبادی ہے۔ پہلے

یہاں پر انگریزی چھاؤنی رہتی تھی - اب صاحب رزیڈنٹ کا قیامگاہ ہے - اس کی آبادی روز افزوں ترقی پر ہے - اور تجارت کا چرچا بھی خوب ہے ؞

تاریخی حالات

تاریخی حالات - یہ ریاست صوبۂ مالوہ کی ریاستوں میں سب سے بڑی اور جلیل القدر ہے - اس کی بنیاد رانوجی سندھیا نے ڈالی تھی جو ایک مرہٹہ سردار علاقۂ پونا کے رہنے والے تھے - یہ ابتدا میں باجے راؤ پیشوا کی باڈی گارڈ کے جرنیل تھے - اٹھارھویں صدی مسیحی کے اوائل میں جبکہ دہلی کا فرمانروا محمد شاہ تھا - یہ وسط ہند میں آئے اور مالوہ کے ایک حصے پر بحیثیت جاگیردار قابض ہوکر اُجین کو دار الریاست قرار دیا - ان کے بعد ان کا فرزند مہاداجی سندھیا جانشین ہوا جو تاریخ ہند میں مہاداجی کے نام سے مشہور ہے ۔ ۱۱۷۵ھ ۱۷۶۱ء میں جب احمد شاہ ابدالی اور مرہٹوں میں بمقام پانی پت لڑائی ہوئی تو مہاداجی اس میں شریک تھے اور انہی خدمات کے صلے میں باپ کی جانشینی حاصل کی تھی - مہاداجی نے اپنے زمانے میں فوجی طاقت کو اس قدر ترقی دی کہ اورنگ زیب کے بعد کسی ہندوستانی رئیس کو ان کی ہمسری نصیب نہیں ہوئی - مالوہ اور راجپوتانہ پر فوج کشی کر کے اکثر زرخیز ملکوں پر قبضہ کیا - رفتہ رفتہ شاہ عالم کے مزاج میں جو آرام طلب آدمی تھا - دخیل ہوکر تمام ممالک شاہی پر قبضہ کر لیا - اور تھوڑے دنوں تک نربدا کے کنارے سے اٹک کی سرحد تک اس کا عمل دخل رہا - ۱۲۰۳ھ ۱۷۸۹ء میں سندھیا نے پھر شاہ عالم سے سازوباز کیا اور اس اندھے بادشاہ کو دوبارہ تخت نشین کر کے خود وزیر بنا - مہاداجی لنگڑا تھا - کسی ظریف نے خوب کہا - عجب قدرت قادر قدیر - اندھا بادشاہ لنگڑا وزیر -

اس راجہ کی مفصل کیفیت اُجین اور اندور میں مذکور ہے -

نام کو تو مہادا جی وزیر تھا۔ مگر درحقیقت دہلی کی کل سلطنت کا مالک تھا۔ ۱۲۰۹ھ / ۱۷۹۴ء میں ان کا انتقال ہوا۔ اور دولت راؤ سندھیا جانشین ہوئے۔ ان کے زمانے میں ممالک مفتوحہ کا بہت سا حصہ ان کے قبضہ سے نکل گیا۔ ۱۲۳۳ھ / ۱۸۱۸ء میں یہ ریاست انگریزوں کے سایۂ حمایت میں آئی۔ اس کا موجودہ اقتدار مہاراجہ جیاجی راؤ سندھیا کے عہد کا ہے۔ انہوں نے غدر ۱۸۵۷ء میں گورنمنٹ کی بڑی مدد کی۔ اس کے صلے میں اضافہ جاگیر اور خطاب حاصل کیا۔ اس وقت ان کے فرزند مہاراجہ مادھو راؤ گدی نشین ہیں۔ علمی قابلیت اور ملکداری کی تدبیر میں ان کی بڑی شہرت ہے۔ ان کے انتظام کے حالات پہلے درج ہو چکے ہیں۔

اِس ریاست کا رقبہ پچیس ہزار مربع میل۔ آبادی تخمیناً ۲۹ لاکھ۔ آمدنی ۶۵ لاکھ۔ مجموعی فوج تقریباً گیارہ ہزار پیادے اور ساڑھے پانچ ہزار سوار ہیں جو تین رسالوں۔ چھ توپ خانوں اور سات پلٹنوں میں منقسم ہیں +

بھوپال

گوالیر سے ۲۴۲ میل طے کرنے کے بعد میں بھوپال آیا۔ راستہ میں جھانسی کے جنکشن سے گزر ہوا جہاں سے ایک لائن کانپور و لکھنؤ جاتی ہے۔ شہر بھوپال ریلوے لائن کے کنارے اسی نام کی ریاست کا دارالخلافہ ہے اور کئی ہزار برس کا بنا ہوا ہے۔ اس کی بنیاد راجہ بھوج نے قائم کرکے بھوجپال اس کا نام رکھا جو رفتہ رفتہ بھوپال بن گیا۔ اس کی آبادی ۷۷ ہزار ہے اور سب کی زبان اُردو ہے +

شہر کی آبادی اگرچہ متوسط درجہ کی ہے اور بازار تنگ ہیں۔ مگر شہر کی عمارتیں مسجدیں اور مندر خوشنما ہیں۔ چوک میں ایک جامع مسجد دو منزلہ بہت عظیم الشان بنی ہوئی ہے۔ تین طرف سیڑھیوں کا ایک خوشنما سلسلہ ہے۔ چوک کے چاروں طرف جوہریوں اور زیور فروشوں کی بڑی بڑی دُکانیں ہیں۔ صبح و شام مسجد کے چوطرفہ بازاروں میں خوب چہل پہل رہتی ہے۔ والیئہ ریاست اور اُن کے خاندان کی عمارتیں بہت وسیع۔ خوش وضع اور قابل دید ہیں +

شہر کے ایک طرف ایک بہت لمبا چوڑا تالاب تقریباً ساڑھے چار میل کے محیط میں پھیلا ہؤا ہے جس کا پانی شہر کی دیواروں تک لہراتا ہے۔ اس میں متعدد کشتیاں پڑی رہتی ہیں جو سیر و تماشے کا کام دیتی ہیں۔ اس تالاب میں دریاے بیتوا سے پانی کاٹ کر لایا گیا ہے۔ اور اتنا بڑا ہے کہ ہندوستان میں اس کی نظیر کہیں کم ہوگی +

بیرون شہر متعدد چھوٹی چھوٹی خوبصورت آبادیاں اور باغات ہیں جو ریاست کے فرمانرواؤں نے اپنے اپنے عہد میں بنوائے تھے۔ ایک آبادی میں نواب شاہجہاں بیگم مرحومہ نے نہایت شوق اور کئی لاکھ روپے کے صرف سے جامع مسجد دہلی کے نمونے پر مسجد بنوانی شروع کی تھی۔ مگر اُن کی وفات سے ناتمام رہ گئی۔ جس عمدگی اور خوبی سے اس کی عمارت بنائی گئی ہے باوجود نامکمل ہونے کے پھر بھی قابل دید ہے +

اس وقت فرمانروائے ریاست نواب سلطان جہاں بیگم صاحبہ ہیں۔ آپ ۱۹۰۱ء میں تخت نشین ہوئیں۔ ابتدا میں نواب حافظ احمد علی خاں صاحب المعروف سلطان دولہا جو آپ کے شوہر اور ایک نہایت لائق شخص

تھے۔ امور ملکی میں آپ کی مدد کرتے تھے۔ نگران کے انتقال کے بعد ریاست کے تمام کاروبار کا بوجھ آپ پر آ پڑا۔ آپ نے ملکی معاملات میں بہت قابلیت اور جفاکشی سے کام کرنا شروع کیا۔ اور ہندوستان کے مختلف حصوں سے چیدہ چیدہ اہلکار بلوا کر ہر محکمہ میں متعین کئے۔ گزشتہ سالوں میں کعبۃ اللہ کی زیارت کا شرف بھی آپ حاصل کر چکی ہیں۔

ایک عرصہ تک ریاست کی توجہ صرف علوم مشرقیہ کی تعلیم پر منحصر تھی۔ مگر بیگم صاحبہ کا میلان علوم قدیمہ کے علاوہ علوم جدیدہ کی طرف بھی شروع ہو گیا ہے۔ مدارس کے باضابطہ انتظام پر آپ کا بہت خیال ہے۔ ایک ہائی سکول عام لوگوں کے واسطے اور ایک ہائی سکول صرف رئیس زادوں کے واسطے ہے۔ تعلیم نسواں پر آپ کی توجہ بالخصوص مبذول ہے۔ لڑکیوں کا ایک مدرسہ ریاست میں قائم کیا ہے۔ علیگڈھ کے زنانہ نارمل سکول کی سرپرستی قبول فرما کر اس میں بہت معقول رقم سے مدد دی ہے۔ سنہ ۱۹۱۰ء میں جب میں اس جگہ آیا تو وزارت کا کام خان بہادر مولوی عبد الجبار صاحب سی۔ آئی۔ ای کے متعلق تھا جو بردوان صوبہ بنگال کے رئیس اور گورنمنٹ انگریزی کے پنشن یافتہ لائق افسر ہیں۔ آپ دیانتدار خوش اخلاق اور علم دوست ہیں۔ مجھے حجاز ریلوے کے مقاصد شائع کرنے کی غرض سے تین ہفتے آپ کے ہاں مہمان رہنے کا اتفاق ہوا تھا۔

تاریخی حالات

تاریخی حالات ۔ یہ ریاست صوبہ مالوہ کی اُن تین بڑی ریاستوں میں شمار کی جاتی ہے جن کو خوش انتظامی کے باعث اُنیسویں صدی میں شہرت حاصل ہوئی ہے۔ اس کے بانی سردار دوست محمد خاں صاحب ۱۱۲۰ھ ۱۷۰۸ء میں تیراہ ملک افغانستان سے آئے تھے۔ اورنگ زیب کی وفات کے بعد جب سلطنت دہلی میں انقلابات ہو رہے تھے۔ دوست محمد خاں نے

موقع پاکر کچھ قوت ہم پہنچائی اور مالوہ کے رئوسا سے معرکہ آرا ہو کر ریاست
کی بنیاد ڈالی۔ محمد شاہ کے عہد میں مالوہ کے صوبہ دار نظام الملک آصف جاہ
کی سختیاں برداشت کیں۔ بیش قرار نذرانے دئے۔ مگر ریاست کا خیال
نہ چھوڑا۔ اور آخر کار مستقل رئیس ہو گئے۔ ۱۱۵۳ھ ۱۷۴۰ء میں ان کے انتقال
کے بعد یار محمد خاں جو اب تک نظام الملک کے پاس حیدر آباد میں تھے
گدی نشین ہوئے۔ اور نظام الملک کی مہربانی سے نوابی کا خطاب حاصل کیا۔

والیان بھوپال کا موجودہ خاندان وزیر محمد خاں کی اولاد سے ہے۔
جو نواب حیات محمد خاں کے ایک جدی اور ابتدا میں ان کے کا مدار
(پرائیویٹ سکرٹری) تھے۔ پھر اپنی قابلیت سے رفتہ رفتہ ملکی نظم و نسق
پر قابض ہو گئے۔ ۱۲۳۲ھ ۱۸۱۶ء میں ان کے انتقال کے بعد ان کا بیٹا
نذر محمد خاں کا مدار ہؤا۔ اور نواب غوث محمد خاں والئے ریاست کی بیٹی گوہر بیگم
عرف قدسیہ بیگم سے شادی کی۔ یہ شخص اپنے والد کی طرح مدبر اور جری تھا۔
۱۸۱۷ء میں گورنمنٹ انگریزی کی اعانت سے ریاست کا فرمانروا قرار پا گیا۔

اس ریاست کی عنان حکومت تین چار پشتوں سے بیگمات کے
ہاتھ میں چلی آتی ہے جن کی علمی قابلیت۔ ملکی نظم و نسق اور جنگی مہمات مسلم
ہیں۔ نواب سکندر بیگم نے ۱۲۷۳ھ ۱۸۵۷ء کے غدر میں گورنمنٹ انگریزی کی
بڑی رفاقت کی تھی۔ جس کے صلے میں اضافہ جاگیر اور خطاب حاصل ہؤا
ان کی بیٹی شاہجہاں بیگم کا زمانہ علوم و فنون قدیمہ کی ترقی اور تیاری عمارات
کے واسطے مشہور ہے۔ میر جمال الدین مدار المہام کو اس کام میں بالخصوص
توجہ تھی۔ علما کی خدمت گزاری اور طالب علموں کی امداد میں ریاست کی
طرف سے بڑی فیاضی عمل میں آتی تھی۔ مولوی سید صدیق حسن خاں جنہوں نے

پہلے میر جمال الدین کی بیٹی سے شادی کی اور پھر بیگم صاحبہ کے ساتھ عقد ثانی کرنے سے نوابی کا خطاب اور جاگیر حاصل کی۔ بیگم صاحبہ کی امداد سے اپنی تالیفات کے چھاپنے اور ہندوستان و بلاد اسلامیہ میں اُن کے مفت تقسیم کرنے میں کامیاب ہوئے تھے۔ اس وقت نواب شاہجہان بیگم کی صاحبزادی نواب سلطان جہاں بیگم صاحبہ ریاست کی فرمانروا ہیں جن کی ملکداری کے حالات پیشتر درج ہو چکے ہیں۔ بیگم صاحبہ کے تین لائق فرزند نرینہ موجود ہیں۔ ان کے وجود سے امید ہے کہ آئندہ کسی زمانے میں ریاست کی حکومت پھر مردوں میں منتقل ہو جائیگی +

ریاست کا رقبہ چھ ہزار آٹھ سو اُنسٹھ مربع میل ہے۔ آبادی ۶ لاکھ ۶۵ ہزار ۹۶۱۔ آمدنی ۳۰ لاکھ سے زیادہ ہے۔

بُرہانپور

بھوپال سے ۲۱۱ میل طے کرنے کے بعد میں بُرہانپور پہنچا۔ راستہ میں اٹارسی کے جنکشن سے گزر ہوا جہاں سے ایک لائن جبل پور کو جاتی ہے۔ یہ شہر ریلوے اسٹیشن سے کوئی تین میل کے فاصلے پر دریائے تاپتی کے کنارے ہے۔ نصیر خاں فاروقی فرمانروائے خاندیس نے ۸۱۲ھ / ۱۴۰۰ء میں اس کی بنیاد ڈالی تھی۔ اس وقت سے تقریباً دو سو برس تک یہ صوبہ خاندیس[1] کا دارالسلطنت رہا۔ ۱۰۰۸ھ / ۱۵۹۹ء میں شہنشاہ اکبر کی فتوحات سے سلطنت مغلیہ کا ضمیمہ ہوا۔ شہنشاہ مذکور کے عہد سے شاہجہان کے زمانے تک یہ شہر کل صوبہ خاندیس اور اس کا دارالحکومت اور فوجی جمعیت کا بڑا بھاری

[1] شاہی زمانے میں صوبہ خاندیس کے متعلق بڑے بڑے یہ شہر تھے۔ برہان پور۔ اسیر گڑھ۔ نصیر آباد۔

مرکز تھا۔ اکبر اور جہانگیر کے دوران حکومت میں مرزا عبدالرحیم خان خاناں اور ایام شاہزادگی میں خود شاہ جہاں ایک عرصہ تک یہاں مقیم رہے ۱۱۷۴ھ / ۱۷۶۰ء میں مرہٹے اس پر قابض ہوئے۔ اور ۱۸۰۳ء سے گورنمنٹ انگریزی کے زیر حکم ہؤا۔ ان تغیرات اور حوادث زمانے سے عہد شاہی کی وہ شان و شوکت سب جاتی رہی۔ اب ایک چھوٹا سا شہر تیس ہزار آدمیوں کی آبادی کا ہے۔ اور ضلع نماڑ (ممالک متوسط) کی ایک تحصیل کا صدر مقام ہے۔ اس گئی گزری حالت میں زمین کی سرسبزی سے بعض خصوصیات اس میں اب تک باقی ہیں۔ اطراف میں باغات بکثرت اور ان میں عمدہ عمدہ قسم کے میوہ جات ہوتے ہیں۔ چاول خاص کر بہت اعلےٰ اور خوش ذائقہ ہوتا ہے۔

شہر کی عمارتیں عمدہ اور بازار خوش وضع بنے ہوئے ہیں۔ شاہی عمارتوں میں سے جامع مسجد جس کے منارے مسافروں کو دُور سے دکھائی دیتے ہیں عمارتی خوبیوں کے لحاظ سے قابلِ دید ہے۔ یہ مسجد دراصل عادل شاہ فاروقی نے ۸۹۷ھ / ۱۴۹۱ء میں تعمیر کرائی تھی۔ اس پر شہنشاہ اکبر کی فتوحات خاندیس کا کتبہ بھی کندہ ہے۔

حرفت و صنعت کو اس شہر میں خوب ترقی ہے۔ اور یہی کاروبار اس کی موجودہ بہتری اور آبادی کا باعث ہیں۔ طلائی لُنگی۔ زریں دوپٹے۔ سادہ زری ساڑھیاں اور کمخواب یہاں اچھا بنتا ہے۔ اور دُور دُور تک باہر جاتا ہے۔ روئی صاف کرنے اور دبانے کے کارخانے بھی یہاں موجود ہیں۔ ہائی سکول تک تعلیم کا اچھا انتظام ہے۔

بُرہان پور کی قدیمی شان و شوکت کے آثار جو اس خستہ حالی میں اپنے بانیوں کی عظمت کی شہادت دے رہے ہیں۔ ان میں سے دو چیزیں

قابل دید ہیں :-

(۱) واٹر ورکس جس کے ذریعے سے دریائے ٹاپٹی کا مصفا پانی سارے شہر میں پہنچایا جاتا تھا۔ یہ آب رسانی مٹی کے پختہ نلکوں کے ذریعے ہوتی تھی۔ شہر میں ان نلکوں کے نشان اور گرد و نواح میں آب رسانی کے رجبہا ہے اب تک موجود ہیں۔ اس واٹر ورکس کے حالات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ زمانۂ حال کی ترقیات سے کئی سو برس پیشتر مغلیہ سلطنت کی قدردانی سے یہاں کے لوگ آب رسانی کے کام سے خوب ماہر تھے +

(۲) ترکی حمام جو شاہی قلعہ میں بیگمات کے نہانے کے واسطے ترکی وضع پر بنایا گیا تھا۔ اس کی کرسی دریائے ٹاپٹی سے جو محلات شاہی کے پائیں بہتا ہے۔ اسی فٹ اونچی ہے۔ حمام کے بیرونی چبوترہ پر کھڑے ہو کر دریا کی طرف دیکھنے سے بڑا دلکش نظارہ معلوم ہوتا ہے۔ قلعہ تو اب بالکل اُجڑ گیا ہے۔ مگر حمام کے آثار ہنوز باقی ہیں +

الوارہ دروازہ کے باہر تقریباً ڈیڑھ میل دور جائیں تو بڑے بڑے آثار قدیمہ دکھائی دیتے ہیں۔ جہاں سلاطین فاروقیہ۔ صوفیائے کرام اور علمائے نامدار خواب دائمی میں سو رہے ہیں۔ ان کے مزاروں پر گنبد اور ان کے ساتھ بڑی بڑی مسجدیں اور خانقاہیں بنی ہوئی ہیں۔ مزاروں اور درگاہوں پر سالانہ عرس بڑی دھوم دھام سے ہوتے ہیں۔ یہاں کے علما میں سے شیخ علی متقی اور صوفیا میں سے شیخ نظام الدین چشتی بڑے بزرگوار ہوئے ہیں۔ شیخ علی متقی کا انتقال ۹۷۵ھ اور شیخ نظام الدین کا انتقال ۹۸۶ھ میں ہوا تھا۔

* تذکرہ علمائے ہند مولفہ خان بہادر رحمان علی صاحب ممبر کونسل ریاست ریوان کے ملاحظہ سے معلوم ہوتا ہے کہ برہانپور میں بڑے بڑے علما اور صوفیا گزر چکے ہیں +

باشندگان شہر کو شیخ نظام الدین چشتی سے بہت اعتقاد ہے - ہر سال آٹھ دس ہزار معتقدین ان کے عُرس پر باہر سے آتے ہیں +

برہانپور سے چھ میل کے فاصلے پر اسیر کا قلعہ جس کو اسیر گڑھ بھی کہتے ہیں - ایک پہاڑی پر بہت مستحکم بنا ہوا ہے - یہ قلعہ قدامت اور استحکام کے ساتھ اس قدر بلند ہے کہ ریل گاڑی میں دور سے دکھائی دیتا ہے +

بمبئی

برہانپور سے ۳۱۰ میل طے کرنے کے بعد مَیں بمبئی آیا - راستہ میں بھوساول - جالگاؤں اور منماڑ جنکشنوں سے گزر ہؤا - منماڑ وہ جگہ ہے جہاں سے پونہ رائچور اور حیدر آباد دکن کو ریلوے لائن نکلتی ہے +

بمبئی ابتدا میں ایک معمولی جزیرہ تھا - چنانچہ سترھویں صدی مسیحی کے وسط تک اس کی حالت کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ اس کو ایسٹ انڈیا کمپنی نے ۱۶۶۸ء میں شاہ انگلستان سے صرف دس پونڈ سالانہ اجارہ پر لیکر اس میں اپنے کاروبار کی بنیاد ڈالی - لیکن سو برس سے کچھ ہی زیادہ عرصہ گزرا ہو گا کہ تجارت کے ساتھ ساتھ انگریزوں نے ملکی اقتدار میں ترقی شروع کی - اور ۱۷۷۳ء میں یہ شہر گورنر جنرل ہند کے ماتحت قرار پاکر پریزیڈنسی یا احاطہ کہلانے لگا - اگرچہ بعد ازاں کچھ عرصہ تک اس کو مرہٹوں کے محاربات اور اور کئی قسم کے انقلابات پیش آئے - مگر اٹھارھویں صدی ختم ہونے سے پیشتر ہی انگریزوں کا مستقل قبضہ بمبئی پر ہو گیا جس کا نتیجہ یہ ہؤا کہ یہ شہر ۱۸۱۸ء میں مغربی ہند کا صدر مقام قرار پایا - اس وقت تک ممالک ایران - عراق اور عرب کا سب سے بڑا بندرگاہ سورت تھا - جو بمبئی سے ۱۶۷ میل کے فاصلے پر جانب شمال واقع ہے

خلیج فارس اور بحیرۂ قلزم کے تمام جہاز یہیں لنگر انداز ہوتے تھے لیکن تھوڑی مدت میں سورت کی عمر گئی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی روز افزوں ترقی تجارت اور انگریزی مغربی ہند کی حکومت کا صدر مقام ہونے سے اس کا ستارۂ اقبال ایسا چمکا کہ سورت کی تجارتی اور جہازی طاقت کو پس پا کر کے مغربی ہند میں اول درجہ کا بندرگاہ بن گیا۔ اس وقت سے یہ شہر روز بروز وسعت۔ آبادی۔ تجارت و تموّل غرض ہر اعتبار سے ترقی کر رہا ہے۔ اس کی مشرقی اور شمالی اطراف ریلوے پلوں کے ذریعے خشکی سے پیوستہ ہو کر ملک کا ایک حصہ بن گیا۔ اس کا طول شمالاً جنوباً گیارہ میل اور عرض شرقاً غرباً زیادہ سے زیادہ تین میل ہے۔

آبادی کے لحاظ سے بمبئی ہندوستان میں دوسرے درجہ کا شہر ہے چنانچہ ۱۹۰۱ء میں اس کی آبادی سات لاکھ ۷۶ ہزار تھی جو ۱۹۰۶ء میں نو لاکھ ۷۷ ہزار تک ترقی کر گئی۔ اس میں ہندوستان کے مختلف حصوں اور مختلف قوموں کے علاوہ ممالک غیر میں سے ایران۔ عرب اور چین کے باشندے بھی شامل ہیں۔ گو دکھنیوں میں بیشتر مرہٹی زبان اور مسلمانوں و پارسیوں میں خاصکر گجراتی بولی جاتی ہے تاہم اُردو زبان کو عام و خاص سمجھتے اور اس میں گفتگو کرتے ہیں۔ سرکاری دفاتر کی کارروائی انگریزی زبان میں ہوتی ہے۔ اور یہ دن بدن ترقی پر ہے۔

مسافروں کی بکثرت آمد و رفت کے باعث بیسیوں ہوٹل اس جگہ موجود ہیں۔ یورپین مسافروں اور اُمرا کے واسطے واٹسن اور تاج محل دو ہوٹل اعلےٰ درجے کے ہیں۔ ہندوستانیوں کے واسطے تین متوسط ہوٹل بیتارام بلڈنگ میں ہیں جو کرافٹ مارکیٹ کے قریب ہے۔ ان میں سے شاہجہان ہوٹل مسلمانوں کے واسطے۔ سندھ پنجاب ہندو ہوٹل ہندوؤں کے

واسطے اور کشمیر ہندو ہوٹل دونوں فریقوں کے لئے ہے۔ مسلمان مسافروں کے کھانے پینے اور نیز مستورات کے پردے کے انتظام کے لحاظ سے شاہجہان ہوٹل سے بہتر کوئی اور ہوٹل نہیں۔ حُسن اتفاق سے سیتارام بلڈنگ کچھ ایسے موقعہ پر واقع ہوئی ہے کہ قلعہ اور شہر کی سیر کے واسطے قریباً قریباً وسط کا حکم رکھتی ہے۔ اس وجہ سے مسافران ریل کو یہاں ہر قسم کی سہولت میسّر ہے ۔

کرافٹ مارکیٹ میں گھوڑا گاڑیوں کا اڈّا ہے اور ٹراموے کا اسٹیشن۔ یہ ٹرامو ے برقی طاقت سے چلتی اور خفیف کرایہ پر مسافروں کو قلعہ و شہر کے تمام حصوں میں سیر کراتی ہے۔ علاوہ بریں شہر کی مغربی جانب بمبئی بڑودہ اینڈ سنٹرل انڈیا اور مشرقی سمت گریٹ انڈین پنینشولا ریلوے کی لوکل ٹرینیں صبح کے ۶ بجے سے ۱۲ بجے رات تک چلتی رہتی ہیں۔ ان کے متعدد اسٹیشن تھوڑے تھوڑے فاصلے پر بنائے گئے ہیں۔ اور کسی دو سٹیشنوں کے درمیان کا کرایہ درجہ سوم آدھ آنہ سے زیادہ نہیں ہے۔ شہر کے ہر حصہ میں اچھی اچھی گھوڑا گاڑیاں بھی موجود ہیں۔ غرض اس ٹرامے لوکل ٹرینوں اور گھوڑا گاڑیوں کے ذریعے شہر کی سیر بہ آسانی ہو سکتی ہے ۔

بمبئی کے بازار وسیع اور مصفّا۔ عمارتیں عالیشان اور خوشنما ہیں حتّٰے کہ ہندوستان میں اس خوبی اور عمدگی کا شہر کلکتہ کے سوا اور کوئی نہیں ۔ قابل دید عمارتیں اس جگہ بکثرت ہیں۔ ان میں سے چند مشہور عمارتیں ذیل میں درج کی جاتی ہیں ۔

(الف) سیتارام بلڈنگ سے شہر کی طرف :۔

کرافٹ مارکیٹ ۔ یہ عمارت نہایت وسیع اور ہوادار موقع پر بہتّر ہزار مربع گز میں پھیلی ہوئی ہے۔ اس کا بارھواں حصہ مسقّف اور باقی کشادہ ہے مسقّف

حصہ میں ہر قسم کی دُکانیں علٰحدہ علٰحدہ ہیں - کہیں میوہ جات، ترکاریاں اور پھول بکتے ہیں - کہیں مچھلی اور گوشت - ایک طرف بسکٹ اور دیگر اشیا کی دُکانیں ہیں، دوسری طرف روزمرہ کی استعمالی اشیا جرابیں - رومال - چھتری وغیرہ چیزیں بکتی ہیں اسی طرح بیرونی حصہ میں ہر قسم کے پرندے فروخت ہوتے ہیں - اسلئے یہ کہنا خالی از مبالغہ ہے کہ شمالی ہند میں اس قسم کی کوئی مارکیٹ نہیں ٭

بھنڈی بازار - یہ بازار پائے دھونی کے چوک سے شروع ہو کر دور تک چلا گیا ہے - اس میں کتب فروشوں - بزازوں اور ٹوپی بیچنے والوں کی بیشمار دُکانیں ہیں - دہلی و لکھنؤ کے اکثر تاجر اور کاروباری اسی بازار میں رہتے ہیں - پائے دھونی اور بھنڈی بازار کے اطراف میں کئی عالیشان مساجد واقع ہیں نیز یہ بازار کتب مطبوعہ ایران و مصر کی سب سے بڑی منڈی ہے ٭

بائی کلہ - یہ بھنڈی بازار سے شمال کی جانب ہے - اس میں کئی بڑی بڑی عمارتیں ہیں - مثلاً سر جمشید جی - جی جی بھائی کا ہسپتال جو بائیکلہ ہسپتال کے نام سے مشہور ہے - میڈیکل کالج - وٹرنیری کالج - وکٹوریا گارڈن - وکٹوریا میوزیم - چڑیا گھر - وکٹوریا جوبلی ٹکنیکل انسٹیٹیوٹ - اس وکٹوریا میوزیم میں دنیا بھر کی عجیب و غریب چیزیں جمع کی گئی ہیں - اور چڑیا گھر میں انواع و اقسام کے زندہ حیوانات اور پرندے ہیں ٭

(ب) کرافٹ مارکیٹ سے قلعہ کی طرف :-

دائیں طرف پولیس کمشنر کا دفتر ہے پھر جے جے سکول آف آرٹ - انجمن اسلامیہ ہائی سکول - ٹائمز آف انڈیا کا پریس اور میونسپلٹی کا دفتر ہے ٭

اپولو بندر۔ بمبئی
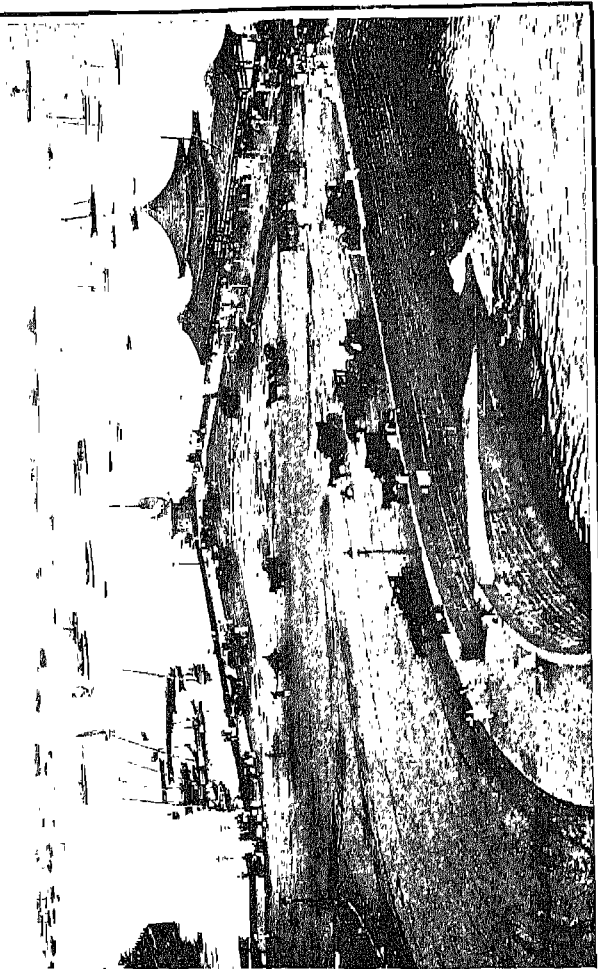
ریلوے سٹیشن

بائیں جانب گریٹ انڈین پنشولا ریلوے سٹیشن کی عظیم الشان عمارت ہے جہاں پونا۔ مدراس۔ حیدرآباد دکن۔ کلکتہ۔ لکھنؤ اور دہلی کے مسافر اُترتے ہیں۔ اس سٹیشن کا نام وکٹوریا ٹرمینس اور یہاں کے لوگ اس کو بوری بندر کہتے ہیں۔ یہ عمارت ۷۵ لاکھ روپے کے صرف سے تیار ہوئی ہے۔ اس کا فرش رنگین اور بیل دار چوکوں سے بنایا گیا ہے۔ ستون ایبریدار پتھر کے ہیں۔ دیواروں اور چھتوں پر نفیس گلکاری کی گئی ہے۔ اس کے مختلف حصے ریلوے دفاتر اور مسافروں کے آرامگاہ ہیں۔ غرض کہ وسعت۔ عظمت اور خوبیِ تعمیر کے لحاظ سے یہ عمارت بڑی شاندار اور اپنی نظیر آپ ہے ؀

میونسپل آفس کے چوک سے سیدھے قلعہ کو جاتے ہوئے دائیں بائیں تھیئیٹر۔ مدرسے۔ کالج۔ پوسٹ آفس۔ تار گھر۔ راجا بائی ٹاور۔ کرنسی آفس اور واٹسن ہوٹل آتے ہیں۔ کرنسی آفس خاصکر تاجروں اور مسافروں کے واسطے بنایا گیا ہے جہاں ان کے روپوں۔ نوٹوں اور پونڈوں کا روزانہ مبادلہ ہوتا ہے۔ واٹسن ہوٹل میں ہندوستانی اُمرا اور یورپین ٹھیرتے ہیں۔ اسی موقعہ پر گورنمنٹ بمبئی کا دفتر۔ سکرٹری ایٹ کاؤس جی کا یونیورسٹی ہال اور گھنٹہ گھر ہیں۔ اس گھنٹہ گھر کی بلندی کوئی ڈھائی سو فٹ ہوگی۔ اوپر چڑھنے سے شہر اور بندرگاہ کا عجیب دلفریب نظارہ دکھائی دیتا ہے۔ ان عمارتوں کے مقابل ملک معظم اور کوئین وکٹوریا کے بُت تھوڑے تھوڑے فاصلے سے استادہ ہیں۔ قریب ہی سمندر کے کنارے اپولو بندر ایک نہایت پُرفضا مقام ہے جس میں بمبئی کا سب سے عمدہ ہوٹل تاج محل ہے۔ اس کا انتظام بڑے اعلےٰ پیمانہ پر کیا گیا ہے جس کے باعث ہندوستانی والیانِ ملک اور اعلےٰ طبقہ کے یورپین مسافر اس میں فروکش ہوتے ہیں ؀

روئی کی منڈی

ٹریوے کے اختتام پر کلا با ریلوے سٹیشن کے محاذ میں روئی کی ایک منڈی ہے جس کو کاٹن گرین" کہتے ہیں - اس میں روئی کے بڑے بڑے کارخانے ہیں - اور تقریباً ۲۵ ہزار چھکڑے یہاں ہر روز آتے اور کئی کروڑ روپے کی روئی ہر وقت موجود رہتی ہے - تمام دنیا میں نیو آرلینز کے بعد بمبئی روئی کی سب سے بڑی بندرگاہ ہے +

(ج) ریلوے سٹیشن کے مغرب کی طرف چوپاٹی اور والکیشور بہت عمدہ سیرگاہیں ہیں چوپاٹی سمندر کے کنارے قوس کی شکل میں والکیشور تک پھیلی ہوئی ہے - یہاں کی ہوا خوشگوار اور صحت بخش ہے لوگ صبح و شام ہوا خوری کو یہاں آتے ہیں - گورنمنٹ ہوس بھی اسی جگہ ہے +

پارسیوں کا دخمہ

بمبئی کی مذہبی عمارتوں میں پارسیوں (آتش پرستوں) کا قبرستان خصوصیت سے قابل ذکر ہے جس کو یہ لوگ دخمہ کہتے ہیں - یہ ایک احاطہ چار دیواری سے گھرا ہوا ہے جس کی دیواروں میں متعدد طاقچے اور وسط میں ایک کنواں بنا ہوا ہے - جب کوئی پارسی مرتا ہے تو یہ لوگ مردہ کو چادر میں لپیٹ کر اور ایک روٹی اس کے منہ میں دیکر طاقچے میں بٹھا دیتے ہیں - گوشت کو کوے اور گدھ نوچ کر کھا جاتے ہیں اور ہڈیاں کوئیں میں ڈال دیجاتی ہیں +

تجارت

تجارت و حرفت کے لحاظ سے بمبئی تمام ہندوستان میں اول درجہ پر ہے - اسی کروڑ روپے سالانہ کی درآمد و برآمد مابین ہندوستان و ممالک غیر اس راہ سے ہوتی ہے - اس غرض کے واسطے چار گودیاں (بندرگاہ) ہیں جس سے لاکھوں من اناج اور مختلف قسم کے اجناس جہازوں پر لدکر دوسرے ملکوں کو جاتے اور کروڑوں روپے کا سامان مثل اونی و سوتی کپڑے - شراب اور
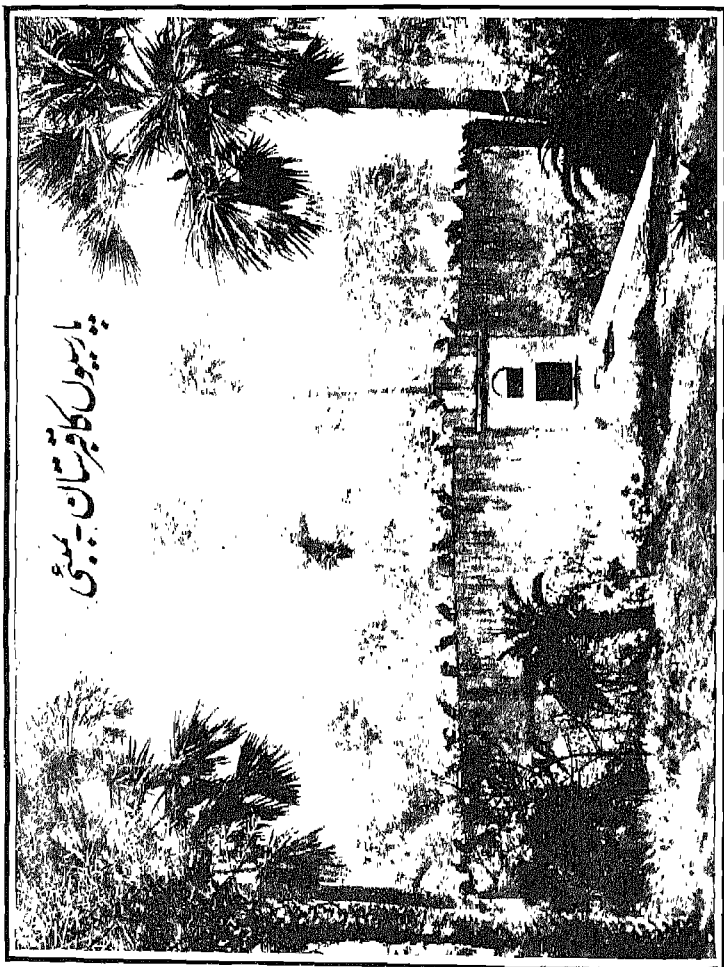
پارسیوں کا قبرستان - بمبئی

کلوں وغیرہ کے ولایت سے آتا اور ریل کے ذریعے سے ہندوستان میں جاتا ہے - سواری اور بگھیوں کے گھوڑے عرب و کاٹھیاوار سے - چھکڑوں کے بیل دکن و شمالی ہند سے دُودھیل (دودھ والی) بھینسیں وسط ہند سے - گائے - بھیڑ اور بکریاں مختلف مقامات سے یہاں سے آتی رہتی ہیں - اس تجارت میں انگریزوں - پارسیوں اور ہندوؤں کے علاوہ مسلمانوں کا بھی معقول حصّہ ہے - چنانچہ اکثر مسلمان سوداگر لکھ پتی اور بعض کروڑ پتی بھی ہیں - شہر میں ستّر سے زیادہ سوت کاتنے اور کپڑا بُننے کے دُخانی کارخانے ہیں - جن میں پچاس ساٹھ ہزار آدمی روزانہ کام کرتے ہیں - چند ریشمی اور بہت سے آہنی کارخانے بھی جاری ہیں - کپڑے کے کارخانوں میں جیکب ساسون کا کارخانہ پریل روڈ میں سب سے بڑا ہے - اس میں ریشمی کپڑا تیّار ہوتا اور دس ہزار آدمی روزانہ کام کرتے ہیں - سر آدم جی پیر بھائی کا چمڑے کی اشیا اور بوٹ بنانے کا کارخانہ بہت اعلےٰ درجے کا ہے ؛

بمبئی کی خصوصیتیں۔

اس تجارت اور حرفت کے ساتھ مندرجہ ذیل خصوصیتیں ایسی ہیں جس سے بمبئی مشرق کا ایک منتخب شہر بن گیا ہے :-

(۱) ہر ہفتہ ولایتی ڈاک کے جہاز یہاں سے انگلینڈ جاتے اور آتے ہیں یورپ آسٹریلیا اور چین کے تجارتی مال اور مسافروں کے لانے اور لے جانیوالے جہازوں کی ماہانہ آمد و رفت کا سلسلہ جاری رہتا ہے - علاوہ ازیں بعض کمپنیوں کے جہاز ہفتہ وار ہندوستان کی بندرگاہوں کے اتا ہے ایک طرف بصرہ تک اور دوسری طرف لنکا تک آمد و رفت رکھتے ہیں ؛

(۲) ہندوستانی اُمرا سیر و سیاحت - کاروباری لوگ دستکاری و تجارت اور عوام الناس مزدوری و ملازمت اور جہازی خدمت کی غرض سے

وقتاً فوقتاً آتے جاتے رہتے ہیں ٭

(۴) ہندوستان۔ افغانستان اور ترکستان کے عازمانِ حج اور ہندوستان کے زائرین بغداد۔ کربلا و دیگر مقامات مقدسہ کی روانگی کے واسطے گورنمنٹ کے حکم سے صرف بمبئی بندرگاہ مخصوص ہے۔ جس کے باعث زمانہ حج اور ایام زیارت میں وہاں کئی ماہ تک مسلمانوں کا بڑا ہجوم رہتا ہے ٭

جہازی سفر

جہازی سفر کے واسطے متعدد کمپنیوں کے علیحدہ علیحدہ دفتر بمبئی میں موجود ہیں۔ اور اپنے اپنے جہازوں میں مسافروں کے بٹھانے اور مال لادنے کا بندوبست کرتے ہیں۔ دُنیا کے مختلف حصوں میں جانے والے مسافروں کے واسطے ٹامس کوک اینڈ کو بہت مفید ہے جس کے ایجنٹ دُنیا کے تمام نامور شہروں میں موجود ہیں۔ مسافروں کو جہاز میں بٹھانے۔ ان کے مال کی روانگی۔ روپے کی حفاظت۔ غیر ملکوں میں قیام کرنے۔ جہازوں کے بہم پہنچانے۔ ڈاک تقسیم کرنے۔ غرض ہر ایک کام جو مسافر کے متعلق ہو۔ کمپنی نہایت قابلیت اور دیانتداری سے کرتی اور حق الخدمت میں ایک خفیف سی رقم اُن سے وصول کرتی ہے ٭

[illegible]

اِس شہر نے کثرت اقوام اور تعدد مذاہب میں جو شہرت حاصل کی ہے۔ اس میں سے فرقہ اسمٰعیلیہ اور فرقہ بابیہ بالخصوص قابل ذکر ہیں۔ فرقہ اسمٰعیلیہ کے لوگ صرف سات اماموں کے قایل ہیں اور امام جعفر صادقؑ کے بیٹے اسمٰعیلؑ پر امامت کو ختم سمجھتے ہیں۔ بمبئی میں ان کے پیشوا ہز ہائنس سر سلطان محمد شاہ آغا خاں ایک تعلیم یافتہ اور روشن خیال شخص ہیں۔ ان کے بزرگ گزشتہ صدی میں ایران سے آکر یہاں مقیم ہو گئے تھے۔ خوجہ قوم

کے لوگ جو بمبئی کے مشہور تاجر ہیں۔ آپ کے معتقد ہیں ÷

فرقہ بابیہ کے مقلد جملہ اَدیانِ سابقہ کو منسوخ اور حضرت بہاءاللہ کے احکام کو قابل عمل سمجھتے ہیں۔ اِن کے جانشین حضرت عبّاس آفندی عکہ ملک شام میں مقیم اور بمبئی میں اُن کی طرف سے جناب مرزا محرم صاحب اشاعت مذہب کرتے ہیں۔ مرزا صاحب بہت بڑے ذی علم خوش بیان اور وسیع الاخلاق ہیں۔ اس فرقہ کے لوگ ہمدردی اور راستبازی کا عمدہ نمونہ ہیں۔ مجھے مصر۔ شام۔ اسٹنبول اور عراق میں جہاں تک بابیوں سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ وہ بنی نوع انسان کے ساتھ محبّت و میل جول رکھنے اور صداقت و مروّت سے پیش آنے میں بہت قابل تعریف پائے گئے +

دعوت خانے

بمبئی کے مسلمانوں کی معاشرت میں مجھے یہ بات پسند آئی۔ کہ اُنہوں نے شادی و غمی اور عام قومی تقریبات کے واسطے متعدد مکان بنائے ہوئے ہیں۔ جن کو یہ لوگ دعوت خانہ کہتے ہیں۔ اس دعوت خانہ میں برتن۔ فرش۔ سامان روشنی اور ہر قسم کی دیگر ضروریات مہیّا رہتی ہیں۔ برادری کا ہر ادنےٰ اعلےٰ بلا دِقّت اس سے مستفید ہوتا ہے +

بہی خواہان ملک

ملک اور قوم کی بہتری میں قیمتی وقت صرف کرنے اور لاکھوں روپے کی مدد دینے سے یہاں کے بعض شخصوں نے بڑی اولوالعزمی ظاہر کی ہے۔ کون شخص ہے جس کو اخبار بینی کا مذاق ہو۔ اور دادابھائی نوروزجی بہرام جی۔ مہربان جی۔ مالاباری۔ فیروزشاہ۔ مہربان جی مہتہ۔ مرحوم آنریبل بدرالدین طیّب جی اور قاضی کبیرالدین احمد کے علمی فضل و کمال اور قومی خدمات سے ناواقف ہو۔ یا جمشید جی۔ نوشیروان جی ٹاٹا۔ سر جمشید جی جیجی بھائی۔ ہزہائینس سر سلطان محمد شاہ آغا خاں۔ سر آدم جی پیر بھائی۔ رفیع الدّین۔

÷ بابیوں کے عقائد میرے سفرنامہ بلاد اسلامیہ میں درج ہیں ÷

سر کریم بھائی ابراہیم کی فیّاضی کی آواز اُس کے کان تک نہ پہنچی ہو۔ مگر یہ امور نظر انداز کر دینے کے قابل نہیں ہیں کہ مسلمانوں کا روپیہ واعظوں۔ پیرزادوں۔ عرب اور مقاماتِ مقدّسہ کے مسافروں اور عام گداگروں کی پرورش میں زیادہ اور قومی کاموں میں کمتر صرف ہوتا ہے۔ لیکن پارسیوں کا روپیہ خاصکر مدارس و ہسپتالوں کے قیام اور اُن قومی کاموں میں لگتا ہے جس سے ملک کی اصلی بہتری متصوّر ہے ٭

حاجیوں کے واسطے مسافرخانہ

بمبئی کے مسلمانوں کو جو قومی اور مذہبی ضرورتیں اس وقت درپیش ہیں۔ اُن میں سب سے زیادہ اہم کام ایّامِ حج میں ہندوستان کے مختلف حصوں سے آتے ہوئے حاجیوں کے قیام اور آرام و آسائش کا انتظام ہے حاجیوں کے قیام کے واسطے صرف لکّوں سیٹھ اور اسمٰعیل سیٹھ کے دو مسافرخانے ہیں جو کئی سو حاجیوں سے زیادہ کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ اس باعث سے موسمِ حج میں بمبئی کے گلی کوچے حاجیوں سے پُر نظر آیا کرتے ہیں۔ اگر بمبئی کے فیّاض مسلمان اس پر توجہ کریں تو اُن کے واسطے کچھ مشکل کام نہیں ٭

تعلیم

بمبئی میں تعلیم بہت ترقی پر ہے۔ اور یہاں کی یونیورسٹی بہت پُرانی ہے۔ آرٹس کی تعلیم کے واسطے الفنسٹن۔ ولسن اور سینٹ اگزیویرئین کالج ہیں جن میں سے الفنسٹن کالج اعلےٰ درجے کا ہے۔ اس کے ساتھ ایک اسکول بھی ہے۔ پروفیشنل تعلیم کے واسطے گرانٹ میڈیکل کالج۔ وٹرنری کالج۔ سر جمسیٹ جی جی جی بھائی کا سکول آف آرٹس اور وکٹوریا جوبلی ٹکنیکل انسٹیٹیوٹ ہیں۔ اس انسٹیٹیوٹ میں میکانیکل انجنیرنگ۔ الکٹرک انجنیرنگ موٹر چلانے اور دیگر اُن صناعیوں کی تعلیم دی جاتی ہے جن میں ہندوستانیوں

کو عملی قابلیت پیدا کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ ان کے علاوہ اصول تجارت کی تعلیم کے واسطے مسٹر واور اور مستری دو پارسی جنٹلمینوں کے علیحدہ علیحدہ دو مدرسے ہیں۔ غرض بمبئی میں ایسی درسگاہیں موجود ہیں کہ شمالی ہند کے جو لوگ انگلستان کے مصارف کے متحمل نہیں۔ اس جگہ اپنی ضروریات کے موافق کافی تعلیم حاصل کر سکتے ہیں۔ مسلمانوں کی تعداد ابتدائی مدارس میں ترقی پذیر ہے۔ مگر رفتہ رفتہ اوپر کی جماعتوں میں گھٹتی جاتی ہے۔ حتے کہ اعلے تعلیم میں ان کا حصہ بہت کم رہ جاتا ہے۔ تعلیم میں پارسیوں اور دکھنیوں نے قابل رشک ترقی کی ہے ✣

انجمن اسلام

بمبئی میں مسلمانوں۔ پارسیوں۔ بوہروں۔ خوجوں اور دکھنیوں کی کئی قومی علمی اور ملکی انجمنیں ہیں۔ ان میں انجمن اسلام کو مسلمانوں کی تعلیم سے بہت دلچسپی ہے۔ یہ انجمن مرحوم آنریبل بدرالدین طیب جی بیرسٹر ایٹ لا جج ہائی کورٹ بمبئی کی مساعی جمیلہ کی یادگار ہے۔ جنہوں نے عام چندہ سے اس کی بنیاد قائم کی۔ اس کے ساتھ انٹرنس کلاس تک تعلیم دینے کے لئے ایک مدرسہ۔ بورڈنگ ہوس اور ایک پبلک لائبریری ہے۔ بورڈنگ ہوس میں دوسرے مدرسوں میں پڑھنے والے مسافر طالب علم بھی بشرط گنجائش رکھے جاتے ہیں۔ ہر طالب علم کو پہلے درجے کے قیام اور کھانے پینے کے مصارف میں ۲۲ روپے ماہوار اور دوم درجے میں ۱۵ روپے ماہوار دینے پڑتے ہیں۔ غرض مسلمان مسافر طالب علموں کے واسطے یہ بورڈنگ بہت مفید ہے ✣

مسلمانوں کی مذہبی ضروریات کے واسطے کئی انجمنیں ہیں جن میں انجمن تبلیغ الاسلام خاصکر قابل ذکر ہے۔ یہ انجمن ایک زمانے میں بہت ترقی پر تھی[*]۔ مگر عمدہ کارکنوں کی

* اس انجمن کے حالات میرے سفرنامہ بلاد اسلامیہ میں مفصل درج ہیں ✣

عدم موجودگی سے آخر کار ٹوٹ گئی۔ تاہم اس کے عوض ایک نئی انجمن
ضیاء الاسلام قائم ہوگئی ہے۔ مگر اس کی ترقی کے لئے ابھی بہت سی
محنت درکار ہے۔ ایک انجمن محافظ حجاج ہے جو آہستہ آہستہ اپنا کام کر رہی ہے۔

پریس

یہاں کا پریس خوب ترقی پر ہے۔ بہت سے رسالے اور اخبار
گجراتی زبان میں شائع ہوتے ہیں۔ جن کو ہندو مسلمان دونو دلچسپی سے
پڑھتے ہیں۔ دو تین اردو اخبار بھی نکلتے ہیں۔ مگر ان سے خاصکر مسلمان
مستفید ہوتے ہیں۔ مسٹر مالاباری کا رسالہ ایسٹ انڈ ویسٹ اور انگریزی
اخبار ٹائمز آف انڈیا یہیں سے شائع ہوتے ہیں۔

ایلی فنٹا

یہ ایک جزیرہ بمبئی سے ۶ میل کے فاصلے پر قدیم زمانے کے عجیب و
غریب مندروں کی وجہ سے مشہور ہے جو پہاڑ کے اندر کاٹ کر غاروں کے طور پر
بنائے گئے ہیں۔ گو جزیرے کا اصل نام گواپوری ہے مگر چونکہ پرتگیزوں
کے قبضہ کرتے وقت اس کے بندرگاہ پر پتھر کا ایک ہاتھی بنا ہوا تھا اسلئے
انہوں نے اس کا نام ایلی فنٹا رکھ دیا۔ مرور زمانہ سے ہاتھی کا سر اور گردن
تو ٹوٹ گئی ہے مگر دھڑ بمبئی کے بائیکلا گارڈن میں اب تک رکھا ہوا ہے۔

میں اپولو بندر سے دخانی کشتی کے ذریعے اس جگہ پہنچا۔ چند دوست
بھی ہمراہ تھے۔ یہاں کے مندر جو پہاڑ کے اندر بنائے گئے ہیں۔ ان میں
سب سے بڑا ۱۲۰ فٹ لمبا ہے جو ۲۶ ایسے ستونوں پر قائم ہے۔ جن کے
سرے پہاڑ سے پیوستہ ہیں۔ مندر کے اندر جس قدر بت بنائے ہیں۔
ان میں سے برہما، وشنو اور شو کے تین چہروں والا بت بہت عجیب و غریب

ہے۔ہر چہرہ کے خط و خال اور اعضا کی بناوٹ سے وہ اوصاف نمایاں ہیں جو اُس دیوتا کی خاص صفت مانے گئے ہیں مثلاً برہما کی خالقیت۔ وشنو کی ہلاکت اور شو کی حفاظت۔ دیگر مندروں میں بھی کئی قسم کے بُت بنے ہوئے ہیں۔ یہ مندر بقول چند سیّاحوں کے کوہ تراشی و نقش و نگار کے لحاظ سے تمام دکن میں اپنی نظیر نہیں رکھتے ۞

بمبئی سے بڑے بڑے شہروں کا فاصلہ اور کرایہ ریل حسب ذیل ہے:۔

نام شہر		مسافت	کرایہ درجہ سوم	کرایہ درجہ دوم
اجمیر۔ براہ احمد آباد		۶۱۵ میل	۶ روپے ۴/	۱۹ روپے ۴/
دہلی	براہ ریواڑی	۸۴۹ میل	۸ ״ ۱/	۲۶ ״ ۹/
	براہ متھرا	۹۵۷ میل	۹ ״ ۱/	۲۹ ״ ۱۵/
لاہور	براہ بھٹنڈا	۱۰۹۸ میل	۱۰ ״ ۸/	۳۷ ״ ۵/
	براہ انبالہ	۱۲۰۶ میل	۱۲ ״ ۹/	۴۰ ״ ۱۴/
شملہ۔ براہ انبالہ		۱۱۹۹ میل	۱۵ ״ ۱/	۴۸ ״ ۱۲/
لکھنؤ۔ براہ جھانسی		۸۸۵ میل	۸ ״ ۴/	۲۷ ״ ۱۱/
الہ آباد۔ براہ جبل پور		۸۴۴ میل	۹ ״ ۱/	۲۹ ״ ۱۵/
بنارس۔ براہ مغل سرائے		۹۴۱ میل	۱۰ ״ ۱/	۳۴ ״ ۲/
کلکتہ	براہ مغل سرائے	۱۳۴۹ میل	۱۳ ״ ۳/	۴۴ ״ ۱۱/
	براہ ناگپور	۱۲۲۱ میل	۱۲ ״ ۵/	۴۰ ״ ۱۴/
حیدر آباد دکن۔ براہ ڈھونڈ		۴۹۱ میل	۵ ״ ۲/	۱۵ ״ ۶/
مدراس۔ براہ ڈھونڈ		۷۹۴ میل	۸ ״ ۵/	۲۴ ״ ۱۴/

کراچی۔ کوئٹہ اور پشاور کی مسافت و کرائے اپنے اپنے موقع پر درج ہو چکے ہیں ۞

چوتھا سفر

گجرات - اجنسی وسط ہند و راجپوتانہ

بمبئی کی سیر کے بعد میرا گزر اُن ملکوں میں ہوا جو گجرات - اجنسی وسط ہند اور راجپوتانہ کے نام سے مشہور ہیں - ان تینوں کا رقبہ باہم ملا ہوا اور اس میں ہندوستان کی وہ نامور دیسی ریاستیں آباد ہیں جن کے فرمانرواؤں کی ذاتی شجاعت اور خاندانی شرافت سے تاریخوں کے صفحات مزین ہیں - ہندوستان کے نقشہ میں جب دریائے نربدا سے شمال کی طرف نگاہ ڈالی جائے - تو بائیں ہاتھ سمندر کی جانب صوبہ گجرات - دائیں ہاتھ کو اجنسی وسط ہند اور شمال کو راجپوتانہ کی ریاستیں آتی ہیں - بمبئی سے دہلی تک ان ریاستوں میں ایک ریلوے لائن گیارہ سو میل لمبی بچھی ہوئی ہے جو بمبئی سے بڑودہ - اندور - اُجین - رتلام - چتوڑ - اجمیر - جے پور اور ریواڑی سے گزرنے کے بعد دہلی پہنچ جاتی ہے - شاہی زمانے میں یہ ریاستیں کبھی خود مختار اور کبھی باجگزار ہوتی رہی ہیں - مگر اب سب گورنمنٹ انگریزی کے زیر حکم اور تین جداگانہ صوبوں میں منقسم ہیں - ملکی انتظام کے لحاظ سے ہر صوبہ کی ریاستوں کی نگرانی کے واسطے گورنمنٹ انڈیا کی طرف سے کہیں ایجنٹ گورنر جنرل اور کہیں رزیڈنٹ مقرر ہے - تفصیلی حالات حسب ذیل ہیں :-

(الف) صوبۂ گجرات و کاٹھیاوار

بمبئی سے سورت - بڑودہ - احمد آباد - بھاؤنگر - جوناگڑھ -

دراول - سومناتھ اور وہاں سے براہ راجکوٹ احمد آباد کی واپسی

(گجرات کی گزشتہ اور موجودہ حالت پر ایک نظر)

گجرات مغربی ہندوستان کے اُس حصّے کا نام ہے جو دریائے نربدا سے صحرائے مارواڑ (جودھپور) تک پھیلا ہوا ہے - اس کے مغربی حصّے کو کاٹھیاوار کہتے ہیں - اور چونکہ اس کو تین طرف سے سمندر گھیرے ہوئے ہے - اس لئے یہ علاقہ جزیرۂ نمائے کاٹھیاوار سے موسوم ہے - اس تمام حصّہ ملک میں گجراتی زبان بولی جاتی ہے - بڑے بڑے شہروں کے لوگ اُردو بھی سمجھتے ہیں - خاص کر مسلمانوں میں اس کا چرچا زیادہ ہے ٭

گجرات کا وسطی میدان دریائے نربدا - سابرمتی اور مہی سے سیراب ہوتا ہے - اس میں میوہ دار درخت خاصکر آم - کیلا اور کئی قسم کے اناج بکثرت پیدا ہوتے ہیں - جزیرہ نمائے کاٹھیاوار میں کئی عمدہ بندرگاہیں ہیں جنکی وجہ سے بیرونی ملکوں کے ساتھ تجارتی تعلّقات کا سلسلہ اچھی ترقی پر ہے - کاٹھیاواری گھوڑے مشہور ہیں - یہ سرزمین مذہبی حیثیت سے مقدس مانی گئی ہے - ہندو اس کو مہادیو اور سری کرشن کا دیس سمجھتے ہیں - دوارکا - سومنات اور پالی ٹانہ میں ان کے بڑے بڑے مندر موجود ہیں - ہندوؤں کے عہد حکومت میں ہندوستان کے مختلف حصّوں کے راجا مہاراجا ان مندروں میں نذرانے چڑھایا کرتے تھے -

اسی شہرت کی بنیاد پر سلطان محمود غزنوی نے ۴۱۶ھ / ۱۰۲۶ء میں سومنات پر حملہ کیا تھا ٭

ریلوے لائن تمام صوبہ میں پھیلی ہوئی ہے جس کا صدر مقام احمد آباد ہے

یہاں سے ایک لائن بمبئی کو اور ایک لائن سیدھی دہلی کو جاتی ہے - راستے میں اس کی دو شاخیں جودھپور اور حیدر آباد سندھ کو نکلتی ہیں - ریلوں کا ایک جال کاٹھیاوار میں اس طرح پھیلا ہوا ہے کہ تمام بڑی بڑی ریاستیں اور بندرگاہیں اس پر واقع ہیں - ایک لائن رتلام ہوتی ہوئی وسط ہند کی ریاستوں میں پہنچتی ہے - اس کے علاوہ کئی چھوٹی شاخیں ہیں +

تجارت

صنعت و تجارت کے لحاظ سے یہ صوبہ اچھی ترقی پر ہے - یہاں کے تاجروں میں جینی لوگ بڑے دولتمند ہیں - ان کی تجارت ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں سے گزر کر لندن اور پیرس تک پھیلی ہوئی ہے - دوسرے درجہ پر پارسی بہت بڑے تاجر ہیں - سلیمانی بوہرے رنگون و جاپان میں ..... سفری سیٹھ اور داؤدی بوہرے افریقہ کے اکثر مقامات میں کام کرتے ہیں +

تعلیم

تعلیمی ترقی میں یہ صوبہ متوسط درجہ کا ہے - احمد آباد - بڑودہ - بھاؤنگر - اور جوناگڈھ میں چار آرٹس کالج ہیں - ہندؤں خصوصاً پارسیوں نے اعلےٰ تعلیم سے خوب فائدہ اٹھایا ہے - مسلمان اس کی طرف بہت کم راغب اور اپنے ابنائے وطن سے بہت پیچھے ہیں - نئی تعلیم نہ ہونے سے پرانے خیالات ان پر غالب ہیں - ان کا میلان کم و بیش جو کچھ ہے وہ پرانے طریق پر عربی پڑھنے کے متعلق ہے اور اس قسم کے کئی مدرسے سورت - جوناگڈھ اور ویراول میں جاری ہیں لیکن علوم عربیہ کے جو عالم اور باکمال شاہی زمانے میں یہاں تھے اب اُن کا خاتمہ ہو چکا ہے - موجودہ تعلیم محض برائے نام ہے +

چھاپخانہ

گجراتی زبان کے چھاپے خانے اور اخبار احمد آباد - بڑودہ اور سورت میں خوب ترقی پر ہیں - اُردو کا کوئی اخبار اس صوبہ سے شائع نہیں ہوتا - اُردو اخبار اور اُردو کتابیں بیشتر شمالی ہند اور کچھ بمبئی سے آتی ہیں +

تاریخی حالات

گجرات کی تاریخ بہت قدیم ہے۔ ایک زمانے میں بُدھ مذہب کے لوگ تمام ملک پر حکمراں تھے۔ پھر ایک عرصہ تک راجپوت اس پر قابض رہے۔ ان کا دارالحکومت انہلواڑہ تھا جو اب پٹن[1] کے نام سے مشہور ہے۔ سلطان محمود غزنوی اور سلطان قطب الدین ایبک نے انہیں فرمانرواؤں کے عہد میں گجرات پر فتوحات حاصل کی تھیں۔ سب سے پہلے علاءالدین خلجی کے عہد (سنہ ۶۹۸ھ / ۱۲۹۸ء) میں یہ صوبہ سلطنت دہلی کے ماتحت ہوا۔ سنہ ۸۱۰ھ / ۱۴۰۷ء میں آخری گورنر ظفرخاں نے آزاد ہو کر لقب شاہی اختیار کیا۔ سنہ ۹۸۰ھ / ۱۵۷۲ء میں شہنشاہ اکبر نے اس صوبہ کو پھر دہلی کا باجگزار بنایا۔ سنہ ۱۱۱۹ھ / ۱۷۰۷ء تک شاہان مغلیہ کا سلسلہ حکومت یہاں مستحکم تھا۔ مگر محمد شاہ رنگیلے کی آرام طلبی نے جب تمام صوبجات کو خودسری کے رنگ میں رنگا تو سنہ ۱۱۵۰ھ / ۱۷۳۷ء میں گائکواڑ نے احمد آباد پر اور نواب نظام نے بھڑوچ پر قبضہ کر لیا۔ آخر انیسویں صدی مسیحی کے آغاز میں انگریزوں نے علم فتوحات بلند کر کے بمبئی پریزیڈنسی کی بنیاد قائم کی +

گجرات کا چوتھا حصہ وسط اور جنوب میں گورنمنٹ بمبئی کے زیر حکم اور اس میں احمد آباد۔ کیرا۔ پنچ محال۔ بھڑوچ اور سورت پانچ ضلعے ہیں۔ باقی رقبہ میں چھوٹی بڑی بہت سی ریاستیں گورنمنٹ انگریزی کے زیر حفاظت ہیں جن پر راجے اور نواب حکومت کرتے ہیں۔ سب سے بڑی ریاست مہاراجہ گائکواڑ بڑودہ کی ہے۔ ان کے تفصیلی حالات اپنے اپنے موقع پر مذکور ہونگے +

سورت

یہ شہر بمبئی سے ۱۶۷ میل شمال کی جانب دریائے ٹاپٹی کے کنارے آباد اور صوبہ گجرات میں تجارتی و تاریخی حیثیت سے مشہور ہے شاہان

[1] یہ شہر ریاست بڑودہ کے ضلع کڑی میں تحصیل کا صدر مقام ہے +

گجرات نے ۹۳۷ھ ۱۵۳۰ء میں اسے تعمیر کرایا تھا۔ سمندر یہاں سے براہ دریا ۱۲ میل ہے۔ اور چونکہ اس کی تعمیر سے بحری تجارت مقصود تھی۔ اس واسطے کسی شاعر نے اس کا مادۂ تاریخ "آباد آباد بندر سورت" کہا ہے۔ تھوڑے عرصہ میں اس شہر کو وہ فروغ ہوا کہ ایران و عرب اور شام و روم تک کے باشندے یہاں آکر آباد ہو گئے۔ چنانچہ ان نو وارد قوموں کے ناموں سے جو محلے آباد ہوئے وہ اب تک اس کی شہادت دے رہے ہیں +

سترھویں صدی عیسی کے آغاز میں پرتگیزوں۔ ڈچوں اور دیگر یورپین اقوام کی تجارت یہاں خوب ترقی پر تھی۔ یہ حال دیکھ کر شاہ انگلستان نے بھی اپنا ایک سفیر ہندوستان بھیجا۔ اُس نے ۱۰۲۴ھ ۱۶۱۵ء میں شہنشاہ دہلی سے تجارتی کوٹھی قائم کرنے کی اجازت لی۔ انگریزوں کی یہی سب سے پہلی کوٹھی ہندوستان میں تھی۔ رفتہ رفتہ تجارت کو اسقدر ترقی ہوئی کہ شہر سورت مغربی ہندوستان کا مرکز تجارت بن گیا اور آبادی کی تعداد آٹھ لاکھ تک پہنچ گئی۔ اگرچہ اس عرصہ میں مرہٹوں کی تاخت و تاراج سے اُس کو صدمات پہنچتے رہے۔ اور ۱۸۳۷ء کی ناگہانی آتشزدگی سے بھی بہت کچھ بربادی ہوئی۔ مگر سب سے آخری صدمہ یہ تھا کہ بحری تجارت کا کام یہاں سے بمبئی منتقل ہو گیا جس سے اُس کی رونق کا بالکل خاتمہ ہو گیا۔ چنانچہ ۱۸۴۱ء میں اس کی آبادی صرف اسّی ہزار تھی۔ اب یہ شہر حکام سول کا صدر مقام اور ریلوے اسٹیشن ہونے سے پھر ترقی کر رہا ہے۔ ۱۹۰۱ء کی مردم شماری کے مطابق اس کی آبادی ایک لاکھ بیس ہزار ہے +

ریلوے سٹیشن سے جب قلعہ کو جائیں تو بڑا بازار راستہ میں آتا ہے۔ یہ بازار وسیع اور مسلسل آباد ہے لیکن اکثر محلوں میں تھوڑے تھوڑے فاصلہ

پر دیرانہ سے کے آثار پائے جاتے ہیں جو ۱۸۳۷ء کی آتشزدگی کی یادگار ہیں امیروں کے مکانات میں یہ خصوصیت ہے کہ اُن کے ساتھ علے العموم سرسبز باغیچے اور پانی سے لبریز حوض موجود ہیں۔ باہر کا دروازہ عالیشان اور اس کی پیشانی پر سنگ مرمر کا کتبہ لگا ہُوا ہے۔ اس گئی گزری حالت میں مکانوں کی یہ شان و شوکت صاف طور پر کہ رہی ہے کہ ان کے بنانے والے بڑے صاحب ثروت تھے +

یہاں کا قلعہ جو ایک تاریخی چیز ہے وسط شہر میں دریا کے کنارے واقع ہے۔ یہ قلعہ سلطان مظفر والئے گجرات نے پرتگیزوں کی روک تھام کے واسطے سنہ ۹۵۱ھ ۱۵۴۴ء میں تعمیر کرایا تھا۔ اس کا مادہ تاریخ کسی شاعر نے کہا ہے ؎

سدّ بود بر سینۂ جانِ فرنگی ایں بنا

قلعہ کے متصل ایک نہایت خوشنما باغ آٹھ ایکڑ زمین میں پھیلا ہُوا ہے جس میں اُن تمام درختوں اور جھاڑیوں کے نمونے ہیں جو سورت میں پیدا ہوتے ہیں قلعہ سے ایک وسیع سڑک گھنٹہ گھر کو جاتی ہے جس کی عمارت ایک سو فٹ بلند ہے +

یہاں مسجدیں اور مندر بالعموم خوشنما ہیں۔ مسجدیں تعداد میں چار پانچسو سے کم نہ ہونگی جن میں سے بعض قابلِ دید ہیں۔ یہاں تین چار ہسپتال ایسے ہیں جن میں مختلف قسم کے جانوروں کا علاج ہوتا ہے۔ قدیم زمانہ کے پُرتگالی۔ ڈچ اور انگریزی کارخانوں کی بڑی بڑی عمارتیں اب بطور پرائیویٹ مکانوں کے مستعمل ہوتی ہیں۔ اُن کے قبرستان اس لحاظ سے قابلِ دید ہیں کہ ان میں بہت سے باتدبیر گورنر۔ سینکڑوں جانباز سپاہی۔ اور متعدد دولتمند تاجر مدفون ہیں ارمنی عیسائیوں کے ایک گرجے کے آثار بھی اب تک باقی ہیں +

یہاں کے لوگ حرفت و صنعت میں علے العموم مشّاق ہیں۔ ہاتھی دانت آبنوس اور صندل کی چیزوں پر نقاشی کا کام خوب کرتے ہیں۔ مشروع۔

کمخاب اور کئی قسم کے ریشمی کپڑے نفیس بناتے ہیں۔ زردوزی کا کام بھی عمدگی اور خوبی سے کیا جاتا ہے۔ یہ تمام چیزیں نیپال اور رنگون تک جاتی ہیں۔ کچھ عرصہ سے پارچہ بانی۔ کاغذ سازی اور دھان کوٹنے کی کلیں بھی جاری ہو گئی ہیں +

علمی مذاق خوب ترقی پر ہے۔ پانچ ہائی سکول اور ایک ٹکنیکل سکول قائم ہے۔ منجملہ ان کے ایک ہائی سکول سر جمشید جی کا قائم کیا ہوا ہے۔ طالب علموں میں زیادہ تعداد ہندوؤں و پارسیوں کی اور سب سے کمتر مسلمانوں کی ہے حالانکہ آبادی کے لحاظ سے یہ لوگ ایک ثلث کے قریب ہیں۔ یہاں کے مسلمان قدامت پسند اور انگریزی تعلیم سے فی الجملہ متنفر ہیں۔ داؤدی بوہرے (جو ہندوستان میں بڑے تجارت پیشہ ہیں) ان کا مذہبی پیشوا اسی جگہ رہتا ہے +

سورت سے مشرق کی طرف دریائے ٹاپٹی کے دوسرے کنارے ایک قصبہ راندیر تجارت اور تموّل کی وجہ سے بہت مشہور ہے۔ کلکتہ و رنگون کے تمام بڑے بڑے سوداگر جو سورتی کہلاتے ہیں۔ اسی قصبہ کے رہنے والے ہیں۔ یہاں کے مسلمان تاجروں میں سے سیٹھ حاجی سلیمان لوٹا کا نام خصوصیت سے قابل ذکر ہے جس نے بیس لاکھ روپے کی جائداد رفاہ عام کے واسطے وقف کر دی +

میں سنہ ۱۹۰۵ء میں جب پہلی مرتبہ سورت آیا تو اُس وقت نواب یاقوت محمد خاں صاحب زندہ تھے۔ اُن کے ذریعے سے اکابر شہر کی ملاقات اور تاریخی حالات معلوم کرنے کا خوب موقع ملا۔ یہ نواب صاحب ریاست جنجیرہ کے ایک معزز رکن۔ بڑے دیندار خوش خُلق اور مہمان نواز تھے۔ خدا ان کی مغفرت کرے +

بڑودہ

سورت اور بڑودہ میں ۸۱ میل کا فاصلہ ہے۔ یہ شہر ریلوے لائن کے کنارے مہاراجہ گائکواڑ کی ریاست کا دارالحکومت اور قدامت کے لحاظ سے سورت سے پہلے کا ہے۔ سنہ ۱۹۰۱ء کی مردم شماری کے مطابق اس کی آبادی ایک لاکھ ۳ ہزار ۷۹۰ ہے +

اسٹیشن سے شہر تک سڑکیں وسیع اور ستھری۔ شہر کی عمارتیں پختہ و باقرینہ بنی ہوئی ہیں۔ وسط شہر میں مانڈوی چار محرابوں کی ایک عمارت ہے۔ جس کی منزل بالائی پر گھنٹہ گھر اور منزل پائیں میں پولیس کا صدر سٹیشن ہے۔ یہاں سے چاروں طرف چار بازار نکلتے ہیں جن میں بڑے بڑے سوداگروں مہاجنوں اور اُمرائے ریاست کے عالیشان محل ہیں۔ مذہبی عمارتوں میں سے دتھل مندر، سوامی نرائن مندر اور کھنڈوبہ کا مندر قابلِ دید ہیں۔ شاہی زمانے کی عمارتوں کا بقیہ ایک جامع مسجد سنہ ۹۱۰ھ ۱۵۰۴ء کی تعمیر ہے۔ مرورِ زمانہ اور مسلمانوں کی غفلت سے اس کی حالت بہت خراب ہو گئی تھی۔ اب انجمن اسلامیہ کے پریزیڈنٹ مسٹر عباس طیب جی جج ہائی کورٹ بڑودہ کی سعی سے اس کی مرمت ہو رہی ہے صحن کے ایک طرف مسافر خانہ اور مدرسہ زیرِ تعمیر ہے۔ کل تخمینہ پچاس ہزار روپے کا ہے جس میں سے بیس ہزار روپیہ والئے ریاست نے عطا کئے ہیں۔ اس مسجد کے متعلق ایک قرآن شریف ہے جو اس وقت محمود باڑی میں رکھا ہوا ہے۔ اس کا طول ۶ ½ فٹ اور عرض ۳ ½ فٹ ہے۔ متن میں فارسی ترجمہ اور حاشیہ پر تفسیر حسینی چڑھی ہوئی ہے۔ اس کا وزن کئی من پختہ اور اس کی رحل اس قدر لمبی چوڑی ہے کہ بجائے خود نوادر کا حکم رکھتی ہے +

یہاں کی عجائبات میں سے سونے اور چاندی کی توپیں ہیں جو گائکواڑ

کی شان وشوکت کی یادگار اور سیاحوں کے واسطے عجوبۂ روزگار ہیں۔ کہتے ہیں کہ پہلے اس قسم کی متعدد توپیں تھیں مگر مہاراجہ حال نے اُن میں سے ایک ایک توپ نمونہ کے طور پر رکھکر باقی کا سونا چاندی داخل خزانہ کردیا ہے +

شہر کی عمارتوں میں سب سے عمدہ راج محل ہے جس کو لکشمی ولاس بھی کہتے ہیں۔ اس کی خوبیوں کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ اس کی تعمیر پر پینتالیس لاکھ روپیہ صرف ہوا ہے +

بیرون شہر ایک باغ میں عجائب خانہ ہے۔ جس میں زمانۂ حال کی عجیب وغریب چیزیں رکھی ہوئی ہیں۔ ان چیزوں میں ہندوستانی مصنوعات کے علاوہ یورپ۔ امریکہ اور جاپان کے بھی عمدہ عمدہ نمونے ہیں۔ سب سے زیادہ دلچسپ وہ کمرہ ہے جس میں اعضاے انسانی کے حصے سر سے پاؤں تک علٰحدہ علٰحدہ بناکر رکھے ہیں۔ تشریح الاعضا کے طالب علموں کو اس کا مطالعہ از حد مفید ہے۔ مصر کے قدیم زمانہ کی دو لاشیں بھی ہیں جن کو عربی میں حنُوط اور انگریزی میں ممی کہتے ہیں +

شہر سے چار میل کے فاصلہ پر مکرپورہ کا پیلس (محل ریاست) ہے اس کا باغ خصوصیت سے عمدہ اور محل کی عجیب و غریب تصویریں اور انواع و اقسام کا سامان آرائش قابل دید ہے +

ریاست کے موجودہ فرمانروا مہاراجہ سیاجی راؤ بڑے روشن خیال رئیس ہیں۔ انہوں نے اعلےٰ درجے کی تعلیم حاصل کی ہے اور یورپ وامریکہ کی سیر سے ملک کی بہبودی اور رعایا کی ترقی کے اچھے نمونے حاصل کئے ہیں۔ حُسن اتفاق سے مہاراجہ صاحب کو مدارالمہام بھی یکے بعد دیگرے نہایت لائق ملتے رہے ہیں۔ آغاز سلطنت ہی میں راجہ سرٹی۔ مادھوراؤ اور

مہاراجہ بڑودہ کا ایک محل
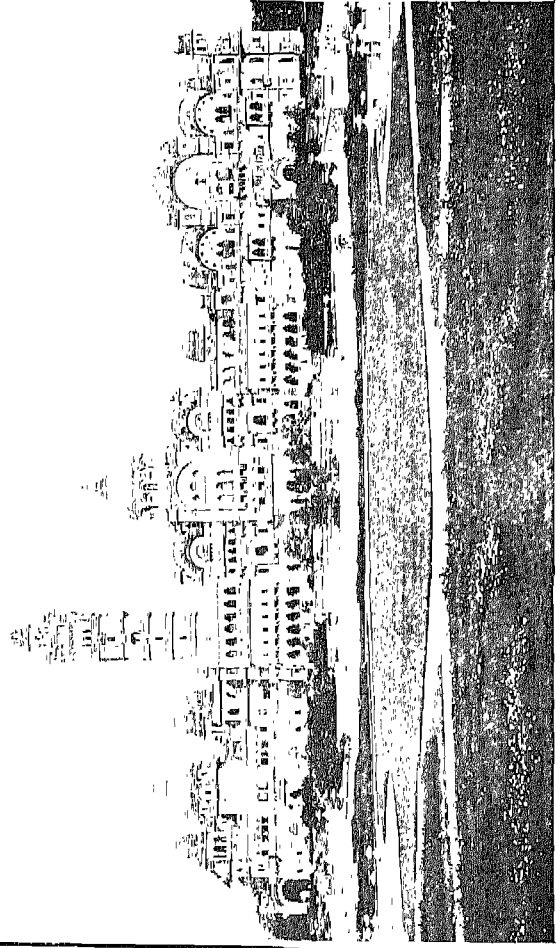
پھر خان بہادر قاضی شہاب الدین اس عہدے پر ممتاز رہے جن کی قابلیت کا تمام ہندوستان میں شہرہ ہے۔ اب مسٹر رومیش چندر دت ہیں جو صوبۂ بنگال کی کمشنری سے پنشنیاب ہوئے ہیں۔ مہاراجہ صاحب نے اپنی اعلیٰ قابلیت اور مدار المہاموں کے مشورہ سے دیوانی فوجداری اور مال غرض ہر محکمہ کا انتظام بڑے اعلیٰ پیمانہ پر کیا ہے۔ اور یہ امر خاص کر قابل ذکر ہے کہ عہدہ داروں میں انگریزوں کی تعداد بہت زیادہ نہیں۔ اکثر حصہ کام کا ہندوستانی عہدہ داروں کے ہاتھ میں ہے جس میں ہندو مسلمان اور پارسی اچھی اچھی قابلیتوں کے لوگ ہیں۔ شمالی ہند کے مسلمانوں میں سے مولوی محمد علی ادہم سپرنٹنڈنٹ ہیں۔ آپ رام پور کے رہنے والے اور علیگڈھ کے تعلیم یافتہ ہیں۔ کچھ مدت آکسفورڈ میں رہ کر اعلیٰ درجے کی قابلیت پیدا کی ہے۔ آپ کے جو مضامین اُردو اور انگریزی اخباروں میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ان کو اہل علم بہت شوق سے پڑھتے ہیں ؛

بڑودہ میں تعلیم اچھی ترقی پر ہے۔ انگریزی تعلیم کیواسطے ایک کالج ہے۔ جس میں علاوہ معمولی نصاب کے ایل۔ ایل۔ بی تک کا انتظام ہے۔ اس کالج میں لکھنوٴ کے ایک پروفیسر مولوی سید نواب علی صاحب قابل ملاقات ہیں۔ کئی طالبعلم مختلف علوم و فنون کی تحصیل کے واسطے ریاست کے خرچ پر انگلستان امریکہ اور جاپان بھیجے جاتے ہیں۔ کالا بھون ایک تعلیمی عمارت ہے جس میں رنگریزی۔ پارچہ بافی۔ نجاری۔ آہنگری۔ نقشہ نویسی اور دیگر فنون کی تعلیم دی جاتی ہے۔ تعلیم نسوان کو اس قدر ترقی ہے کہ ایک زنانہ ٹرننگ کالج بھی موجود ہے۔ تعلیمی مقاصد کے لحاظ سے بڑودہ پہلی ہندستانی ریاست ہے جس نے رعایا کے ہر فرد پر ابتدائی تعلیم لازمی قرار دے رکھی ہے ؛

اِس ریاست کی زبان اگرچہ گجراتی ہے مگر مہاراجہ صاحب نے مسلمانوں کے واسطے اردو سکول کھول دیئے ہیں۔ اور فیس سے اُنہیں مستثنےٰ کر دیا ہے۔ صرف کالج میں فیس دینی پڑتی ہے۔ کالج میں تین وظیفے بیس بیس روپے ماہوار کے خاص مسلمانوں کے واسطے مہاراجہ صاحب کی طرف سے مقرر ہیں +

فرمانروایان ریاست کو مدت سے پہلوانوں کی کشتیاں دیکھنے کا شوق تھا۔ مہاراجگان خود بھی کشتی لڑا کرتے تھے جس سے ہندوستان کے نامور پہلوان اس جگہ جمع ہو گئے تھے۔ مگر اب یہ کشتیاں صرف تماشے کا کام دیتی ہیں +

مسلمانوں کی تالیف قلوب کے لیے بانیانِ ریاست نے مفصلہ ذیل امور جس طرح قائم کیے تھے۔ اب تک اُن پر عملدرآمد ہوتا ہے :-

(۱) عید الفطر اور عید الضحےٰ کی نماز کے وقت مہاراجہ اپنے خدم و حشم کے ساتھ عیدگاہ میں جاتے ہیں اور نماز ختم ہونے پر امام کو خلعت عطا کرتے ہیں۔ والیٔ ریاست کی غیر حاضری میں نائب الریاست اس رسم کو پورا کرتا ہے +

(۲) ایامِ محرم میں تعزیہ داری کے مصارف میں خزانہ سے امداد کی جاتی ہے +

(۳) ہر مہینے ساٹھ دیگیں پکوا کر گیارھویں کی نیاز تقسیم ہوتی ہے +

بڑودہ کے اعلےٰ عہدہ داروں میں سے نواب سعد الدین حسین خان خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ آپ کو مسلمانوں کی بہبودی کا بڑا خیال ہے۔ اوہام باطلہ اور رسم و رواج کی پابندی سے جو افعالِ قبیحہ مسلمانوں میں مروّج ہو گئے ہیں۔ ان کے مٹانے پر آپ کی دلی توجہ مبذول ہے۔ چنانچہ آپ نے اس غرض سے چند رسالے اُردو زبان میں چھپوا کر انجمنوں میں مُفت تقسیم کرائے ہیں تاکہ اُن کی آمدنی رفاہ عام کے کاموں میں صرف ہو۔ آپ نے وسط شہر میں ایک

کتب خانہ بھی قائم کیا ہے جس میں تفسیر حدیث فقہ تصوف اخلاق تاریخ
اور جغرافیہ کی کتابیں فراہم کی ہیں - یہ سب کتابیں اُردو زبان میں ہیں تاکہ عام لوگ
اُن سے مستفید ہو سکیں +

تاریخی حالات

تاریخی حالات - یہ ریاست صوبہ گجرات کی ریاستوں میں بہت بڑی اور ثروت
وحُسنِ انتظام میں مشہور ہے - اس کی تاریخ مغلوں کی سلطنت کے زوال سے
شروع ہوتی ہے - اس کا بانی پیلاجی گائکواڑ ہے جس نے محمد شاہ فرمانروائے
دہلی کے عہد میں اس کی بنیاد ڈالی تھی - پیلاجی کی فتوحات ابھی تک تکمیل کو نہیں
پہنچی تھیں کہ ۱۷۳۱ء میں اس کا انتقال ہو گیا اور ریاست کا کام داماجی گائکواڑ
کے قبضہ میں آیا - انہوں نے چالیس برس معرکہ آرائی اور ملک گیری میں صرف
کر کے گجرات اور کاٹھیاوار کے اکثر راجاؤں کو اپنا باجگزار بنایا - احمد آباد اور پٹن
پر بھی اپنا تسلط قائم کیا - کچھ عرصہ تک گائکواڑ کا گہوارہ سونا گڑھ تھا مگر آخر کار
بڑودہ مستقل دارالحکومت بن گیا +

۱۸۰۲ء میں گورنمنٹ انگریزی سے معاہدہ ہو کر ایک رزیڈنٹ کا قیام
دربار بڑودہ میں قرار پایا - گنپت راؤ گائکواڑ جو ۱۸۴۷ء میں مالک ریاست ہوئے
اُن کا عہد امور رفاہ عام کے واسطے مشہور ہے - انہوں نے سڑکیں - پُل اور
سرائیں تعمیر کرائیں - سڑکوں پر دو رویہ درخت نصب کرائے - دختر کشی کی
رسم اور لڑکے لڑکیوں کی فروخت بند کی - ان کے عہد کا آخری سال اس وجہ
سے مشہور ہے کہ انہوں نے بمبئی بڑودہ انڈ سنٹرل انڈیا ریلوے کے واسطے
سرکار کو زمین دی ۱۸۵۶ء میں کھانڈے راؤ گائکواڑ گدی نشین ہوئے - یہ
بڑے بہادر اور لائق تھے - انہوں نے مفسدہ غدر کے فرو کرنے میں سرکار
کی بڑی مدد کی - گجرات میں خوب امن قائم رکھا ۱۸۶۰ء میں ریاست کا

متصب ملہار راؤ کو ملا۔ مگر یہ اپنی بدنظمی اور جور و ستم سے ۱۸۷۵ء میں معزول ہُوا اور ریاست موجودہ فرمانروا مہاراجہ سیاجی راؤ کو ملی۔ ان کے عہد میں ریاست نے مالی اور ملکی نظم و نسق میں خوب ترقی کی تعلیم کی بہت اشاعت ہوئی۔ اس وقت مہاراجہ سیاجی راؤ کی بیدار مغزی اور اعلےٰ قابلیت سے یہ ریاست خوش انتظامی میں مشہور ہے ۔

اِس ریاست کے متعدد علاقے گجرات اور کاٹھیاوار میں واقع اور انگریزی اضلاع ان کے درمیان حائل ہیں۔ کاٹھیاوار کی کئی ریاستیں جو در اصل گورنمنٹ انگریزی کے ماتحت ہیں گائکواڑ کو بھی ان کی آمدنی کا کچھ حصّہ بطور نذرانہ کے ملتا ہے۔ ریاست بڑودہ کا کل رقبہ آٹھ ہزار پانسو ۷۰ مربع میل ہے۔ مردم شماری تقریباً ۲۰ لاکھ پندرہ ہزار۔ آمدنی ایک کروڑ ۳۵ لاکھ سالانہ۔ فوج میں ۳ ہزار ۵۶۲ سوار۔ ۴ ہزار ۹۰۸ پیدل اور اڑتیس توپیں ہیں ۔

احمد آباد

یہ شہر بڑودہ سے ساٹھ میل کے فاصلہ پر دریائے سابرمتی کے کنارے آباد اور احمد شاہ والئے گجرات کی یادگار ہے جس نے ۸۱۳ھ ۱۴۱۰ء میں اس کا بنیادی پتھر رکھا تھا۔ کسی شاعر نے اس کا مادۂ تاریخ "خیر" کہا ہے۔ اس شہر کے تعمیر ہونے پر قدیمی دارالحکومت انہلواڑہ (پٹن) سے اُٹھ کر یہاں آگیا۔ سلطان احمد شاہ اور سلطان محمود شاہ بیگھڑا سلاطین گجرات کے زمانہ میں اس کو بڑی شہرت ہوئی۔ علم و فضل۔ صنعت و تجارت کے اعتبار سے دہلی کے بعد یہ ہندوستان کا سب سے بڑا شہر شمار ہوتا تھا۔ ایک زمانہ میں اس کی آبادی دس لاکھ تک پہنچ گئی تھی۔ ایک ہزار سے زیادہ مسجدیں اور مقبرے

تھے جن کے ساتھ عمدہ عمدہ باغ لگے ہوئے تھے۔ شہر کے اطراف وجوانب میں پانچ پانچ میل تک پُرانی عمارتوں کے کھنڈر دیکھنے سے آبادی کی اس کثرت کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔ شہنشاہ اکبر کے عہد تک احمد آباد صنعت۔ تجارت اور فراوانی دولت سے اپنی پوری شان وشوکت پر تھا۔ مگر محمد شاہ کے زمانہ میں مرہٹوں کے حملوں سے اس کی رونق میں فرق آگیا۔ ۱۸۱۸ء سے سرکار انگریزی کے قبضہ میں ہے اور اس وقت کمشنر گجرات کا صدر مقام ہے۔ ۱۹۰۱ء کی مردم شماری کے مطابق اس کی آبادی ایک لاکھ ۸۵ ہزار ہے جینی لوگ باوجودیکہ ان کی آبادی دس فیصدی سے زیادہ نہیں مگر تجارت اور تمول میں سب سے بڑھے ہوئے ہیں ۔

ریلوے سٹیشن شہر سے ملا ہوا ہے۔ چاروں طرف شاہی زمانہ کی پختہ فصیل ہے۔ پانچ کوئیں کے دروازہ سے شہر میں داخل ہوں تو ایک بڑے بازار سے گزر ہوتا ہے جو تقریباً میل بھر لمبا ہوگا۔ اس کی عمارتیں خوشنما۔ سڑکیں مصفا اور دُکانیں تجارتی مال سے پُر ہیں۔ وسط میں مانک چوک کے قریب سلطان احمد شاہ کی جامع مسجد بڑی عظیم الشان ہے۔ اس کے صحن کا طول ۷۰ گز اور عرض ۲۲ گز ہے۔ مسجد کے عُلوِ شان کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ۲۵۲ ستونوں پر چھت قائم اور اس میں چھوٹے بڑے پندرہ گنبد ہیں اس کے مشرق کی طرف ایک احاطہ میں سلاطین گجرات کی قبریں اعلےٰ درجہ کی صناعی وگلکاری کے باعث قابل دید ہیں۔ یہ لمبا بازار تین در کے دروازہ سے ہوتا ہؤا اُس موقع پر ختم ہوتا ہے جہاں سلاطین گجرات کے محلوں کی بقیہ عمارتیں اب تک اپنا جلوہ دکھا رہی ہیں۔ باقی بازار اکثر ٹیڑھے اور بعض اس قدر نشیب میں ہیں کہ برسات میں پانی اور کیچڑ سے راستہ چلنا دُشوار

ہو جاتا ہے چونکہ نالیوں کے نہ ہونے سے پانی جمع رہتا ہے۔ اس واسطے بعض اوقات اس کے تعفّن سے دماغ کو سخت پریشانی ہوتی ہے +

جامع مسجد اور شاہی قبروں کے علاوہ بعض اور عمارتیں بھی قابل دید ہیں۔ خصوصاً رانی سپری کی مسجد جس کو سلطان محمود شاہ بیگڑا کی بیوہ رانی سپری نے سنہ ۹۲۰ھ (۱۵۱۴ء) میں تعمیر کرایا تھا۔ اس میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی طرز تعمیر یکجا دکھلائی گئی ہے۔ اور عمارتی خوبیوں کے لحاظ سے احمد آباد کی سب مسجدوں سے خوبصورت اور سرمایہ فخر و ناز ہے۔ فصیل شہر سے ملا ہوا ایک میونسپل باغ ہے جس کے اُس طرف دریائے سابرمتی بہتا ہے۔ یہاں اکثر لوگ شام کے وقت ہوا خوری کو آتے ہیں +

شہر کی مشرقی جانب "کانکریا" ایک عظیم الشان تالاب سب سے اچھی سیرگاہ ہے۔ اس کے وسط میں ایک باغ اور باغ میں پختہ عمارت بنی ہوئی ہے۔ گرداگرد باقاعدہ درختوں کی قطاریں اور جابجا پھولوں کے تختے ہیں۔ ایام بارش میں یہ تالاب لبریز ہو جاتا ہے۔ اس میں کشتیاں پڑی رہتی ہیں۔ شائقین اُن میں سوار ہو کر لطف حاصل کرتے ہیں۔ یہ تالاب سلطان قطب الدین بن محمد شاہ گجراتی کی یادگار ہے۔ کہتے ہیں کہ شاہی زمانہ میں تالاب کے چاروں طرف عمدہ عمدہ عمارتیں اور خوشنما باغات تھے۔ شہنشاہ جہانگیر کے زمانہ میں ان کی مرمت بھی ہوئی تھی۔ مگر زمانہ کے بیدرد ہاتھوں نے اب ان سب کو برباد کر دیا +

احمد آباد کے لوگ صناعی اور دستکاری میں مشہور ہیں۔ سوتی ریشمی اور طلائی و نقرئی تار کا کپڑا بنانے میں انہیں کمال ہے۔ ان تینوں چیزوں کی دستکاری وہاں اس قدر زیادہ ہے کہ شہر کے بڑے حصہ کی روزی اس پر

رانی سپری کی مسجد - احمد آباد

مسجد کا دریچہ منقش ـــ احمد آباد
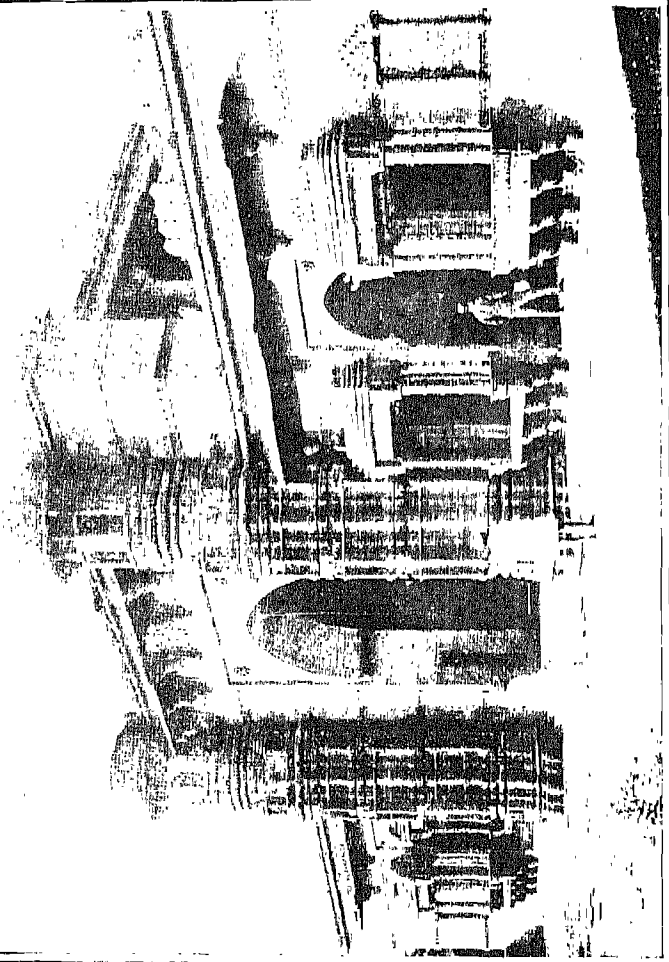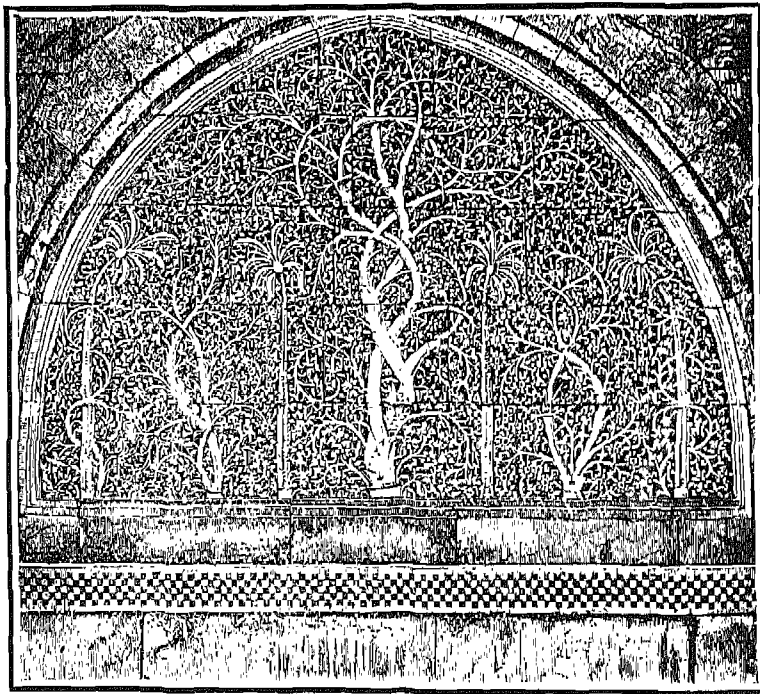
منحصر ہے۔ اسی وجہ سے ان کے ہاں ایک پُرانی مثل چلی آتی ہے۔
"احمد آباد تین تاروں پر لٹکتا ہے"۔ دستی راچھوں کے ذریعے دھوتیاں اور ساڑھیاں
بکثرت بنتی اور تمام پریزیڈنسی میں فروخت ہوتی ہیں۔ ریشمی جالیاں ململیں
پگڑیاں اور کمربند بھی عمدہ تیار ہوتے ہیں۔ کمخواب یہاں اعلےٰ درجے کا ہوتا
ہے۔ خالص سونے اور چاندی کے تاروں کے کپڑے خوب بنتے ہیں۔
جس کو سُنہرے اور رُپہلے کہتے ہیں۔ سونے اور چاندی کا تار بنانے میں لوگ
ایسے مشاق ہیں کہ ایک تولہ چاندی کا آٹھ سو گز لمبا تار ہاتھ سے کھینچ لیتے
ہیں۔ لکڑی اور چمڑے کا کئی قسم کا کام عمدہ تیار ہوتا ہے۔ کچھ عرصہ سے
مشینوں کے ذریعے سے بھی کام شروع ہوگیا ہے اور اس وقت پچاس سے زیادہ
ملیں جاری ہیں۔ ایک مل دیا سلائی کی منشی شیخ محمد صاحب کے زیر اہتمام
جاری ہے۔ غالباً تمام ہندوستان میں دیا سلائی کی یہ پہلی مل ہے جسے
دیسیوں کے ہاتھوں میں کامیابی سے چلنے کا اعزاز حاصل ہے۔ مجھے
تفصیلی طور پر اس کارخانے کے دیکھنے کا موقع ملا۔ دیا سلائی کی ایک کھیپ
تیار کرنے میں دس بارہ مرحلے طے کرنے پڑتے ہیں۔ اور اس تدبیر سے
کئی سو دیا سلائی کا بکس ایک دفعہ تیار ہو جاتا ہے ؎

تعلیم اچھی ترقی پر ہے۔ ایک آرٹس کالج۔ چار ہائی سکول۔ ایک
سکول آف آرٹ اور ایک میڈیکل سکول جاری ہے۔ مسلمان تعلیم میں بہت
پیچھے ہیں۔ غالباً ان کی تعداد پانچ فیصدی سے زیادہ نہ ہوگی۔ کالج کے
فارسی پروفیسر مرزا کوثر ایرانی الاصل ایک بزرگوار بہت لائق اور با اخلاق ہیں
آپ اُردو میں بہت شُستہ اور بلا تکلّف گفتگو کرتے ہیں۔ فارسی شعر و سخن
کا مذاق بہت اعلےٰ درجے کا ہے۔ آپ کا ایک شعر ہے ؎

چشمِ مے گونِ تو گویا ست کہ صہبا زدہ ؎ نوشِ جاں باد ولے حیف کہ بے ما زدہ

سب سے افسوسناک حالت یہاں کے مسلمانوں خصوصاً پیرزادوں کی ہے۔ ان میں باہمی حسد اور نفاق اس قدر ترقی پر ہے کہ انجمن اسلامیہ کے سکرٹری کے عہدے پر ایک ہندو کی تقرری ضروری سمجھی گئی مسلمانوں کی دینداری کا مزید اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ چند مسجدیں متولیوں نے فروخت کر دی ہیں۔ اور بعض مسجدیں قبرستان سمیت چوہڑوں کو ٹھیکے پر دے رکھی ہیں جس میں وہ چونے وغیرہ کا کام کرتے ہیں۔ ایک مسجد جو دریائے سابرمتی کے کنارے پتھر کی بنی ہوئی اور آثار قدیمہ کا بہترین نمونہ ہے پیر فرید میاں صاحب فاروقی نے چالیس روپے ماہوار پر ایک انگریز انجنیر کو کرائے پر دے رکھی ہے۔ پرانا قبرستان جو اس کے متصل ہے وہاں اس انگریز کا اصطبل بنا ہوا ہے۔ مسلمانوں کی حمیت کے مقابلہ میں لارڈ کرزن سابق وائسرائے ہند کا یہ ذکر کرنا کچھ نامناسب نہ ہوگا کہ جب وہ احمد آباد میں آئے اور ایک مسجد میں تحصیل کا دفتر دیکھا۔ تو فوراً مسجد کے خالی کرنے کا حکم صادر کیا۔ کاش اس زمانہ میں لارڈ کرزن کو اس مسجد کی اطلاع کسی نے دی ہوتی جس سے یہ خانۂ خدا اور قبرستان عیسائیوں کے قبضہ سے نکلکر آزاد ہو جاتا ✤

عمارات بیرون شہر

شاہی زمانہ میں احمد آباد کے اطراف و جوانب میں پانچ پانچ میل تک آبادی پھیلی ہوئی تھی۔ کئی سو مسجدیں اور چند عالیشان مقبرے جو اس وقت ویرانہ کو آباد کر رہے ہیں۔ اُس زمانہ کی یادگار اور سیاحوں کی خاص دلچسپی کا باعث ہیں۔ ان میں سے صرف چند مقامات کا ذکر کیا جاتا ہے ✤

(۱) دادا ہری کا کُنواں ۔ یہ کنواں ۱۹۶ فٹ طویل اور ۴۰ فٹ عریض ہے۔

اس میں اُترنے کے واسطے تین گیلریاں اور ہر گیلری میں متعدد زینے
بنے ہوئے ہیں - آخری گیلری سطح آب سے دو تین فٹ بلند ہے -
گیلریوں کے بنانے میں یہ رعایت کی گئی ہے کہ ایک طرف کی سیڑھی
دیگر اطراف کی سیڑھیوں سے جا ملتی ہے جس سے ایک گیلری سے
دوسری گیلری میں بآسانی پہنچ سکتے ہیں ۔

(۲) شاہ عالم - شہر سے دو میل جنوب کی طرف شاہ عالم کی یادگاریں چند
عمارتیں بنی ہوئی ہیں جس میں مقبرہ - مسجد اور دیوان عام شامل ہے -
یہ شاہ عالم ایک ولی کامل اور سلطان محمود بیگڑا کے مرشد تھے مقبرے
کا نقشہ نہایت دلفریب ہے - فرش میں سنگ مرمر اور سنگ سیاہ
کی پچی کاری کی ہوئی ہے - کسی زمانے میں یہ مقبرہ سونے اور جواہرات
سے مزیّن تھا - اب بھی اسکا برنجی دروازہ قابل دید ہے جو باشندگان
احمد آباد کی اعلےٰ صنعت کا گواہ ہے ۔

(۳) سرخیز - یہ جگہ شہر سے پانچ میل کے فاصلے پر سلطان محمود بیگڑا
کی سیرگاہ ہے - شاہی زمانہ میں یہاں ایک بڑا تالاب اور اس کے
کنارے پر عالیشان عمارتیں تھیں - اب تالاب خشک اور عمارتیں شکستہ
ہیں - اس کے ایک طرف سلطان محمود بیگڑا اور اس کے بیٹے
سلطان مظفر کے عالیشان مقبرے ہیں ۔

تالاب کے شمالی کنارے پر شیخ احمد ختو ایک بڑے بزرگ کا مقبرہ
ہے جو سلطان احمد شاہ کے پیر و مرشد تھے ۔

۱۹۰۵ء کے سفر میں بمبئی سے احمد آباد تک نظام الدین آفندی
قریشی میرے رفیق راہ تھے - میں اُن دنوں انہیں کا مہمان تھا - اور گجراتی

زبان کے سوال وجواب میں یہ میرے ترجمان بھی تھے۔ ان کو گجراتی انشاپردازی میں اچھا دخل ہے۔ پہلے ایک رسالہ الہلال انکے اہتمام سے نکلتا تھا اور اب بمبئی میں ایک اخبار کے اڈیٹر ہیں۔ میں ان کے حُسن اخلاق کا بہت ممنون ہوں۔ اُسی زمانہ میں مولوی ابوالنصر مرحوم دہلوی التخلص بہ آہ میرے ساتھ بغداد تک کی سیر کرنے کے ارادے پر بمبئی سے یہاں تشریف لائے تھے۔

احمدآباد سے چند شہروں کا فاصلہ حسب ذیل ہے :-

	مسافت	کرایہ درجہ سوم	کرایہ درجہ دوم
جوناگڑھ براہ دھولا	۲۴۹ میل	۲ روپے ۱۳/	۶ روپے ۱۱/
راجکوٹ۔ براہ وَدھوان	۱۵۵ میل	۲ روپے	۴ روپے ۱۴/
جودھپور۔ براہ مارواڑ	۲۸۲ میل	۲ روپے ۱۵/	۹ روپے ۸/
حیدرآباد۔ براہ مارواڑ	۱۰۰ میل	۹ روپے ۶/	۲۹ روپے ۲/
اندور۔ براہ رتلام	۲۰۹ میل	۳ روپے ۳/	۸ روپے ۱۲/

بھاؤنگر

اب احمدآباد سے میرا سفر کاٹھیاوار شروع ہوتا ہے۔ ویرم گام۔ ودھوان اور دھولا جنکشنوں سے گزرنے کے بعد میں بھاؤنگر پہنچا۔ یہ شہر احمدآباد سے ۱۸۴ میل ریلوے لائن کے کنارے اسی نام کی ریاست کا دارالحکومت اور روزافزوں ترقی کرنے والا بندرگاہ ہے۔ اس کی مردم شماری کاٹھیاوار کے سب شہروں سے زیادہ اور تعداد میں ۵۵ ہزار ۶ سو ۴۰ ہے۔

بھاؤنگر کی عمارتیں خوشنما اور بازار بارونق ہیں۔ بیرون شہر فرمانروائے

ریاست کے نئے محل اور باغات قابل دید ہیں۔ خصوصاً سنگ مرمر کا ایک مندر جو وسط تالاب میں ہے بہت نفیس ہے۔ انگریزی تعلیم کے واسطے ہائی سکول اور ایک آرٹس کالج ہے جس میں بی اے تک پڑھائی کا انتظام ہے۔ گھوڑوں کی نسل بڑھانے کا ایک بڑا ذخیرہ اس جگہ موجود ہے۔ روئی کثرت سے پیدا ہوتی اور جہازوں کے ذریعے سے باہر جاتی ہے۔ استعمالی چیزیں عموماً باہر سے آتی ہیں ٭

موجودہ فرمانروا سر بھاؤ سنگھ جی تخت سنگھ جی کے۔ سی۔ ایس۔ آئی ایک راجپوت خاندان کے رکن اور بیدار مغز رئیس ہیں۔ ان کی کوشش سے ملک کی سرسبزی اور رعایا کی مرفہ الحالی یوماً فیوماً ترقی پر ہے۔ ریاست کا رقبہ ۲ ہزار ۸ سو مربع میل۔ آبادی ۴ ۸ لاکھ ۶۵ ہزار اور محاصل تقریباً چالیس لاکھ روپے سالانہ ہے ٭

پالیتانہ

یہ ایک چھوٹی سی ریاست دھولا اور بھاؤ نگر کے درمیان سون گڑھ ریلوے سٹیشن سے پندرہ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ پالیتانہ کی شہرت جین مذہب کے اُن مندروں کے باعث ہے جو پہاڑ پر بنے ہوئے ہیں زائرین ڈولیوں میں سوار ہو کر وہاں جاتے ہیں ٭

موجودہ فرمانروا سر مان سنگھ جی سُور سنگھ جی کے۔ سی۔ ایس۔ آئی راجپوت قوم کے ایک تعلیم یافتہ اور روشن خیال رئیس ہیں۔ ریاست کا رقبہ دو سو ۸۹ مربع میل۔ آبادی ۵۲ ہزار ۸ سو ۵۶۔ اور محاصل ۲ لاکھ ۷۵ ہزار سالانہ ہے ٭

جُوناگڑھ

بھاؤنگر اور جُوناگڑھ میں ۱۲۷ میل کا فاصلہ ہے۔ راستے میں دھولا اور جیتپل سر جنکشن آتے ہیں۔ جیتپل سر وہ مقام ہے جہاں سے کاٹھیاوار کی بڑی بڑی ریاستوں کو ریلوے لائن نکلتی ہے۔۔۔۔۔ احمد آباد سے سیدھے جوناگڑھ جائیں۔ تو ۲۴۹ میل مسافت طے کرنی پڑتی ہے۔ یہ شہر ریلوے لائن کے کنارے اسی نام کی ریاست کا دارالحکومت اور کاٹھیاوار کے شہروں میں دوسرے درجے پر ہے۔ اس کی آبادی ۳۱ ہزار ہے +

جوناگڑھ کے بازار بہت لمبے مگر چنداں خوشنما نہیں ہیں۔ قدامت اور استحکام کے لحاظ سے یہاں کا قلعہ بہت مشہور ہے۔ نوابانِ جوناگڑھ کے مقبرے اور مسجد مقامی حیثیت سے خوش وضع اور ان میں ایک قسم کی خصوصیت پائی جاتی ہے۔ کوہ گرنار پر جین مذہب کے مندر بہت عمدہ اور قابلِ دید ہیں +

اُنیسویں صدی مسیحی کے آخری حصہ میں ہز ہائنس سر نواب محمد رسول خاں بہادر فرماں روائے حال کی سرپرستی اور شیخ بہاء الدین دیوان کی حُسن تدبیر سے امور رفاہ عام میں بہت ترقی ہوئی ہے۔ ٹکنیکل سکول کے علاوہ ایک آرٹس کالج قائم ہے جس میں بی اے تک پڑھائی ہوتی ہے۔ ریاست کی طرف سے ایک زنانہ ہسپتال لاکھ روپے کے صرف سے راجکوٹ میں تیار ہوا ہے۔ نیز علیگڈھ کالج کی امداد میں معقول تعداد کا روپیہ دیا ہے۔ قانون ریاست کے مطابق زر نوفیہ رفاہ عام کے کاموں میں لگایا جاتا ہے +

ریاست کا نظم ونسق ایک مدت دراز تک شیخ بہاءالدین کے ہاتھوں میں تھا - جو یکے بعد دیگرے تین نوابوں کے زمانہ فرمانروائی میں اس عہدے پر ممتاز رہے - باوجودیکہ خود لکھے پڑھے نہیں - مگر اہل علم کے قدردان ہیں ان کی سرپرستی سے مختلف ملکوں کے باکمال بامید قدردانی یہاں چلے آتے ہیں - خصوصاً نواب صاحب اور دیوان صاحب کی دینداری کی وجہ سے علما کی بہت عزت ہوتی ہے - اب ریاست نے کچھ عرصہ سے شیخ بہاءالدین کی پیرانہ سالی کے باعث مرزا عباس علی بیگ صاحب کی خدمات گورنمنٹ بمبئی سے مستعار لیکر دیوانی کا کام اُن کے سپرد کیا ہے - مرزا صاحب ایک تعلیم یافتہ اور بہت روشن خیال شخص ہیں ؛

کاٹھیاوار میں اس ریاست کو یہ خصوصیت حاصل ہے - کہ نواب صلابت خان بانئ ریاست نے محمد شاہ بادشاہ دہلی کے عہد میں کاٹھیاوار کے بعض رئیسوں پر غلبہ حاصل کیا اور بہ حیثیت اعلےٰ حاکم ہونے کے ان سے کچھ کچھ سالانہ نذرانہ لینا قرار دیا جو اب تک قائم ہے - بیشتر یہ نذرانہ والیانِ ریاست سے فوج کشی کے ذریعے وصول ہوتا تھا - مگر کچھ عرصہ سے گورنمنٹ انگریزی اپنے توسط سے وصول کرا دیتی ہے اور ایک چوتھائی اُس کے معاوضہ میں مجرا کر لیتی ہے ؛

اس ریاست میں شیر ببر بکثرت ہوتے ہیں - چنانچہ اس لحاظ سے جوناگڑھ کو ہندوستان کی ریاستوں میں خاص شہرت حاصل ہے - اس کا رقبہ ۳ ہزار ۲ سو ۴۸ مربع میل - آبادی ۳ لاکھ ۹۵ ہزار ۴ سو ۲۸ - فوجی قوت ۱۹۹۲ ہے - جس میں ۳۰۶ سوار اور ۱۶۸۶ پیدل ہیں ؛

وراول

یہ شہر جوناگڑھ سے ۵۱ میل کے فاصلے پر سمندر کے کنارے ریاست جوناگڑھ کا بندرگاہ ہے - اس کے بازار وسیع اور عمارتیں پختہ ہیں۔ تجارت کی خوب گرم بازاری ہے - ریاست کی پیداوار اسی بندر کے ذریعے سے ممالک غیر کو جاتی ہے - میرے ۱۹۰۸ء کے سفر میں ہز ہائنس نواب صاحب جوناگڑھ کی سرپرستی سے مسر رسول خاں اینڈ کمپنی ایک مل قائم ہو رہی تھی جس کے مہتمم فریدالدین معزالدین احمد آباد کے رہنے والے ایک لائق شخص ہیں۔ مسلمان تاجروں کے مذہبی جوش سے عربی کا ایک عالیشان مدرسہ بنا ہؤا ہے طلبا کے خورونوش کے مصارف مدرسہ کی طرف سے ادا ہوتے ہیں۔ مگر انتظام تعلیم نامکمل۔ ضلع مظفر نگر کے ایک مولوی صاحب یہاں درس دیتے ہیں +

سومناتھ

یہ جزیرہ نماے کاٹھیاوار کا ایک قدیم اور مشہور مندر موضع پٹن میں ہے۔ جو وراول ریلوے سٹیشن سے دو میل کے فاصلہ پر سمندر کے کنارے ریاست جوناگڑھ کے ماتحت ہے - احمد آباد یہاں سے تقریباً تین سو میل ہوگا - اسلامی تاریخ میں سب سے پہلے اس کا ذکر سلطان محمود غزنوی کے اُس حملہ میں ملتا ہے۔ جو سلطان ممدوح نے ۴۱۶ھ ۱۰۲۶ء میں کیا تھا - راقم اور "سر رسول خاں کمپنی" کے منیجر میاں فریدالدین صاحب اس مندر کی سیر کو لئے - وراول سے پٹن تک سڑک کے دائیں بائیں مسلمانوں کی بے شمار قبریں نظر آئیں۔ جنھوں نے سلاطین اسلام کے عہد میں اس مندر کے فتح کرنے میں اپنی جانیں نثار کی تھیں +

پٹن کا دروازہ بہت مستحکم اور عالیشان ہے۔ فصیل پر دو کتبے پتھر کے ہیں۔ ایک عربی میں اور دوسرا سنسکرت میں۔ عربی کتبے میں فتح کے کارنامے اور شہیدوں کے نام کندہ ہیں۔ دوسرے پھاٹک پر ایک اور کتبہ ہے جس میں علاءالدین خلجی کا فتحنامہ لکھا ہے۔ غرض یہ دروازہ تاریخی واقعات کی ایک زندہ تصویر ہے۔ یہاں سے ہم تنگ اور غیر مصفّا بازاروں کو طے کرتے ہوئے مندر کے پاس پہنچے۔ اور احاطہ کا آہنی دروازہ کھولکر اندر گئے۔ مندر کی عمارت پختہ مگر بالکل ویران اور اس کی موجودہ خستہ حالت قدرت الٰہی کا ایک کرشمہ ہے۔ کچھ نامناسب نہ ہوگا اگر میں اس کی ابتدائی شان و شوکت کے حالات ناظرین کی دلچسپی کے واسطے درج کروں۔

مؤرخوں نے لکھا ہے کہ یہ مہادیو کا مندر تھا۔ اور حملہ محمودی کے زمانہ تک ہندوستان کے مشہور تیرتھوں میں شمار ہوتا تھا۔ چاند اور سورج گرہن کے دنوں لاکھوں آدمی دور دور سے یہاں آتے تھے۔ ہندؤں کا یہ اعتقاد ہے کہ روحیں بدن سے جدا ہوکر سومناتھ کی خدمت میں مسئلہ آواگون (تناسخ) کے موافق آتی ہیں اور وہ اپنی مرضی کے موافق اجسام کو روحیں تقسیم کرتا ہے۔ سمندر جو اس کے نیچے لہریں مارتا ہے۔ یہ کوئی جوار بھاٹا نہیں بلکہ سومناتھ کی پرستش میں چڑھتا اُترتا ہے۔ سومناتھ دیوتا مندر کے دروازے کی طرف کھڑا تھا۔ اس کی مورت پانچ گز لمبی تھی۔ ۲ گز زمین کے اندر اور ۳ گز زمین کے باہر۔ عظمت و شان کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ جواہر اور الماس جو در و دیوار میں جڑے ہوئے اور مرصع قندیلوں میں لگے ہوئے تھے۔ اُن کی جوت اور جگمگاہٹ سے دن رات وہاں برابر معلوم ہوتا تھا۔ بیرونی روشنی کی کچھ ضرورت نہ پڑتی تھی۔ چھپن ستون مرصع جواہرات کے تھے۔ چھت میں دو سو من سونے کی زنجیر لٹکتی تھی اور

اُس میں ایک گھنٹہ آویزاں رہتا تھا جو پوجا کے وقت بجتا تھا۔ گنگا باوجودیکہ یہاں سے چھ سو کوس پر ہے مگر ہر روز گنگا جل آتا تھا اور اس سے سومناتھ کا اشنان ہوتا تھا۔ پانچ سو لڑکیاں پوجا کے وقت گاتی اور ناچتی تھیں تین سو گویّے بھجن گاتے اور ساز بجاتے تھے۔ تین سو حجام زائرین کے سر اور داڑھی کے بال مونڈھنے کے واسطے نوکر تھے۔ دو ہزار پنڈے حفاظت کے واسطے متعین تھے۔ اس کے علاوہ ہندوستان کے راجے مہاراجے دور دراز سے بیش قرار چڑھاوے بھیجتے رہتے تھے۔ غرض اس مندر میں اس قدر دولت جمع تھی کہ کسی راجا کے خزانہ میں نہ ہوگی۔ فتح کے بعد سلطان مندر کے اندر داخل ہوا اور سومناتھ کی ناک تبر سے اُڑا دی۔ جب مورت کے توڑنے کا حکم دیا۔ تو پجاری دوڑ کر سلطان کے پاؤں میں گر پڑے اور عرض کرنے لگے۔ کہ اگر آپ اس کو نہ توڑیں تو اس کے عوض جس قدر روپیہ چاہیں ہم لوگ نذر دینے کو آمادہ ہیں۔ یہ بات سُن کر محمود نے کچھ تامل کیا۔ اور فرمایا کہ میرے لئے ایک بُت فروش نام پانے سے بُت شکن نام پانا بہتر ہے۔ یہ کہ کر اس زور سے مورت پر گُرز مارا کہ اُس کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔ اور سلطان کی خوش قسمتی سے اس قدر ہیرے۔ موتی اور جواہرات بیش بہا اس کے پیٹ سے نکلے کہ اس کے مقابلے میں اُس نذرانہ کی کچھ حقیقت نہ تھی۔ جو پنڈے سلطان کی خدمت میں پیش کرتے تھے۔ سلطان نے اُس کے دو ٹکڑے مکّہ معظمہ اور مدینہ منورہ بھجوا دئے۔ اور دو غزنی کو روانہ کرکے ان میں سے ایک جامع مسجد میں اور دوسرا دیوان عام کے دروازے پر ڈلوا دیا +

گجرات کی تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ سلطان کی واپسی کے کچھ

مدّت بعد ہندوؤں نے پھر مندر کو درست کر کے سومناتھ کی مورت اس میں قائم کر دی تھی شیخ سعدی شیرازی ساتویں صدی ہجری میں جب یہاں آئے تو مندر آباد اور اس میں ہاتھی دانت کی مورت رکھی تھی۔ چنانچہ بوستاں میں فرماتے ہیں ؎

بُتے دیدم از عاج در سومنات٭ مرصّع چو در جاہلیت منات

نویں صدی ہجری میں سلاطین گجرات نے اس مندر پر حملہ کیا اور مورت کو توڑ ڈالا۔ اس کے بعد پھر یہ مندر کبھی آباد نہیں ہؤا۔ یہ مندر باہر سے ہشت پہلو اور غالباً اسی مقام پر ہے جہاں پہلے تھا۔ باہر کی طرف کئی قسم کے نقش و نگار ہیں۔ چوڑائی و لمبائی تقریباً دس پندرہ گز ہو گی۔ مندر میں دیوتا کی کوئی مورت نہیں اور نہ کوئی پجاری وہاں رہتا ہے۔ البتہ مویشی اس کے احاطہ میں چرتے رہتے ہیں۔ ہندوؤں نے اس سے تھوڑے فاصلے پر ایک اور مندر وسط شہر میں بنایا ہے۔ عمارت معمولی اور صرف دو چار پجاری وہاں موجود تھے۔ شاید کسی خاص موقع پر جاتریوں کا ہجوم بھی ہوتا ہو۔ اس وقت سومنات ایک معمولی قصبہ ہے تجارتی حیثیت سے اس کو کچھ فروغ نہیں اور نہ جہازوں کی آمد و رفت ہے۔

راج کوٹ

وراول سے راجکوٹ تک ۱۱۲ میل کا فاصلہ ہے۔ راستہ میں

٭ اس شعر میں سومنات سے مراد وہ بُت خانہ یا گاؤں ہے جہاں بُت رکھا ہؤا تھا۔ شیخ فریدالدین عطار کا کلام بھی اسی کا مؤیّد ہے ؎

لشکرِ محمود اندر سومنات٭ یافتند آں بُت کہ نامش بود لات

صاحبِ تاریخ فرشتہ نے لکھا ہے کہ سوم بادشاہ کا نام اور ناتھ بت کا نام ہے چونکہ یہ بُت اُس بادشاہ کے حکم سے بنایا گیا تھا۔ اس واسطے اس شہر کا نام بھی سومناتھ ہی مشہور ہو گیا۔ جیسے بعلبک کہ بُت اور شہر دونو کا نام ہے۔

جونا گڑھ ۔ جیتل سر اور گونڈل بڑے سٹیشن آتے ہیں۔ راجکوٹ ایک متوسط درجے کا شہر اور ریاست ہائے کاٹھیاوار کی پولیٹیکل ایجنسی کا صدر مقام اور ریلوے لائن کا جنکشن ہے۔ یہاں ایک راجکمار کالج ہے جس میں احاطہ بمبئی کے رئیس زادے تعلیم پاتے ہیں۔ کالج کے پرنسپل پروفیسر سید بدیع الزمان (مولوی سید اشرف علی عرف سید عبدالفتاح گلشن آبادی کے نواسے) ایک ذی علم اور با اخلاق آدمی ہیں۔ ان کے ذریعے راجکمار کالج الفرڈ ہائی سکول۔ میموریل انسٹیٹیوٹ۔ کناٹ ہال۔ واٹس میوزیم۔ لنگ لائبریری اور ریڈنگ روم کی سیر کا اچھا موقعہ ملا۔ کناٹ ہال خصوصیت سے قابل دید ہے کہ اس میں کاٹھیاوار کے رئیسوں کی خوشنما تصویریں آویزاں ہیں۔ انہی پروفیسر صاحب کے ذریعے منشی غلام محمد صاحب سے ملاقات ہوئی۔ آپ جوناگڑھ کے رہنے والے اور کل کاٹھیاوار میں ایک ہی مسلمان بیرسٹرایٹ لا ہیں +

راجکوٹ کے فرمانروا ٹھاکر لکھا جی راج باواجی ٹھاکر صاحب ہیں۔ ریاست کا رقبہ ۲۸۱ مربع میل۔ آبادی ۵۷ ہزار اور سالانہ محاصل ۲ لاکھ روپے ہے +

کاٹھیاوار میں اور بھی کئی ریاستیں ہیں جن میں سے منگرول ایک مشہور اسلامی ریاست ہے۔ اس کے فرمانروا کا نام نواب شیخ محمد جہانگیر ہے۔ مگر کمی فرصت کے باعث مجھے وہاں جانے کا اتفاق نہیں ہوا۔ میں اس سفر کو یہیں ختم کر کے وان کنر۔ وڈھوان اور ویرم گام کے راستے سے احمد آباد واپس آیا۔ راجکوٹ سے احمد آباد تک ۱۵۵ میل کا فاصلہ ہے +

(ب) اجنٹی وسط ہند

احمد آباد سے اندور مہو (مئو) اور وہاں سے اُجّین۔ رتلام و جاورہ کی سیر

اجنٹی وسط ہند میں وہ بہت سی ریاستیں شامل ہیں جن کا اکثر حصہ ہندوستان کی اُس سرزمین میں واقع ہے جو تاریخ ہند میں صوبۂ مالوہ کے نام سے مشہور ہے۔ اس کی شمالی حد راجپوتانہ سے ملی ہوئی ہے۔ یہاں کی ریاستوں میں گوالیار۔ اندور اور بھوپال بہت مشہور ہیں۔ ان کے علاوہ ریوان۔ بندھیلکھنڈ۔ دھار۔ دیواس۔ رتلام۔ جاورہ اور بھی کئی ریاستیں ہیں۔ ان سب کا رقبہ اکھتر ہزار مربع میل اور آبادی ۸۵ لاکھ آدمیوں کی ہے کچھ مدت تک مرہٹوں کی تاخت و تاراج سے اس ملک کی حالت بہت ابتر تھی۔ مگر جب سے گورنمنٹ انگریزی نے اپنا تسلط جمایا۔ لوٹ مار رُک گئی اور لوگوں کو ہر قسم کا امن حاصل ہُوا۔ اب یہ ریاستیں گورنمنٹ کی باجگزار ہیں۔ سرکار کی طرف سے نواب گورنر جنرل بہادر کشور ہند کا ایک ایجنٹ ان کی نگرانی کے واسطے مقرر ہے جس کا صدر مقام اندور ہے ÷

پیداوار

اِس ملک کی زمین زرخیز ہے۔ کئی قسم کے غلے اور انواع و اقسام کے میوے یہاں اچھے ہوتے ہیں۔ سب سے زیادہ پیداوار افیون کی ہے۔ تمام بڑے بڑے مہاجن اس کا بیوپار کرتے ہیں۔ ہر سال افیوں کی ہزاروں پیٹیاں بمبئی کے راستے سے جہازوں پر لدکر چین جاتی ہیں۔ چین کے علاوہ گجرات مارواڑ۔ سندھ۔ حیدرآباد دکن اور امراوتی میں بھی اس کی کھپت ہے ÷

ریل

اِس اجنسی کے اکثر حصّوں میں ریل کے ذریعے ... آمد و رفت جاری ہے۔ رتلام سے ایک لائن اجمیر کو۔ دوسری احمد آباد کو اور تیسری اندور ہوتی ہوئی کھنڈوا کو جاتی ہے۔ ایک چوتھی لائن اُجّین ہوتی ہوئی بھوپال پہنچتی ہے آگرہ سے جو لائن بمبئی جاتی ہے۔ اُس پر گوالیر۔ بھوپال وغیرہ کئی شہر واقع ہیں ÷

تعلیم

اجنسی وسط ہند کو اگرچہ تاریخی و پولیٹکل لحاظ سے بہت کچھ اہمیّت حاصل ہے۔ مگر تعلیم۔ تجارت اور صنعت وحرفت میں اسکی حالت اچھی نہیں ہے۔ صرف دو آرٹس کالج ہیں۔ ایک گوالیار میں اور دوسرا اندور میں۔ باقی ریاستوں میں کہیں ہائی سکول اور کہیں مڈل سکول تک پڑھائی کا انتظام ہے اور اخبار تو شاید کسی ریاست سے بھی شائع نہیں ہوتا۔ ہندو ضروریات زمانہ سے آگاہ ہو کر پچھلی کسر نکالنے کے درپے ہیں۔ مگر مسلمان جس قدر تعداد میں کم ہیں اُس سے زیادہ تعلیم اور تجارت میں پست ہیں ÷

گوالیر اور بھوپال کا حال اس سے پہلے سفرنامہ میں درج ہو چکا ہے۔ اندور مہو، اُجّین۔ رتلام اور جاورہ کا حال اس جگہ لکھا جاتا ہے ÷

اِندور

احمد آباد سے ۲۷۹ میل طے کرنے کے بعد میں اندور پہنچا۔ یہ شہر ریلوے لائن کے کنارے اسی نام کی ریاست کا دارالحکومت اور سطح سمندر سے دو ہزار فٹ بلند ہے۔ ایک برساتی نالہ ہے جس کو یہاں کے لوگ کاہان ندی کہتے ہیں۔ شہر کے دو حصّے ہو گئے ہیں۔ بیچ میں نو محرابوں کا ایک پُل مہاراج جسونت راؤ ہلکر کی بیٹی بھیما بائی کا بنوایا ہوا ہے۔ جس کے

ذریعے دونو حصّوں میں آمدورفت ہوتی ہے۔ سو برس پہلے یہ ایک گمنام گاؤں تھا۔ اہلیا بائی بیوہ مہاراج کھانڈے راؤ نے اس کو آباد کیا۔ اور مہاراج جسونت راؤ نے یہاں اپنی چھاؤنی قائم کی۔ شہر کی عمر اگرچہ سو برس سے کچھ ہی زیادہ ہے مگر اس عرصہ میں اس کو ایسا عروج حاصل ہؤا کہ تجارت کے لحاظ سے مالوہ کا کوئی شہر اس کی برابری نہیں کر سکتا۔ بازار وسیع اور عمارتیں دو منزلہ سہ منزلہ بہت عمدہ خوشنما ہیں خصوصاً چوک میں مہاراجہ صاحب کا محل بہت ہی شاندار ہے۔ جینی مذہب کے مندر بھی خوبصورت اور نئی عمارتیں دن بدن کثرت سے بنتی جاتی ہیں۔ مسلمانوں کی کوئی عمارت ایسی نہیں جو خصوصیت سے قابل ذکر ہو۔ مہاراجہ تکوجی راؤ والئے ریاست ہنوز نابالغ ہیں۔ ملکداری کا انتظام ایک کونسل کے متعلق ہے۔ اس میں ہندو اور مسلمان دونو قوموں کے لوگ ہیں۔ مگر زیادہ تر بیرونجات کے ÷

شہر سے تھوڑے فاصلے پر مہاراجہ صاحب کا لال باغ قابل دید ہے جس میں موسم گرما کے واسطے ایک سہ منزلہ کوٹھی بنی ہوئی ہے۔ درمیان میں ایک چھوٹا سا چڑیا خانہ بھی ہے ÷

ریلوے سٹیشن سے بائیں ہاتھ کو انگریزی چھاؤنی ہے۔ جس میں ایجنٹ گورنر جنرل کی کوٹھی ہے۔ ایجنٹ صاحب کی وجہ سے مالوہ کی تمام ریاستوں کے وکلا یہاں حاضر رہتے ہیں۔ ملازمانِ اجنسی میں سالار بخش ناظر نے اچھی عزت پیدا کی ہے۔ بیرونجات کے عہدہ دار علما اور فقراء اکثر ان کے ہاں آکر ٹھیرتے ہیں۔ یہ پشاور کے رہنے والے اور ایک مدت سے یہاں ملازم ہیں ÷

اندور میں تجارت بہت ترقی پر ہے۔ اور زیادہ تر جینی لوگوں کے

ہاتھوں میں ہے۔ مسلمانوں میں سے بوہروں نے خوب ترقی کی ہے اور
یہ اچھے خوشحال ہیں۔ تعلیمی حالت زیادہ اچھی نہیں۔ صرف ایک آرٹس کالج
اور دو ہائی سکول ہیں۔ ... رئیس زادوں کی تعلیم کے واسطے ایک چیفس
کالج ہے جو ہندوستان کے چیفس کالجوں میں چوتھے نمبر پر شمار کیا جاتا
ہے۔ ۱۹۰۱ء میں جب میں اندور آیا۔ تو میرے ایک ہم وطن دوست پنڈت
سری کشن صاحب رئیس زادوں کے مصاحب تھے۔ اُنہوں نے اپنی
قابلیت سے بڑی عزت پیدا کی ہے۔ مجھے ان کے ذریعے ... کالج کی
سیر اور یہاں کے انتظامی حالات دریافت کرنے کا اچھا موقع ملا +

اس سفر میں مولوی سید عبدالحق صاحب وکیل رتلام سے
خوب ملاقاتیں ہوئیں۔ یہ ضلع مظفر نگر کے رہنے والے۔ علوم عربیہ میں بہت
لائق اور بڑے مہماں نواز ہیں۔ آپ نے ازراہ مسافر نوازی چند اہل علم اور
معززین سے شناسا کیا۔ ان میں سے حکیم محمد اعظم خاں صاحب بڑے لائق
طبیب اور نامور مصنف ہیں۔ آپ نے اکسیر اعظم۔ محیط اعظم۔ قرابادین اعظم
اور چند دیگر بڑی بڑی مفید کتابیں فن طب میں تصنیف کی ہیں۔ اور اس
خصوصیت میں اُنیسویں صدی کے ہندوستانی اطبا میں سب سے زیادہ
قابل تعریف ہیں۔ حکیم صاحب دراصل رامپور کے رہنے والے ہیں۔ اندور
میں پہلے میر منشی کے عہدے پر ممتاز تھے۔ پھر طبابت کے مشغلے میں
لگ گئے۔ اور اُسے تکمیل کی حد تک پہنچایا۔ دوسرے صاحب مولوی
محمد مجتبیٰ خاں اکونٹنٹ جنرل کی خدمت پر مامور اور بہت با اخلاق
و ذی علم ہیں۔ آپ بھی رامپور کے رہنے والے ہیں۔ اکونٹنٹ کو اس جگہ
پھڑ نویس کہتے ہیں جو غالباً فرد نویس کا بگڑا ہوا ہے ۱۹۰۱ء میں جب

میں اندور آیا۔ حکیم محمد اعظم صاحب انتقال کر چکے تھے۔ پنڈت سری کرشن پنجاب چلے گئے۔ مولوی سید عبدالحق صاحب اکونٹنٹ جنرل کے عہدے پر تبدیل ہوکر زنلام میں تشریف رکھتے ہیں۔ غرض اس وقت پرانے دوستوں میں سے صرف محمد مجتبیٰ خاں اور رسالدار بخش ناظر اجنٹی اپنے اپنے کام پر ہیں ۔

نواباں باندہ کا خاندان زمانہ غدر سے اس جگہ مقیم ہے۔ یہ خاندان دراصل پیشوا کی اولاد سے ہے جن کے مورثِ اعلیٰ نے شرف اسلام قبول کیا تھا۔ اس خاندان کے موجودہ رکن نواب بہادر نے دینی حمیّت سے ایک مسجد چھاؤنی میں تعمیر کرائی ہے جو مقامی حیثیت کے لحاظ سے خوش وضع اور چھاؤنی کے مسلمانوں کو اس سے بڑا آرام ہے ۔

تاریخی حالات اندور منجملہ اُن ریاستوں کے ہے جن کو مرہٹہ سرداروں نے سلطنت مغلیہ کے زمانہ ضعف میں قائم کیا تھا۔ اس کے مورث اعلیٰ مہار راؤ ہلکر ہیں۔ یہ ابتدا میں بھیڑ بکری چرایا کرتے تھے۔ مگر مرہٹوں کی سرکار میں فوجی ملازمت سے ترقی کرتے کرتے بڑے صاحب اقتدار ہو گئے۔ ۱۱۴۵ھ ۱۷۳۲ء میں صوبہ دار مالوہ کو شکست دیکر ملک کا بڑا حصّہ بطور جاگیر حاصل کیا۔ اور چالیس سال فرمانروائی کرنے کے بعد ۱۱۷۹ھ ۱۷۶۵ء میں راہے ملک عدم ہوئے۔ ان کے انتقال پر ریاست کی آمدنی تقریباً ایک کروڑ روپیہ تھی۔ اس خاندان میں دو رانیاں بڑی نامور فرمانروا گزری ہیں۔ (۱) مہارانی اہلیا بائی بیوہ مہاراجہ کھنڈے راؤ جس نے تیس سال حکومت کے بعد ۱۲۱۰ھ ۱۷۹۵ء میں انتقال کیا۔ (۲) مہارانی تلسی بائی جو ۱۲۳۲ھ ۱۸۱۷ء میں مقتول ہوئیں ۔

سب سے آخری فرمانروا مہاراجہ سیواجی راؤ ہلکر جی۔ سی۔ ایس۔ آئی ایک تعلیم یافتہ۔ روشن دماغ اور آزاد خیال شخص تھے۔ افسوس ہے کہ یہی

آزاد خیالی آخر کار اس امر کا باعث ہوئی۔ کہ ریاست اپنے ولیعہد کو سپرد کر کے خود حکومت سے علیحدہ ہو گئے۔ ولیعہد مہاراجہ تکوجی راؤ ہنوز نابالغ اور انتظام ریاست کونسل کے ہاتھ میں ہے ✤

ریاست کا رقبہ ۹ ہزار ۵ سو مربع میل آبادی ۸ لاکھ ۵۰ ہزار ہے۔ فوج میں ۳ ہزار ۲ سو سوار ۶ ہزار پیادے اور ۶۰ توپیں ہیں ✤

مہو (مئو)

اندور سے چودہ میل کے فاصلے پر مئو کی مشہور چھاؤنی اُس لائن پر واقع ہے جو اندور سے کھنڈوا کو جاتی ہے۔ یہ بڑا وسیع فوجی سٹیشن اور عمدگی آب و ہوا کی وجہ سے مشہور ہے۔ اس میں یورپین اور دیسی فوجیں ۱۸۱۸ء کے معاہدہ کے مطابق معقول تعداد سے رہتی ہیں۔ اندور اور مئو میں کثرت آمد و رفت کے باعث سپیشل ٹرینوں کے علاوہ موٹر کار بھی کئی مرتبہ آتی جاتی ہے ✤

اُجّین

اندور سے ۳۹ میل طے کرنے کے بعد میں اُجّین پہنچا۔ یہ شہر سپرا ندی کے کنارے حضرت مسیح سے بہت پہلے کا آباد اور زمانہ قدیم میں مہاراجگان مالوہ کا پایۂ تخت تھا۔ ان میں سے راجا بکرماجیت بہت مشہور ہوا ہے جس کی تاریخ جلوس سے ہندو سمت کا آغاز کرتے ہیں۔ اُجّین کا اصلی نام اونتی کا پوری ہے۔ اس شہر کی قدامت کا اس سے پتہ لگتا ہے کہ مہابھارت میں بھی اس کا ذکر موجود ہے۔ شاستر کے مطابق

یہ شہر ہندوستان کے سات مشہور تیرتھوں میں شمار ہوتا ہے - جن کو سات پورے کہتے ہیں - ہندوؤں کے عہد میں یہاں مندر بکثرت اور لاکھوں آدمی آباد تھے - چنانچہ عمارات قدیم کے کھنڈر اب تک کوسوں میں دکھائی دیتے ہیں +

سلطان شمس الدین التمش نے ۶۳۱ھ میں اس کو فتح کیا - اس کے بعد کچھ عرصہ تک یہاں کے حکمران سلطنت دہلی سے آزاد ہوکر خود مختار ہوگئے جن کا دارالحکومت شہر مانڈو تھا - شہنشاہ اکبر کے زمانے میں یہ دہلی کا صوبہ قرار پایا - اور مغلوں کے آخری دور تک اُجّین صوبہ مالوہ کا دارالحکومت رہا - تیرھویں صدی ہجری میں کچھ عرصہ تک مہاراجی سیندھیا اور دولت راؤ سیندھیا کے زمانے میں بھی دارالحکومت رہنے کی عزت اس کو حاصل تھی - جب دولت راؤ سیندھیا نے ۱۲۲۵ھ / ۱۸۱۰ء میں اپنا دارالحکومت گوالیار کو منتقل کیا - اُس وقت سے اس کی وہ رونق جاتی رہی - اب معمولی حیثیت کا قصبہ اور ۳۵ ہزار کی آبادی ہے - ریاست گوالیار کا جس قدر حصہ صوبہ مالوہ میں ہے - اس کا سرصوبہ (کمشنر) اس جگہ رہتا ہے +

شہر کی آبادی ریلوے سٹیشن سے ملی ہوئی ہے - بازار وسیع اور نئی عمارتیں اکثر خوشنما ہیں - دُکانیں انواع و اقسام کے مال سے پُر ہیں - ہندو مسلمانوں کی مذہبی عمارتیں قابل دید ہیں - مسجدوں میں بے نیو کی مسجد اور جامع مسجد

ملہ ان سات تیرتھوں کے نام یہ ہیں :- (۱) اجودھیا جہاں راجہ رامچندر جی پیدا ہوئے - (۲) متھرا جہاں سری کرشن جی نے جنم لیا - (۳) مایا یعنی ہردوار - (۴) کاشی یعنی بنارس - (۵) کانجی جو ملک دکن میں ہے - (۶) اونتکا پوری یعنی اُجّین - (۷) دوارا یعنی دوارکا - (از سفرنامہ رائے بہادر لالہ ایسر چندر صاحب جیا) +

قدیم عمارتیں ہیں۔ تجارت کو خوب ترقی ہے۔ مسلمانوں میں بوہرے تجارت پیشہ اور بڑے مالدار ہیں۔ سیٹھ نذر علی بوہرہ نے ایک کارخانہ کپڑا بننے کا جاری کیا ہے۔ پہلے اس میں صرف سوت کاتا جاتا تھا۔ اب پارچہ بافی کا کام بھی شروع ہوگیا ہے۔ سرسوبہ نے بیان کیا کہ تقریباً تین سو تھان روزانہ تیار ہوتے ہیں۔ مادھو کالج میں انٹرنس کلاس تک پڑھائی کا انتظام ہے۔

چوبیس کھنبا۔ شہر کی ایک جانب چوبیس کھنبا (ستون) کا دروازہ مشہور تاریخی مقام ہے۔ جس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ راجا بکرماجیت کا بنوایا ہوا ہے۔ برہمنوں کا بیان ہے کہ اس مکان میں ۶۴ جوگی رہا کرتے تھے۔ شہر کے باشندوں میں سے ایک آدمی ہر روز راجا بنایا جاتا تھا۔ یہ جوگی اُس کو مار کر اُس کا خون پی لیتے تھے۔ آخر کار بکرماجیت نے اُن کو زیر کیا اس واقعہ کی یادگار میں دسہرہ اور اشٹمی کے دن بھگوتی کا بڑا بھاری میلہ یہاں ہوتا ہے۔ اس دن شراب کے بے شمار گھڑے اس دروازے میں لنڈھائے جاتے ہیں۔ لوگ بہتی ہوئی شراب کو تبرک کے طور پر اُٹھا لیتے ہیں۔

مہاکال کا مندر۔ باڑہ کے قریب مہاکال مہادیو کا مندر ہے کہتے ہیں کہ اُجین میں چوراسی مہادیو ہیں۔ اور ان سب کے سردار مہادیو مہاکال ہیں۔ راجہ بکرماجیت نے یہ مندر بہت عالیشان بنوایا تھا۔ اس کی بلندی سو گز تھی۔ سلطان شمس الدین التمش نے جب مالوہ فتح کیا۔ تو اس مندر کو توڑ ڈالا۔ موجودہ مندر زمانہ مابعد کا بنایا ہوا ہے۔ اس کے سامنے ایک تالاب ہے جس کو کوٹ تیرتھ کہتے ہیں۔ یہاں اشنان کرنے سے ایک کروڑ تیرتھ کا اشنان ہو جاتا ہے۔ اس کے چاروں طرف چھتریاں بنی ہوئی ہیں۔

سپرا ندی کے گھاٹ - بائیں شہر سپرا ندی بہتی ہے۔ اس کے کنارے کنارے پختہ گھاٹوں کا سلسلہ بنا ہوا ہے۔ جس کو پچاس موچن* کا گھاٹ کہتے ہیں۔ ہندو یہاں غسل کرنے کو بڑا ثواب سمجھتے ہیں۔ صبح سے شام تک غسل کرنے والوں کا ہجوم رہتا ہے۔ گھاٹوں کے محاذ ایک ٹیکرے پر بہت سی عمدہ عمارتیں اور مندر ہیں۔ مندروں کے درمیان سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیا کے خلیفہ مولانا مغیث الدین کی درگاہ ہے۔ جس کے احاطے میں ۴۵ سیڑھیاں طے کرنے کے بعد جانا پڑتا ہے۔ احاطے میں ایک قناتی مسجد اور کئی پختہ قبریں ہیں۔ انہیں میں مولانا وجیہ الدین اور شیخ ابراہیم کے مزار ہیں جو حضرت نصیر الدین چراغ دہلوی کے برادر زادہ ہیں۔ مولانا مغیث الدین کے مزار کے محاذ جو گھاٹ بنا ہوا ہے۔ وہ مسلمانوں کے غسل کرنے کے واسطے مختص ہے +

رانی خاں کا باغ - سپرا ندی کے پار رانی خاں کا باغ مشہور ہے۔ یہ رانی خاں ذات کا سقہ اور پانی پت کی لڑائی میں مرہٹہ فوج کے ہمراہ تھا۔ جب مرہٹے شکست کھا کر بھاگے۔ تو مہاواجی سیندھیا طلائی اور نقرئی ساز و سامان سے آراستہ گھوڑے پر سوار تھا۔ ایک ولایتی تعاقب کرتا ہوا اُس کے پیچھے گیا اور نہر کے قریب مہاواجی کے پاؤں پر تبر مار کر زمین پر گرا دیا۔ اس وقت رانی خاں بیل پر سوار آرہا تھا۔ مہاواجی کو اُٹھا کر بیل پر سوار کرایا اور خدمت کرتا ہوا اُجّین لے آیا۔

* پچاس موچن سنسکرت کے ایک لفظ پساچ مُوکش کا بگڑا ہوا ہے۔ پساچ بھوت پلید اور ارواح خبیثہ کو کہتے ہیں۔ اور موکش کے معنی نجات کے ہیں۔ ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ جس شخص پر بھوت پلید آتا ہو۔ وہ اس گھاٹ پر غسل کرے۔ تو اُس سے نجات پائے +

مہاواجی نے اس خدمت کے صلہ میں رانی خاں کو بھائی بنایا - اور امرا میں داخل کر لیا ٭

بھرتری کی گپھا شہر سے تھوڑے فاصلے پر راجا بکرما جیت کے بھائی راجہ بھرتری کی گپھا (گوشۂ عبادت) ایک پہاڑ کی غار میں ہے - اور اس میں کچھ عمارت بھی بنی ہوئی ہے - مشہور ہے کہ جب راجہ بھرتری نے تارک السلطنت ہو کر جوگ اختیار کیا - تو اسی جگہ بیٹھ کر ریاضت کیا کرتا تھا - یہ گپھا متبرک سمجھی جاتی ہے - جہانگیر بادشاہ نے اس گپھا میں ایک جوگی سے ملاقات کی تھی - اور اس کا ذکر اپنی تزک میں کیا ہے ٭

کالیادہ - اجین سے دو ڈھائی کوس کے فاصلے پر سلطان ناصر الدین بن غیاث الدین شاہ مانڈو کا محل کالیادہ کے نام سے مشہور ہے - اس جگہ سپرا ندی دو دھاریں ہو کر بہتی ہے - اس کے درمیان ٹیکرا ہے جس پر یہ محل بنایا گیا تھا - محل میں متعدد باغات - حوض اور آبشار ہیں - ٹیکرے سے ندی کے کنارے تک سترہ در کا ایک بہت مستحکم پل بنا ہوا ہے اور اس کے منفذوں سے پانی تقسیم ہو کر حوضوں میں گرتا ہے - پھر دوسرے حوضوں میں گشت کرتا ہوا تمام باغوں کو سیراب کر کے ندی میں مل جاتا ہے - بیچ میں کئی جگہ آبشار . . اور فوارے ہیں - زمانۂ مابعد میں اکثر سلاطین نے یہاں مکانات تعمیر کرائے - شہنشاہ اکبر - جہانگیر اور شاہجہان کے عہد کے کتبے نشستگاہوں اور ستونوں پر اب تک موجود ہیں - مگر مرہٹوں نے اپنے زمانے میں اس بے نظیر عمارت کی کچھ قدر نہ کی - جس سے دن بدن ویرانی اور بربادی کے آثار نمودار ہوئے - اگرچہ عمارتیں کچھ کچھ منہدم ہو گئیں - باغ اُکھڑ گئے - حوض پٹ گئے - مگر با ایں ہمہ

موقعہ کی عمدگی۔ عمارت کی لطافت اور خوشنمائی کچھ ایسی دلفریب واقع ہوئی ہے کہ حالت فرسودگی میں بھی اس کے دیکھنے سے طبیعت کو فرحت حاصل ہوتی ہے ÷

رصد گاہ - اُجّین سے گوشۂ جنوب میں ایک رصد گاہ ہے جسے راجہ جے سنگھ صوبہ دار مالوہ نے ۲۰ لاکھ روپے کے صرف سے محمدؐ شاہ کے عہد میں بنوایا تھا - اب یہ رصد گاہ بالکل برباد ہو گئی صرف چند دیواروں کی بنیادیں اور پتھر چونے کا انبار نظر آتا ہے ÷

رتلام

اُجّین اور رتلام میں ۵۳ میل کا فاصلہ ہے۔ یہ شہر ریلوے لائن کے کنارے اسی نام کی ریاست کا دارالحکومت اور ایک متوسط درجے کا شہر ہے۔ شہر کا نواح سرسبز اور باغات دلچسپ ہیں - خاص کر ریاست کا باغ بہت خوش وضع ہے۔ چاندنی چوک کا بازار چوسر کی شکل پر بہت وسیع اور خوب بنا ہوا ہے - تجارت اچھی ترقی پر ہے - جینی لوگ یہاں کے بڑے تاجر ہیں - تعلیم کا انتظام ہائی سکول تک ہے - رتلام سے اجمیر بڑودہ - اندور اور اُجّین کو ریل کی سڑکیں نکلتی ہیں جس سے اس کی رونق دن بدن ترقی پر ہے ÷

موجودہ فرمانروا ہز ہائنس راجا سجن سنگھ صاحب کا خاندانی سلسلہ ریاست جودھ پور سے ملتا ہے۔ جو ہندوستان میں بہت قدیم اور ایک مشہور ریاست ہے - آپ اندور کالج کے تعلیم یافتہ اور بیدار مغز رئیس ہیں - رعایا کی بہبودی کا آپ کو بڑا خیال ہے ÷

مولوی عبدالحق صاحب جو میرے ۱۹۰۱ء کے سفر میں ریاست کی طرف سے اندور میں وکیل تھے - اب کچھ عرصے سے یہاں اکونٹنٹ جنرل کے عہدے پر ممتاز ہیں - ان کی ملاقات سے بہت خوشی ہوئی - ریاست کا رقبہ ۹ سو ۲ مربع میل آبادی ۸۳ ہزار ۷ سو ۳ ۷ اور آمدنی ۱۲ لاکھ ہے +

جاورہ

رتلام اور جاورہ میں ۲۱ میل کا فاصلہ ہے - یہ شہر ریلوے لائن کے کنارے اسی نام کی ریاست کا دارالحکومت اور ایک چھوٹا سا شہر ہے - شہر کے درمیان سے ایک پہاڑی نالہ گزرتا ہے - والیٔ ریاست کے محلات اسی نالہ کے کنارے پر واقع ہیں - اور مقامی حالت کے لحاظ سے اچھے ہیں - والیٔ ریاست کے زمانہ نابالغی میں نواب یار محمد خاں صاحب مدار المہام نے انتظامی کاروبار کو خوب رونق دی - رعایا کی بہبودی خصوصاً تعلیم کی سرپرستی اور رفاہ عام میں انہیں بڑی دلچسپی ہے - چالیس ہزار روپے نقد اور ۲۰۰ روپے ماہوار کی پنشن علیگڈھ کالج کو نذر کردی ہے - جاورہ کی شہرت جو مقامی حیثیت کے مقابلہ میں بہت بڑھی ہوئی ہے - وہ انہی کی حسن تدبیر اور فیاضی کا نتیجہ ہے +

تاریخی حالات - ریاست کے بانی نواب غفور خاں صاحب افغانستان کے رہنے والے اور ایک بہادر و باتدبیر آدمی تھے - ابتدا میں مہاراج ہلکر اور امیر خاں نواب ٹونک کے درمیان وکالت کا کام کرتے تھے - پھر ۱۸۱۸ء میں سرکار انگریزی کی توجہ سے ریاست کے مستقل فرمانروا قرار پا گئے - موجودہ فرمانروا ہز ہائینس نواب افتخار علی خاں بہادر صولت جنگ ایک ہونہار تعلیم یافتہ نوجوان ہیں +

(ج) راجپوتانہ

چتوڑ گڑھ سے اودے پور اور وہاں سے اجمیر۔ جودھپور۔ جے پور۔
بھرت پور۔ الور۔ حصار۔ بٹھنڈا کی سیر کرتے ہوئے لاہور کی واپسی

راجپوتانہ اُن دیسی ریاستوں کا بڑا مجموعہ ہے جو پنجاب سے جنوب کی طرف ریاست ہلکر و پالن پور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ ضلع اجمیر کے سوا جو گورنمنٹ انگریزی کے زیر حکم ہے۔ باقی تمام رقبہ میں اٹھارہ ریاستیں ہیں۔ ان میں سے اودے پور یا میواڑ۔ جودھپور یا مارواڑ کے رئیس ہندوستان کے سب سے پُرانے رؤسا میں شمار ہوتے ہیں۔ باقی ریاستوں میں بیکانیر۔ جیسلمیر۔ جے پور۔ ٹونک۔ بھرتپور۔ دھولپور اور الور زیادہ مشہور ہیں۔ منجملہ ریاستہائے مذکورہ کے ریاست ٹونک مسلمانوں کی۔ بھرت پور اور دھولپور جاٹوں کی۔ اور باقی سب راجپوتوں کی ہیں۔ ان کا رقبہ ایک لاکھ ۲۸ ہزار مربع میل اور آبادی ایک کروڑ کے قریب ہے۔ سرکار انگریزی کی طرف سے ان کی نگرانی کے واسطے گورنر جنرل کا ایک ایجنٹ مقرر ہے جس کا صدر مقام کوہ آبو ہے +

پیداوار

راجپوتانے کا اکثر حصّہ خصوصاً شمال مغرب بالکل ریگستان ہے۔ جنوب اور مشرق کے علاقوں میں کوہستان زیادہ ہیں۔ گندم اور مکئی اس ملک کی خاص پیداوار ہے۔ مگر بارش کم ہونے سے ملک کا بڑا حصّہ کاشتکاری کے واسطے کچھ فائدہ مند نہیں۔ البتہ ریگستانی حصے میں اونٹوں مویشیوں اور بھیڑوں۔ بکریوں کے لئے چارہ کافی ہوجاتا ہے۔ جھیل سانبھر جو اجمیر کے شمال میں ہے۔ وہاں سے نمک بکثرت نکلتا اور ہندوستان

کے مختلف حصوں میں جاتا ہے۔ سنگ مرمر اور سنگ سُرخ جو دہلی و آگرہ کے خوبصورت مکانوں میں لگا ہوا ہے۔ شمال مشرقی راجپوتانہ سے نکلتا ہے +

ریل

راجپوتانے کی اکثر ریاستیں ریلوے لائن کے ذریعے ملی ہوئی ہیں۔ ریل کا صدر مقام اجمیر ہے۔ جہاں سے ایک لائن چتوڑ ہوتی ہوئی سنٹرل انڈیا کو۔ دوسری احمد آباد کو اور تیسری دہلی جاتی ہے۔ ایک لائن جودھپور ہوتی ہوئی حیدر آباد سندھ تک پہنچتی ہے +

باشندے

باشندے علے العموم زراعت پیشہ ہیں۔ ساہوکارے کا کام خاصکر مارواڑیوں کے ہاتھ میں ہے۔ یہ لوگ بڑے دولتمند اور ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں میں صرافی اور بیوپار کا کام کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں +

تعلیم

تعلیمی حالت کے لحاظ سے ابھی یہ صوبہ بہت پیچھے ہے۔ منجملہ اٹھارہ ریاستوں کے صرف جے پور میں ایک کالج ہے۔ باقی ریاستوں میں کہیں ہائی سکول اور کہیں مڈل سکول تک پڑھائی ہوتی ہے۔ البتّہ گورنمنٹ کی طرف سے ایک آرٹس کالج انگریزی تعلیم کے واسطے اور ایک چیفس کالج رئیس زادوں کی تعلیم کے واسطے اجمیر میں قائم ہے۔ اور یہ دونو بڑی کامیابی سے چل رہے ہیں +

تمدّن

اِس صوبے کی تمدّنی حالت بہت قابلِ اصلاح ہے۔ خصوصاً مسلمان دینی اور دُنیاوی ترقی میں اپنے ابنائے وطن سے بہت پیچھے رہے ہوئے ہیں۔ ان کے مذہب کی یہ حالت ہے کہ رسم و رواج میں ہندوؤں کی عادات کے پابند ہیں۔ اُنہی کا سا لباس پہنتے ہیں۔ بیاہ شادی

کے موقعوں پر برہمنوں سے مہورت نکلواتے ہیں۔ بچوں کی جنم پتری اُن سے تیار کراتے ہیں۔ حیرانی کی بات ہے کہ شمالی ہند کی اسلامی انجمنیں ادھر کیوں توجہ نہیں کرتیں ؟

تاریخی حالات

اس ملک کی فرمانروا قوم راجپوت ہے جس کو سورج بنسی خاندان کی اولاد ہونے کا فخر ہے۔ یہ لوگ نہ مسلمانوں کی طرح نووارد اور نہ مرہٹوں کی طرح نودولت ہیں۔ بلکہ ان کی حکومت سینکڑوں برس سے چلی آتی ہے۔ اور انہیں کے نام پر یہ ملک راجپوتانہ یا راجستان کہلاتا ہے۔ یہ لوگ مسلمانوں کی فتوحات سے پہلے شمالی ہند میں بڑی بڑی سلطنتوں پر حکمران تھے۔ ان کا یہ دستور تھا کہ جب کبھی راجپوتوں کے کسی خاندان کی حکومت ہندوستان کے زرخیز حصہ میں نہ رہتی تو سارا خاندان یا اُس کا کوئی حصہ مغرب کی طرف جاکر راجپوتانے میں اپنی چھوٹی موٹی ریاست قائم کر لیتا تھا۔ اس طرح سے راجپوتوں کے خاندان اور ان کی شاخیں آج تک وہاں حکمران اور زمینوں پر قابض ہیں۔ باوجود مسلمانوں کی پے در پے فتوحات کے ہندوؤں کے راج کی قدیم حالت کی نشانیاں اب تک اس ملک میں باقی ہیں۔ یہ راجپوت ہمیشہ سے بہادر مانے گئے ہیں مسلمانوں کا مقابلہ زیادہ تر انہیں نے کیا تھا۔ اکبر کے زمانہ تک تو وہ کسی مسلمان بادشاہ کے مطیع نہ ہوئے۔ مگر اس مدبّر بادشاہ نے زور شمشیر اور حسن تدبیر سے ان کو اپنا گرویدہ کر لیا۔ اور راجپوت رانیوں سے شادی کرکے رشتۂ اخوت جوڑا۔ مغلوں کے زمانہ میں ایک عرصہ تک ان ریاستوں کا انتظام عمدہ تھا۔ مگر اٹھارھویں صدی عیسوی میں دکن کے مرہٹوں اور ہمسایہ جاٹوں کے حملات اور پنڈاروں کی لوٹ مار سے ملک میں بدنظمی پھیل گئی۔ لوگوں کی جان و مال بالکل غیر محفوظ تھی۔ کوئی شخص بغیر ہتھیار باندھے گھر سے نہیں نکلتا تھا۔ اُنیسویں صدی کے شروع میں انگریزی گورنمنٹ نے ان تمام حملہ آوروں

کو مطیع کرکے راجپوتانے کے راجاؤں کو اپنے سایۂ حفاظت میں لے لیا۔ اُس وقت سے پورا امن ہے +

چتّوڑ

یہ ریاست اودے پور کے ایک ضلع کا صدر مقام اُس لائن پر ہے جو اجمیر سے اندور کو جاتی ہے اجمیر یہاں سے ۱۱۶ میل اور اندور ۱۹۱ میل ہے۔ شہر ریلوے سٹیشن سے ۲ میل اور اُس پہاڑی کے دامن میں واقع ہے جس پر چتّوڑ کا نامور اور تاریخی قلعہ ہے۔ اس کی آبادی اگرچہ ساڑھے سات ہزار کے قریب ہے۔ مگر مسافروں کی آرام و آسائش کا کچھ بندوبست نہیں +

قلعہ کی عمارت ایک پہاڑی پر ہے جو اردگرد کی سطح زمینوں سے پانسو فیٹ بلند ہے۔ اس کی لمبائی سوا تین میل اور عرض زیادہ سے زیادہ نصف میل ہے۔ آمد و رفت کے واسطے ایک چکردار سڑک بنی ہوئی ہے۔ اس سڑک کی حفاظت کے واسطے بیرونی جانب کو ایک مستحکم فصیل اور موقعہ موقعہ پر سات دروازے ہیں۔ باوجود اس قدر بلندی کے آبرسانی کا انتظام بہت اچھا ہے۔ کئی چشمے۔ باوڑیاں اور تالاب موجود ہیں۔ راجاؤں کے زمانہ میں قلعہ کی آبادی کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے۔ کہ شہنشاہ اکبر کے حملہ کے وقت آٹھ ہزار فوج اور چالیس ہزار باشندے قلعہ کے اندر تھے۔ کہتے ہیں کہ چترانگ نام ایک راجا نے ساتویں صدی مسیحی میں اس کو تعمیر کروایا تھا۔ اور اسی کے نام پر یہ چتراکوٹ کہلاتا تھا۔ جو آخرکار بگڑ کر چتّوڑ ہو گیا +

یہ قلعہ سولھویں صدی مسیحی تک ریاست اودے پور کا پایہ تخت تھا۔

اس کو تاریخ ہند میں اس وجہ سے شہرت ہے کہ یہاں کے راجپوتوں نے اپنی آزادی قائم رکھنے کے لئے بڑی بڑی خونریز لڑائیاں اس جگہ کی تھیں۔ سلاطین اسلام میں سب سے اوّل علاء الدین خلجی نے ۷۰۳ھ ۱۳۰۳ء میں اس کو فتح کیا۔ علاء الدین کے دوسرے حملہ کی سرگزشت بہت دردناک ہے جو اُس نے رانی پدمنی کے واسطے کیا تھا۔ جب راجہ شاہی محاصرہ سے جاں بلب ہُوا اور پدمنی کو اپنی موت کا یقین دلایا۔ تو اُس نے جان کو پاکدامنی پر قربان کردیا اور ایک چتا بنا کر مع دیگر رانیوں کے جل گئی۔ اس کے بعد سلطان محمدؐ تغلق بادشاہ دہلی۔ بہادر شاہ والئے گجرات اور شہنشاہ اکبر بڑے بڑے معرکوں کے بعد اُس پر قابض ہوئے غرض یہ قلعہ تاریخی واقعات کی ایک دلچسپ یادگار ہے ×

قدیم زمانے کے بہت سے محل اور مندر قلعہ میں ہیں جن میں سے ثابت کم اور شکستہ زیادہ۔ ایک طرف کچھ زمینداروں اور دُکانداروں کے مکان بھی ہیں مگر اس کی تمام حالت ویرانہ کے مشابہ ہے۔ البتہ وہ حصّہ جس میں مہارانائے اودے پور کبھی کبھی آکر ٹھیرتے ہیں اچھی حالت میں ہے۔ یہاں کی عمارتوں میں سے "جے ستھمب" مینار قابل دید ہے جس کو رانا کھمبا نے ۸۴۶ھ ۱۴۴۲ء اور ۸۵۳ھ ۱۴۴۹ء میں شاہان مالوہ اور گجرات کی متحدہ فوجوں پر فتحیاب ہونے کی یادگار میں بنوایا تھا۔ اس کی ۹ منزلیں ہیں جن میں نیچے سے اوپر تک چکردار سیڑھیاں بنی ہوئی ہیں۔ اس مینار کی بلندی ۱۲۰ فٹ ہے ×

اودے پور (میواڑ)

چتوڑ اور اودے پور میں ۶۹ میل کا فاصلہ ہے۔ اودے پور اسی نام کی ریاست کا دارالحکومت اور اودے پور چتوڑ ریلوے کا انتہائی اسٹیشن ہے۔

سنہ ۱۹۰۱ء کی مردم شماری کے مطابق اس کی آبادی تقریباً ۴۶ ہزار ہے اور اس حیثیت سے راجپوتانہ کے شہروں میں اس کا پانچواں نمبر ہے۔ ریاست کا دارالحکومت ایک عرصہ دراز تک چتوڑ تھا۔ سنہ ۹۶۷ھ مطابق ۱۵۵۹ء میں رانا اودے سنگھ نے یہ شہر تعمیر کرا کر اس کو دارالحکومت قرار دیا۔ باشندوں کی زبان مارواڑی ہے کاروباری لوگ اُردو بھی سمجھتے ہیں۔

شہر ریلوے سٹیشن سے کوئی تین میل کے فاصلہ پر ایک چھوٹی سی پہاڑی کے ڈھلوان پر ہے۔ بازار وسیع۔ سڑکیں کشادہ اور مکانات خوشنما ہیں۔ مہارانا صاحب کا محل پہاڑ کی چوٹی پر ہے۔ اس کے پائیں پچولا جھیل سوا دو میل لمبی اور ڈیڑھ میل چوڑی ہے۔ ایک کنارے پر رعایا کے مکانات اور وسط میں جگ مندر و جگ نواس ریاست کے دو محل سنگ مرمر کے ہیں جن کے اندرونی حصہ میں قیمتی پتھر آگرہ کے تاج محل کی طرح جڑے ہوئے ہیں۔ جگ نواس کا صحن وسیع اور اس میں ایک بہت عمدہ باغ ہے جگ مندر کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ شاہجہاں بایام شاہزادگی اس میں رہا کرتا تھا۔ جھیل میں کشتیاں پڑی رہتی ہیں۔ لوگ صبح و شام ان میں سوار ہو کر سیر کرتے ہیں۔ عمارت میں جو خوبی اور خوشنمائی ہے۔ جھیل کے پانی اور پہاڑ کے سبزہ سے اُس کی دلچسپی بدرجہا بڑھ گئی ہے بحیثیت مجموعی ایسا دلکش منظر ہندوستان میں دوسری جگہ نہ ہوگا۔

باشندوں کی توجہ نوکری پر زیادہ اور حرفت و صنعت پر کم ہے تلواریں خنجر اور زردوزی کا کام اچھا ہوتا ہے۔ مگر استعمال چیزیں بیشتر باہر سے آتی ہیں۔ تعلیم کا انتظام صرف ہائی سکول تک ہے۔ دو مدرسے لڑکیوں کے بھی ہیں۔ ہائی سکول میں مولوی نجم الغنی صاحب رام پور کے رہنے والے
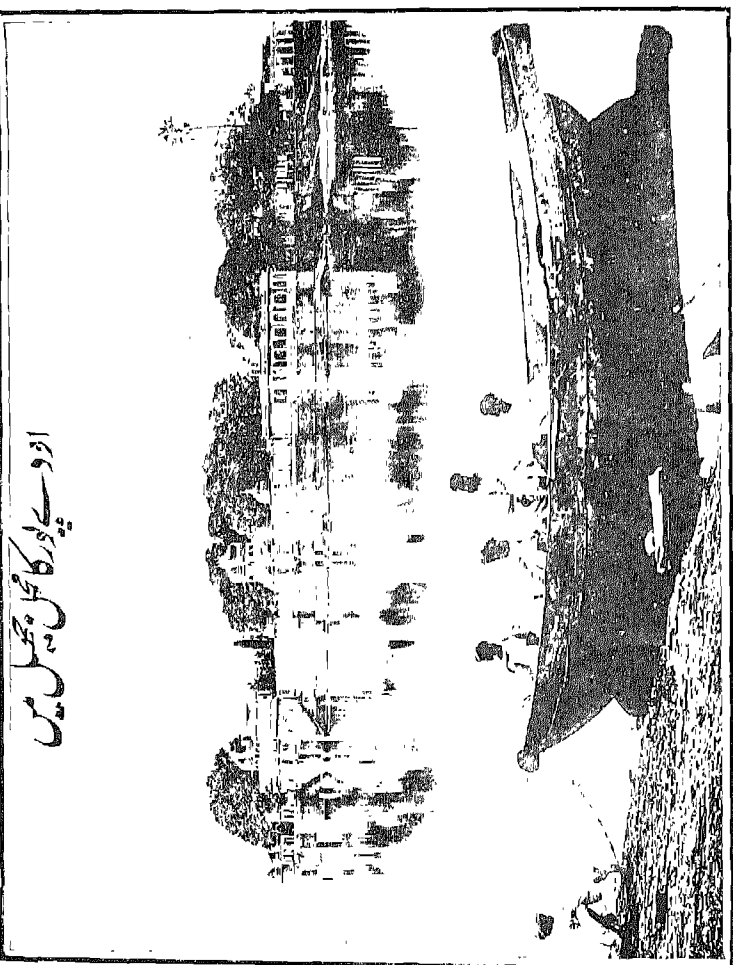
اودے پور کا محل جھیل میں

ایک بہت قابل آدمی ہیں۔ ابتدا میں آپ طبابت کیا کرتے تھے۔ علوم عقلیہ ونقلیہ سے بہت باخبر اور کئی کتابوں کے مصنّف ہیں +

اس ریاست کے فرمانروا مہارانا فتح سنگھ صاحب ہیں۔ اِن کو رعایا پروری کا بڑا خیال ہے۔ مندرجہ ذیل دو امور سے اُن کے حُسنِ انتظام کا سرسری اندازہ ہوسکتا ہے +

(۱) غلّے کی نکاسی عام طور پر ممنوع ہے۔ اس وجہ سے اشیائے خوردنی اس قدر ارزاں ہیں جو ہندوستان کے کسی حصہ میں نہیں +

(۲) عدالت دیوانی کی کارروائی بالکل سادہ ہے۔ میرے زمانہ قیام میں سیالکوٹ کے ایک مسلمان صقلی گر کو عدالت اپیل سے ایک سردار پر ڈگری ملی تھی۔ صقلی گر کے ارادہ سفر اور سردار صاحب کے اظہار تساہل پر عدالت نے حکم دیا۔ کہ زرِ ڈگری سردار صاحب کے زرِ جاگیر موجودہ خزانہ سے دلوایا جاوے۔ چنانچہ اس کی تعمیل فوراً ہوئی +

مسلمانوں کے لئے یہ بات البتہ کسی قدر زحمت دِہ ہے کہ آئے دن کے ہندو تیوہاروں کے باعث قصاب خانہ بند رہتا ہے جس سے اُنہیں گوشت نصیب نہیں ہوتا +

یہ ریاست بلحاظ خاندانی اعزاز اور سلسلہ قدامت راجپوتانہ کے تمام راجپوتوں میں ممتاز ہے۔ مسلمان حملہ آوروں کی مدافعت میں جو بہادری اور دیر پا مقابلہ اس ریاست نے کیا۔ کسی ریاست کی تاریخ میں اس کی نظیر نہیں۔ یہ خصوصیت بھی اس کو حاصل ہے کہ مغلوں کی سلطنت کے زمانہ میں دیگر راجپوتوں کی طرح انہوں نے اپنی لڑکیاں بادشاہوں کو نہیں دیں اس خاندان میں سب سے بڑا بہادر رانا سنگرام عرف رانا سانگا ہوا ہے۔ جو

ہندوستان کے راجوں کا مہاراجہ تھا - اس کی سالانہ آمدنی دس کروڑ روپیہ
تھی - میدان جنگ میں اسی ہزار سوار - پانسو ہاتھی - سات راجے نو راؤ
اور ایک سو چار راول اس کے ہمرکاب ہوتے تھے - شہنشاہ بابر کی لڑائی
سے پیشتر یہ اٹھارہ لڑائیوں میں کامیاب ہو چکا تھا - آخر ۹۳۴ھ / ۱۵۲۷ء میں
شہنشاہ بابر سے شکست کھائی - انقلاب زمانہ سے اب اس ریاست کی
آمدنی ساڑھے چھبیس لاکھ روپے ہے +

اجمیر

اودے پور سے براستہ چتوڑ و نصیر آباد ۱۸۵ میل طے کرنے کے
بعد ہیں اجمیر پہنچا - دہلی یہاں سے ۲۳۴ میل اور بمبئی ۶۱۵ میل ہے +
یہ شہر قدیم زمانہ میں ہندو راجاؤں کا ایک ممتاز شہر تھا - مسلمانوں
کی آمد کے وقت رائے پتھورا یہاں فرمانروائی کرتا تھا - جو ۵۸۹ھ / ۱۱۹۳ء میں سلطان
شہاب الدین محمد غوری کے مقابلہ میں مارا گیا - ۵۹۱ھ / ۱۱۹۴ء میں یہ شہر اسلامی سلطنت
کا ضمیمہ ہوا - مغلوں کے زمانہ میں صوبہ اجمیر کا دارالحکومت تھا - اب بھی
راجپوتانہ برٹش ایجنسی اور حکام سول کا صدر مقام ہے - اس کی آبادی ۷۳
ہزار کے قریب ہے +

شہر ریلوے سٹیشن سے ملا ہوا ہے - اس کے گرد ایک سنگین شہرپناہ
اور عمارتیں خوش وضع بارونق ہیں - اکثر قدیمی مکانات کے سامنے کے حصے
منقش ہونے کی وجہ سے بہت عمدہ معلوم ہوتے ہیں - دہلی - بمبئی اور
اندور ریلوے کا جنکشن ہونے سے اس کی تجارت دن بدن ترقی پر ہے +
شہر کے اندر کئی مسجدیں اور مندر ہیں - اسلامی عمارتوں میں سے

حضرت خواجہ معین الدین حسن سنجری چشتیؒ کی درگاہ بہت مشہور ہے جو ۵۶۱ھ ۱۱۶۵ء میں یہاں تشریف لائے اور اشاعت اسلام میں مشغول ہوئے - آپ ہندوستان کے صوفیائے چشتیہ کے سب سے پہلے رہنما ہیں - آپ کے مزار پر ایک مربع گنبد دار عمارت ہے جس کے ایک دروازے کی محراب بالکل چاندی کی ہے - درگاہ کے احاطہ کے ملحق آبنوشی کا ایک چشمہ جھالرا بہت گہری چٹان کے اندر قابل دید ہے ٭

اس میں آمدورفت کے واسطے سیڑھیاں بنی ہوئی ہیں - احاطہ کے اندر شہنشاہ اکبر - شاہجہاں - اورنگ زیب کی مسجدیں اور سرآسمان جاہ سابق وزیر اعظم حیدرآباد دکن کا مجلس خانہ بنا ہوا ہے - یہ عمارتیں اپنی عمدگی اور خوبی کے لحاظ سے بہت دلچسپ ہیں - اکبری مسجد میں دینی تعلیم کے واسطے ایک مدرسہ بھی جاری ہے - مگر پڑھائی کا طریق بہت کچھ اصلاح طلب معلوم ہوتا ہے ٭

اس درگاہ کے احاطہ میں دو بہت بڑی بڑی دیگیں رکھی ہوئی ہیں - بڑی دیگ میں سوا سو من پختہ اور چھوٹی دیگ میں پچھتر من پختہ چاول پکتے ہیں - پہلی کی تیاری میں تقریباً ڈیڑھ ہزار روپیہ صرف ہوتا ہے - عقیدتمند زائرین بڑی خوشی سے اس صرف کے متحمل ہوتے ہیں - اور عرس کے دنوں میں میٹھے چاول پکوا کر زائرین میں تقسیم کرتے ہیں ٭ (خواجہ صاحب کے حالات ضمیمہ میں درج ہیں)

مدار دروازہ کے باہر مسلمانوں کے ابتدائی زمانہ کی عمارتوں کا عمدہ نمونہ ایک مسجد ہے - جس کو "ڈھائی دن کا جھونپڑا" کہتے ہیں - یہ مسجد قلعہ تاراگڑھ کے مقابل عین پہاڑی کے دامن میں ہے - ابتداءً یہاں جینیوں کا ایک مندر تھا مگر سلطان شہاب الدین محمد غوری کے حکم سے اُس کا مغربی حصہ چھوڑ کر باقی میں مسجد کی بنیاد ڈھائی دن میں قائم ہوئی - پھر سلطان شمس الدین التمش کے عہد میں

اس پر اضافہ ہوکر سات محرابوں کا ایک درجہ بنا یا گیا۔ اس میں سے درمیانی محراب کی چوڑائی ۲۲ فٹ اور بلندی ۵۶ فٹ ہے ۔ محرابوں کی دیوار پر اس عمدگی اور خوبی سے کام بنا ہے کہ دہلی کی مسجد قوت الاسلام سے کہیں بڑھکر ہے ۔ مرور زمانہ سے مسجد کی حالت ابتری کو پہنچ گئی تھی ۔ اب گورنمنٹ کا محکمہ قدیمہ اس کی مرمت پر متوجہ ہے ۔ مگر نماز پڑھنے والا اب بھی یہاں کوئی نہیں +

اجمیر کے شمالی دروازہ سے تین میل کے فاصلہ پر اناساگر ایک مصنوعی جھیل ہے جو سینکڑوں ایکڑ رقبہ میں پھیلی ہوئی ہے ۔ اس کا طول ۱۲۰۰ گز اور عرض ۸۰۰ گز ہے ۔ برسات میں اس کا دائرہ چھ میل تک وسیع ہوجاتا ہے بے انتہا درجہ کی خوشنما ہے ۔ کنارے پر کئی بارہ دریاں جو مغل بادشاہوں کے عہد کی بنی ہوئی ہیں ۔ اُن سے اس کا نظارہ اور بھی دلکش معلوم ہوتا ہے ۔ اس موقع پر ایک بہت خوبصورت باغ شاہی زمانہ کا ہے ۔ جو دولت باغ کے نام سے مشہور ہے +

دولت باغ سے جب شہر کے باہر باہر جائیں ۔ تو سنگ سُرخ کا ایک عالیشان مندر آتا ہے ۔ میو کالج کی عمارت بھی قابل دید ہے ۔ جس کی بنیاد لارڈ میو وائسرائے ہند نے راجپوتانہ کے رئیس زادوں کی تعلیم کے واسطے ۱۸۷۰ء میں ڈالی تھی +

جودھپور (مارواڑ)

اجمیر سے ۱۵۱ میل طے کرنے کے بعد میں جودھپور آیا ۔ راستہ میں مارواڑ اور لُونی جنکشنوں سے گزر ہُوا ۔ مارواڑ سے بمبئی کو اور لُونی سے جودھپور حیدرآباد سندھ کو لائن نکلتی ہے ۔ یہ ریاست راجپوتانہ کی سب ریاستوں سے

بڑی ہے اس کو مارواڑ[1] بھی کہتے ہیں - اس کا دارالحکومت جودھپور ہے جسکو
مہاراجہ جودھا نے ۸۶۴ھ ۱۴۵۹ء میں آباد کیا تھا - سنہ ۱۹۰۱ء کی مردم شماری کے مطابق
اسکی آبادی ۷۹ ہزار ایک سو ۹ ہے اور اس حیثیت سے راجپوتانہ میں اس کا دوسرا
نمبر ہے +

شہر ریلوے سٹیشن سے تقریباً ایک میل کے فاصلہ پر ہے - راستہ میں
اکثر مقامات پر عمارتیں بنی ہوئی ہیں سٹیشن کے قریب رانی صاحب کی ایک
عالیشان سرائے ہے جس میں ہندو مسلمان بلاکرایہ ٹھیرتے اور آرام پاتے
ہیں - اس سے آگے بڑھکر دو مندر بہت خوشنما ہیں - شہر کے گرد پختہ فصیل
ہے - بڑے بڑے بازاروں میں دو رویہ عمدہ مکانات - مہاراجہ صاحب کے
محل - امرائے ریاست اور ٹھاکروں کی عالیشان حویلیاں بنی ہوئی ہیں -
متعدد مقامات پر تالاب اور اُن کے اطراف میں خوبصورت مندر ہیں مسجدوں
کی تعداد بھی معقول ہے - خاصکر منارہ والی مسجد بہت عمدہ ہے - لوگوں نے
بیان کیا کہ یہ مسجد اور منارہ شاہی زمانہ کی یادگار ہے - مسجد کی عمارت میں اگرچہ
کوئی خصوصیّت نہیں مگر منارہ قدیم فن عمارت کا ایک عمدہ نمونہ ہے +

جودھپور کا قلعہ ایک چٹان پر ہے جو زمین سے چار سو فٹ بلند اور
دُور سے دکھائی دیتا ہے - یہ قلعہ خوبصورتی میں راجپوتانہ کے سب قلعوں سے
بہتر ہے - اسکی عمارتوں میں سب سے عمدہ موتی محل ہے جس کو راجا سُورسنگھ
نے سترھویں صدی مسیحی کے اوائل میں بنایا تھا - دوسری عمارت فتح محل ہے
جو اس سے سو برس بعد مہاراجہ اجیت سنگھ نے مغل فوج کی واپسی کی یادگار

---

[1] مارواڑ کے معنی ہیں موت کا قطعہ - چونکہ اس ملک کی زمین بیشتر ریتلی اور ناخوشگوار
بنجر ہے - اس واسطے یہ ملک اس نام سے موسوم ہے +

تعمیر کرائی تھی ۔

جودھپور سے ریل کی کئی سڑکیں نکلتی ہیں - اس سے تجارت دن بدن ترقی پر ہے مگر یہاں کے مصنوعات کو کچھ اہمیت نہیں - صرف لوہے اور پینل کے برتنوں کے چند کارخانے ہیں تعلیم بھی متوسط درجہ کی ہے - ایک ہائی سکول اور تین سنسکرت سکول ہیں - ایک سکول آف آرٹ بھی ہے ۔

یہاں کے فرمانروا مہاراجہ سردار سنگھ بہادر ہیں مگر بعض وجوہات سے ریاست کا انتظام ابھی کونسل کے ہاتھ میں ہے جس کے ممبر سب دیسی ہیں ۔

یہ ریاست بلحاظ قدامت خاندانی اور شرافت نسبی راجپوتانہ میں بہت معزز مانی گئی ہے - مسلمانوں کی آمد سے پیشتر اس کے مورث اعلےٰ قنوج کے حکمراں تھے - راجا جے چند آخری فرمانروا تھا جو سلطان محمد غوری کی لڑائی میں شکست کھا کر مارا گیا - اُس وقت سے یہ خاندان راجپوتانہ میں قائم ہے ۔

اس ریاست کی زمین اکثر ریتلی اور ناخوشگوار بنجر ہے - زرخیز قطعات صرف کہیں کہیں پائے جاتے ہیں - پانی بہت گہرا ہے - دو سو فٹ زمین کھودنے سے نکلتا ہے - صحرا میں اونٹ مویشی اور بھیڑیں خوب اور بکثرت ہوتی ہیں - اس صحرا کے اونٹ اور ناگور کے بیل تمام ہندوستان میں مشہور ہیں - سب سے بڑی پیداوار نمک کی ہے جو جھیل سانبھر سے نکلتا ہے ۔

رقبہ ۳۴ ہزار ۹ سو ۶۳ مربع میل - آبادی ۱۹ لاکھ ۳۰ ہزار ۵ سو ۶۵ آدمی - آمدنی تقریباً ۶۴ لاکھ روپے سالانہ ۔

جے پور کا ایک حصہ

جے پور (امبیر)
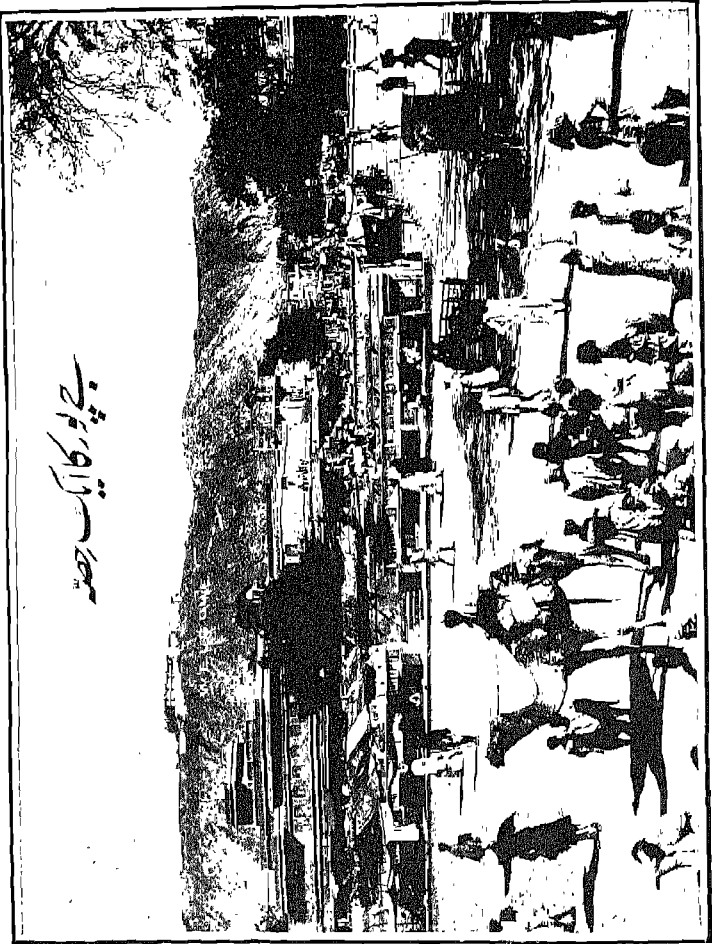
جودھ پور سے میرتا روڈ پھولیرا ہوتا ہُوا ۱۹۱ میل طے کرنے کے بعد میں جے پور پہنچا۔ یہ شہر ریلوے لائن کے کنارے اسی نام کی ریاست کا دارالحکومت ہے۔ سنہ ۱۹۰۱ء کی مردم شماری کے مطابق اس کی آبادی ایک لاکھ ۶۰ ہزار ہے۔ بمبئی یہاں سے ۶۹۹ میل اور دہلی ۱۵۰ میل ہے +

چاند پول دروازے سے داخل ہوتے ہی جے پور کا ایک بڑا وسیع بازار ملتا ہے جو ایک سرے سے دوسرے سرے تک ۲ میل لمبا اور ۴۰ گز چوڑا چلا گیا ہے۔ راستہ میں جہاں جہاں دیگر بازار اس سے تقاطع کرتے ہیں وہاں بڑے وسیع اور خوشنما چوک بنے ہوئے ہیں۔ اور سب قائم الزاویہ ہیں۔ بازار کے دورویہ پتھر کی شاندار عمارتیں تقریباً ایک صنع کی بنی ہوئی ہیں۔ یہ شہر اپنی صفائی اور خوشنمائی کے لحاظ سے ایسا خوبصورت ہے کہ ہندوستان میں کہیں اس کی نظیر نہیں۔ بازار میں ایک طرف کو سکول آف آرٹس اور اس سے کچھ آگے بڑھ کر کالج اور ایک کتب خانہ ہے۔ اس میں انگریزی۔ عربی۔ فارسی۔ اردو اور سنسکرت کتابوں کا اچھا ذخیرہ موجود ہے +

شہر میں سب سے عمدہ عمارت مہاراجہ صاحب کے محلات ہیں۔ اسکے صحن میں داخل ہوتے ہی بڑے بڑے آلات رصد دکھائی دیتے ہیں۔ جو لوہے سے بنا کر ایک خاص ترتیب سے نصب کئے ہوئے ہیں۔ یہ آلات راجہ سوائی* جے سنگھ کے علمی شوق کی یادگار ہیں۔ اگرچہ اس وقت صرف نمائش

* راجا سوائی جے سنگھ محمد شاہ کے عہد میں مالوہ کے صوبے دار اور علم ریاضی کے بہت شائق تھے۔ انہوں نے بادشاہ کی اجازت سے خیر اللہ مہندس کو بلوا کر زیج محمد شاہی تیار کروائی۔ اور دہلی۔ جے پور۔ اجین اور بنارس میں رصد خانے بنوائے +

کا کام دیتے ہیں ۔لیکن ان پر غور کرنے سے ہندوستان کے ہیئت دانوں کی عظمت و وقعت ناظرین کے دلوں پر نقش ہوتی ہے۔ اس سے آگے بڑھ کر ایوان خاص ہے جس کی تمام عمارت سنگ مرمر کی ہے۔ اس سے آگے چندا محل خاص مہاراجہ صاحب کے رہنے کی سات منزلہ عمارت ہے +

تصویروں کا کام اس جگہ خوب بنتا ہے منقش برتن اور پرانی وضع کے ہتھیار بنانے میں یہاں کے باشندوں کو اچھی مہارت ہے۔ مینا کاری کا کام اس قدر عمدگی اور خوبی سے تیار ہوتا ہے کہ شاید ہندوستان کے کسی دوسرے حصے میں کم بنتا ہوگا۔ دیسی دستکاری جو کسی زمانہ میں ہندوستان میں مروج تھی۔ اُس کی ترویج اور قیام کے واسطے ایک سکول آف آرٹس ہے اس مدرسے کی تانبے پیتل اور چینی کی بنائی ہوئی چیزوں کو شمالی ہند میں بہت فروغ ہے۔ یورپین سیاح جو اس ملک کی سیر کو آتے ہیں۔ ان میں سے اکثر چیزوں کو نمونہ کے طور پر ہمراہ لے جاتے ہیں +

یہ ریاست راجپوتانہ کی ریاستوں میں بہت پرانی اور خوش انتظامی کے لحاظ سے مشہور ہے۔ یہاں کے فرمانروا مہاراجہ مادھو سنگھ بہادر ہیں جن کی انصاف پسندی اور خوش خیالی سے جے پور کو بڑی شہرت حاصل ہے۔ اگرچہ مسلمانوں کی آبادی کم ہے۔ مگر اہل کاران ریاست میں چند معزز مسلمان اعلےٰ عہدوں پر مامور ہیں +

علوم و فنون کی قدردانی اور اس کی اشاعت پر اس ریاست کی توجہ ہمیشہ سے مبذول چلی آتی ہے +

یہاں کئی درسگاہیں ہیں :- (۱) آرٹس کالج جس کی پڑھائی بی اے تک ہے۔ (۲) اورینٹل کالج جس میں عربی فارسی کی تعلیم پنجاب یونیورسٹی

کے امتحانات مولوی فاضل اور منشی فاضل تک ہوتی ہے۔ (۳) سنسکرت کالج اور ویدک (ہندی طبابت) کا مدرسہ۔ اس میں بنارس کالج کے مطابق پڑھائی ہوتی ہے۔ (۴) رئیس زادوں کی تعلیم کے واسطے ایک ہائی سکول ٭

علمی ترقی کے ضمن میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ خواجہ قمرالدین دہلوی جو بوستان خیال کے مترجم ہیں اُس زمانہ سے یہاں وارد ہیں جبکہ والیان ریاست کو مشرقی علوم کی قدردانی کا خیال تھا ٭

سانگانیر دروازہ کے باہر پبلک گارڈن قابل دید ہے۔ روشوں کی تراش۔ مختلف قسم کے پودوں کی موجودگی اور صفائی و آراستگی بہت سلیقہ سے کی گئی ہے۔ نہر کا پانی باغ میں برابر آتا رہتا ہے جس سے اس کی عمدگی اور بھی بڑھ گئی ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ باغ ستر ایکڑ زمین میں ایک انگریز کی زیر نگرانی تیار ہؤا ہے اور چار لاکھ روپے اس پر صرف ہوئے ہیں۔ وسط باغ میں ایک عجائب خانہ ہے جس میں انواع واقسام کی قدیم دستکاریوں کے نمونے بڑی تلاش سے بہم پہنچائے گئے ہیں۔ عجائب خانہ کی عمارت سنگ سُرخ کی ہے۔ اس میں جابجا سنگ مرمر کا کام کیا ہؤا ہے۔ پہلی ڈیوڑھی کی دیواروں پر فرمانروایانِ جے پور کی قدِآدم تصویریں منقوش اور ہر ایک کے ساتھ اُن کی ولادت اور وفات کے سن تحریر ہیں۔ پھر مختلف دیواروں پر چین۔ جاپان۔ مصر اور لنکا کی قدیم زمانہ کی عجیب وغریب تصویریں ہیں۔ خصوصاً لنکا کے جلائے جانے کا سماں اور سکندر و دارا کی لڑائی کی تصویریں بہت دلچسپ ہیں۔ عجائب خانے کے ایک طرف دارالحیوانات اور دوسری طرف دارالطیور ہے۔ ان دونو میں انواع واقسام کے حیوانات اور پرندے عجوبۂ روزگار موجود ہیں۔ لوگ صبح وشام ہواخوری کے واسطے

اس باغ میں آتے ہیں۔ یہ باغ بہ حیثیت مجموعی ہندوستان میں بے نظیر ہے +

ریاست کی عمارتوں میں سب سے دلچسپ مقام امبیر کا محل ہے۔ جو جے پور سے سات میل کے فاصلہ پر ایک جھیل کے کنارے آباد ہے۔ یہ امبیر ایک زمانہ میں دارالحکومت تھا۔ مگر جب سے پایۂ تخت جے پور قرار پایا۔ اب یہ صرف سیرگاہ کا حکم رکھتا ہے +

اس ریاست کے فرمانروا مثل ریاستہائے اودے پور و جودھپور سورج بنسی خاندان سے ہیں۔ ان کے بزرگ پہلے گوالیر میں حکمران تھے پھر امبیر پر قبضہ کیا جو ریاست جے پور کا قدیمی دارالحکومت ہے +

ریاست کا رقبہ پندرہ ہزار ۵ سو ۷۹ مربع میل۔ آبادی ۲۸ لاکھ ۴۵ ہزار ۶ سو ۵۵ اور سالانہ آمدنی ۶۵ لاکھ روپیہ ہے +

بھرت پور

جے پور سے ۱۱۶ میل طے کرنے کے بعد میں بھرتپور آیا۔ راستہ میں باندی کوئی جنکشن سے گزر ہوا جہاں سے دہلی کو براہ ریواڑی ایک سیدھی لائن نکلتی ہے۔ شہر بھرت پور اسی نام کی ریاست کا پایہ تخت ریلوے لائن کے کنارے واقع ہے۔ مغلوں کے زمانے میں صوبۂ آگرہ کے متعلق تھا مگر اب راجپوتانہ میں شمار ہوتا ہے۔ اس کی آبادی ۴۴ ہزار اور راجپوتانہ میں اس لحاظ سے چھٹے نمبر پر ہے +

سٹیشن سے شہر تک دو میل کا فاصلہ ہے۔ پہلے ایک قلعہ آتا ہے جو شہر سے ملا ہوا ہے۔ اس کے گرد ایک لمبی اور عریض خندق ہر وقت

پانی سے لبریز رہتی ہے جو اپنی وسعت کے لحاظ سے ندی کہلانے کی مستحق ہے۔ آج سے سو برس پیشتر یہ قلعہ ناممکن التسخیر سمجھا جاتا تھا۔ مگر جب سے گورنمنٹ انگریزی کا غلبہ ہوا قلعہ کا استحکام غیر ضروری سمجھا گیا۔ حتےٰ کہ اس کے اندر ایک دروازہ سے دوسرے دروازہ تک عام لوگوں کی آمد و رفت کے واسطے ایک سڑک بنا دی گئی ہے۔ ریاست کا ایک عظیم الشان محل اس قلعہ میں اب تک موجود اور قابل دید ہے ؀

بڑا بازار تقریباً دو میل لمبا اور خوب آباد ہے۔ وسط میں ایک مندر اور اس سے کچھ فاصلہ پر ایک مسجد ہے۔ یہ دونو عمارتیں بہت بڑے پیمانہ پر بننی شروع ہوئی تھیں۔ سابق فرمانروائے ریاست کی تجویز سے ان کے مصارف فوج کے ایک خفیف چندہ سے ادا ہوتے تھے۔ ہندو سپاہیوں کا چندہ مندر کی تعمیر پر اور مسلمان سپاہیوں کا چندہ مسجد کی تعمیر پر لگایا جاتا تھا مگر موجودہ منتظمین نے یہ قاعدہ بند کر دیا ہے۔ اس وجہ سے دونو عمارتیں ناکمل رہ گئیں تاہم جس قدر حصے بن چکے ہیں بہت عمدہ اور قابل دید ہیں۔ شہر سے تین کوس کے فاصلہ پر ریاست کی ایک عمارت چھاؤنی کے نام سے مشہور ہے جو عمارتی خوبیوں کے لحاظ سے قابل دید ہے ؀

اس شہر میں گھوڑوں کے بالوں کی چنوریاں اور ایک قسم کے نفیس پنکھے تیار ہوتے ہیں۔ بیشتر استعمالی چیزیں باہر سے آتی ہیں۔ تعلیم بھی کچھ زیادہ ترقی پر نہیں۔ صرف انٹرنس تک کی خواندگی کا انتظام ہے ؀

موجودہ فرمانروائے ریاست راجہ کشن سنگھ صاحب ہنوز نابالغ اور

ریاست کا انتظام ایک کونسل کے ہاتھ میں ہے۔ ممبران کونسل میں میرے پرانے دوست پنڈت گردھاری لال صاحب مشیر مال ہیں۔ ان کی مہربانی سے مجھے شہر کی سیر کرنے اور تاریخی حالات دریافت کرنے کا اچھا موقعہ ملا۔

اس ریاست کے دو پرانے شہر آثار قدیمہ کے لحاظ سے قابل ذکر ہیں :-

(۱) **بیانہ** - یہ بھرتپور سے ۲۶ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ گو اسکی موجودہ حالت اس وقت ایک قصبہ کی ہے مگر مسلمانوں کے عہد میں بہت ترقی پر تھا۔ چنانچہ یہاں کا قلعہ بہت مستحکم اور مشہور ہے۔ بڑے بڑے علما و صلحا اس شہر میں رہتے تھے۔ مسجدیں اور خانقاہیں جس کثرت سے اب تک موجود ہیں وہ بیانہ کی عظمت کا کافی ثبوت ہیں۔ سنگ سرخ اور سنگ سفید اس قصبہ کے گردونواح سے بکثرت نکلتا ہے اس کی ترقی تجارت کے باعث ریلوے لائن بھی بھرت پور سے یہاں تک بن گئی ہے۔

(۲) **ڈیگ** - یہ بھرت پور سے ۲۱ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ یہاں کا قلعہ جنگی استحکام اور زمانہ حال کے واقعات کے لحاظ سے مشہور ہے اس کے اندر راجا سورج مل کا ایک بہت بڑا عالیشان محل ہے اس میں پتھر کا کام جس عمدگی اور خوبی سے کیا گیا ہے وہ جاٹوں کے عہد حکومت کی ایک عمدہ یادگار ہے۔

بھرت پور کے فرمانروا جاٹ خاندان سے ہیں۔ ریاست کی بنیاد راجا مدن سنگھ نے ۱۱۳۵ھ ۱۷۲۲ء میں قائم کی تھی۔ اس کے بیٹے راجا سورج مل
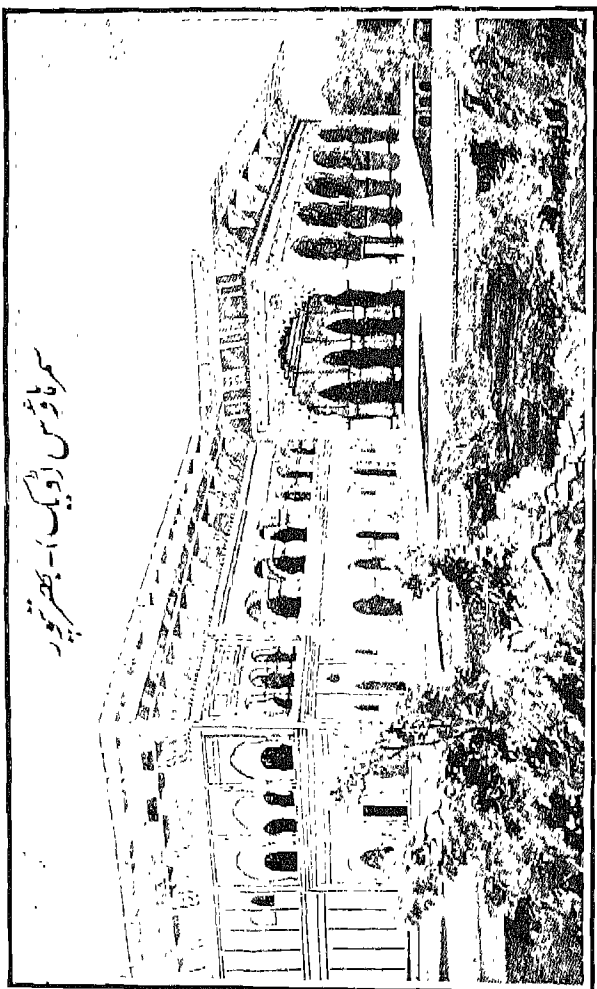
سمر ہاؤس (ڈیگ) - بھرت پور

کے زمانہ میں جاٹوں کی طاقت کو بہت ترقی ہوئی - اس نے دہلی اور آگرے پر قبضہ کر کے تمام شمالی ہند میں خوب لوٹ مار کی - مگر اس کے جانشینوں کے عہد میں ملک مفتوحہ کا بہت سا حصہ ان کے قبضہ سے نکل گیا - کُل آبادی ۶ لاکھ سے اوپر اور سالانہ آمدنی ۲۱ لاکھ روپے ہے +

الور

بھرت پور سے براہ باندی کوئی ۱۴۴ میل طے کرنے کے بعد میں الور پہنچا - یہ شہر ریلوے لائن کے کنارے اور اسی نام کی ریاست کا دارالحکومت ہے - بمبئی یہاں سے ۷۰۵ میل اور دہلی ۹۹ میل ہے مغلوں کے زمانہ میں یہ صوبۂ آگرہ کے متعلق تھا مگر اب راجپوتانہ میں شمار ہوتا ہے - اس کی آبادی ۵۶ ہزار ۷ سو ۱۷ اور راجپوتانہ میں چوتھے نمبر پر ہے - سٹیشن سے باہر نکلتے ہی پہلی نگاہ جس عمارت پر پڑتی ہے وہ ایک قدیم اور خوشنما مقبرہ ریلوے لائن کے کنارے ہے - کہتے ہیں کہ یہ مقبرہ ۹۵۴ھ مطابق ۱۵۴۷ء کی تعمیر اور فتح جنگ کی یادگار ہے - مگر کوئی شخص نہیں بتا سکتا کہ یہ فتح جنگ کون بزرگوار تھے +

سٹیشن سے شہر تک نئی آبادی روز بروز ترقی پر ہے - اس کے تین طرف فصیل اور چوتھی طرف ایک پہاڑی ہے جس پر قلعہ بنا ہوا ہے شہر کے دروازے شاہی قلعوں کی طرز کے ہیں - بیرونی حصہ کے دونو طرف دو توپیں نصب کی ہوئی ہیں - لال دروازہ سے ایک سیدھا بازار شروع ہو کر مندر جگدیش پر ختم ہوتا ہے - اس کے بازار وسیع سڑکیں مصفا اور عمارتیں با قرینہ ہیں - وسط میں قدیم زمانہ کا ایک شاندار گنبد بنا ہوا ہے

جو ترپولیہ کے نام سے مشہور ہے اس کے چار دروازے ہیں۔ اور ہر دروازہ سے سڑک نکلتی ہے۔ لوگوں نے بیان کیا کہ یہ گنبد ۷۵۱ھ (۱۳۵۰ء) کی تعمیر اور دراصل فیروزشاہ کے بھائی سارنگ خاں کی قبر تھی۔ مگر اب مرور زمانہ سے قبر کے آثار مٹ گئے ہیں۔ بازار کے خاتمہ پر جگدیش جی کا مندر ایک کرسی دار عمارت پر بنا ہوا ہے۔ جولائی کے مہینے میں جگن ناتھ جی کی رتھ یہاں سے نکلتی ہے۔ اس موقع پر کئی ہزار آدمیوں کا مجمع ہوتا ہے۔

مندر سے تھوڑی دور دائیں ہاتھ کو حضوری دروازہ آتا ہے۔ اس کے اندر سرکاری دفاتر اور شاہی زمانہ کی ایک مسجد ہے جو مسلمانوں کی نماز خوانی کے عوض ریاست کا سامان رکھنے کے کام آتی ہے۔ اسی موقعہ پر مہاراجہ بنے سنگھ بہادر کے عہد کا ایک دربار ہال قابل دید ہے۔ اس کی عمارت سنگ مرمر کی اور در و دیوار پر پچی کاری کا بہت عمدہ کام کیا ہوا ہے۔ عمارت کے ایک حصہ میں مشرقی علوم کی عمدہ عمدہ کتابیں موجود ہیں جن میں گلستاں اور تزک بابری خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ تزک بابری پر شہنشاہ اکبر کے عہد سے کتب خانے کے داخلے اور سلاطین مغلیہ کی مہریں موجود ہیں۔ گلستاں ایک لاکھ روپے کی لاگت سے تیار ہوئی ہے۔ اس کی خوشخطی۔ تصویریں اور طلائی نقش و نگار کے دیکھنے سے آنکھوں کو نور اور دل کو سرور حاصل ہوتا ہے۔ یہ گلستاں مہاراجہ بنے سنگھ بہادر کے حکم سے ۱۲۶۵ھ (۱۸۴۸ء) میں تیار ہوئی تھی۔ میرے پرانے دوست منشی بیرام خاں صاحب حاکم اپیل کی مہربانی سے مجھے اس کتب خانے کی سیر کا اچھا موقعہ ملا۔ وہ اپنی علم دوستی سے ملاحظہ کتب خانہ کے وقت میرے ہمراہ تھے۔

یہاں کا اسلحہ خانہ بھی قابل دید ہے۔ اس میں قدیم زمانہ کی عجیب عجیب

تلواریں رکھی ہوئی ہیں۔ ان کے دستے جواہرات سے مرصع ہیں۔ ایک بکتر کا وزن سوا آٹھ سیر اور سب پر ہیرے جڑے ہوئے ہیں +

باشندگان کی توجہ صنعت و حرفت پر کم ہے۔ اکثر استعمالی چیزیں باہر سے آتی ہیں۔ تعلیم کا انتظام انٹرنس کلاس تک ہے +

یہاں کے فرمانروا مہاراجہ سوائی جے سنگھ بہادر ہنوز نابالغ ہیں ۔ ملکداری کا انتظام کونسل کے ہاتھ میں ہے جس کے پریزیڈنٹ نواب حمید الظفرخاں صاحب رئیس نجیب آباد ہیں +

الور کے فرمانروا راجگان جے پور کے ایک جدی اور تقریباً سو سوا سو برس سے اس ریاست پر قابض ہیں۔ اس کا رقبہ زیادہ تر ریاست جے پور اور کچھ بھرت پور سے نکل کر بنا ہوا ہے +

اس کا رقبہ ۳ ہزار ایک سو ۴۱ مربع میل۔ آبادی ۸ لاکھ ۲۸ ہزار پانسو اور سالانہ آمدنی تقریباً تیس لاکھ روپے ہے +

حصار

الور سے ۱۳۶ میل طے کرنے کے بعد میں اس جگہ آیا۔ راستہ میں ریواڑی جنکشن سے گزر ہوا جہاں سے بھٹنڈا اور دہلی کو ریل کی سڑکیں نکلتی ہیں۔ ریواڑی سے بمبئی ۸۷۹ میل۔ دہلی ۵۲ میل اور بھٹنڈا ۱۸۶ میل ہے۔ بھٹنڈا لین کا بڑا حصہ ریگستان سے گزرتا ہے۔ اس پر بھوانی۔ ہانسی۔ حصار اور سرسہ چار بڑے قصبے ہیں۔

حصار شاہی زمانے میں بہت آباد اور ہریانہ کے علاقہ میں سب سے بڑا شہر تھا۔ فیروز شاہ تغلق کی لاٹھ اور ہمایوں بادشاہ کی جامع مسجد یہاں موجود ہے اس وقت ایک معمولی قصبہ اور حکام سول کا صدر مقام ہے۔ اس کی آبادی

تقریباً اٹھارہ ہزار آدمی کی ہے - اس علاقہ کی آب و ہوا اور چارہ مویشیوں کے واسطے بہت مفید ہے - گائے بھینسیں یہاں کی عمدہ اور دودھ بہت دیتی ہیں - بیلوں کی نسل بڑھانے کے واسطے سرکار کی طرف سے ایک گاؤ سال بھی ہے +

بٹھنڈا

حصار اور بٹھنڈے میں ۹۷ میل کا فاصلہ ہے - تاریخی واقعات کے لحاظ سے اس کو بڑی شہرت ہے - سلطان محمود غزنوی نے ۳۹۲ھ ۱۰۰۱ء میں راجہ جیپال کو بمقام پشاور گرفتار کر کے اس پر حملہ کیا تھا - اس زمانہ میں غالباً یہ شہر بہت بارونق ہوگا - مگر اب ایک معمولی قصبہ اور مہاراجہ پٹیالہ کی عملداری میں ہے - تھوڑے عرصہ سے ریل کا سٹیشن قرار پانے اور اطراف و جوانب کو ریل کی سات سڑکیں نکلنے سے اسکی آبادی ترقی کر رہی ہے - نئی آبادی سٹیشن اور شہر سے ملی ہوئی ہے - اسکو منڈی کہتے ہیں - یہاں یہ نئی بات دیکھنے میں آئی کہ شہر میں شراب اور گوشت کی دکانیں موجود ہیں مگر منڈی میں کوئی نہیں - لوگوں نے بیان کیا کہ ساہوکاروں نے اجرائے ریل کے وقت منڈی میں ان دونو چیزوں کے فروخت نہ ہونے کا عہد سرکار سے کر لیا ہوا ہے +

قدیم عمارتوں میں سے بٹھنڈے کا قلعہ بہت مستحکم اور اس قدر اونچا ہے کہ مسافران ریل کو میلوں سے دکھائی دیتا ہے - اس وقت ریاست کے چند اہلکار اس میں رہتے ہیں - اسی شہر میں بابا رتن ہندی کی خانقاہ ہے جو چھٹی صدی ہجری میں فوت ہوا ہے - اس کو درازی عمر کے ساتھ پیغمبر خدا کی زیارت کا دعوے تھا - اور بعض علما نے اس سے حدیث کی روایت بھی کی ہے - بٹھنڈے پر میرے چوتھے سفر کا خاتمہ ہے - میں یہاں سے کوٹ کپورا - فرید کوٹ - فیروز پور اور قصور ہوتا ہوا لاہور واپس آیا +
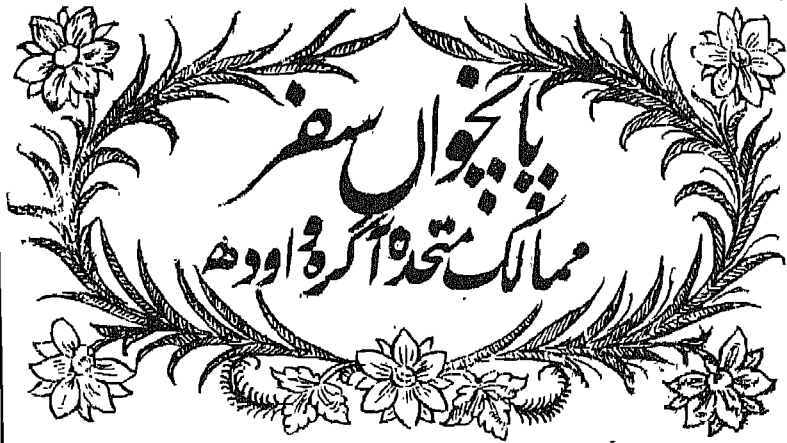
لاہور سے روانگی براہ سہارنپور - دیوبند - رُڑکی - پیران کلیر - ہردوار - گورکل - ڈیرہ دون - مرادآباد - رامپور - بریلی - بدایوں - شاہجہانپور - لکھنؤ - ردولی - فیض آباد - اجودھیا - جونپور - بنارس

{ممالک متحدہ آگرہ واودھ کی موجودہ حالت پر ایک نظر}

مذکورۂ بالا اٹھارہ ۱۸ شہر ممالک متحدہ آگرہ واودھ میں ہیں جو صوبہ پنجاب کے جنوب مشرق کی طرف دریائے گنگا کی وادئ بالائی میں واقع ہیں۔ ابتدائے عملداری انگریزی میں یہ دونو صوبے علیحدہ علیحدہ حکام کے ماتحت تھے۔ مگر ۱۸۷۷ء میں دونو کو ملا کر ممالک مغربی و شمالی و اودھ ان کا نام قرار پایا۔ ۱۹۰۱ء میں جب دریائے سندھ سے پار کا حصّہ علیحدہ ہو کر شمال مغربی سرحدی صوبہ کے نام سے موسوم ہؤا تو اس کا نام بدل کر ممالک متحدہ و آگرہ و اودھ رکھا گیا +

ان صوبجات کا کل رقبہ ایک لاکھ سات ہزار مربع میل اور آبادی ۴ کروڑ ستر لاکھ سے زیادہ ہے۔ برٹش انڈیا میں یہ صوبہ بلحاظ آبادی دوسرے درجہ پر ہے اور بلحاظ رقبہ چھٹے درجے پر۔ اگر اس کی آبادی میلوں کے حساب سے پھیلائی جائے۔ تو فی میل ۴۴۵ اشخاص اس میں بستے ہیں۔ سرکاری مالگذاری ساڑھے بارہ کروڑ روپیہ سالانہ ہے +

صوبۂ آگرہ

گورنمنٹ انگریزی نے اپنی ابتدائی فتوحات میں اس صوبہ کا نام ممالک مغربی وشمالی مقرر کیا جس کی وجہ یہ تھی کہ انگریز بنگال کی طرف سے ملک گیری کرتے ہوئے یہاں پہنچے تھے۔ اور بنگال سے یہ ملک شمال مغرب کی طرف واقع تھا +

تو ضیح آبادی

مغلوں کے زمانہ میں اس صوبہ کا بیشتر رقبہ دریائے جمنا اور چمبل کا درمیانی علاقہ تھا۔ مگر انگریزی عملداری میں تمام صوبہ الہ آباد اور کچھ حصہ صوبہ دہلی کا ملکر اسکی حدود بہت وسیع ہوگئی ہیں چنانچہ اس وقت اس کی وسعت صوبہ بنگال سے زیادہ ہے رقبہ ۸۳ ہزار مربع میل اور آبادی تقریباً ساڑھے تین کروڑ ہے۔ کل آبادی کا آٹھواں حصہ مسلمان باقی سب ہندو اور تھوڑے سے عیسائی ہیں۔ مروجہ زبانیں اُردو ہندی ہیں۔ مگر اُردو بولنے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہے +

آب و ہوا

صوبہ آگرہ کا شمالی حصّہ کوہستان اور وسطی و جنوبی حصّہ اکثر مسطح ہے۔ اس میں گنگا جمنا اور ان کے بیشمار معاون دریا بہتے ہیں۔ جو علاقہ گنگا اور جمنا کے درمیان ہے وہ دوآبہ کہلاتا ہے اور سرسبزی و زرخیزی کے لحاظ سے تمام ہندوستان میں مشہور ہے اس صوبہ کی سرزمین بنارس میں سطح سمندر سے صرف ۳سو۷۴ فٹ بلند ہے۔ مگر شاہجہانپور میں اس کی بلندی ایک ہزار فٹ ہو جاتی ہے۔ آب و ہوا گرم ہے مگر گرمی اور سردی کی ایسی شدّت نہیں ہوتی جیسی پنجاب میں۔ کوہ شوالک ہمالہ کے متوازی گنگا سے بیاس تک صوبہ کے بیچوں بیچ دور تک چلا گیا ہے اور اس میں کئی پُر فضا وادیاں ہیں +

پیداوار

جو علاقہ دریائے گنگا اور جمنا سے سیراب ہوتا ہے وہاں زراعت کو بہت ترقی ہے۔ مگر باقی حصہ ملک جہاں فصلوں کا مدار صرف بارش پر تھا اسکی حالت

اچھی نہ تھی۔ سرکار انگریزی نے گنگا اور جمنا سے نہریں نکال کر اب صوبہ کو رشک گلزار بنا دیا ہے۔ افیون۔ تل۔ گنا۔ کپاس۔ نیل اور چاے اس صوبہ میں بافراط پیدا ہوتی ہے۔ خاصکر گیہوں نہایت عمدہ ہوتا ہے +

حرفت و صنعت

حرفت و صنعت کے لحاظ سے یہ صوبہ بہت مشہور ہے۔ مختلف شہروں میں کئی قسم کی دستکاریاں بہت عمدہ اور نفیس ہوتی ہیں۔ مراد آباد میں تانبے اور دھات کے سادہ و منقش برتن۔ بریلی میں میز کرسی اور ہر قسم کا فرنیچر۔ نگینہ ضلع بجنور اور سہارنپور میں لکڑی کی کھدائی کا کام۔ مظفر نگر میں اُونی کمل۔ علیگڈھ میں دریاں اور قفل۔ آگرہ میں دریاں اور قالین۔ مرزاپور میں قالین اور لاکھ کا کام۔ کانپور میں سوتی کپڑا اور چمڑے کا سامان۔ گورکھپور میں تمباکو۔ جونپور میں عطر اور خوشبودار تیل۔ بنارس میں ریشمی اور زری کے پارچات اچھے بنتے اور تمام ہندوستان میں فروخت ہوتے ہیں۔ شاہجہان پور۔ بریلی گورکھپور اور بنارس میں کھانڈ کے کارخانے بہت مشہور ہیں۔ شاہجہان پور کی "روزہ کمپنی" کو کھانڈ اور شراب کی عمدگی کے باعث تمام ہندوستان میں خاص شہرت ہے +

تجارت

اس ملک سے گیہوں۔ تیل نکالنے کے بیج۔ روئی۔ کھانڈ۔ افیون چمڑا۔ گھی اور پیتل کے برتن کثرت سے باہر جاتے ہیں۔ اُونی اور سوتی کپڑا۔ دھاتیں مٹی کا تیل۔ برتن اور نمک باہر سے آتا ہے۔ نیپال اور تبت سے بھی اس ملک کی تجارت کا سلسلہ گورکھپور اور نیپال گنج (ضلع بہرائچ) کے راستے سے جاری ہے +

ریلوے

صوبہ آگرہ کے تمام بڑے بڑے شہر ریل کے کنارے پر واقع ہیں۔ سہارنپور سے بنارس تک اودھ روہیلکھنڈ ریلوے۔ دہلی سے مغل سرائے تک ایسٹ انڈیا ریلوے۔ لکھنؤ سے گورکھپور کی جانب بنگال نارتھ ویسٹرن ریلوے۔ کانپور سے جنوب مغرب کی جانب انڈین مڈلینڈ ریلوے کا جال بچھا ہوا ہے۔ ان کے علاوہ

اور بھی کئی شاخیں ہیں +

باشندوں کی حالت

یہاں کے باشندے بقول سرسید مرحوم اہل پنجاب کی طرح زندہ دل تو نہیں مگر حلیم الطبع اور ملنسار ہیں گھبیل اور بندھیل راجپوت اچھے توانا اور مضبوط ہوتے ہیں - انگریزی عملداری کے شروع میں بنگال کی فوجوں میں اس صوبہ کے جوان بھرتی کیئے جاتے تھے - ملازمت اور حرفت و تجارت کی غرض سے یہ لوگ ہندوستان کے مختلف حصوں خصوصاً دیسی ریاستوں میں پھیلے ہوتے ہیں اور عزت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں - بعض اشخاص اپنی اعلےٰ قابلیت کے باعث بڑی بڑی معزز خدمتوں پر ممتاز ہیں - مگر ہندوستان سے باہر جانے کے عادی نہیں - اس بارے میں پنجاب - سندھ اور پھر گجرات کے تاجروں کو خاص امتیاز حاصل ہے +

مذہبی خیالات

مسلمانوں کی فتوحات سے اگرچہ بڑے بڑے انقلابات اس صوبہ میں ہوئے مگر یہاں کے ہندو مسلمان مذہبی معاملات اور قومی رسم و رواج میں اس قدر راسخ الاعتقاد ہیں کہ کسی نئی مذہبی یا ملکی تحریک سے بمشکل متاثر ہوتے ہیں - آج سے چالیس برس پیشتر جبکہ آنریبل سرسید احمد خاں مرحوم نے مسلمانوں کی دنیوی تعلیم کے واسطے علیگڈھ میں ایک کالج قائم کرنا چاہا تو باوجودیکہ وہ صاحب وجاہت - معزز عہدہ دار اور حکام انگریزی ان کے مددگار تھے - پھر بھی مسلمانوں نے بہت دیر میں ان کی بات پر توجہ کی - ادھر مولوی محمد قاسم صاحب مرحوم نے جب مذہبی تعلیم کے واسطے دیوبند میں پرانے اصول پر مدرسہ قائم کرنے کا ارادہ کیا تو ان کی آواز سنتے ہی مسلمانوں نے چاروں طرف سے لبیک کی صدا بلند کی - مگر چند روشن خیال مسلمانوں نے جب ندوۃ العلما قائم کرنا چاہا تو ہر چند اس سے بھی مذہبی علوم کی اشاعت مقصود تھی - مگر چونکہ اس میں پرانے خیالات کے مقابلہ میں کچھ وسعت خیالی سے کام لیا گیا تھا - اور مقلد و غیر مقلد ہر قسم

کے مسلمان اس میں شریک کئے گئے تھے۔ اس واسطے مولویوں نے نہایت
زور سے مخالفت کی۔ اور اب بعد مدت بڑی مشکلوں سے اس میں کامیابی
کے آثار نمودار ہونے شروع ہوئے۔ سوامی دیانند سرستی کو بھی اپنی ابتدائی
کوششوں میں کامیابی نہ ہوئی۔ غرض نئی باتوں سے انہیں یہاں تک تنفر ہے
کہ ایک عرصہ تک کوٹ پتلون پہننے اور میز کرسی پر کھانا کھانے کو بھی دینداری
کے خلاف سمجھتے رہے۔ انگلستان کا سفر تو ان کے نزدیک سخت ناپسندیدہ فعل تھا
اور ہندو تو اس میں اپنے دھرم کی قطعی بربادی سمجھتے تھے۔ بنگالیوں اور آریوں نے
حقوق طلبی اور حکام کی نکتہ چینی پر بہت کچھ شور و غل برپا کیا مگر یہ اپنی پرانی
روش کے مطابق سلامت روی کے دائرہ سے باہر نہیں ہوئے۔ مگر باوجود اس
کے انگریزی تعلیم سے جو آزادخیالی پھیل رہی ہے وہ نامعلوم طور پر آہستہ آہستہ
ان کی طبائع میں اپنا اثر کرتی جاتی ہے۔ اور مذہبی و قومی تنفر کو روز بروز کم کر رہی
ہے +

تعلیم

تعلیم کے لحاظ سے یہ صوبہ اچھی حالت میں ہے۔ اور اس میں یونیورسٹی
بھی ہے۔ اعلےٰ تعلیم کے واسطے بیس آرٹس کالج الہ آباد۔ بنارس۔ علیگڈھ۔
آگرہ۔ کانپور۔ بریلی۔ میرٹھ۔ الموڑہ۔ مسوری۔ نینی تال اور گورکھپور میں ہیں پہلے
پانچ شہروں میں سات کالج اعلےٰ درجے کے ہیں جن میں میور سنٹرل کالج
الہ آباد اور محمڈن اینگلو اورینٹل کالج علیگڈھ سب سے بڑھ کر ہیں۔ تین کالجوں کے
ساتھ مشرقی زبانوں کی اعلےٰ تعلیم کا بندوبست بھی ہے۔ ان میں سے کوئنس کالج
اور سنٹرل ہندو کالج بنارس میں سنسکرت کا اور علیگڈھ کالج میں عربی کا۔ علاوہ بریں
رڑکی کے انجینیرنگ کالج۔ ڈیرہ دون کے فارسٹ (جنگلات) کالج اور سروے (پیمائش) ٹریننگ
سکول۔ سہارنپور کے باٹینیکل (نباتات) سکول۔ کانپور کے زراعتی سکول نے اس

صوبے کو خاص امتیاز دے رکھا ہے ÷

ہندوؤں کے مقابلہ میں یہاں کے مسلمان اگرچہ تعلیم میں پیچھے ہیں مگر بلحاظ تناسب آبادی دیگر صوبجات کے مسلمانوں سے آگے بڑھے ہوئے ہیں اور یہ صرف محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کی وجہ سے ہے +

اس صوبہ کے دو مذہبی مدرسے خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ ایک مدرسہ دیوبند واقع ضلع سہارنپور جس میں مسلمانوں کے مذہبی علوم عربی زبان میں پڑھائے جاتے ہیں۔ دوسرا گورو کل واقع ضلع بجنور جس میں آریوں کے مذہبی علوم بھاشا کے ذریعے سکھائے جاتے ہیں۔ یہ دونو مدرسے قوم کی مدد سے چلتے ہیں۔ اور بہت تسلی بخش حالت میں ہیں +

اُردو زبان

یہ صوبہ اُردو زبان کا مرکز ہے۔ تمام بڑے بڑے شہروں بلکہ تمام قصبات و دیہات میں بھی اُردو زبان بولی جاتی ہے۔ چند مسلمانوں اور ہندوؤں نے اچھی اچھی کتابیں بھی اردو زبان میں لکھی ہیں۔ مگر اخبارات کی اشاعت اور کثرت تصنیف و تالیف کتب کے اعتبار سے اُردو کو جو ترقی پنجاب میں ہوئی ہے وہ یہاں کی بہ نسبت بہت حیرت انگیز ہے۔ مسلمانوں کا انگریزی اخبار صوبہ بھر میں کوئی نہیں۔ البتہ ہندوؤں کے چند انگریزی اخبار شائع ہوتے ہیں +

۱۹۰۷ء کی شورش

پولیٹیکل شورش کے شعلے اگرچہ سنہ ۱۹۰۷ء میں بنگال اور پنجاب میں بہت زور سے بلند ہوئے اور عامہ خلائق کے امن و امان کو اس سے نقصان پہنچا۔ مگر یہاں کے باشندوں نے باوجود پولیٹیکل تحریکوں میں شامل ہونے کے گورنمنٹ کے برخلاف کوئی حصہ نہیں لیا۔ اس میں شک نہیں کہ چند اخبارات کے اڈیٹروں کو مُغوبانہ مضامین کی پاداش میں سزائے قید دی گئی۔ مگر عام طور پر دیسی پریس حد اعتدال کے اندر رہا ہے +

تاریخی حالات

صوبۂ آگرہ کی ملکی اور مذہبی تاریخ اپنی قدامت کے لحاظ سے بہت دلچسپ ہے۔ ہندوؤں کے کئی ایک جلیل القدر فرمانروا اس صوبہ کی خاک سے پیدا ہوئے ان کے بڑے بڑے مندر اور مقدس دریا اس سرزمین میں بہتے ہیں سلطان محمود غزنوی۔ شہاب الدین محمدؐ غوری اور شہنشاہ بابر نے زیادہ تر اسی حصّہ ملک کی زرخیزی کے باعث ہندوستان پر چڑھائی کی تھی۔ دریائے گنگا کے نزدیک قنوج اور بنارس دو بڑے شہر ہیں۔ قنوج بڑی زبردست ہندو ریاستوں کا صدر مقام رہ چکا ہے اور بنارس ان کی سب سے بڑی پرستشگاہ ہے +

دریائے گنگا کے آس پاس اور بھی کئی ریاستیں قائم تھیں جو باہم جنگ و جدال میں مصروف رہتی تھیں۔ کیونکہ گنگا ہندوؤں کے نزدیک نہایت مقدس دریا ہے اور مذہب کے رُو سے اس میں اشنان کرنا اُن پر واجب ہے۔ اس کے قریبی شہروں کا قبضہ حاصل کرنے کے لئے ہندو راجاؤں کے درمیان اکثر کش مکش رہتی تھی۔ اس وقت بھی ہر سال لاکھوں ہندو دریائے گنگا میں اشنان کرنے کی غرض سے الہ آباد اور ہردوار آتے ہیں اور اس تقریب سے ایک میلہ سال بسال اور ایک میلہ بارہ برس کے بعد یہاں لگتا ہے +

مشہور شہر

آگرہ کا صوبہ سات کمشنریوں اور ۴۷ ضلعوں پر مشتمل ہے۔ رُہیلکھنڈ کی کمشنری کوہ ہمالہ کے دامن میں پھیلی ہوئی ہے اور کمایوں کا پہاڑی علاقہ اس کے شمال میں کوہ ہمالیہ کی شاخ پر واقع ہے۔ جب دریائے گنگا اور جمنا کی وادیوں میں نیچے کی طرف بڑھیں تو میرٹھ۔ آگرہ الہ آباد اور بنارس کی کمشنریاں آتی ہیں۔ آگرہ کے جنوب میں جھانسی کی کمشنری ہے۔ تاریخی اعتبار سے اس صوبہ میں یہ مقام مشہور ہیں۔ بنارس جو ہندوؤں کے نزدیک مقدس اور مندروں کی کثرت کے سبب سے خاص طور پر مشہور ہے۔ چنار جو ضلع مرزاپور

میں ایک مشہور پہاڑی قلعہ ہے۔ جونپور جو ایک عرصہ تک سلاطین شرقیہ کا دارالحکومت اور اسلامی علوم وفنون کا مرکز تھا۔ الہ آباد جو صوبہ کا صدر مقام اور گنگا وجمنا کے مقام اتصال پر واقع ہے۔ یہ شہر بھی ہندؤں کے نزدیک مقدس ہے۔ آگرہ جو ایک مدت تک مسلمان بادشاہوں کا پایہ تخت اور عمارتی خوبیوں کے باعث مشہور ہے۔ تاج محل کا روضہ جو عجائبات عالم میں درجہ اوّل پر شمار ہوتا ہے اسی شہر میں ہے۔ فتح پور سیکری کے قریب موضع خانا ہے جہاں شہنشاہ بابر اور رانا سانگا میں بڑا سخت معرکہ ہوا تھا۔ قنوج مسلمانوں کی آمد سے پیشتر ہندو راجاؤں کا مشہور دارالحکومت تھا۔ متھرا جو کرشن جی کا جنم بھوم اور ہندؤں کی پرستشگاہ ہے۔ بجنور جو کالیداس مشہور مصنف شکنتلا کا وطن ہے۔ گورکھپور میں بُدھ مذہب کے آثار ہیں جن کی زیارت کو چینی لوگ آتے رہتے ہیں۔

صوبہ اودھ

ممالک متحدہ آگرہ کا دوسرا حصّہ اودھ کے نام سے مشہور ہے۔ یہ صوبہ نیپال اور دریائے گنگا کے درمیان واقع ہے۔ اس کی شمالی حدود ترائی پر ختم ہوتی ہیں۔ اس کا رقبہ ۲۴ ہزار مربع میل اور آبادی ایک کروڑ تیس لاکھ ہے آبادی کا دسواں حصہ مسلمان اور باقی ہندو ہیں۔ مروجہ زبانیں اُردو اور ہندی۔

صوبہ کی سطح ہموار ہے۔ گومتی۔ گھاگرا اور دوسرے دریا ملک کو سیراب کرتے ہیں۔ آب وہوا خشک ہے۔ گرمیوں میں سخت گرمی اور سردیوں میں سخت سردی پڑتی ہے۔ زمین زرخیز ہے۔ گندم۔ چاول۔ تل۔ شکر۔ افیون۔ نیل اور کپاس یہاں کی خاص پیداوار ہیں۔ اودھ رُہیلکھنڈ ریلوے اور بنگال نارتھ ویسٹرن ریلوے اس صوبہ میں سے گزرتی ہیں۔

باشندے

یہاں کے لوگ عموماً زندہ دل اہل علم اور متواضع ہیں۔ تنومندی اور جفاکشی کی وجہ سے ان کو خاص شہرت ہے۔ بنگالہ کی فوجوں میں پہلے اسی مُلک کے سپاہی زیادہ بھرتی ہوتے تھے جو پوربیہ فوج کے نام سے مشہور تھے اب بھی نوکری اور محنت مزدوری کی غرض سے کلکتہ تک ان کی جولانگاہ ہے سائیس۔ دھوبی اور بُوٹ ساز زیادہ اسی ملک کے رہنے والے دیگر صوبجات میں پائے جاتے ہیں۔ مگر عام طور پر یہاں کے لوگ ہندوستان سے باہر نہیں جاتے۔

تعلیم

اودھ زمانہ قدیم سے علوم و فنون کا مخزن رہا ہے۔ مشرقی علوم کے علما ملک کے اکثر حصوں میں بڑے نامور گزرے ہیں۔ خصوصاً لکھنؤ ایک مدت تک علمائے فرنگی محل کے سبب دارالعلما مانا جاتا تھا۔ اب بھی اُسی پرانی شہرت کے باعث ندوۃ العلما کا دارالعلوم یہاں قائم ہؤا مگر لوگوں نے انگریزی تعلیم میں بقدر مناسب ترقی نہیں کی۔ خصوصاً مسلمان تو بہت ہی پیچھے ہیں۔ باوجودیکہ لکھنؤ میں دو تین کالج اور کئی ضلعوں میں متعدد ہائی سکول موجود ہیں۔

لکھنؤ کی اُردو نہایت شستہ اور پاکیزہ خیال کی جاتی ہے۔ اور اس میں عمدہ عمدہ کتابیں ہر سال شائع ہوتی رہتی ہیں۔ چند اُردو اخبار بھی جاری ہیں۔ ایک روزانہ اخبار انڈین ڈیلی ٹیلی گراف مسلمانوں کے زیر اہتمام نکلتا ہے سال گزشتہ میں جو شورش گورنمنٹ کے برخلاف ملک کے اکثر حصوں میں ہوئی یہاں کے اخباروں کی پالیسی حدِ اعتدال سے متجاوز نہیں ہوئی۔

تعلقہ دار

اس صوبہ میں بڑے بڑے زمینداروں کو تعلقہ دار کہتے ہیں جو گورنمنٹ کی خیرخواہی کے لئے مشہور ہیں۔ یہ لوگ اکثر ذی علم اور قومی کاموں میں بڑا حصہ لیتے ہیں۔ بیشتر تعلقہ دار صوبہ اودھ کے رئیس ہیں۔ مگر پنجاب کے بعض والیان ملک اور رؤسا جنہوں نے غدر ۱۸۵۷ء میں گورنمنٹ کی امداد

کی تھی وہ بھی یہاں کے تعلقدار ہو گئے ہیں اور بڑی بڑی اراضیات کے مالک ہیں ÷

تاریخی حالات

اودھ زمانہ قدیم میں ایک بہت بڑی ریاست تھی۔ اس وقت اس کو کوسلیا کہتے تھے اور راجا رام چندر کے والد یہاں کے فرمانروا تھے مسلمانوں نے بارھویں صدی مسیحی کے اختتام پر اس کو فتح کیا اور مدت تک شاہان مغلیہ کے زیر نگین رہا۔ ۱۱۵۳ھ ۱۷۴۰ء میں جبکہ سلطنت دہلی کا چراغ ٹمٹما رہا تھا۔ یہاں کا صوبہ دار خود مختار بن بیٹھا۔ آخری جانشینوں نے شاہی کا لقب بھی اختیار کیا مگر انتظام سلطنت میں فتور واقع ہونے سے انجام یہ ہوا کہ ۱۸۵۶ء میں انگریزوں نے اس کو اپنی حکومت میں شامل کر لیا۔ ۱۸۷۷ء تک یہاں ایک چیف کمشنر حکمرانی کرتا رہا۔ پھر اس کو ممالک متحدہ آگرہ سے ملحق کر کے لفٹنٹ گورنر کے ماتحت کر دیا ÷

مشہور شہر

اودھ میں لکھنؤ اور فیض آباد دو کمشنریاں ہیں جن میں سے لکھنؤ مغرب میں اور فیض آباد مشرق میں ہے۔ ان دونوں کمشنریوں میں بارہ ضلعے ہیں۔ شاہان اسلام کی عظمت کے لحاظ سے لکھنؤ۔ اور ہندو فرمانرواؤں کے تقدس کے لحاظ سے اجودھیا مشہور شہر ہیں۔ بہرائچ میں سید سالار مسعود غازی کی خانقاہ ہے جس کی زیارت کے واسطے ہر سال بیشمار لوگ چلے آتے ہیں۔ لکھنؤ۔ بلگرام اور خیر آباد کو آج سے کچھ مدت پیشتر مشرقی علوم کی ترقی کی وجہ سے تمام ہندوستان میں فروغ تھا۔ اور اب بھی ہے ÷

اب میں یہاں سے اپنے سفر کے تفصیلی حالات لکھتا ہوں ÷

سہارنپور

میں لاہور سے انبالہ ہوتا ہوا سہارنپور پہنچا۔ لاہور اور سہارنپور میں

۲۳۸ میل کا فاصلہ ہے۔ یہ شہر خوب آباد اور صاحب کلکٹر کا صدر مقام ہے۔ اسکی آبادی ۶۶ ہزار سے کچھ زیادہ اور باشندوں کی زبان اُردو ہے ٭
سٹیشن سے شہر تک کوئی آدھ میل کا فاصلہ ہے۔ راستہ کے ایک طرف جیوبلی باغ اور دوسری طرف ہسپتال و گورنمنٹ ضلع سکول آتا ہے۔ شہر کا سب سے پہلا حصہ نخاسا بازار کہلاتا ہے۔ یہاں سے ایک بڑے کشادہ چوک میں گزر ہوتا ہے جو رونق اور وسعت کے اعتبار سے شہر کا عمدہ حصہ ہے۔ اس چوک میں ایک بڑی عالیشان جامع مسجد اور اس کے نیچے دُکانیں ہیں۔ یہ مسجد گزشتہ صدی کے آخری حصے میں دہلی کی جامع مسجد کے نمونے پر تعمیر ہوئی ہے۔ عام مسلمانوں نے ایک لاکھ روپیہ اس کے واسطے چندہ دیا تھا۔ اس کے پنج منزلہ منارے دور سے دکھائی دیتے ہیں۔ شہر کی دیگر عمارتیں خوشنما مگر علے العموم پُرانی وضع کی ہیں جن میں زمانہ حال کی ترقیات نے تھوڑا اثر کیا ہے ٭
نواح شہر کی زمین سر سبز اور میوہ جات کے لئے نہایت موافق ہے۔ ہر قسم کا میوہ و پونڈا گنا عمدہ اور بافراط پیدا ہوتا ہے۔ زرعی پیداوار کی تجارت خوب ترقی پر ہے۔ چاول۔ گیہوں۔ گڑ۔ شکر اور روئی کی خرید و فروخت بکثرت ہوتی ہے اس تجارت کی ریل پیل سے بازاروں میں ہر وقت ہجوم رہتا ہے۔ مالدہ کے آم۔ لیچی۔ لوکاٹھ۔ ناشپاتی۔ امرود اور کئی قسم کے عمدہ عمدہ میوے تجارت کے طور پر یہاں سے دوسرے ملکوں کو بھیجے جاتے ہیں۔ میوہ دار درختوں کی پود بھی یہاں سے دستیاب ہوتی ہے پھلوار ایجنسی نے اس کی روانگی کا اچھا انتظام کر رکھا ہے مسلمانوں کی خاص تجارت سال کی لکڑی ہے۔ یہ لوگ جنگل خرید کر لکڑی لاتے ہیں اور اس کو اچھی قیمت پر بیچتے ہیں ٭
لکڑی کے منقش سامان مثل میز۔ تپائی۔ پردے۔ تصویروں کے چوکھٹے

قرآن شریف کی رحلیں بنانے کی کچھ دستکاری بھی ہے اور مسلمانوں کو بالخصوص اس کام سے اچھی واقفیت ہے۔ یہ چیزیں تُن اور شیشم سے خوب بنتی اور مدراس کے ایجنٹوں کے ذریعے ولایت تک جاتی ہیں۔ کچھ مدت پیشتر چمڑے کے صندوق۔ بستر بند اور سلیپر بھی عمدہ بنتی تھیں +

انگریزی تعلیم کا انتظام ہائی سکول تک ہے۔ مسلمان اس کے فوائد سے روز بروز آگاہ ہوتے جاتے ہیں۔ مگر دراصل اس شہر اور رُہیلکھنڈ کی تمام اسلامی آبادی پر دینداری کے ساتھ قدامت پسندی زیادہ غالب ہے۔ پہلے اس شہر میں مشرقی علوم کے بڑے زبردست عالم ہوتے تھے جن کا حلقۂ درس بہت وسیع تھا۔ چنانچہ مدرسہ مظاہر العلوم مولوی احمد علی صاحب مرحوم محدّث کی یادگار میں اب تک موجود ہے۔ اس مدرسہ کی عمارت خانۂ شہر پر بنی ہوئی ہے کسی زمانہ میں یہ مدرسہ بہت ترقی پر تھا۔ اور دُور دُور کے لوگ تحصیل علمی کی غرض سے یہاں آتے تھے۔ اب بھی بیرونجات کے طالب علم شہر کی مسجدوں میں رہنے اور اس مدرسہ میں آکر سبق پڑھ جاتے ہیں۔ بعض طالب علموں کی خور و نوش کے واسطے مدرسہ سے بھی مدد ملتی ہے۔ غرض سابقہ شہرت ان کو کشاں کشاں لئے چلی آتی ہے۔ مولوی عبداللہ جان صاحب جو لدھیانہ کے رہنے والے اور کچھ مدت سے یہاں وکالت کا کام کرتے ہیں۔ اپنی خوش خلقی اور حکمت عملی سے انگریزی تعلیم اور زمانہ حال کی ضروریات پر مسلمانوں کو توجّہ دلاتے رہتے ہیں۔ مولوی صاحب کا وجود مسافروں کے واسطے مغتنمات سے ہے +

بیرون شہر کمپنی باغ بہت وسیع اور پُر فضا مقام ہے۔ یہ باغ کسی زمانہ میں نواب نجیب الدولہ کی بیٹی نے بنوایا تھا۔ اور اُس وقت ڈھائی سو بیگھہ میں تھا۔

سرکار انگریزی کے عہد میں مختلف ملکوں سے انواع و اقسام کے پودے منگوا کر علمی اصول کے مطابق اس جگہ لگائے گئے ہیں۔ یہ باغ انیسویں صدی مسیحی کی علمی ترقیات کا ایک عمدہ نمونہ ہے جس سے گرم ملکوں کے درخت ٹھنڈے ملکوں میں اور ٹھنڈے ملکوں کے درخت گرم ملکوں میں سرسبز اور بارآور ہونے کا راز کھلتا ہے ٭

شہر سے دو میل کے فاصلے پر سرکاری گھوڑوں کا ایک ڈپو (مخزن) بارہ میل کی وسعت میں پھیلا ہوا ہے۔ انگریزی رسالوں اور توپ خانوں میں جس قدر گھوڑے مطلوب ہوتے ہیں وہ یہاں سے لئے جاتے ہیں ٭

یہ شہر نارتھ ویسٹرن ریلوے اور اودھ رُہیلکھنڈ ریلوے کا جنکشن ہے۔ انبالہ یہاں سے ۵۰ میل۔ لاہور ۲۳۸ میل۔ دہلی ۱۱۲ میل۔ ڈیرہ دون ۴۱ میل اور لکھنؤ ۳۲۲ میل ہے ٭

دیوبند

یہ قصبہ سہارنپور سے ۲۲ میل کے فاصلے پر ریل کے کنارے ہے۔ اس کو شمالی ہند میں خصوصاً اور بلاد بعیدہ میں عموماً اس وجہ سے شہرت ہے کہ یہاں علوم عربیہ کا ایک بہت بڑا مدرسہ ہے جس کو تیرھویں صدی ہجری کے آخری حصہ میں مولوی محمد قاسم صاحب مرحوم نانوتوی نے قائم کیا ہے اس مدرسہ میں صرف۔ نحو۔ منطق۔ معانی۔ بیان۔ ادب۔ فقہ۔ حدیث۔ تفسیر ریاضی اور علم کلام کی وہ تمام کتابیں پڑھائی جاتی ہیں جو درس نظامیہ کے نام سے مشہور ہیں۔ موجودہ تعلیم سے یہ فائدہ تو ہے کہ طالب علموں کو دینی مسائل سے واقفیت اور دیگر مسلمانوں کو اس سے آگاہ کرنے کی قابلیت ہو جاتی ہے مگر کوئی ایسا علم یہاں نہیں پڑھایا جاتا جو مدرسہ چھوڑنے کے بعد معاش دنیوی

ہیں اُن کی مدد کر سکے۔ اور نہ کسی علم میں ایسی اعلےٰ درجے کی تعلیم دی جاتی ہے جس سے یہاں کا تعلیم یافتہ کسی فن میں خصوصیت کے ساتھ اہل علم کی نظروں میں وقعت حاصل کر سکے۔ بہرکیف یہاں کے سند یافتہ تمام ہندوستان میں عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں اور مدارس اسلامیہ میں کم و بیش نوکری ان کو مل جاتی ہے۔

یہ مدرسہ پبلک کی امداد سے چل رہا ہے۔ ممالک مغربی۔ اودھ۔ پنجاب۔ راجپوتانہ۔ مالوہ اور دیگر صوبجات کے عام مسلمانوں سے لیکر والیان ملک تک ہمیشہ چندے دیتے رہتے ہیں۔ مدرسہ کی عمارت اور بورڈنگ ہوس پختہ بنا ہوا ہے۔ اکثر طالب علموں کو خوراک مدرسہ کی طرف سے ملتی ہے۔ ایک وقفی کتب خانہ بھی موجود ہے جس میں علاوہ مختلف علوم و فنون کی بیش بہا کتابوں کے خاص درسی کتابوں کے اس قدر زائد نسخے مہیا ہیں کہ طالب علموں کو کتابیں خریدنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔

مدرسہ کے بانی مولوی محمد قاسم نانوتہ ضلع سہارنپور کے رہنے والے تھے ۱۲۴۸ھ میں پیدا ہوئے۔ فارسی عربی کی ابتدائی کتابیں نانوتہ میں پڑھیں اور پندرہ برس کی عمر میں شوق تکمیل ان کو دہلی لے گیا جو اُس وقت علم و فضل کا مرکز سمجھا جاتا تھا۔ یہاں کتب درسیہ مولوی مملوک علی صاحب سے اور علم حدیث مولانا شاہ عبد الغنی صاحب سے پڑھا۔ تحصیل علوم سے فارغ ہونے کے بعد کچھ دنوں دہلی کے سرکاری مدرسہ میں مدرّس رہے اور پھر تصحیح کتب کا کام مطبع احمدی میں شروع کر دیا۔ تین مرتبہ حرمین شریفین کی زیارت کی۔ اپنی عمر کا بڑا حصہ درس و تدریس اور عیسائیوں و آریوں کے مناظروں میں گزارا۔ پادری تارا چند اور سوامی دیانند سے ان کے جو مباحثے ہوئے وہ ان کی کثرت معلومات اور قوت استدلال کی

عمدہ یادگار ہیں - آخر ۷۹ برس کے بعد ۱۲۹۷ھ میں انتقال کیا - اور دیوبند ہی میں مدفون ہوئے ÷

مولوی محمود حسن دیوبندی - مولوی فخرالحسن گنگوہی اور مولوی احمد حسن امروہی آپ کے مشہور شاگردوں میں سے ہیں ÷

رُڑکی

دیوبند سے واپس ہوکر سہارنپور کے راستے سے میں رُڑکی پہنچا - سہارنپور اور رڑکی میں ۲۲ میل کا فاصلہ ہے - سٹیشن سے قصبہ تک چھاؤنی کی کوٹھیاں اور فوجی بارکیں بکثرت ہیں جن میں دیسی اور انگریزی فوج رہتی ہے اصل آبادی ایک چھوٹا سا قصبہ ہے جس کا بازار کشادہ اور دور تک لمبا چلا گیا ہے - اگرچہ عمارتیں معمولی ہیں مگر بحیثیت مجموعی دلچسپ معلوم ہوتی ہیں ÷

رڑکی ابتدا میں محض ایک گمنام گاؤں تھا - اس کی موجودہ شہرت کا ذریعہ ٹامسن انجینیرنگ کالج ہے جس میں فن انجینیری کی تعلیم اعلےٰ پیمانہ پر دی جاتی ہے - یہ کالج فن عمارات کی ترقی کے لحاظ سے شمالی ہند میں بے نظیر ہے - اس کی پڑھائی کے تین درجے ہیں - سب اُورسیر کلاس - اُورسیر کلاس اور اسسٹنٹ انجینیر کلاس دیسی اور انگریز طلبا ہندوستان کے اکثر حصوں سے انجینیری کی تعلیم حاصل کرنے کے واسطے یہاں آتے ہیں - ان لوگوں کی عملی لیاقت بڑھانے کی غرض سے ہر قسم کے انجینیری آلات اور متعدد ورکشاپ موجود ہیں - طالب علم لوہار اور بڑھئی کا کام ہاتھ سے بھی کرتے ہیں ÷

عمارات کالج کے بعد نہر گنگ کا پل قابل دید ہے جو رڑکی سے ایک میل کے فاصلہ پر ہے - نہر کے راستہ میں سیلانی ندی آتی ہے - انجینیروں

نے اس کے دونو طرف تین میل لمبا ئشتہ باندھکر بہاؤ کے موقع پر پل بنایا ہے اور نہر کا پانی اُس کے اوپر سے لے گئے ہیں ۔ یہ پل زمانہ حال کی فن عمارت کا بہت اعلےٰ نمونہ اور نہایت حیرت انگیز ہے ٭

پیران کلیر

یہ گاؤں رڑکی سے چھ میل کے فاصلے پر ہے ۔ یہاں سے پیران کلیر تک نہر گنگ کے کنارے ایک سڑک بنی ہوئی ہے جس پر سے گاڑیاں اور مسافر آمدورفت کرتے ہیں ٭

پیران کلیر مقامی حیثیت کے لحاظ سے ایک خام اور خس پوش آبادی ہے اس کی موجودہ شہرت اور عظمت کا ذریعہ صرف مخدوم علاء الدین علی احمد صاحب کا مزار ہے جس کی کشش دور دراز کے مسلمانوں کو یہاں لئے چلی آتی ہے ۔ ہر سال اُن کے مزار پر عرس ہوتا ہے ۔ ہزاروں آدمی دور دراز مقامات سے اس میں شریک ہوتے ہیں ۔ مخدوم صاحب ساتویں صدی ہجری کے صوفیا میں گزرے ہیں ۔ ان کا مفصّل حال ضمیمہ میں درج ہے ٭

ہردوار

رڑکی سے ہردوار تک ۲۴ میل کا فاصلہ ہے ۔ راستہ میں لکسر جنکشن سے گزر ہوا جہاں سے ریل کی ایک لائن مراد آباد ہوتی ہوئی لکھنؤ جاتی ہے ہردوار دریائے گنگا کے کنارے ہندوؤں کا بڑا بھاری تیرتھ اور ریلوے سٹیشن سے کوئی دو میل کے فاصلے پر ہے ۔ دریا کے کنارے کنارے بڑی بڑی عمدہ حویلیاں ۔ مندر اور گھاٹ بنے ہوئے ہیں ۔ شہر کے بالائی حصّہ میں مہاراجہ کشمیر ۔ پٹیالہ ۔ کپورتھلہ اور ٹیڑھی گڑھوال کی عالیشان دھرم ارتھ حویلیاں

ہیں جن میں سفید پوش زائرین آرام پاتے ہیں +
پشاور اور سندھ تک کے ہندو اشنان کرنے کے واسطے بارہ مہینے یہاں
آتے رہتے ہیں۔ اشنان کے واسطے ہلالی شکل کی سیڑھیوں کا ایک سلسلہ بنا
ہوا ہے جس کے دائیں بائیں پختہ عمارتیں ہیں۔ زائرین ان سیڑھیوں سے
اُتر کر دریا میں غسل کرتے ہیں۔ ان میں سے خاص متبرک مقام "ہر کی پیڑی"
کہلاتا ہے۔ یہاں دریا کے کنارے کنارے پختہ گھاٹ بنا ہوا ہے۔ زائرین
اشنان کے بعد اسی گھاٹ سے واپس جاتے ہیں۔ آج کل تو قلت زائرین
کے باعث کوئی دقت نہیں۔ مگر بیساکھی کے میلہ پر جو ہمیشہ ۱۱ اپریل میں ہوتا
ہے اور خصوصاً کُمبھ کے وقت جو بارہ سال بعد ہوتا ہے۔ لاکھوں آدمیوں کے
ازدحام اور اس پر ہر شخص کی طرف سے غسل میں جلد بازی ہونے سے سخت
تکلیف ہوتی ہے۔ اس موقع پر سرکار کی طرف سے بڑا انتظام کیا جاتا ہے۔
"ہر کی پیڑی" کے سامنے ایک چھوٹا سا آہنی پُل بطور نشستگاہ بنا ہوا ہے۔
عملہ نگرانی اس پر متعین رہتا ہے۔ اگر نگرانی نہ ہو تو ہجوم خلائق سے ہزاروں
آدمی پامال ہو کر مر جائیں۔ پُل کے قریب دریا میں ریت پڑ جانے سے ایک
جزیرہ بن گیا ہے جس کے اطراف پتھر اور چُونہ سے پُختہ بنائے گئے ہیں +
اس دریا کا پانی ٹھنڈا۔ میٹھا۔ مصفّا اور ہاضم ہے۔ اس میں غسل
کرنا صحت جسمانی کے واسطے مفید ہے۔ ہندو علے العموم یہاں سے قرابوں
میں پانی بھر بھر کر اپنے ہمراہ لے جاتے ہیں۔ اور اس کو گنگا جل کہتے ہیں +
بازار سے پاؤ میل کے فاصلے پر سڑک کے کنارے "بھیم گوڑا" ایک
"تالاب" آتا ہے جس کی نسبت ہندوؤں کا یہ عقیدہ ہے کہ جب گنگا مہادیو کی
جٹا سے بہنے لگی۔ تو راجہ بھیم اُس کو پہاڑوں سے لا کر یہاں چھوڑ گئے تھے۔

اس تالاب میں اشنان کرنا بھی متبرک سمجھا جاتا ہے۔ شہر سے اس مقام تک گنگا کے کنارے کنارے سینکڑوں فقیر اور سادھو میلے کے دنوں میں ڈیرے ڈالے ہوئے رہتے ہیں۔ ان میں بعض باکمال بھی ہوتے ہیں۔ اور عام و خاص ان کی زیارت کو آتے ہیں ✣

ہردوار کی تقدیس کے لحاظ سے ہندوؤں نے بعض خاص قواعد یہاں جاری کر رکھے ہیں۔ کوئی شخص دریا سے مچھلی نہ پکڑے۔ عورتیں شہر میں نہ رہیں۔ شراب اور گوشت کی فروخت نہ ہو۔ انہیں قواعد کی پابندی سے "ہر کی پیڑی" کے پانڈوں (خدام) کے بال بچے کنکھل اور جوالا پور میں رہتے ہیں جو یہاں سے تھوڑے فاصلے پر ہیں ✣

کنکھل ایک بہت آباد قصبہ ہردوار سے تین میل کے فاصلہ پر ہے۔ اس کے قریب گنگا کا وہ حصہ ہے جس میں ہندو اپنے مردوں کے پھول لا کر دریا میں ڈالتے ہیں۔ ہردوار سے کنکھل جاتے ہوئے نہر گنگ کے پل پر سے عبور کرنا پڑتا ہے۔ اس کی متصلہ آبادی کا نام مایا پور ہے۔ انگریز اور دیگر سرکاری عہدہ دار اسی جگہ رہتے ہیں۔ یہاں گوشت اور شراب فروشی کی کوئی ممانعت نہیں ✣

گورُوکُل

مجھے اس سفر میں چند گھنٹوں کے واسطے گوروکل کا مدرسہ دیکھنے کا اتفاق ہؤا جو آریا پرتھی ندھی سبھا پنجاب نے سوامی دیانند سرسنی کی ہدایات کے مطابق جاری کیا ہے۔ یہ مدرسہ ہردوار سے ۵ میل اور کنکھل سے دو میل کے فاصلے پر دریائے گنگا کے پرلے کنارے موضع کانگڑی ضلع

بجنور میں ہے۔ کانگڑی کا سالم موضع شہر نجیب آباد کے ایک رئیس منشی امن سنگھ صاحب کا وقف کیا ہُوا ہے۔ میں نو بجے کے قریب ہردوار سے روانہ ہُوا۔ لالہ فتح چند ساکن ریاست بہاولپور میرے شریک سفر تھے کنکھل تک ہم نے ٹُم ٹُم پر سفر کیا۔ پھر دریا کے رستے سے گذرنے کے بعد گھاٹ پر آئے اور وہاں سے پار ہو کر تھوڑی دیر بھٹکتے ہوئے موضع کانگڑی میں پُہنچے۔ کنکھل سے کانگڑی تک کا راستہ دُشوار گزار ہے۔ ریت اور سنگلاخ سے گذرنا پڑتا ہے۔ سواری اور رہنما کا نہ ہونا بڑی دقّت کا باعث ہُوا ﴿

اِن تمام مراحل کو طے کرنے کے بعد ہمارا گزر ایک سرسبز اور وسیع قطعہ زمین میں ہُوا جہاں گورُوکُل کا مدرسہ بنا ہُوا ہے۔ سب سے پہلے ہم دفتر کے کمرے میں داخل ہوئے۔ اور لالہ منشی رام صاحب وکیل ساکن جالندھر سے ملاقات کی۔ لالہ صاحب موصوف اس مدرسہ کے آنریری گورنر ہیں۔ اُنہوں نے لالہ رام دیو صاحب بی اے ہیڈ ماسٹر ساکن ہوشیارپور سے تعارف کرایا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے مہربانی فرما کر ہمیں مدرسہ کی سیر اچھی طرح کرائی ﴿

اِن دنوں موسمی چُھٹیوں کے باعث پڑھائی بند تھی۔ پڑھائی کا ہر قسم کا سامان۔ تشریح الاعضا کی تصاویر۔ نقشہ کشی۔ جغرافیہ اور مختلف اقسام کے تعلیمی نقشے۔ اور مختلف مقاموں کے فوٹو کمروں میں آویزاں تھے۔ سائنس کے آلات دس ہزار روپیہ مالیت کے اور کنڈرگارٹن کا سامان پانسو روپیہ مالیت کا ہے۔ انگریزی اور سنسکرت کا ایک کتب خانہ جس میں ڈھائی ہزار سے زیادہ کتابیں موجود ہیں۔ ایک مطالعہ کا کمرہ۔ شفاخانہ جس میں بیدک اور ڈاکٹری کی دوائیں موجود رہتی ہیں۔ ایک مخزن روزمرہ کی استعمالی اشیا کا تجارتی اصول پر موجود ہے۔ برامدوں میں ہم دو تین گھنٹوں تک پھرتے رہے مگر کمروں میں

داخل ہوتے وقت لالہ رام دیو صاحب کی ہدایت کے مطابق جوتے اُتار دیتے تھے۔ جو لڑکے مدرسہ میں موجود تھے وہ اس وقت باورچی خانے میں روٹی کھا رہے تھے اور سب ایک قطار میں خالی زمین پر بیٹھے ہوئے تھے اُن کے باہر نکلنے پر معلوم ہوا کہ گلے میں ململ کے کرتے ٹانگوں میں دھوتیاں تھیں۔ مگر سر اور پیر سے برہنہ۔ اِن کے سونے کے کمرے فراخ۔ ہوادار اور مصفّا تھے۔ ایک ایک کمرے میں متعدد لڑکوں کے بستر بچھے ہوئے تھے۔ مگر چارپائیوں کے عوض لکڑی کے تخت کا استعمال تھا۔ لڑکے عموماً کم سن تھے انکی عمریں آٹھ نو سال کے اندر معلوم ہوتی تھیں۔ اُستادوں کی حُسن تربیت سے باادب اور بظاہر خوش و خرم نظر آتے تھے۔

خاتمہ پر ہیڈ ماسٹر صاحب نے مجھے ایک چھپی ہوئی رپورٹ عنایت کی جس میں اس مدرسہ کے اغراض و مقاصد حسب ذیل درج تھے:۔

"زمانہ سلف کے طریق برہمہ چریہ کو از سرنو حیات دیکر سرسبز و رائج کرنا۔ ساتھ ہی آریوں کی قدیم الہامی و مستند کتب (وید و شاستر) کی بوجہ احسن ترویج اور زمانہ حال کی مروجہ زبانوں اور علوم کی تعلیم دینا" اِن مقاصد کی تکمیل کی غرض سے سنسکرت کی تعلیم کو سب سے مقدم رکھا ہے۔ صرف ضروریات زمانہ کے لحاظ سے انگریزی زبان بھی ساتھ ساتھ سکھائی جاتی ہے۔ جغرافیہ۔ تاریخ۔ ریاضی اور سائنس کی تعلیم ناگری کے ذریعے ہوتی ہے۔ ہر علم و فن کے بڑے بڑے اُستاد نامور مقرر کئے گئے ہیں جن میں اکثر آنریری ہیں۔

طالب علموں کی زندگی اور پڑھائی کا عام دستور العمل یہ معلوم ہوا کہ کوئی بچہ آٹھ برس سے کم عمر کا داخل نہیں ہوتا۔ ان کے دو فریق ہیں۔ ایک فریق کی پڑھائی دس سال اور دوسرے کی پڑھائی سولہ سال ہے۔ لڑکے

صبح کے چار بجے اُٹھا دئے جاتے ہیں۔ ضروریات سے فارغ ہونے کے بعد یہ اوران کے اُستاد گنگا کے کنارے ورزش کرتے ہیں۔ پھر کچھ دیر عبادت میں مشغول رہتے ہیں۔ سوا چھ بجے ہَوَن٭ کی رسم ادا ہوتی ہے۔ تین گھنٹے قبل دوپہر اور تین گھنٹے بعد دوپہر پڑھائی ہوتی ہے۔ دن میں صبح و شام دو دفعہ دودھ پینے کو ملتا ہے۔ کھانے میں ایک دال اور ترکاری ہوتی ہے۔ لال مرچ کھٹائی پیاز اور اسی قسم کی دیگر چیزوں کی سخت ممانعت ہے۔ شام کو پھر دوبارہ ورزش کرائی جاتی ہے۔ پہلے فریق سے دس روپے ماہوار اور دوسرے فریق سے سولہ روپے ماہوار فیس لی جاتی ہے۔ اس میں خوراک پوشاک۔ دُھلائی حجامت۔ کاغذ۔ کتابیں وغیرہ سب مصارف شامل ہیں۔ منتظمان کا ارادہ ہے کہ اگر سبھا کے پاس اس قدر روپیہ جمع ہو جائے جس کے سود سے گورو کُل کے تمام اخراجات ادا ہو سکیں تو پھر کسی طالب علم سے کوئی خرچ نہیں لیا جاویگا۔

گورو کُل کے متعلق ہر سال نہایت دھوم دھام سے سالانہ جلسے منعقد ہوتے ہیں جن میں اطراف ملک سے نصف لاکھ کے قریب آدمی شریک ہوتے ہیں اور اس موقع پر دولتمند لوگ بڑے بڑے چندے دیتے ہیں۔ زمین اور جائدادیں وقف کرتے ہیں۔ چنانچہ اس وقت مستقل فنڈ دو لاکھ ۴۸ ہزار ۹ سو ۵۳ روپے ہے۔ یہ گورو کُل کی خوش قسمتی ہے کہ اُس کو لالہ منشی رام جیسا گورنر اور لالہ رام دیو جیسا ماسٹر مل گیا ہے جنہوں نے اپنی عمر اس قومی کام کے واسطے وقف کر دی ہے۔ جو طالب علم اس قومی درسگاہ میں ایسے اچھے کارکنوں کی خدمات اور سالانہ جلسوں میں اہل وطن کی گرم جوشی کا نمونہ دیکھینگے

٭ ہَوَن۔ پوجا پاٹ کی ایک رسم کا نام ہے۔ ایک گڑھے میں آگ جلا کر گھی اور خوشبو ڈالی جاتی ہے۔ پھر کچھ اشلوک اور منتر وغیرہ پڑھتے ہیں۔ مؤلف

ظاہر ہے کہ مشرقی اور مغربی علوم کی تحصیل کے ساتھ حب الوطنی کے شیدائی اور قوم وملت کے فدائی ہو کر نکلینگے ⁂

ڈیرہ دُون

ہردوار سے ۳۲ میل طے کرنے کے بعد میں ڈیرہ دُون پہنچا۔ یہ شہر کوہ ہمالیہ اور کوہ سوالک کے دامن میں واقع ہے۔ اس کی ابتدائی شہرت اگرچہ گیارھویں صدی ہجری کے آخر سے ہے۔ جبکہ سکھوں کے گورو رام رائے صاحب نے یہاں گوردوارہ بنایا۔ مگر اس کی موجودہ آبادی و ترقی کا زمانہ اُنیسویں صدی سے شروع ہوتا ہے جبکہ گورنمنٹ انگریزی کو اس کے قدرتی مناظر نے اپنی طرف کھینچا۔ اور چھاؤنی کی بنیاد قائم کی۔ شہر کی موجودہ آبادی اگرچہ مختصر مگر بہت خوبصورت ہے۔ بازار وسیع۔ راستے سیدھے مکانات عموماً کشادہ اور خوش قطع ہیں۔ ہر مکان کے ساتھ ایک چھوٹا سا باغیچہ بھی ہے۔ کوٹھیاں جس قدر ہیں۔ اُن کے احاطے اور باغیچے بہت وسیع ہیں۔ پانی اور ہریاول کی اس قدر کثرت ہے کہ جس سڑک کو دیکھو۔ اُس میں نہریں بہتی اور دورویہ سرسبز درختوں کی قطاریں لہلہاتی نظر آتی ہیں۔ آبادی کے بالائی حصے میں ایک بہت بڑا وسیع میدان ہے جس کی نظیر شملہ۔ ڈلہوزی اور دھرم سالہ میں بھی میری نظر سے نہیں گزری۔ آب و ہوا کی عمدگی کے باعث اکثر یورپین اور کچھ دیسی لوگ موسم گرما بسر کرنے کو یہاں آتے رہتے ہیں ⁂

گورو رام رائے صاحب کا گُردوارہ شہر کے بائیں طرف ہے۔ اس کی عمارت دور سے بہت خوشنما اور مُغلئی وضع کی نظر آتی ہے۔ بادی النظر میں

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی امیر کا مقبرہ ہوگا - اصل حقیقت اندر جانے سے کھلتی ہے - ایک دو منزلہ گنبد دار عمارت کرسی دیکر بنائی ہے - تمام فرش سنگ مرمر کا ہے - چاروں طرف بڑا وسیع صحن اور ہر کونہ پر ایک گنبد ہے - جس کی نسبت لوگوں نے بیان کیا کہ یہ گورو صاحب کی چار بیویوں کی چار سمادھیں ہیں - یہ عمارت ہندوستان کے نامور فرمانروا اورنگ زیب کے عہد کی بنی ہوئی ہے - بادشاہ نے گورو صاحب کی کسی ملکی خدمت سے خوش ہوکر راجہ ٹیڑھی کو اس کی تعمیر پر توجہ دلائی تھی - جنوبی دروازہ کے اندر فارسی حرفوں میں سنگ مرمر پر ایک کتبہ لکھا ہوا ہے - جس میں یہ الفاظ درج ہیں "ششم شہر ذیقعد سنہ سی و یک عہد عالمگیر بادشاہ غازی موافق سنہ یک ہزار و نود و نہ ہجری" - شہر کی کل زمین گوردوارہ کی ملکیت ہے - کوئی شخص گوردوارہ کو سالانہ نذر زمین دئے بغیر مکان نہیں بنا سکتا - اس کا انتظام مہنت صاحب کے متعلق ہے جو ایک نوجوان اور خوش خلق آدمی ہیں - اُن کا نام مہنت لچھمن داس ہے - گوردوارہ کے ساتھ کچھ دیہات بھی وقف ہیں - مسافروں کو روزانہ روٹی لنگر سے ملتی ہے ٭

ڈیرہ دُون کی سرزمین کو نباتات سے خوب مناسبت ہے - چائے بہت عمدہ قسم کی پیدا ہوتی ہے - مگر چائے کے باغچوں کے مالک انگریز بیشتر اور دیسی کمتر ہیں - بالسمتی کے چاول بہت نفیس اور خوشبودار ہوتے ہیں - میوہ جات میں لیچی سب سے خوش ذائقہ ہے ٭

علمی سوسائٹی کو یہاں روزافزوں ترقی ہے - مشن سکول اور ویدک سکول کے علاوہ مسلمانوں کی طرف سے دیرہ انسٹیٹیوٹ اور ایک انجمن نصرت الاسلام قائم ہے - اس کے سکرٹری منشی حسن محمد صاحب مختار

فوجداری کو قومی معاملات سے اچھی دلچسپی ہے۔ علمی درس گاہوں میں کنیا پاٹھ شالا (لڑکیوں کا مدرسہ) خصوصیت سے قابل ذکر ہے۔ اس کے ساتھ ایک بورڈنگ ہوس بنا ہوا ہے۔ جس میں دیرہ کے علاوہ بیرونجات کی لڑکیاں بھی پڑھنے آتی ہیں۔ اور بورڈر کے طور پر رہتی ہیں۔ اس مدرسہ کا اہتمام لالہ جوتی پرشاد وکیل کی بی بی کے متعلق ہے۔ جو رائے سوہن لال صاحب کی بیٹی ہیں۔ اُنہوں نے اس سکول کے چلانے میں بڑی کامیابی حاصل کی ہے۔ انہیں خدمات کے صلے میں ان کو قیصر ہند کا تمغہ بھی مل چکا ہے +

گورنمنٹ نے انواع و اقسام کے پودوں کی موجودگی گرد و نواح میں جنگلوں کی کثرت اور خاص شہر میں ہموار زمین کی بہتات دیکھ کر یہاں فارسٹ کالج قائم کیا ہے۔ اس کی پڑھائی کے دو درجے ہیں۔ رینجر اور اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر رینجر۔ ہندوستان کے تمام صوبوں اور لنکا و برہما تک کے دیسی اور انگریز طلبا یہاں تعلیم حاصل کرنے کو آتے ہیں +

کالج کے ساتھ ایک عجائب خانہ ہے۔ اس کا وہ حصّہ خصوصیت سے دیکھنے کے لائق ہے جس میں مختلف قسم کی لکڑیوں کے نمونے اور لکڑی کاٹنے کے کئی قسم کے اوزار رکھے ہوئے ہیں۔ ایک لکڑی اتنی بڑی موٹی ہے کہ اُس کا محیط ۲۷ فٹ ہے +

سروے پارٹی انڈیا جو موسم سرما میں ہندوستان کے مختلف حصّوں کو پیمائش کی غرض سے جاتی ہے۔ اُس کا دفتر اسی جگہ ہے۔ اس کے احاطے میں ایک آبزرویٹری (رصد) بنی ہوئی ہے۔ کہتے ہیں کہ ہندوستان میں ایسی اعلےٰ درجے کی ابزرویٹری کہیں نہیں ہے +

یہ شہر عرصہ دراز سے جلیل القدر پولیٹیکل پنشن خواروں کا مسکن ہے۔

افغانستان کی پہلی لڑائی کے بعد امیر دوست محمد خان والئے کابل اسی جگہ بھیجے
گئے تھے۔ الحاق پنجاب کے بعد مہاراجہ دلیپ سنگھ اور اُن کی والدہ رانی جنداں
کو یہاں رہنا پڑا۔ تھوڑے دنوں بعد راجہ لال سنگھ آگرہ کے قلعے سے یہاں
منتقل ہوئے۔ راجہ صاحب کے بڑے بیٹے راجہ رنبیر سنگھ اور اُن کے بھائی
اب بھی اسی جگہ مقیم ہیں۔ راجہ صاحب خوش خلقی اور مہمان نوازی کی وجہ سے عام و خاص
کی نظروں میں بہت محترم ہیں۔ امیر شیر علی خاں صاحب کے سفر پنجاب کے
کے بعد ان کے بھائی سردار محمد شریف خاں یہاں ٹھیرائے گئے۔ افغانستان
کی دوسری لڑائی سے سردار محمد یعقوب خاں یہاں تشریف فرما ہیں۔ سال
گزشتہ تک سردار صاحب کے اٹاچی گورنمنٹ انڈیا کی طرف سے خان بہادر
منشی نجف علی صاحب تھے۔ جنہوں نے اپنی خوش خُلقی اور ملنساری سے
بڑی عزت پیدا کی ہے۔ یہ پنجاب کے نامور اخبار نویس پادری رجب علی صاحب آنجہانی
کے بھائی ہیں۔ سال حال میں سید سجاد حیدر صاحب بغداد رزیڈنسی سے
اس عہدے پر تشریف لائے ہیں۔ انہیں انگریزی۔ عربی۔ فارسی۔ ترکی
اور اُردو پانچ زبانوں میں خوب مہارت ہے۔ یہ بڑے مضمون نگار اور مہمان نواز
ہیں۔ بغداد کے بعد ان سے میری یہ دوسری ملاقات ہوئی ہے +

مجھے سنہ ۱۹۰۶ء میں لدھیانہ کے ڈپٹی کمشنر دیوان ٹیک چند صاحب کے ہمراہ
پہلی مرتبہ ڈیرہ دون آنے کا اتفاق ہوا تھا۔ دیوان صاحب عربی زبان کے اعلےٰ
امتحان کی تیاری کی غرض سے مصر کے عازم تھے۔ اور اس سفر کے متعلق
مشورہ کرنے کے واسطے مجھے ہمراہ لائے تھے۔ میں دس بارہ دن دیوان
صاحب کے ساتھ ڈیرہ دون میں مقیم رہا۔ اُن کی حُسن معاشرت سے یہ دن
بہت اچھی طرح بسر ہوئے۔ اثنائے رفاقت میں یہ بھی معلوم ہوا کہ دیوان صاحب

عربی۔ فارسی۔ پشتو۔ بلوچی اور سندھی زبانوں کے ابتدائی امتحانات پاس کر چکے ہیں۔ مجھے جن دیسی سو بیس شرفا سے سفر و حضر میں اب تک ملاقات کا اتفاق ہؤا ہے۔ دیوان صاحب اُن میں اکتساب فضائل کے لحاظ سے ایک ممتاز شخص ہیں ٭

ڈیرہ دُون سے مسُوری کا پہاڑ دو پڑاؤ ہے۔ نصف راستہ میں راجپورہ آتا ہے۔ یہاں تک گاڑیاں اور ٹمٹمیں بڑی آسانی سے جاتی ہیں۔ راجپورہ سے مسُوری تک گھوڑے یا ڈانڈی (ایک قسم کی پالکی) کے ذریعے سفر ہوتا ہے۔ آب و ہوا کی عمدگی کے باعث صدہا انگریز موسم گرما بسر کرنے کو یہاں چلے آتے ہیں ٭

مُرادآباد

ڈیرہ دُون سے اکسر۔ نجیب آباد۔ نگینہ اور دھام پور ہوتا ہؤا ۱۳۵ میل طے کرنے کے بعد میں مُرادآباد پہنچا۔ یہ شہر خوب آباد اور حکام سول کا صدر مقام ہے۔ اس کی آبادی ۷۵ ہزار ہے۔ ہندو مسلمان سب اُردو میں بات چیت کرتے ہیں ٭

سٹیشن سے شہر تک ایک میل کا فاصلہ ہے۔ سب سے پہلے بیرون شہر ایک آبادی سے گزر ہؤا جس کا نام بُدھ بازار ہے۔ یہاں ہر ہفتے بُدھ کے دن پینٹھ لگتی ہے۔ گرد و نواح کے لوگ اپنے ہاں کی پیداوار یہاں لاکر بیچتے ہیں۔ اور اپنی ضرورت کی چیزیں خرید کر لے جاتے ہیں۔ اس کے بعد ایک سرسبز باغیچہ آتا ہے۔ جس کے وسط میں ٹون ہال اور اطراف میں ہسپتال اور کوتوالی کی عمارتیں ہیں۔ یہاں سے شہر کی

آبادی شروع ہو جاتی ہے۔ شہر کے بازار چوڑے اور سیدھے۔ عمارتیں باقرینہ اور چوک بہت خوش وضع بنے ہوئے ہیں۔ جدھر تدھر دیکھو۔ دُکانیں تجارتی مال سے پُر ہیں۔ تمام رُہیلکھنڈ میں ایسا خوشنما اور آباد شہر میری نظر سے کوئی نہیں گزرا۔ خاتمہ پر جہاں رام گنگا بہتی ہے۔ نواب رستم خاں کے زمانے کی دو یادگاریں ہیں۔ ایک جامع مسجد اور دوسرا قلعہ۔ مسجد سنہ ۱۰۴۴ھ ۱۶۳۴ء کی تعمیر اور اس وقت پہلے سے زیادہ اچھی حالت میں ہے۔ مگر قلعہ مسمار ہو کر اُس کی جگہ گورنمنٹ ضلع سکول بنادیا گیا ہے ٭

مسلمان اکثر دین دار مگر قدامت پسند ہیں۔ شاہی زمانے میں یہاں کے مسلمان بہت خوشحال تھے۔ مگر غدر ۱۸۵۷ء سے ادھر بہت تغیر ہو گیا جن رؤسا کے مکانوں کے سامنے ہندو سوار ہو کر نہیں جا سکتے تھے اب اُن کی جائدادوں پر یہ لوگ قابض ہیں۔ صرف چند خاندانوں کے ممبر دیگر شہروں میں اچھے اچھے عہدوں پر ممتاز ہونے سے آسودہ ہیں۔ خاندان سادات سے خان بہادر سید قائم علی مرحوم پنجاب میں اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر کے عہدہ پر ممتاز تھے۔ ان کی اولاد اب تک پنجاب میں اچھی اچھی خدمات پر مامور ہے۔ میر نذر الباقر جن کا ذکر پشاور میں کیا گیا انہی کے پوتے ہیں ٭

یہاں کی بڑی دستکاری تانبے اور دھات کے سادہ و منقش برتنوں کی ساخت ہے جو بہت عمدہ اور بکثرت تیار ہو کر ہندوستان کے اطراف و جوانب میں جاتے ہیں۔ ان برتنوں کے دساور سے یہاں کے لوگ مرفہ الحال اور صاحب ثروت ہیں اور یہ کام بیشتر مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے ٭

مسلمانوں کی تعلیمی حالت خاطر خواہ نہیں ہے۔ عربی کے دو معمولی مدرسے موجود ہیں۔ انگریزی تعلیم سے انہیں فی الجملہ تنفر ہے۔ باوجودیکہ

گورنمنٹ اور مشن کی طرف سے دو ہائی سکول موجود ہیں۔ مگر مسلمانوں نے مذہبی تعلیم کو مدنظر رکھکر ایک چھوٹا سا مدرسہ مڈل کلاس تک قائم کیا ہے۔ مدرسوں کی تنخواہیں کم۔ آمدنی تھوڑی اور غیر مستقل ہے۔

برتنوں کی ساخت کے بعد مراد آباد نے جس خاص کام میں شہرت حاصل کی ہے۔ وہ اُردو اخباروں کا اجرا ہے۔ اس شہر سے نیّر اعظم مخبر عالم نجم بازغ۔ ستارۂ ہند۔ رہبر۔ نظام الملک پنچ وغیرہ اس قدر اخبار نکلتے ہیں جو ہندوستان کے بڑے سے بڑے شہر کو بھی بمشکل نصیب ہونگے۔ نیّر اعظم کے سوا باقی اخبارات ضرورت کے وقت شائع ہوتے ہیں۔ لوگوں نے بیان کیا کہ یہ اخبار زیادہ تر ریاست رام پور کے بھروسے پر چلتے تھے۔ کوئی مدح سرائی سے اور کوئی ہجوگوئی سے اپنا کام نکالتا تھا۔ جب سے آخر الذکر ایک دو اڈیٹروں کو فوجداری میں سزائیں مل چکی ہیں۔ اُس وقت سے یہاں کے اخبارات بالکل کس مپرسی کی حالت میں ہیں۔

مُراد آباد اودھ رُہیلکھنڈ ریلوے کا جنکشن ہے۔ تجارت کے باعث چاروں طرف ریل چلتی ہے۔ یہاں سے دہلی براہ امروہہ ۱۰۰ میل۔ علیگڈھ ۱۰۵ میل۔ رام پور ۱۷ میل۔ ڈیرہ دُون ۱۳۵ میل اور سہارنپور ۱۲۰ میل ہے۔

رام پُور

مُراد آباد سے ۱۷ میل طے کرنے کے بعد میں رام پور آیا جو اسی نام کی ریاست کا دار الحکومت اور ریلوے لائن پر ہے۔ سہارنپور یہاں سے ۱۳۷ میل اور لکھنؤ ۱۸۵ میل ہے۔ سٹیشن سے شہر تک کوئی تین میل کا

فاصلہ ہے۔ بیرون شہر بانسوں کا ایک گھنا جنگل دائرے کی شکل میں واقع ہے کسی زمانے میں یہ جنگل فصیل کا کام دیتا تھا۔ اور اُس وقت داخلہ کے دروازوں پر جنگی پہرے رہتے تھے۔ تاکہ ہر شخص کی نقل و حرکت کی نگرانی ہو سکے۔ مگر اب یہ پہرے غیر ضروری سمجھ کر اُٹھا دئے گئے ہیں۔ رام پور کی آبادی ۸۷ ہزار اور باشندوں کی زبان اُردو ہے +

شہر کے بازار پختہ مگر کچھ شاندار نہیں ہیں۔ قلعہ کے قریب صفدر گنج کا چوک اچھے موقع پر واقع ہے۔ شام کے وقت یہاں خوب چہل پہل رہتی ہے چوک کی بائیں جانب نواب صاحب والئے رام پور کے محل ایک قلعہ نما فصیل سے گھرے ہوئے ہیں جن کو نواب میجر حامد علی خان بہادر فرمانروائے حال نے کئی لاکھ روپے کے صرف سے تیار کرایا ہے۔ یہ محل اپنی وضع میں خوشنما ہیں +

شہر کے اکثر باشندے پٹھان قوی ہیکل ہیں۔ جن کے چہروں سے جرأت کے نشان نمودار ہیں۔ ان کا زیادہ میلان فوجی خدمت کی طرف ہے۔ حرفت و صنعت پر کچھ توجہ نہیں۔ یہاں کی مصنوعات میں سے کھیس بہت عمدہ ہوتا ہے جس کے ایک جوڑے کی قیمت چالیس روپے تک ہے۔ بانس کی لکڑیاں (چوب دستی) اور سرونٹے بھی خوب بنتے ہیں +

انگریزی تعلیم کے واسطے ایک ہائی سکول موجود ہے۔ مگر باشندے اس کی تحصیل پر کم راغب ہیں۔ علوم مشرقی کی تعلیم و تعلّم کا چرچا یہاں عرصہ دراز سے ہے آج سے سو برس پیشتر نواب فیض اللہ خاں کے زمانہ میں مولانا عبد العلی بحر العلوم لکھنوی۔ نواب یوسف علی خاں کے عہد میں مولانا فضل حق خیرآبادی اور مفتی محمد سعد اللہ صاحب مرادآبادی آکر یہاں مقیم ہوئے۔ ان کے فضل و کمال اور ریاست کی قدر دانی سے رام پور مشرقی علوم کا مرکز قرار پا گیا تھا۔ یہاں کی درسگاہوں

کو فلسفہ اور معقولات کی تدریس میں ایسی ہی خصوصیت تھی جیسی دیوبند کے مدرسہ کو مذہبی علوم کی تعلیم میں ہے۔ اس شہرت کو سُنکر ممالک بعیدہ کے طالب علم چلے آتے تھے۔ مولانا عبدالحق خیر آبادی کے وجود تک یہ رونق بدستور قائم رہی مگر اب ریاست کی توجہ ان امور پر نہیں ہے۔ اس واسطے نہ اُس پایہ کے عالم اور نہ ویسے مستعد طالب علم۔ صرف شہرت دیرینہ لوگوں کو کشاں کشاں یہاں لئے چلی آتی ہے +

علما کے علاوہ زبردست شعرا کا ایک مجمع حاضر رہتا تھا۔ دہلی و لکھنؤ کے مشہور شاعر مثل نواب مرزا داغ۔ منشی مظفر علی اسیر۔ منشی امیر مینائی۔ شیخ امداد علی بحر۔ قلق۔ جلال۔ منیر وغیرہ مدتوں یہاں رہے۔ مرزا غالب بھی یہاں کے وظیفہ خوار تھے۔ اس وقت مولانا عبدالحمید فرخی نظم و نثر میں مشہور اور قابل ملاقات ہیں +

یہاں کی قابل قدر اور مقامی یادگار مشرقی علوم کا ایک کتب خانہ قلعہ کے اندر ہے۔ اس میں عربی۔ فارسی اور مختلف زبانوں کی آٹھ ہزار جلدیں ہیں۔ جن میں سے بعض اپنی خصوصیات کی وجہ سے نادرالوجود مانی گئی ہیں۔ مگر یہ کتب خانہ پبلک نہیں۔ شائقین کو اجازت لیکر دیکھنے کا موقع ملتا ہے۔ دسمبر ۱۹۱۲ء میں جب میں اس جگہ آیا۔ تو دہلی کے رئیس حکیم حافظ اجمل خاں صاحب افسر الاطبا اس کتب خانہ کے مہتمم تھے۔ ان کے ذریعے کتب خانہ کی سیر کا مجھے اتفاق ہوا تھا۔ میرے ۱۹۰۸ء کے سفر میں اس کا اہتمام حافظ احمد علی خاں صاحب شوق کے ہاتھ میں ہے جو ایک علم دوست۔ ملنسار اور دو تین سفر ناموں کے مترجم ہیں +

تاریخی حالات - اس ریاست کے مورث اعلےٰ شاہ عالم اور حسین خاں دو بھائی ہیں جو سترھویں صدی مسیحی کے آخر میں افغانستان سے ہندوستان آئے تھے۔ شاہ عالم کے دو فرزند ہوئے۔ ایک داؤد خاں اور دوسرے حافظ

رحمت خاں - انھوں نے مرہٹوں کے محاربات میں بڑے بڑے نمایاں کام کئے
سلطنت دہلی کے زمانہ ضعف میں اگرچہ داؤد خاں کے متبنّیٰ فرزند نواب علی محمد خاں
نے رہیلکھنڈ پر قبضہ کر لیا مگر خاندان کا مسلّم سرغنہ حافظ رحمت خاں ہی مانا گیا - نواب
علی محمد خاں کے انتقال پر رہیلکھنڈ کا علاقہ کچھ مدت تک حافظ رحمت خاں کے
زیر اہتمام رہا - اور آخر کار تقسیم ہو کر رام پور کی ریاست نواب فیض اللہ خاں کے حصّہ
میں آئی جو حافظ رحمت خاں کے انتقال کے بعد ۱۷۸۳ء میں پورے طور سے
قابض ریاست ہوئے - اٹھارھویں صدی کے خاتمہ پر نواب فیض اللہ خاں کے
پوتے نواب احمد علی خاں مسند نشین ہوئے - وہ ہنوز نابالغ تھے کہ نواب وزیر اودھ
نے ۱۸۰۱ء میں رام پور کی ریاست انگریزوں کے حوالے کر دی - اس کے
موجودہ اعزاز و اکرام کی بنا نواب محمد یوسف علی خاں سے شروع ہوتی ہے -
جو غدر ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کی خیر خواہی پر قائم رہے - اس کے صلہ میں
گورنمنٹ کی طرف سے خطاب اور اضافہ جاگیر مرحمت ہوا - نواب کلب علی خاں کے
زمانے میں اس کی شان و شوکت کو خوب ترقی ہوئی - اس وقت اُن کے پوتے
نواب میجر حامد علی خاں یہاں کے فرمانروا ہیں +

اس ریاست کے فرمانرواؤں کی فیاضی - دینداری - اور علمی قدردانی کا
ہندوستان میں بڑا چرچا ہے - نواب کلب علی خاں مرحوم کے چند ایسے
کارنامے ہیں جو عرصہ دراز تک مسلمانوں کو یاد رہینگے - (۱) دہلی کی جامع مسجد
کی مرمت کے واسطے ڈیڑھ لاکھ روپے عطا کئے - (۲) نہر زبیدہ کی درستی کے
واسطے سوا لاکھ روپے دیکر عرفات کے میدان میں حاجیوں کی دائمی راحت
کا بندوبست کیا - (۳) مدرسۃ العلوم علیگڈھ کی ایک گراں قدر عطیہ سے امداد
دے کر سرپرستی قبول کی +

ریاست کا رقبہ ۹۴۱ مربع میل۔ آبادی چھ لاکھ اور آمدنی تقریباً بتیس لاکھ روپے ہے۔ فوجی قوت میں ۷۰۴ سوار۔ ایک ہزار نوسو پیدل اور ۲۰۷ توپچی ہیں +

بریلی

رام پور سے ۳۹ میل طے کرنے کے بعد میں بریلی پہنچا۔ یہ شہر ہندوستان کے پُرانے شہروں میں شمار ہوتا ہے۔ اس کے گردونواح میں بدھ مذہب کے زمانے کے آثار اب تک پائے جاتے ہیں۔ سلطنت مغلیہ کے زمانۂ ضعف میں پٹھانوں کی رہیلہ قوم نے اس پر قبضہ کیا۔ جن میں سے نواب حافظ رحمت خاں کا نام تاریخ ہند میں بہت مشہور ہے۔ ۱۸۰۱ء سے یہ شہر سرکار انگریزی کے قبضے میں آیا۔ اس وقت حکام سول کا صدر مقام اور رُہیلکھنڈ کی فوجی جمعیت کا مرکز ہے۔ اس کی مردم شماری ایک لاکھ ۳۱ ہزار ہے زبان سب کی اُردو ہے +

سٹیشن سے شہر تک آدھ میل کا فاصلہ ہے۔ راستے میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر آبادی ملتی جاتی ہے۔ شہر میں داخل ہوتے سے پہلے دائیں ہاتھ کو بریلی کالج۔ ڈاک خانہ۔ ٹون ہال اور بائیں ہاتھ کو اخبار یونین گزٹ اور رہیلکھنڈ گزٹ کا دفتر ہے۔ ٹون ہال میں ایک کتب خانہ ہے۔ یہاں کا چوک بہت خوش وضع و با رونق ہے۔ بازار عموماً سیدھے اور فراخ۔ مکانات عمدہ اور با قرینہ ہیں۔ یہ شہر ان خوبیوں کے لحاظ سے مرادآباد سے دوسرے درجے پر ہے +

بریلی میں لکڑی کا کام خوب بنتا ہے۔ یہاں کی میز۔ کرسیاں اور ہر قسم کا فرنیچر تمام ہندوستان میں جاتا ہے۔ اور یہ کام بیشتر مسلمانوں کے ہاتھ

میں ہے - یہاں سرمہ کی فروخت بھی بکثرت ہوتی ہے جس کا بہت باریک پسا ہوا ہونا مشہور ہے +

یہاں انگریزی تعلیم خوب ترقی پر ہے - دو ہائی سکولوں کے علاوہ ایک کالج ہے - مگر مسلمانوں نے اس سے کم استفادہ کیا ہے - رہیلکھنڈ کے دوسرے شہروں کی طرح ان پر بھی خیالات قدیمہ غالب ہیں - عربی کے دو تین چھوٹے چھوٹے مدرسے جاری ہیں - لوکل کمیٹی نے مسلمانوں کی پستی حالت دیکھ کر تھوڑے دنوں سے ایک چھوٹا سا مدرسہ ان کی دینی اور دنیوی تعلیم کی غرض سے جاری کیا ہے - اس کے علاوہ ایک یتیم خانہ بھی موجود ہے یتیموں کو نوشت خواند کے ساتھ کارچوبی کا کام سکھایا جاتا ہے +

قاضی محمد خلیل صاحب نے جو خاندانی حیثیت کے ساتھ بڑے علم دوست اور مسافر نواز ہیں - بریلی کے مسلمانوں کی پستی تعلیم کا مجھے یہ قصہ سُنایا - "میں نے آج سے پندرہ سولہ سال پیشتر نواب محسن الملک مرحوم سے بریلی کے مسلمانوں کی تعلیم پر ایک لیکچر دلایا تھا - اس لیکچر میں ہندو سات آٹھ سو اور مسلمان بمشکل چالیس پچاس ہونگے" - یہاں کے علما میں سے مولوی احمد رضا خاں صاحب بہت بڑے ذی علم اور مرجع خلائق ہیں - اگر ان کی توجہ مذہبی جھگڑوں کے عوض مسلمانوں کے باہمی اتحاد اور ضروریات زمانہ پر مبذول ہو تو مسلمانان بریلی کے واسطے بہت مفید ہے +

اس شہر میں دو عمارتیں قابل دید ہیں - (۱) اندرون شہر حضرت شاہ نیاز احمد صاحب کا مزار - آپ تیرھویں صدی کے مشہور بزرگ اور خواجہ فخر الدین دہلوی کے مرید ہیں - آپ کا ذکر ضمیمہ میں درج ہے + (۲) بیرون شہر نواب حافظ الملک حافظ رحمت خاں کا مقبرہ - حافظ رحمت خان رہیلہ قوم کے سردار

اور اٹھارھویں صدی میں رہیلکھنڈ کے حاکم تھے۔ اُس زمانہ میں بریلی ان کا دارالحکومت تھا۔ احمد شاہ ابدالی نے ۱۱۷۴ھ ۱۷۶۱ء کی لڑائی میں دو لاکھ مرہٹوں کو پانی پت کے میدان میں جو شکست دی۔ اس میں حافظ الملک کے فنون حربیہ کا حصہ بھی شامل تھا۔ ۱۱۸۸ھ ۱۷۷۴ء میں نواب وزیر اودھ نے چالیس لاکھ روپے کا مطالبہ ان سے کیا۔ اور روپیہ وصول نہ ہونے سے بمشورہ وارن ہیسٹنگز گورنر جنرل رہیلکھنڈ پر چڑھائی کر کے کل ملک کو بے چراغ کر دیا۔ اسی معرکہ میں حافظ رحمت خان شہید ہوئے ایک شاعر نے مادۂ تاریخ خوب کہا ہے ؎

چو از لفظ ظفر جستند تاریخ — پئے باقی سرِ حافظ بریدند

ایک ظریف نے مادہ تاریخ اس طرح نکالا ہے ؎

ز چار انگشت دو انگشت خم شد۔ چار انگشت کی شکل یہ ہے۔
۱۱۱۱ جب ان میں سے دو کو خم کیا۔ تو یہ صورت ہوئی ۱۱۸۸۔ اور یہی سال شہادت ہے۔ حافظ الملک کا مقبرہ فاحہ دروازہ سے ایک میل کے فاصلے پر جو کی کربلا کے قریب ہے۔ عمارت پختہ مگر موجودہ حالت خستہ ہو رہی ہے +

شہر سے ایک میل کے فاصلے پر انگریزی چھاؤنی ہے جو رُہیلکھنڈ کا فوجی صدر مقام ہے +

یہ شہر اودھ رُہیلکھنڈ ریلوے اور رُہیلکھنڈ کمایوں ریلوے کا جنکشن ہے۔ یہاں سے سہارنپور ۱۷۶ میل۔ لکھنؤ ۱۲۶ میل۔ بدایوں ۲۷ میل۔ پیلی بھیت ۳۶ میل اور کاٹھ گودام ۶۶ میل ہے +

بدایوں

بریلی سے ۲۷ میل طے کرنے کے بعد مَیں بدایوں پہنچا۔ یہ شہر رُہیلکھنڈ کمایوں ریلوے کی شاخ پر ہے جو کاسگنج ہاتھرس اور متھرا ہوتی ہوئی آگرہ سے جا ملی ہے۔ شہر کی آبادی سٹیشن سے دو میل کے فاصلے پر ہے +

بدایوں ایک پُرانا شہر ہے۔ اسلامی تاریخ میں اس کا تذکرہ اُس وقت سے ملتا ہے۔ جبکہ قطب الدین ایبک نے ۵۹۹ھ ۱۲۰۲ء میں یہاں کا قلعہ فتح کیا قطب الدین ایبک کے جانشینوں کے آثار اب تک اس شہر میں موجود ہیں۔ وسط شہر میں سلطان شمس الدین التمش کی یادگار ایک عالیشان مسجد ہے۔ اگرچہ یہ بہت بڑی نہیں۔ مگر نہایت خوش قطع اور نفیس بنی ہوئی ہے۔ تمام رُہیلکھنڈ میں ایسی عمدہ مسجد میری نظر سے نہیں گزری۔ مرورِ زمانہ سے جو تغیرات اس کی حالت میں ہو گئے تھے۔ مسلمانوں نے ایک لاکھ روپیہ کے چندہ سے اس کی مرمت کرادی ہے +

یہاں کے باشندے قدامت پسند ہیں۔ حرفت و صنعت کا یہاں کچھ چرچا نہیں۔ اور نہ تجارت کو چنداں فروغ ہے۔ انہی وجوہات سے ریل کے تعلقات تازہ ہیں۔ بدایوں لائن ابھی دو برس سے جاری ہوئی ہے +

اس شہر کے لوگ عرصہ دراز تک علوم عربیہ کی تحصیل پر بہت مائل رہے۔ اور علمی لیاقت سے اچھے اچھے عہدوں پر ممتاز ہوئے۔ مگر اس علم و فضل کے ساتھ زمانہ کی ضروریات سے بے پروا۔ شیخ عبدالغفور صاحب وکیل بلند شہر نے جن سے میری ملاقات پیران کلیر کے سفر میں

ہوئی تھی۔ بیان کیا۔ کہ "غدر کے بعد تک ممالک مغربی کے مختلف اضلاع میں تحصیل دار سے لیکر سب جج تک ۴۴ جوڈیشل عہدہ دار بدایوں کے رہنے والے تھے۔ انہوں نے مذہبی تعصب سے اپنی اولاد کو انگریزی پڑھنے سے روکا۔ نتیجہ یہ ہوا۔ کہ ان عہدہ داروں کی وفات پر معدودے چند کے سوا کوئی ان کی جانشینی نہ کرسکا"۔ اس تنزل کے بعد اب پھر ترقی شروع ہوئی ہے۔ لوگوں کا میلان انگریزی کی طرف ہو چلا ہے۔ اب یہاں کے مسلمان ہائی سکول سے مستفید ہو رہے ہیں۔ اور اعلےٰ تعلیم کے واسطے اپنے بچوں کو کالجوں میں بھیجتے ہیں +

اسلامی دورِ حکومت میں یہاں بڑے بڑے باکمال صوفیا اور نامدار علما گزر چکے ہیں۔ منشی محمد فصیح الدین صاحب ڈپٹی کلکٹر نے ان تمام بزرگوں کے اسما اور اُن کے حالات اپنی کتاب تذکرۃ الواصلین میں درج کئے ہیں۔ ساتویں صدی ہجری میں چشتیائے نظامیہ کے سرگروہ حضرت نظام الدین سلطان الاولیا ان کے ہمعصر خواجہ ضیاء الدین نخشبی مشہور شاعر اور دسویں صدی ہجری میں شہنشاہ اکبر کے پیش نماز اور مشہور مؤرخ ملا عبدالقادر ایسے باکمال گزرے ہیں جن کا نام ہندوستان بھر میں مشہور ہے +

بیرون شہر مشاہیر علما اور نامور صوفیا کی صدہا قبریں ہیں جن میں سے اکثر کو استدادِ زمانہ نے لاعلمی کی حالت میں مستور کر رکھا ہے اور بعض کو زمینداروں نے ہل چلا کر بے نشان کر دیا۔ حضرت نظام الدین سلطان الاولیا کے والد خواجہ سید احمد چشتی اور آپ کے دادا سید علی چشتی کے مزار سب سے زیادہ مشہور ہیں۔ لوگ ان مزارات کا بڑا احترام کرتے ہیں۔ مزار کے متولی سلطان الاولیا کی ہمشیرہ کی اولاد سے خواجہ فضل حق نظامی ایک خوش خلق آدمی ہیں [illegible]

علاوہ عیدگاہ کی عمارت بھی بہت پُرانی اور قابلِ دید ہے +

بدایوں کی سیر کرانے میں قاضی علی احمد محمود اللہ شاہ صاحب کا میں بہت ممنون ہوں۔ قاضی صاحب یہاں کے معززین میں سے ہیں۔ اِنکی علمی قابلیت اچھی ہے۔ ہندوستان کی قومی مجالس میں اکثر شریک ہوتے رہتے ہیں +

شاہجہاں پور

مَیں بدایوں سے بریلی آیا۔ اور یہاں سے ۴۴ میل طے کرنے کے بعد شاہجہاں پور پہنچا۔ اس جگہ سے سہارنپور ۲۲۴ میل اور لکھنؤ ۹۰ میل ہے۔ شہر کی آبادی ۷۶ ہزار کے قریب ہے +

شہر اسٹیشن سے ملا ہُوا ہے۔ تھوڑی دور جانے کے بعد آبادی شروع ہو جاتی ہے۔ بازار وسیع اور عمارتیں پختہ ہیں پہلے آبادکاروں نے جو افغانستان کے رہنے والے اور معزز تھے۔ اپنی اپنی قوم کے نام سے باون محلے بسائے۔ یہ محلے اب تک اُنہی قدیمی ناموں سے مشہور ہیں ہر محلہ میں رئیس قوم کی عالیشان اور بہت وسیع عمارتیں ہیں۔ اس کے اردگرد خدمتگاروں اور کمینوں کے مکانات سفالہ پوش ہیں۔ کہیں کہیں سفید زمینیں پڑی ہیں۔ کہیں زراعت بھی ہوتی ہے۔ غرض اس کیفیت سے شہر کی آبادی کئی میل کے لمبان میں چلی گئی ہے۔ اس کشادہ آبادی کے باعث تازہ ہوا سب مکانوں میں آتی رہتی ہے۔ اور صحت بخش آب و ہوا کی وجہ سے یہ شہر تمام رہیلکھنڈ میں مشہور ہے +

یہاں کے باشندوں کا میلان حرفت و صنعت پر بہت کم ہے۔

اکثر لوگ فوجی خدمت کے شیدا اور اس غرض سے دور دور چلے جاتے ہیں۔ یہ بڑے توانا اور قوی الجسم ہیں۔ دلیری اور جوانمردی کے آثار ان کے چہروں سے نمایاں۔ اور اچھے اچھے عہدوں پر مامور ہیں خان بہادر محمد برکت علی خاں مرحوم جو ایک عرصہ تک لاہور میں مقیم رہے۔ وہ اسی شہر کے رئیس اور فوجی خدمت سے ترقی کرتے ہوئے اکسٹرا اسسٹنٹ تک پہنچے تھے۔ دینداری کا چرچا بھی یہاں خاصا ہے۔ مگر نوجوان لڑکے اکثر بیکار پھرتے اور جرائم کے مرتکب ہوتے رہتے ہیں۔ محمد سعید خاں صاحب یہاں کے سوداگروں میں ایک روشن خیال اور متموّل شخص ہیں۔ ان کو تجارتی کاروبار سے بڑی دلچسپی ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ کوئی ایسا کارخانہ جاری کریں جس سے نوجوانوں کی وارستہ مزاجی میں کمی اور معیشت کا انتظام ہو +

انگریزی تعلیم کے واسطے ایک ہائی سکول قائم ہے اور اب تھوڑے دنوں سے مسلمان اس سے فائدہ اُٹھا رہے ہیں۔ بیشتر لوگ شرقی تعلیم کے دلدادہ ہیں۔ عربی تعلیم کے واسطے دو مدرسے قائم ہیں۔ مگر تعلیم کا انتظام اچھا نہیں۔ یوں سرمایہ بھی غیر تکنفی ہے۔ مولوی مسیح الزمان خاں جو حضور نظام دکن کے اُستاد اور یہاں کے رؤسا میں سے ہیں مشرقی تعلیم کے بڑے حامی ہیں مگر اب تک اُن کی کوششوں سے کوئی خاطر خواہ انتظام نہیں ہُوا +

شہر سے تین میل کے فاصلے پر انگریزی تاجروں کا ایک کارخانہ "روزہ کمپنی" کے نام سے قائم ہے۔ جہاں دانہ دار چینی اور رُم شراب بنائی جاتی ہے۔ ان دونوں چیزوں کا وساور دور دور تک ہے۔ اس ضلع میں اکثر

اُمرا و زمینداروں کے کھنڈسال کے کارخانے جاری ہیں۔ جن میں چینی۔ گُڑ۔ شکر اور راب بنائی جاتی ہے۔ مگر "روزہ کمپنی" کے اجراسے اس کی تجارت پہلے کی سی نہیں رہی ÷

لکھنؤ

شاہجہاں پور سے ۹۸ میل طے کرنے کے بعد میں لکھنؤ پہنچا۔ راستہ میں ہردوئی۔ سندیلہ اور کاکوری جیسے مشہور قصبوں سے گزر ہؤا ÷

شہر لکھنؤ دریائے گومتی کے کنارے پر آباد اور نواب آصف الدولہ کے عہد سے ۱۸۵۶ء تک نوابان اودھ کا دارالحکومت رہ چکا ہے۔ نواب موصوف کے عہد میں اس شہر کو اس قدر ترقی ہوئی۔ کہ آبادی کا پھیلاؤ ۳۶ مربع میل تک پہنچ گیا۔ نوابوں کی قدردانی سے ہر قسم کے اہل علم و ہنر یہاں فراہم ہو گئے۔ دہلی کے شکستہ حال باکمال بھی قدردانی کا چرچا سُنکر آ پہنچے۔ غرض نوابانِ اودھ کے زمانہ میں اس کو وہ رونق حاصل ہوئی۔ کہ لکھنؤ ہندوستان کے سب سے بڑے شہروں میں شمار ہونے لگا۔ شہر کی صفائی و آراستگی اور باشندوں کی تراش وخراش سے ہندوستان کا پیرس اس کا لقب ہؤا۔ واجد علی شاہ آخری فرمانروائے اودھ کی معزولی اور غدر ۱۸۵۷ء کے انقلاب سے اگرچہ وہ بات تو جاتی رہی۔ مگر اب بھی کلکتہ و بمبئی و مدراس و حیدرآباد دکن کے بعد اس کا درجہ ہے۔ شاہی زمانہ کی بقیہ شوکت اور چند شاندار عمارتوں کی تاریخی عزت و عظمت کے باعث یورپ و امریکہ کے سیاح بڑی دلچسپی سے اس کی سیر کو آتے ہیں۔ سنہ ۱۹۰۱ء کی مردم شماری کے موافق اس کی آبادی دو لاکھ ۶۴ ہزار

اور باشندوں کی زبان اُردو ہے +

غدر سے جو تغیرات اس شہر میں ہوئے ہیں۔ اس سے لکھنؤ کئی حصّوں میں منقسم ہو گیا ہے۔ مگر بہیئت مجموعی ایک ہی شہر تسلیم کیا جاتا ہے ایک حصّہ کو دیکھو تو بازار مسلسل اور آبادی بہت باقرینہ ہے۔ ذرا آگے بڑھو تو انگریزی چھاؤنیوں کی سی کیفیت نظر آنے لگتی ہے۔ کہیں مکانات۔ کہیں ویرانہ اور کسی جگہ زراعت ہوتی ہے۔ دوسرے حصّہ کو دیکھو تو پھر عالیشان حویلیاں اور بازار بارونق ہیں۔ غرض لکھنؤ کے نظارے آبادی اور ویرانہ کے دو مجموعی نمونے ہیں۔ اس وقت شہر کے بڑے بڑے حصّے یہ ہیں :-

چوک بازار۔ یہ لکھنؤ کی قدیم آبادی کا ایک بہت بارونق حصّہ ہے۔ اس کا بازار تنگ اور لمبان میں دور تک چلا گیا ہے۔ اس میں ہر قسم کا تجارتی سامان۔ جوہریوں اور کتب فروشوں کی دُکانیں۔ اُمرا کے مکانات اور اطراف و جوانب میں بڑے بڑے مطابع موجود ہیں۔ ایک محلہ میں جس کا نام جھوائی ٹولہ ہے لکھنؤ کے قدیم اور نامی اطبّا کا خاندان رہتا ہے۔ اس وقت حکیم عبدالعزیز اور حکیم عبدالولی شہر کے نامور طبیب ہیں۔ ان صاحبوں کے زیر اہتمام یونانی طبابت کے قیام کی غرض سے ایک مدرسہ طبیہ بھی جاری ہے جس سے عموماً لوگ مستفید ہوتے ہیں +

ایک محلہ فرنگی محل کے نام سے مشہور ہے جو کسی زمانہ میں شاہان مغلیہ کی طرف سے فرنگیوں کا جائے قیام تھا۔ اب تک اسی وجہ سے اس کو فرنگی محل کہتے ہیں۔ یہاں کے علما جو ملا نظام الدین کی اولاد سے ہیں اپنے علمی فضل و کمال کے باعث ہندوستان بھر میں نہایت عزت اور عظمت کی نگاہ سے

دیکھے جاتے ہیں +

وکٹوریا پارک - چوک بازار کے باہر وکٹوریا پارک بالکل یورپ کے باغات کے نمونے پر ہے - زمین کا نشیب و فراز قدرتی میدانوں کے موافق دکھلایا گیا ہے - اور سبز گھاس کی زمردین چادر نے اس کی خوبصورتی کو اور بھی بڑھا دیا ہے۔ شہر کے لوگ صبح و شام تفریح کے واسطے اس پارک میں آتے ہیں - اسی جگہ ملکہ وکٹوریہ کا ایک آہنی بت بھی نصب ہے +

حسین آباد - وکٹوریا پارک سے ایک سیدھی سڑک حسین آباد کو جاتی ہے - یہ ایک چھوٹی سی بارونق آبادی ہے - اور اس میں محمد علی بادشاہ کا امام باڑہ ہے جو ۱۲۵۳ھ ۱۸۳۷ء میں تعمیر ہوا تھا - اس کی عمارت نہایت خوبصورت اور نفیس ہے - دروازہ میں داخل ہوتے ہی دائیں بائیں پیتل کی قد آدم مورتیں ایسی نصب ہیں کہ بادی النظر میں اصلی ہونے کا گمان گزرتا ہے - صحن کے دونو طرف دو خوشنما مقبرے بیچ میں نہر اور ادھر اُدھر سرسبز درخت لگے ہوئے ہیں - نہر کے خاتمے پر خوشنما امام باڑہ ایک چبوترے پر بنا ہوا ہے +

بیرون شہر ایک بہت بڑا تالاب ہے - اسی موقعہ پر ایک کوٹھی ہے جس میں شاہان اودھ کی رنگین اور تقریباً قد آدم تصویریں اور اوقاف کا دفتر ہے +

اس امام باڑہ کے متعلق سلاطین اودھ کی طرف سے اوقاف مقرر ہیں جن کی آمدنی چودہ ہزار روپیہ ماہوار بیان کی جاتی ہے - آمدنی اور مصارف کی نگرانی ایک کمیٹی کے متعلق ہے جس کے سکرٹری سید محمد جواد صاحب ہیں کمیٹی کی تجویز سے اوقاف کی آمدنی حسب ذیل مدات میں خرچ ہوتی ہے :-

(۱) امام باڑہ حسین آباد - امام باڑہ نواب آصف الدولہ - مقبرہ امجد علی شاہ کے ملازموں - محافظوں - مرثیہ خوانوں - مجالس عزا اور روشنی کے مصارف

اور نیز وکٹوریا پارک کے مصارف۔ (۲) ایک سو زائرین کربلا کا سالانہ خرچ بحساب سو روپیہ فی کس۔ (۳) اعلےٰ حکام کی بعض پارٹیوں اور جلسوں کا خرچ (۴) حسین آباد ہائی سکول اور شاہی شفاخانہ انگریزی و یونانی کے مصارف +

آصف الدولہ کا امام باڑہ حسین آباد سے تھوڑی دور جانے کے بعد جو ایک عالیشان عمارت نظر آتی ہے۔ وہ نواب آصف الدولہ کا امام باڑہ ہے دو بڑے عالیشان دروازوں اور صحنوں سے گزر کر اس امام باڑہ میں داخل ہوتے ہیں۔ آخری صحن میں سبزہ زمردین کا فرش ہروقت بچھا رہتا ہے اور یہیں سے اصل امام باڑہ کی عمارت شروع ہوتی ہے۔ اس کی کرسی اتنی اونچی ہے کہ متعدد سیڑھیاں چڑھنے کے بعد امام باڑہ میں داخل ہوتے ہیں۔ امام باڑہ کی عمارت بڑی عالیشان اور نہایت مستحکم ہے۔ دیواروں کی موٹائی سولہ فٹ اور لداؤ کی چھت ہے۔ تمام عمارت میں لکڑی کا کہیں نام تک نہیں۔ چھت پر چھوٹی چھوٹی محرابوں کی بھول بھلیاں ہے۔ یہ محرابیں آپس میں اس درجہ مشابہ ہیں کہ اُن کے اندر سے نکلتے ہوئے انسان مغالطے میں پڑجاتا ہے۔ وسعت کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ بڑے کمرے کا طول ۱۶۷ فٹ اور عرض ۵۲ فٹ ہے۔ تمام اودھ و ممالک مغربی و شمالی میں اتنا بڑا ہال کہیں نہیں۔ یورپ کے سیاح جنہوں نے یہ امام باڑہ دیکھا ہے۔ عمارتی خصوصیت کے لحاظ سے اس کو دُنیا کی خاص عمارتوں میں شمار کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ اس امام باڑہ کی عمارت ۱۱۹۵ھ ۱۷۸۰ء کی قحط سالی میں نواب آصف الدولہ بہادر کے حکم سے غربا اور مساکین کی امداد کے واسطے شروع ہوئی تھی۔ امام باڑہ اور اس کی متعلقہ عمارتوں پر جس قدر
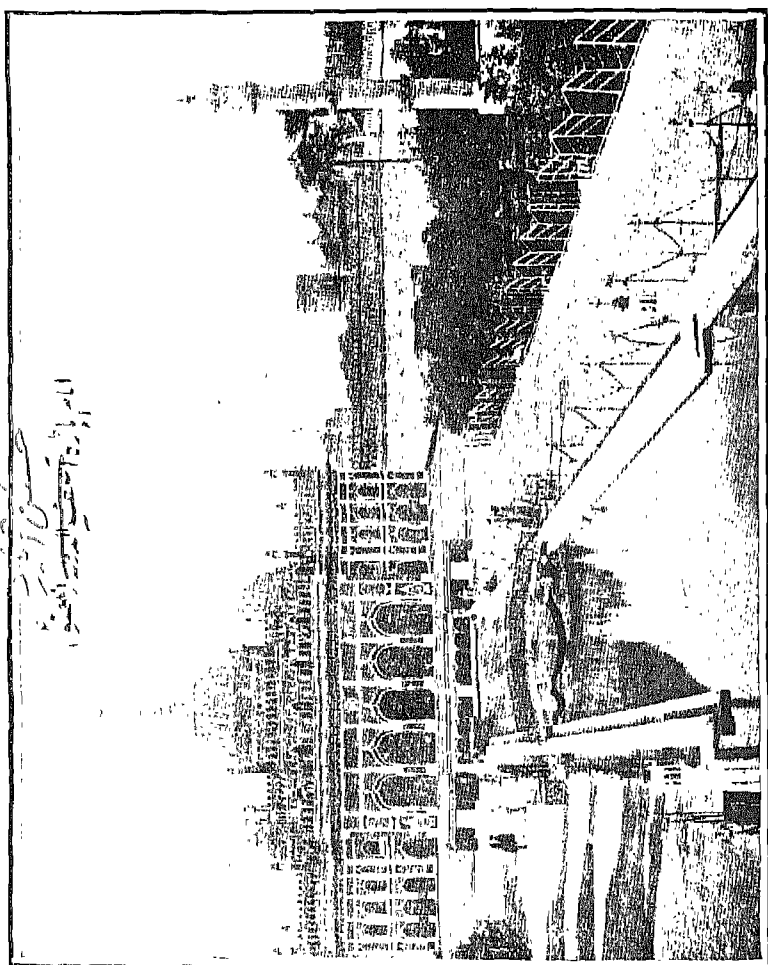
روپیہ خرچ ہؤا - اس کا تخمینہ ایک کروڑ اشرفی کیا گیا ہے +

وسط ہال میں نواب آصف الدولہ بہادر کی قبر ہے - اس کے گرد چاندی کا کٹہرا لگا ہے - حفّاظ صبح و شام قرآن کی تلاوت کرتے ہیں - قبر کے سرہانے ایک بیش قیمت تاج رکھا ہؤا ہے - امام باڑہ کی خدمت اور حفاظت کے واسطے متعدد خادم اور محافظ و حفّاظ ملازم ہیں - امام باڑہ کے جملہ مصارف حسین آباد کے اوقاف سے ادا ہوتے ہیں - حسب ہدایات مندرجہ بورڈ مسلمان جوتہ اُتار کر اور انگریز ٹوپی اُتار کر اندر جا سکتے ہیں +

شاہ مینا - امام باڑہ کے پس پُشت حضرت شاہ مینا کا مزار ہے - نوابی عہد میں اس کو محلہ میناگری کہتے تھے - اب اس کے چاروں طرف کھلا میدان ہے - ہر جمعہ کو زائرین یہاں آتے ہیں - شاہ مینا نویں صدی کے مشاہیر صوفیہ میں سے گزرے ہیں - آپ کا حال ضمیمہ میں درج ہے - منشی امیر احمد صاحب مینائی مصنف امیر اللغات جو زمانہ حال کے ایک مشہور شاعر گزرے ہیں - انہی بزرگوار کی مناسبت سے مینائی کہلاتے ہیں +

چھتر منزل - امام باڑہ سے تھوڑے فاصلے پر یہ شاہی زمانے کی ایک عمارت ہے - آجکل اس میں کلب گھر بنا ہؤا ہے جو انگریزوں کی تفریح گاہ کا کام دیتا ہے +

رزیڈنسی - چھتر منزل سے تھوڑی دور جانے کے بعد رزیڈنسی کا احاطہ آتا ہے جس کو بیلی گارڈ بھی کہتے ہیں - اس احاطے کی چپّہ چپّہ زمین غدر ۱۸۵۷ء کے حوادث کا دردناک مرقع ہے - شکستہ مکانات کی دیواروں پر باغیوں کے گولوں اور گولیوں کے نشانات اب تک باقی ہیں - پتھر کے کئی میناروں پر اُن انگریزی افسروں اور عہدہ داروں کی یادگار درج

ہے۔ جنہوں نے رزیڈنسی کی حفاظت میں باغیوں کا مقابلہ کیا تھا۔ احاطے
میں کئی سیدھی سڑکیں اور سبز گھاس کی عمدہ روشیں بنی ہوئی ہیں۔ چند مقامات
پر شاہی زمانے کی توپیں اور گولے بھی رکھے ہیں ÷

عجائب خانہ۔ یہاں سے مشرق کی جانب تھوڑے فاصلے پر عجائب خانہ
آتا ہے۔ اس کے نیچے کے درجے میں قدیم زمانے کے انسانوں اور حیوانوں
کے بڑے عجیب و غریب سنگین بُت اور دیگر اسی قسم کی چیزیں رکھی ہوئی
ہیں۔ جو مختلف مقامات سے بڑی تلاش کے بعد بہم پہنچائی گئی ہیں۔
اُوپر کے درجے میں ہندوستان کی دستکاریوں۔ جانوروں کے اجسام
اور ڈھانچے۔ ایک طرف مختلف صوبوں کے سپاہیوں۔ فقیروں اور پیشہ وروں
کی قدآدم تصویریں کھڑی ہیں۔ ان کا رنگ و روغن ایسی عمدگی سے کیا ہے
کہ اصلی شکلوں کے مشابہ معلوم ہوتی ہیں۔ ایک اور موقع پر انواع و اقسام
کے پھل اور نباتات مٹی کے بنے ہوئے رکھے ہیں جن پر اصلی ہونے کا دھوکا
ہوتا ہے۔ اس کے متصل ہی ایک عمارت میں کتب خانہ ہے جس میں
عمدہ عمدہ قلمی کتابیں اور نفیس تصویریں ہیں ÷

مقبرہ نواب صاحب۔ عجائب خانہ کے بعد نواب سعادت علی خاں
کا مقبرہ آتا ہے۔ عمارتی خوبیوں کے لحاظ سے گو اس میں کوئی دلچسپی نہ ہو
لیکن یہ ایک ایسے مدبر سلطنت کی دائمی آرامگاہ ہے جو شاہان اودھ میں
علمی اور عملی قابلیت کے لحاظ سے واجب الاحترام فرمانروا مانا گیا ہے ÷

حضرت گنج۔ یہ حصہ یوں تو شاہی آبادی کا ایک محلہ ہے مگر موجودہ
عمارتوں کی قطع وضع کے لحاظ سے بالکل نیا معلوم ہوتا ہے۔ سرکاری دفاتر
اور کچہریوں کے علاوہ یورپین تاجروں کی بڑی بڑی دکانیں۔ عمدہ عمدہ ہوٹل

منشی نولکشور کا مشہور مطبع و کارخانۂ کاغذ- اور انگریزوں کی خوبصورت کوٹھیاں
سب اس ہی میں ہیں - یہ حصہ صفائی اور خوشنمائی کے لحاظ سے لکھنؤ کی سب سے
عمدہ آبادی ہے ٭

شاہ نجف - حضرت گنج سے آگے بڑھ کر ایک عمارت شاہانِ اودھ کے
زمانے کی بلند ہے - جو امام باڑہ شاہ نجف کے نام سے مشہور ہے - عمارت
عمدہ اور وسیع ہے - مگر استحکام کے لحاظ سے آصف الدولہ کے امام باڑہ
سے اور خوشنمائی و دلفریبی میں حسین آباد کے امام باڑہ سے اُسے کوئی
مناسبت نہیں - قرآن خوانی مجالس عزا اور خدام کا انتظام پہلے دونو امام باڑوں
کی مانند ہے - یہاں کے مصارف حسین آباد کے وقف سے چلتے ہیں ٭

چھاؤنی - حضرت گنج سے شمال کی جانب صوبہ اودھ کی مشہور و معروف
چھاؤنی ہے جس میں دیسی و انگریزی فوجیں کافی تعداد سے ہیں ٭

قیصر باغ - چھاؤنی سے واپسی پر قیصر باغ آتا ہے - یہ باغ بڑا وسیع
اور بادشاہی زمانے میں نہایت ترقی پر تھا - اب بھی اس کی سڑکیں صاف
اور روشیں باقرینہ ہیں - وسط میں سفید بارہ دری اور فصیل کے ساتھ ساتھ
تین طرف عالیشان دو منزلہ عمارتیں بنی ہوئی ہیں - شمالی سمت میں کیننگ کالج
کی عمارت ہے - غدر کے بعد گورنمنٹ نے تمام عمارتیں تعلقہ داران اودھ
کو عطیہ کے طور پر دے دیں - نواب وائسرائے - لفٹنٹ گورنر وغیرہ تمام
بڑے بڑے حکام جو لکھنؤ میں آتے ہیں - اُن کے اعزازی جلسے اسی
جگہ ہوتے ہیں ٭

امین آباد - یہ حصہ قیصر باغ سے تھوڑے فاصلے پر نواب امین الدولہ بہادر
کا آباد کیا ہوا ہے - جو فرمانفرما ئے اودھ کے وزیر اعظم تھے - اس کی آبادی

لکھنؤ کا ایک بارونق حصہ ہے - ہر قسم کا تجارتی مال یہاں فروخت ہوتا ہے وسط میں ایک چوک آتا ہے جہاں سے چار سڑکیں نکلتی ہیں - دائیں ہاتھ کی سڑک پر نواب امین الدولہ بہادر کی حویلی ہے جو کسی زمانے میں بڑی شان و شوکت کی تھی ؞

باکمال لوگ - شاہی زمانہ میں سُنّی اور شیعہ دونو گروہوں کے علما کا بڑا بھاری مجمع لکھنؤ میں موجود تھا - جو تعلیم و تعلّم اور تصنیف و تالیف میں مشغول رہتا تھا - فرنگی محل ایک عرصہ تک علمائے تسنّن کے درس و تدریس کا نامور درسگاہ بنا رہا - مُلّا نظام الدین (المتوفی ۱۱۶۱ھ ۱۷۴۷ء) یہاں کے علما میں بڑے مشہور فاضل اور یگانۂ روزگار گزرے ہیں - عربی کا نصاب تعلیم جو اب تک ہندوستان میں جاری اور درس نظامیہ کے نام سے مشہور ہے - انہی کا تجویز کیا ہوا ہے - ان کی اولاد میں یکے بعد دیگرے بڑے بڑے نامور عالم ہوئے ہیں - تیرھویں صدی کے خاتمہ پر مولوی عبدالحی صاحب اس خاندان کے نامور رُکن تھے - ساری عمر درس و تدریس - فتوے نویسی اور تصنیف کتب میں صرف کی - فقہ - حدیث - تاریخ معقول اور فلسفہ کے متعلق تین سو کتابیں شائع کیں - ہندوستان کے ہر حصہ میں آپ کے نامور شاگرد موجود ہیں - آپ کے علم و فضل کا شہرہ سُنکر نواب سر سالار جنگ اول مدار المہام حیدرآباد نے ڈھائی سو روپیہ ماہوار آپ کا وظیفہ مقرر کیا تھا ۱۲۶۱ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۲۹۶ھ ۳۸ سال کی عمر میں انتقال کیا - اس وقت فرنگی محل میں مولوی عینُ القضاۃ - مولوی عبدالمجید اور مولوی عبدالباری مشہور علما ہیں ؞

علمائے اہل تشیع میں سے مولوی سید حامد حسین صاحب علم و فضل

کے لحاظ سے مجتہد العصر مانے جاتے تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی میں عربی کا ایک بہت بڑا کتب خانہ بہم پہنچایا جس کی نسبت مولانا عبداللہ عمادی صاحب اڈیٹر رسالہ "البیان" نے ذکر کیا۔ انقلاب سلطنت اودھ کے بعد مولوی صاحب کا جو اثاث البیت غارت وتاراج ہونے سے بچ رہا تھا۔ مولوی صاحب اُس کو بیچکر حدیدہ کے راستے سے مصر کو روانہ ہوئے۔ وہاں شافعی المذہب اختیار کرکے علوم اسلامی کا درس شروع کیا۔ اس سفر کی خاص غرض یہ تھی کہ قدیم عربی کتابیں فراہم کی جائیں جس میں اُن کو نہایت غیر معمولی کامیابی ہوئی۔ بہت سی بیش بہا اور نادر کتابیں جمع کرکے ہندوستان کو واپس آئے۔ عبقات الانوار کی کئی جلدیں جو آپ نے شاہ عبدالعزیز صاحب دہلوی کی کتاب تحفۂ اثنا عشریہ کی رد میں شائع کی ہیں۔ آپ کی کثرت معلومات کی ایک عمدہ شہادت ہے۔ اس وقت آپ کے خلف ارشد مولوی سید ناصر حسین صاحب ایک مشہور اور وسیع النظر عالم ہیں۔ ان کی سعی سے کتب خانہ میں اور ترقی ہوئی ہے۔ اس وقت یہ کتب خانہ نوادر کتب کے باعث ہندوستان کے ممتاز کتب خانوں میں شمار ہوتا ہے ٭

اُردو شعر وسخن کو بھی اعلےٰ درجے کی ترقی تھی۔ نواب آصف الدولہ کے عہد میں میر تقی۔ مرزا رفیع سودا اور سید انشا شعر وسخن کی قدردانی کا حال سُنکر دہلی سے یہاں چلے آئے۔ متاخرین میں سے خواجہ حیدر علی آتش اور شیخ امام بخش ناسخ غزل میں۔ میر انیس و مرزا دبیر مرثیہ گوئی میں کمال رکھتے تھے واجد علی شاہ آخری فرمانروائے اودھ کو خود شعر وسخن کا بہت شوق تھا۔ اور جان عالم تخلص کرتے تھے۔ اب اس گئے گزرے زمانے میں منشی امیر احمد صاحب امیر مینائی ایک بڑے ذی علم اور مسلم الثبوت شاعر تھے۔ باوجودیکہ

اُردو زبان کی زاد بوم دہلی ہے۔ مگر ان باکمال لوگوں کی قابلیت سے لکھنؤ
کی اُردو ٹکسالی ہو گئی ؛

باشندوں کی حالت۔ یہاں کے باشندے عموماً خوش پوش اور لسان ہیں۔ مگر علم و کمال سے عاری۔ شاہی خاندان کے منتسلین کیا اعلےٰ کیا ادنےٰ انگریزی تعلیم سے متنفر۔ محنت و مزدوری کے دشمن اور صرف اُن وثیقوں پر قانع ہیں جو نسلاً بعد نسلٍ کم ہوتے ہوتے دو دو چار چار روپے تک پہنچ گئے ہیں۔ باوجود افلاس کے ضروریات زمانہ سے ناواقف ہیں۔ اور اس وقت تک پتنگ بازی۔ بٹیر بازی۔ مرغ بازی جیسے مشغلے ان فاقہ مستوں کے دل بہلانے کا ذریعہ ہیں۔ طُرفہ یہ کہ مذہبی جوش حد سے زیادہ ہے۔ سال بسال محرم کے دنوں میں تعزیہ داری پر ہزاروں روپے خرچ کرتے ہیں۔ باہمی اتفاق کی بجائے سُنّی شیعہ کے جھگڑے ہمیشہ ہوتے رہتے ہیں جو ہر سال چند کلہ گوؤں کو جیل خانہ میں پہنچا دیتے ہیں ؛

یہ خصوصیات وہاں کے اصلی باشندوں سے تعلق رکھتی ہیں۔ بیرونجات سے جو لوگ یہاں آ کر آباد ہوئے ہیں۔ اُن میں وکلا۔ بیرسٹروں۔ ڈاکٹروں تاجروں غرضیکہ اہل علم و کمال کا ایک ایسا گروہ ہے جس نے اس وقت لکھنؤ کے نام و نمود کو قائم کر رکھا ہے۔ لکھنؤ میں درحقیقت یہی لوگ ہیں جو سوسائٹی کا بہترین نمونہ سمجھے جا سکتے ہیں ؛

صنعت و حرفت۔ لکھنؤ کے باشندے چکن و کامدانی بنانے میں مشہور ہیں۔ یہاں کی چکن اپنی نفاست کے باعث تمام بڑے بڑے شہروں میں جاتی ہے۔ عطر کا کام بھی یہاں اچھا ہوتا ہے۔ یہاں کا خمیرا تمباکو ایک پانچ روپے سیر بکتا ہے۔ انسانوں اور حیوانوں۔ مختلف قسم کی نباتات اور

میووں کے نمونے مٹی سے ایسے عمدہ بنتے ہیں کہ نقل کو اصل کر دکھاتے ہیں۔ یہ اس قدر خوش وضع ہوتے ہیں کہ دور دراز کے شہروں میں تحفہ کے طور پر بھیجے جاتے ہیں ؛

تعلیم۔ لکھنؤ میں تعلیم خوب ترقی پر ہے۔ گورنمنٹ۔ مشن اور حسین آباد تین ہائی سکول ہیں۔ حسین آباد مسلمانوں کا قومی مدرسہ ہے جو غدر کے بعد کی یادگار ہے۔ ابتدا میں عربی مدرسہ کی برانچ تھا۔ مگر اب اس نے بڑی ترقی کی ہے اور عربی مدرسہ اس کی برانچ ہوگیا ہے۔ پہلے اس کے مصارف حسین آباد کے وقف سے چلتے تھے۔ مگر اب سرکار نے جدید انتظام کے مطابق اس کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے۔ اعلیٰ تعلیم کے واسطے کیننگ کالج۔ ریڈ کرسچن کالج اور لا مارٹینیو کالج ہیں۔ اس آخری کالج میں صرف یورپین اور یوریشین طالب علم پڑھتے ہیں یہ کالج مارٹین ایک فرانسیس تاجر کا قائم کیا ہوا ہے جو لکھنؤ میں جواہرات کی تجارت کیا کرتا تھا۔ اس نے نواب آصف الدولہ کے عہد میں ملکی انتظام پر اچھا قابو حاصل کیا تھا۔ اور نواب صاحب کے ساتھ اُن کے بیہودہ مشاغل (مرغ بازی وغیرہ) میں شریک رہتا تھا۔ ایک میڈیکل کالج پرنس آف ویلز کی تشریف آوری کی یادگار میں تعلقہ داران اودھ نے بنانا تجویز کیا ہے جسکی نسبت خیال ہے کہ ہندوستان کے بڑے میڈیکل کالجوں کا ہم پلّہ ہوگا۔ باوجودیکہ تعلیم کا سامان کافی ہے مگر مسلمانوں کی حالت پھر بھی بہت افسوسناک ہے ؛

مشرقی علوم کے درس تدریس کے لحاظ سے ندوۃ العلما کا دارالعلوم جو اس وقت گولہ گنج میں قائم ہوا ہے۔ لائق ذکر ہے۔ ندوۃ العلما کے ابتدائی مقاصد حسب ذیل تھے :-

(۱) مسلمانوں میں باہمی اتحاد قائم کیا جائے ۔
(۲) اشاعت اسلام کا بندوبست کیا جائے ۔
(۳) علوم وفنون عربیہ کو از سر نو تازگی دی جائے ۔

مولوی سید محمد علی صاحب سکرٹری مولوی مسیح الزمان خاں نائب سکرٹری۔ خان بہادر اطہر علی وکیل ہائی کورٹ اس کے کارکن اور اودھ۔ ممالک مغربی و پنجاب کے علماء امراء اس کے معاون بنے۔ ان لوگوں کی کوششوں سے کئی سال تک کانپور سے پنجاب کلکتہ اور مدراس تک اس کے جلسے ہوتے رہے ان جلسوں میں ہزاروں آدمی شامل ہوتے تھے۔ اس طرح سے اس کے اغراض و مقاصد کی اشاعت تمام ہندوستان میں بخوبی ہو گئی۔ مگر بعد میں مولوی محمد علی صاحب نے بعض وجوہات کی بنا پر سکرٹری کا کام چھوڑ دیا۔ اس اثنا میں شمس العلما مولوی شبلی نعمانی کو جب حیدر آباد دکن کے کاروبار سے علحدگی اختیار کرنی پڑی تو اُنہوں نے دو تین سال سے سکرٹری کا کام اپنے ذمے لیا۔ اور اب تک لے رکھا ہے۔ شبلی صاحب کو سر سید احمد خاں مرحوم کے ماتحت علیگڈھ کالج میں رہنے اور مصر و شام و استنبول کا سفر کرنے سے تعلیمی معاملات میں اچھا تجربہ اور ضروریات زمانہ سے بخوبی واقفیت ہو چکی ہے

ندوۃ العلما کا اہم فرض جو مسلمانوں میں باہمی اتحاد پیدا کرنے اور اشاعت اسلام کی خدمت بجالانے کا تھا۔ بالفعل نظر انداز کر دیا گیا۔ شبلی صاحب کا خیال ہے کہ علما میں روشن خیالی پیدا کئے بغیر یہ مقاصد پورے نہیں ہو سکتے۔ اب صرف علوم وفنون کی تدریس کا کام جاری ہے۔ سنہ ۱۹۰۸ع دار العلوم کے واسطے بہت مبارک سال ہے کہ نابالغ نواب صاحب بہاولپور کی جدّہ بزرگوار نے پچاس ہزار روپیے کا یک مشت عطیہ اس کی عمارت کے لئے

عطا کیا۔ اور گورنمنٹ سے بھی ایک ٹکڑا زمین کا اسی مطلب کے واسطے ملا۔ اخیر نومبر پر نواب لفٹنٹ گورنر نے بنیادی پتھر اپنے ہاتھ سے رکھا۔ اور ساتھ ہی پانسو روپے ماہوار کی امداد منظور کی۔ اگر انتظام اچھا رہا اور شبلی صاحب استقلال سے جم کر بیٹھے رہے۔ تو امید ہے کہ جو کمی دیوبند۔ رام پور اور دیگر اسلامی مدارس میں محسوس ہو رہی ہے۔ اُس کے پورا ہونے سے یہاں کے تعلیم یافتہ ہندوستان میں بہت عزّت کی نگاہ سے دیکھے جائینگے ۔

پریس ۔ ورنیکلر پریس کو جو ترقی لکھنؤ میں ہوئی۔ اس کی نظیر کلکتہ کے سوا دوسری جگہ نہ ملیگی۔ غدر سے بیشتر اور کچھ زمانہ مابعد مطبع مصطفائی ۔ مطبع محمدی۔ مطبع رضوی۔ مطبع علوی۔ مطبع کلاں کوٹھی نے خوشخط اور صحیح کتابیں چھاپنے میں خاص امتیاز حاصل کیا تھا۔ اُردو۔ فارسی۔ عربی نظم و نثر۔ صرف و نحو۔ منطق۔ فلسفہ۔ ادب۔ لُغت۔ طب اور فقہ میں نہایت عمدہ عمدہ کتابیں چھاپ کر شائقین کو ممنون کیا۔ گزشتہ صدی کے آخری حصّہ میں منشی نولکشور صاحب نے اُردو۔ فارسی اور عربی کتابیں جس عمدگی اور خوبی سے چھاپنی شروع کیں۔ اُس سے اُوپر کے مطابع ماند پڑ گئے۔ بڑا کام یہ کیا۔ کہ تاریخ۔ فقہ اور طب کی بڑی بڑی ضخیم کتابیں اصل عربی اور فارسی زبانوں میں اور نیز اُن کے ترجمے اُردو میں ارزاں قیمت پر شائع کرنے شروع کئے۔ مگر اس ارزانی کے زمانے میں خوشخطی کا لحاظ اور صحت کا انتظام کم ہو گیا بہرکیف ان نادرالوجود کتابوں کے چھاپنے سے علمی دنیا پر منشی صاحب کا بڑا بھاری احسان ہے ۔

دو تین اُردو اخبار بھی لکھنؤ سے شائع ہوتے ہیں۔ اودھ اخبار روزانہ ہندوستانی ہفتہ میں دو دفعہ اور اودھ پنچ ہفتہ وار ہے۔ اودھ پنچ کا لٹریچر بہت مستند اور طرز ادا ظریفانہ ہے۔ ہندوستانی

کو پولیٹکل مضامین لکھنے میں خاص شہرت ہے۔ ڈیلی ٹیلی گراف ایک روزانہ انگریزی اخبار بھی مسلمانوں کے زیر اہتمام جاری ہے۔ عربی کا ایک ماہانہ رسالہ البیان مولوی عبداللہ عمادی صاحب کی اڈیٹری سے شائع ہوتا ہے۔ عمادی صاحب جونپور کے رہنے والے ہیں۔ علوم مشرقی خصوصاً ادب اور تاریخ میں ان کو اچھی مہارت ہے۔ ایک رسالہ الندوہ شبلی نعمانی صاحب کے زیر اہتمام نکلتا ہے اور اس میں اسلامی علوم و فنون کا تذکرہ ہوتا ہے۔

لکھنؤ کئی ریلوں کا جنکشن ہے۔ بڑے بڑے شہروں کی مسافت حسب ذیل ہے۔

نام شہر	مسافت	کرایہ درجہ سوم	کرایہ درجہ دوم
کانپور	۴۵ میل	۹ ر ۶ پائی	۱ روپیہ ۶ ر ۶ پائی
آگرہ	۲۰۴ میل	۲ روپے ۸ ر ۳ پائی	۸ " ۱۳ ر ۹ "
دہلی براہ آگرہ	۳۲۶ میل	۴ " ۲ ۳ "	۱۲ " ۱۳/۹ "
دہلی براہ مرادآباد	۳۰۳ میل	۴ " ۲ ر ۶ "	۹ روپے ۱۰ ر ۶ پائی
کلکتہ	۶۱۶ میل	۹ " ۷ ر	۲۴ روپے
بنارس براہ پرتاب گڑھ	۱۰۷ میل	۲ "	۴ روپے ۱۳ ر ۶ پائی
الہ آباد براہ پرتاب گڑھ	۱۲۴ میل	۱ روپیہ ۴ ر	۴ روپے ۸

ردولی

لکھنؤ سے ۵۶ میل طے کرنے کے بعد ہم ردولی پہنچا۔ یہ ایک چھوٹا سا قصبہ ریلوے لائن سے ایک میل کے فاصلے پر ہے۔ عمارتیں علی العموم پختہ اور دیسی کپڑے کی تجارت خوب ہوتی ہے۔ خاندانی لوگوں میں مشرقی علوم کا چرچا اب تک باقی ہے۔ مولوی محمد حلیم انصاری جنہوں نے عربی زبان کے

ترجمہ میں اچھی ناموری حاصل کی ہے۔ یہیں کے رہنے والے ہیں +
اس قصبہ کو خاص شہرت شاہ احمد عبدالحق صاحب کے مزار کے باعث ہے جو چشتیا ے صابریہ میں بہت باکمال بزرگ گزرے ہیں۔آپ کا عرس سال بسال بڑی دھوم دھام سے ہوتا ہے۔ ہزاروں معتقدین دُور دراز مسافت طے کرکے اس میں شامل ہوتے ہیں۔آپ کی نیاز کا حلوا مشہور ہے جس میں مَیدہ۔گھی اور میٹھا ہم وزن ہوتا ہے اور صرف ان لوگوں میں تقسیم کیا جاتا ہے جو حقہ کشی سے محترز ہوں۔آپ کے حالات ضمیمہ میں درج ہیں +

فیض آباد

ردولی اور فیض آباد میں ۲۴ میل کا فاصلہ ہے۔ یہ شہر نواب شجاع الدولہ صوبیدار اودھ کے زمانہ میں مستقر حکومت اور بہت بارونق تھا۔مگران کے فرزند نواب آصف الدولہ نے جب دارالحکومت لکھنؤ کو منتقل کیا تو اس کی رونق میں روز بروز کمی ہونے لگی۔اس وقت اس کی آبادی پچھتر ہزار ہے۔ بازار پختہ سڑکیں سیدھی۔اور تجارت خوب ترقی پر ہے۔شہر میں غلہ وغیرہ کی کئی منڈیاں ہیں +

نوابی زمانہ کی عمارتوں میں سے نواب شجاع الدولہ اور ان کی بیگم (بہو بیگم) کے مقبرے قابل دید ہیں۔یہ دونو مقبرے ایک دوسرے سے کچھ فاصلے پر ہیں اور عمارات کی عمدگی و باغات کی آراستگی کے لحاظ سے اودھ میں خصوصیت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔یہاں کا امام باڑہ بھی مشہور ہے +

فیض آباد سے دو میل پر انگریزی چھاؤنی اچھی ترقی پر ہے +

اجودھیا

یہ شہر فیض آباد سے چھ میل کے فاصلے پر دریائے گھاگرہ کے کنارے ہندوؤں کے سات* مقدس شہروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ راجہ رام چندر جو ہندوؤں کے اوتار (مظہر حق) مانے جاتے ہیں یہیں پیدا ہوئے تھے۔ راجہ رام چندر کے زمانہ میں یہ شہر بہت بڑا اور شاندار تھا۔ بدھ مذہب والوں نے اپنے زمانہ عروج میں اس شہر کی دینی اور دنیاوی حکومت پر قبضہ کیا۔ ۵۷ء میں راجہ بکرماجیت نے براہمنی مذہب میں از سر نو جان ڈال کر اجودھیا کو پھر آباد کیا اور اُن مختلف مندروں اور مقاموں کا پتہ چلایا جن کو راجہ رام چندر کے واقعات زندگی کا تعلق ہونے کی وجہ سے خاص تقدیس حاصل ہو چکی تھی۔

سلاطین مغلیہ کے عہد میں یہ شہر صوبہ** اودھ کا دار الحکومت تھا۔ اٹھارھویں صدی مسیحی میں اودھ کے پہلے خود مختار حاکم نواب شجاع الدولہ نے بھی اسی کو صدر مقام قرار دیا۔ مگر جب دار الحکومت فیض آباد کو منتقل ہو گیا تو اس کی تمام اہمیت جاتی رہی۔ اس وقت یہ شہر ضلع فیض آباد کا ایک حصہ ہے۔ اس کی آبادی ۱۹۰۱ء کی مردم شماری کے مطابق ۱۲ ہزار ۵ سو ۸۴ ہے۔ باشندوں کی اصلی زبان تو ہندی ہے مگر کچھ کچھ اُردو بھی سمجھ لیتے ہیں۔

شہر کی عمارتیں پختہ اور مکانات متوسط درجہ کے ہیں۔ دریا کے کنارے سے شمالاً جنوباً ایک وسیع اور پُر فضا سڑک دور تک چلی گئی ہے۔ اس کے دو نو طرف غیر مسلسل دُکانیں معمولی عمارت کی بنی ہوئی ہیں جن میں

* ان سات شہروں کی تفصیل صفحہ ۲۰۹ میں درج ہو چکی ہے۔

** مغلوں کے زمانہ میں صوبہ اودھ کے متعلق یہ مشہور شہر تھے۔ اجودھیا۔ بھڑائچ۔ نکھار۔ لکھنؤ۔ بلگرام ۔۔ مؤلف

فروختنی اشیا معمولی قسم کی رکھی ہیں - وسط میں ایک چوک بہت بارونق ہے اور وہیں مہاراجہ اجودھیا کے عالیشان مکانات ہیں - اس بازار کے خاتمہ سے پُرانی آبادی شروع ہوجاتی ہے - کچھ ویرانہ نما آبادی سے گزرنے کے بعد مندروں اور پُرانی عمارتوں کے آثار دکھائی دیتے ہیں - عمارات جدیدہ میں سے درشن سنگھ بابان سنگھ کا مندر اور ہنومان کی گڑھی قابل دید ہیں - عمارات قدیمہ میں سے دو جگہ خاص کر مشہور ہیں :-

(۱) منی پربت - یہ ایک ٹیلہ راجا اشوک کی طرف منسوب ہے - اسی موقع پر گوتم بُدھ نے لوگوں کو مذہبی تعلیم و تلقین شروع کی تھی +

(۲) رام کوٹ - جہاں راجہ بکرماجیت کا قلعہ اور محل تھا - یہ قلعہ اب راجہ رام چندر کے مندر کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے - کیونکہ راجا رام چندر اسی جگہ پیدا ہوئے تھے +

مسلمانوں کی عمارتوں میں سے شہنشاہ بابر کی مسجد اس موقع پر ہے - جو راجا رام چندر صاحب کی رانی سیتا کے رسوئی خانہ (باورچیخانہ) کے نام سے مشہور ہے - بیرونی صحن کے دائیں بائیں دو چھوٹی چھوٹی عمارتیں رسوئی خانہ کی یادگار ہیں جہاں برہمن زائرین کو پوجا پاٹ کراتے ہیں - مسجد کا راستہ ان دونو کے بیچ سے ہو کر گزرتا ہے - یہ مسجد بہت مستحکم بنی ہوئی ہے اور اس کے ساتھ کچھ جائداد بھی وقف ہے جس سے امام و مؤذن کی تنخواہیں اور دیگر مصارف ادا ہوتے ہیں - شہنشاہ اورنگ زیب نے جو مسجد دریا کے کنارے تعمیر کرائی تھی اُس کو تغیرات زمانہ نے فرسودہ کر دیا ہے +

ہندو زائرین یوں تو اکثر اوقات اجودھیا کی زیارت کو آتے رہتے ہیں - مگر مارچ یا اپریل میں رام نومی کے میلہ پر اُن کا بڑا ہجوم ہوتا ہے - سرکاری تخمینہ

کے موافق زائرین کی تعداد لاکھوں تک پہنچ جاتی ہے +

جونپور

فیض آباد اور جونپور میں ۴۸ میل کا فاصلہ ہے۔ دریائے گومتی شہر کے درمیان سے گزرتا ہے کسی زمانے میں ہندؤں اور بدھ مذہب والوں کے بڑے بڑے مندر اس دریا کے کنارے آباد تھے جن کے کچھ حصے مسلمان بادشاہوں کے حملوں تک بھی موجود تھے۔ فیروز شاہ تغلق نے اس پرانی آبادی کو از سر نو ترقی دیکر سلطان محمد تغلق عرف جونا خاں کے نام پر جونا پور اس کا نام رکھا تھا جو رفتہ رفتہ جونپور ہوگیا۔ موجودہ شہرت کا آغاز سلطان ابراہیم شاہ شرقی کے عہد ۸۰۴ھ ۱۴۰۱ء سے ہے جب اُس نے جونپور کو سلطنت کا پایہ تخت قرار دیا۔ اُس زمانہ میں علما و فضلا اور باکمال اس کثرت سے یہاں جمع ہوگئے کہ لوگ اس کو دوسری دہلی کہا کرتے تھے۔ شہنشاہ اکبر کے عہد میں جب دارالحکومت الہ آباد تبدیل ہوا تو اس کی عظمت و شوکت کم ہونی شروع ہوگئی۔ اب یہ ایک معمولی حیثیت کا شہر اور کلکٹر کا صدر مقام ہے۔ سنہ ۱۹۰۱ء کی مردم شماری کے مطابق اس کی آبادی ۴۲ ہزار ۷ سو ۱ ہے +

شہر کا وہ حصہ جو دریائے گومتی کے پل کے دونو طرف آباد ہے۔ بہت بارونق۔ اس کی عمارتیں عمدہ اور بازار وسیع ہیں۔ پل پتھر کا بنا ہوا اور عظمت و استحکام کے لحاظ سے بہت مشہور ہے۔ دونو کناروں پر تھوڑا تھوڑا فاصلہ چھوڑ کر دکانیں ہیں۔ نواب منعم خاں خانخانان نے ۹۷۵ھ ۱۵۶۷ء میں تیس لاکھ روپے کے صرف سے اِسے تعمیر کرایا تھا۔ مادۂ تاریخ الصراط المستقیم ہے۔ ایک شاعر نے اس کو نظم میں یوں منسلک کیا ہے ؎
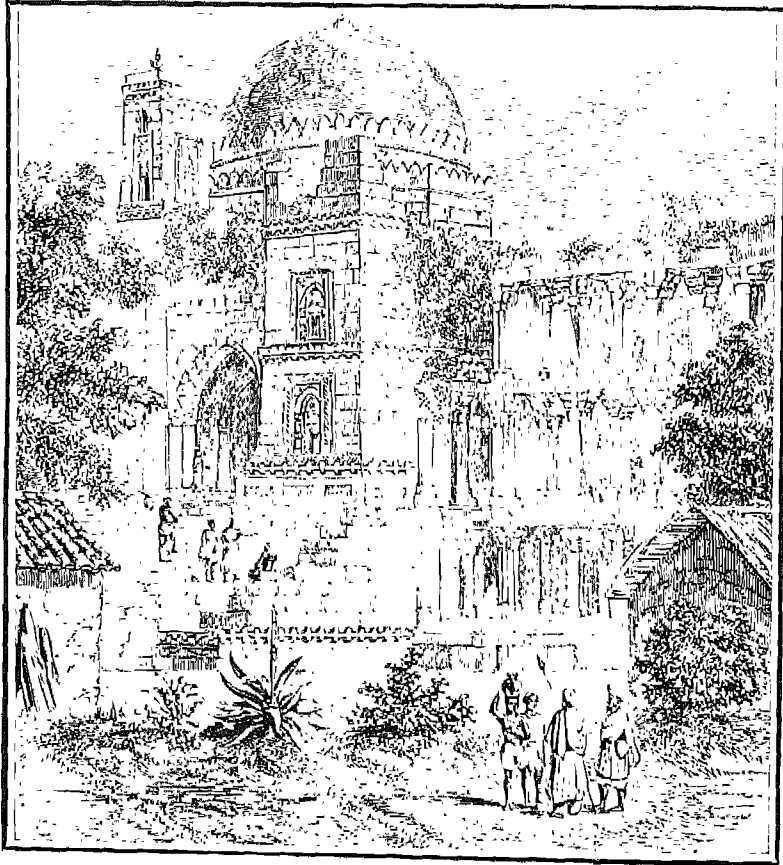
دروازہ جامع مسجد — جونپور

خان خانان خان منعم اقتدار بستہ ایں پُل را بتوفیق کریم
نام او منعم ازاں آمد کہ ہست بر خلائق ہم کریم و ہم رحیم
رہ بتاریخش بری گر افگنی لفظ بد را از صراط المستقیم

باوجودیکہ اس پُل کو تعمیر ہوئے ساڑھے تین سو برس کا عرصہ گزر چکا ہے مگر اب تک کہیں جنبش کے آثار نمودار نہیں ہوئے۔ یہ پُل ہندوستان کے قدیم فن تعمیر کی ایک بے نظیر مثال ہے۔ اس کے پاس اکثر عمارتیں تھیں جن میں سے ایک عالیشان حمّام دریا کے کنارے پر اب تک موجود ہے۔ یہ بارہ مہینے گرم ہوتا تھا اور ہر خاص و عام امیر و غریب بلا کسی روک ٹوک کے اس میں غسل کر سکتا تھا۔ مگر اوقاف کے ضبط ہونے سے اب بالکل بند ہے ۔

شہر میں مسجدیں بکثرت اور بعض حسن صنعت کے لحاظ سے عجوبۂ روزگار ہیں۔ سب سے بڑی مسجد سلاطین شرقی کی یادگار ہے۔ جس کو "مسجد جامع الشرق" کہتے ہیں اور یہی مادۂ تاریخ ہے جس سے ۸۵۲ھ ۱۴۴۸ء نکلتا ہے۔ یہ بڑی مستحکم، وسیع اور عالیشان ہے۔ اس میں حفظ قرآن کا ایک مدرسہ ہے۔ اطراف و جوانب کے ایک سو طالب علم اس میں پڑھتے ہیں اوّل مدرّس حافظ محمد صدیق صاحب ہیں جن کے والد پنجاب سے آکر یہاں مقیم ہوئے تھے ۔

مسجد کے دائیں جانب سلاطین شرقی کا قبرستان بڑی عبرت کا مقام ہے۔ اس میں شاہی خاندان کی قبریں ہیں جن پر فارسی و انگریزی میں اُن کے نام تحریر ہیں۔ لارڈ کرزن کے زمانے میں ان کی مرمت خاص طور پر ہوئی تھی ۔

دوسری عظیم الشان مسجد اٹالہ ہے۔ یہ مسجد بہت وسیع اور عمارتی خوبیوں کے لحاظ سے مشہور ہے۔ اس میں مذہبی علوم کا ایک مدرسہ حافظ عابد حسین صاحب وکیل اور رئیس شہر کے خرچ سے چلتا ہے۔ عربی مدرس مولوی اصغر حسین صاحب دیوبند کے تعلیم یافتہ ہیں ÷

ایک ایسی ہی عظمت و شان کی مسجد لعل دروازہ میں بھی ہے۔ اس مسجد کا اصلی نام "نماز گاہ" ہے اور اس میں بھی طلبہ پڑھتے ہیں لعل دروازہ اصل میں سلاطین شرقی کے محل سرا کا نام تھا۔ اور اسی نام سے یہ محلہ مشہور ہے ÷

شاہی عمارتوں میں سے قلعہ قابل دید ہے۔ اس کے نشانات بہت اچھے نمودار ہیں۔ صدر دروازہ بدستور قائم ہے۔ مینا کاری کا جو عجیب و غریب کام اس پر کیا ہے۔ وہ اب بھی تازہ نظر آتا ہے۔ دیوان عبدالرشید کی خانقاہ۔ مضافات عیدگاہ کے روضے۔ خاص حوض۔ چین قلیچ خاں کی بارہ دری۔ یہ سب قابل دید مقامات ہیں ÷

جونپور کوئی تجارتی شہر نہیں۔ خوشبودار تیل اور پینے کا تمباکو یہاں اچھا بنتا اور دور دور تک جاتا ہے ÷

انگریزی تعلیم کے واسطے دو ہائی سکول ہیں۔ مسلمانوں کا زیادہ میلان مشرقی علوم کی طرف ہے۔ عربی کے متعدد مدارس موجود ہیں۔ سب سے بڑی درسگاہ مدرسہ حنفیہ ہے۔ اُس سے دوسرے درجہ پر اٹالہ مسجد کا مدرسہ۔ اور خانقاہ رشیدیہ کا عربی مدرسہ۔ پھر حفظ قرآن کا مدرسہ۔ ان میں طالب علموں کی خوراک کا پورا انتظام ہے۔ مگر تعلیم میں کافی دلچسپی نہیں۔ لوگ ضروریات زمانہ سے اکثر ناواقف اور جدید تمدن کا اثر ان پر بہت

کم پڑا ہے ٭

ایک زمانہ میں ملک العلما قاضی شہاب الدین دولت آبادی کا دار الحکمۃ (کالج) اور استاد الملک کا مدرسہ فلسفہ کی تعلیم کے لئے تمام ہندوستان میں خصوصیت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ قاضی صاحب غزنی کے رہنے والے تھے۔ دولت آباد (دیوگڑھ) میں نشو و نما پائی اور سلطان ابراہیم شرقی کے زمانہ میں جونپور آئے۔ اخیر اس جگہ ۸۴۹ھ (۱۴۴۵ء) میں فوت ہوئے۔ مگر اب اس دار الحکمۃ اور مدرسہ کا کہیں نشان تک نہیں۔ ملا محمود جونپوری جو شمس بازغہ کے مصنف ہیں وہ بھی اسی سرزمین کے جوہر قابل ہیں۔ ان کا انتقال ۱۰۶۲ھ (۱۶۵۱ء) میں ہوا ہے۔ اخیر زمانہ میں فرنگی محل (لکھنؤ) کے مشاہیر علما مولانا عبد الحلیم صاحب اور مفتی محمد یوسف صاحب یہاں درس دیتے تھے۔ اب درس تدریس کی حالت بالکل ناقص اور قابل اعتراض ہے۔ مدرسین میں نہ کوئی ذی استعداد ہے اور نہ طلبہ فارغ التحصیل ہوتے ہیں ٭

خاتمہ پر منشی حسیب الدین قابل ذکر شخص ہیں۔ انہوں نے کیمیاوی علوم میں اچھی لیاقت پیدا کی ہے۔ علم کیمیا کے متعلق ان کی کتابیں خوب بکتی ہیں۔ بعض لوگ ان کتابوں کو پڑھکر سونا چاندی بنانے کی ترکیب سیکھنے کے واسطے ان کے پاس آمد و رفت رکھتے ہیں ٭

جونپور سے تین میل کے فاصلے پر ایک موضع ظفرآباد ہے کسی زمانے میں یہ بڑا شہر تھا۔ اب بھی سلاطین اسلام کی عمدہ عمدہ عمارتیں اور بزرگان دین کی یادگاریں بکثرت اس جگہ موجود ہیں۔ کاغذ سازی کے لئے یہ شہر مشہور تھا۔ مگر اب انگریزی کاغذ کے رواج پانے سے یہاں کے کارخانے ماند پڑ گئے ٭

بنارس (کاشی)

جونپورا اور بنارس میں ۳۵ میل کا فاصلہ ہے۔ یہ شہر دریائے گنگا کے کنارے ہے اور منجملہ اُن سات شہروں کے ہے جو ہندوؤں کے نزدیک مقدس مانے گئے ہیں۔ ہندوستان میں غالباً اس سے زیادہ قدیم شہر اور کوئی نہ ہوگا۔ ابتدا سے آجتک ہر زمانہ میں ہندوؤں کے دلوں میں اس کے تقدس کا خیال رہا۔ اور اب تک ہے۔ کم سے کم ہر ایک ہندو کو اس بات کی آرزو رہتی ہے کہ مرنے سے پہلے ایک دفعہ بنارس میں جائے اور وہاں گنگا کے متبرک پانی میں غسل کرکے گناہوں سے نجات حاصل کرے۔ ہندوؤں کے نزدیک بنارس کی بزرگی اس قدر زیادہ ہے کہ وہ اس کو بہشت کا دروازہ تصور کرتے ہیں۔ اُن کا عقیدہ ہے کہ جو شخص وہاں مرے۔ اس کی نجات میں کچھ کلام نہیں۔ ہندوؤں کے علاوہ بدھ مذہب کے لوگ بھی اس کو ایسا ہی مقدس سمجھتے ہیں۔ آج سے ڈھائی ہزار سال پیشتر گوتم بدھ نے اپنا سب سے پہلا وعظ اس جگہ کیا تھا۔ اور اسی شہر کو اپنے مذہب کا مرکز قرار دیکر لنکا۔ جاپان۔ چین۔ برھما۔ تبّت اور نیپال میں واعظ بھیجے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُس زمانہ میں دُنیا کی نصف آبادی اس کے اصولوں کی معتقد ہوگئی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اب سے ڈھائی ہزار سال قبل بھی بنارس مذہبی خیالات کا بڑا مرکز تھا۔ ہرچند گوتم بدھ نے اپنے زمانہ میں بُت پرستی کی بیخکنی کی مگر اس وقت بنارس میں جدھر دیکھو اس کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا۔ اسلامی تاریخ میں سب سے پہلے بنارس کا ذکر چھٹی صدی ہجری میں ملتا ہے جبکہ سلطان محمد غوری نے ۵۹۰ھ (۱۱۹۲ء) میں اس پر حملہ کیا

٭ ان سات شہروں کی تفصیل صفحہ ۱۰۶ میں لکھی جاچکی ہے۔

اس وقت یہ شہر صاحب کلکٹر اور صاحب کمشنر کا صدر مقام ہے۔ سنہ ۱۹۰۱ء کی مردم شماری کے مطابق اس کی آبادی دو لاکھ سے کچھ زیادہ ہے۔ اس حیثیت سے کل ہندوستان میں اس کا چھٹا نمبر اور ہندوؤں کا مذہبی مقدس مقام ہونے کے لحاظ سے اوّل درجہ ہے۔ اکثر ہندو اور مسلمان اردو زبان سمجھتے اور اس میں بات چیت کرتے ہیں۔ کاشی سٹیشن سے ایک بڑی وسیع سڑک شہر کو جاتی ہے بازار بارونق۔ مکانات عالیشان۔ عمارتیں خوش قطع اور اکثر پانچ منزل سے زیادہ ہیں۔ کوتوالی کے چوک میں شام کو بڑی چہل پہل رہتی ہے اور ہر قسم کی چیزیں یہاں فروخت ہوتی ہیں۔ البتہ گلیاں نہایت تنگ اور متعفّن ہیں۔ اکثر کوچے و بازار ایسے ہیں کہ وہاں دھوپ سے بچنے کے لئے چھتری لگانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ اس شہر کے مختلف حصّوں میں ہر قوم و مذہب کے لوگ جدا جدا آباد ہیں۔ مگر وسط شہر میں مسلمانوں کی آبادی بہت کم ہے ؛

چونکہ ہندو لوگ اس جگہ مرنے کو باعث نجات سمجھتے ہیں۔ اس واسطے بڑے بڑے ساہوکار۔ راجا۔ بابو اور فقرا اپنی آخری زندگی بسر کرنے کے واسطے گھر بار چھوڑ کر یہاں سکونت اختیار کر لیتے ہیں اور عام جاتریوں کی آمد و رفت بارہ مہینے جاری رہتی ہے۔ اس واسطے یہ شہر ہمیشہ بارونق رہتا ہے اور یہاں کے باشندے اکثر دولتمند ہیں ؛

یہاں چار چیزیں علی العموم مسافروں کے واسطے خطرناک سمجھی گئی ہیں۔ عورتوں کا حُسن و جمال۔ گلی کوچوں میں سانڈھوں کا گشت لگانا۔ سیڑھیوں کا اترنا اور چڑھنا۔ سنیاسی فقیروں کا عام و خاص کو اپنی طرف گرویدہ کرنا۔ ان چاروں کی نسبت یہاں یہ مثل مشہور ہے۔

"رانڈ۔ سانڈ۔ سیڑھی۔ سنیاسی ان سے بچے سو سیوے کاسی"

ہندوؤں کی پرستشگاہیں خصوصاً مہادیو کے شوالے یہاں بکثرت ہیں۔

شہر کے اندر باہر جدھر دیکھو ہزاروں مندر دکھائی دیتے ہیں۔ مندروں کی اس کثرت کے باعث انگریز اس کو سٹی آف ٹمپلز (مندروں کا شہر) کہتے ہیں۔ وسط شہر میں سب سے بڑا مشہور مندر وشیشر جی کا ہے جس کو یہ لوگ کاشی وشوناتھ کہتے ہیں یعنی کل دنیا کا مالک۔ اس کا گنبد طلائی ہے۔ پہلے جس مندر میں وشیشر جی کا بُت تھا وہ یہاں سے دس بارہ گز کے فاصلے پر ویران اور اسکے دیوار بدیوار شہنشاہ اورنگ زیب کی مسجد ہے۔ موجودہ مندر اور مسجد کے درمیان ایک کنواں گیان باپی کے نام سے مشہور ہے۔ برہمن کہتے ہیں کہ جب اورنگ زیب نے مسجد بنوائی تو وشیشر جی ناراض ہو کر اس کنوئیں میں کود پڑے تھے۔ اس واسطے ہندوؤں نے ایک نیا مندر بنا کر وشیشر ناتھ کی ستھاپنا اس میں کر دی مسجد اور مندر دونو آباد ہیں مگر اُن کے باہم قریب ہونے سے ہندو مسلمانوں میں آئے دن دنگا فساد ہوتا رہتا ہے اور کبھی کبھی فوجداری تک بھی نوبت پہنچ جاتی ہے +

اورنگ زیب پر اس مندر کے گرانے سے مذہبی تعصب کا الزام لگایا جاتا ہے۔ مگر کتب تاریخ سے اس کی اصلیت٭ یہ معلوم ہوتی ہے کہ دارا شکوہ کے قتل کے بعد جو سلطنت کا مدعی اور اورنگ زیب کا حریف تھا۔ چند مندروں کے پوجاریوں نے اورنگ زیب کے مظالم اور دارا شکوہ کی نیکیاں بیان کرنی شروع کیں بادشاہ نے خبر لگی منعم خاں خانخاناں کو ان پوجاریوں کی سرکوبی کے ساتھ مابہ النشراع مندروں کے گرانے کا حکم دیدیا ورنہ شہر میں اور بھی بہت مندر تھے مگر بادشاہ نے کسی کے گرانے کا حکم نہیں دیا +

مان مندر جس میں راجہ جے سنگھ کا رصد خانہ (جنتر منتر) بنا ہُوا ہے۔ قابل دید ہے۔ آلات رصد یہ جس قدر یہاں موجود ہیں وہ بہت درست حالت میں ہیں اور ہر ایک کی مختصر کیفیت ایک پتھر پر انگریزی میں لکھی ہوئی ہے +

٭ دیکھو رسالہ مخزن ماہ ستمبر ۱۹۰۱ء +

گنگا کا نظارہ (بنارس)
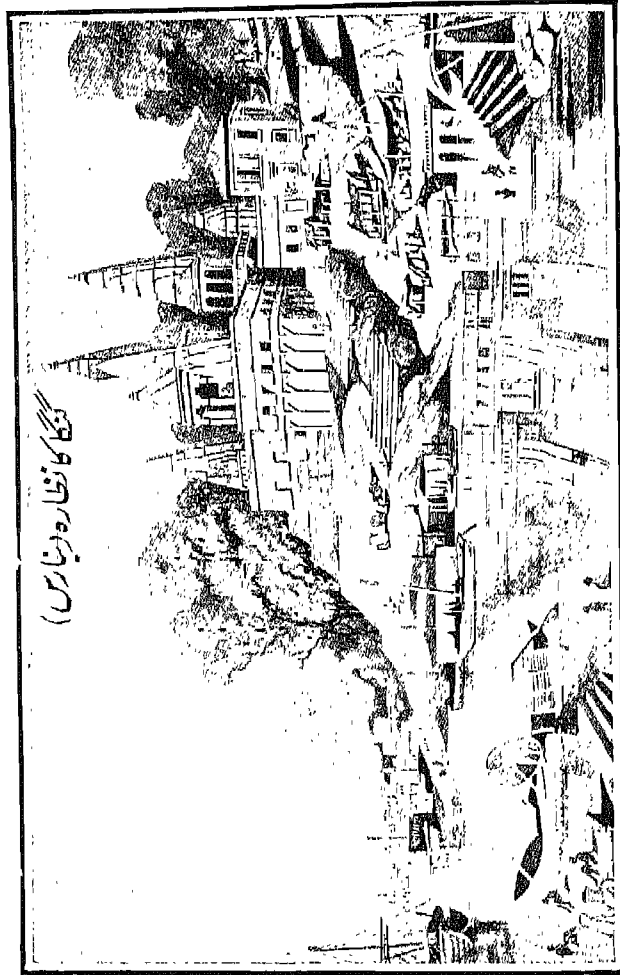
دریا کے کنارے کنارے سنگین سیڑھیوں کے بیسیوں گھاٹ بنے ہوئے
ہیں جن پر لوگ صبح کے وقت نہاتے اور پوجا پاٹھ کرتے ہیں۔ گھاٹوں
کی سیر کا پورا لطف جب حاصل ہوتا ہے کہ انسان صبح کے وقت کشتی پر سوار ہو کر
دریا کے کنارے گشت لگائے۔ اس گشت میں شہر کی حویلیاں۔ مکانات اور مندر
جو قوسی شکل میں زمین چار میل تک پھیلے ہوئے ہیں اُن کا نظارہ بڑا دلچسپ معلوم
ہوتا ہے۔ اسی نظارہ کی وجہ سے "صبح بنارس" مشہور ہے۔ جو عمارتیں اس موقع پر
ہیں اُن میں سے نیپالی مندر اور دھریرا کی مسجد خصوصیت سے قابل دید ہیں۔
مندر لکڑی کا ہے اور اُس پر مرد عورت کی فحش تصویریں منبّت کی ہوئی ہیں۔
مسجد کی عمارت بہت بلند اور وسیع و خوشنما ہے۔ اس کے مینار تقریباً ڈیڑھ سو
فٹ اونچے ہیں اور اُن کے اندر ۱۳ چکّر دار سیڑھیاں بنی ہوئی ہیں۔ جن پر
چڑھنے سے شہر کی آبادی کی کیفیت خوب معلوم ہوتی ہے۔ نماز پڑھنے والے تو
یہاں کم آتے ہیں مگر مناروں کی سیر کرنے والے اکثر +

تجارت کو خوب ترقی ہے۔ باہر سے ہر قسم کا مال چلا آتا ہے۔ شہر کے
باشندے طلائی اور ریشمی پارچات بنانے میں مشہور ہیں۔ کمخاب۔ ریشمی دھوتی
گلبدن۔ طلائی دوپٹے بہت عمدہ اور بیش قیمت تیار ہوتے اور دُور دُور تک
باہر جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ پیتل کی منقش چیزیں خوب بنتی ہیں۔ اور
ہندوستان کے علاوہ یورپ و امریکہ تک ان کی مانگ رہتی ہے +

سنسکرت زبان اور شاستر کی تعلیم و تعلّم کا یہ شہر ہمیشہ سے مرکز چلا آتا ہے
اور اس وقت تک ہندؤں کے باقیماندہ علوم کا دار العلم ہے۔ ہر مندر اور ہر
پاٹ شالہ میں شاستر کا چرچا ہے۔ بنارس کے پنڈت ہندوستان بھر میں مشہور
ہیں۔ صدہا برہمن ہزاروں کوس کی مسافت طے کر کے یہاں آتے ہیں اور سنسکرت

میں اعلےٰ درجے کی قابلیت حاصل کرتے ہیں۔ شیخ محمد علی ایرانی متخلص بحزیں نے غالباً انہی برہمن بچوں کو دیکھکر یہ شعر کہا ہوگا ؎

از بنارس نروم معبد عام ست اینجا ہر برہمن پسر لچھمن و رام ست اینجا

انگریزی زبان اور علوم جدیدہ کی تحصیل کے واسطے دو کالج ہیں۔ کوئنز کالج و سنٹرل ہندو بنارس کالج۔ کوئنز کالج ۱۷۹۱ء میں گورنمنٹ نے قائم کیا۔ ابتدا میں یہ سنسکرت کالج تھا۔ مگر اب گورنمنٹ کالج کی ایک شاخ سمجھا جاتا ہے۔ سنٹرل ہندو کالج بنارس ملک اور قوم کے چندے سے حال میں قائم ہوا ہے۔ والیان ملک اور عام ہندوؤں نے دل کھول کر اس کی اعانت کی ہے۔ مس اینی بیسنٹ ایک مشہور امریکن لیڈی جو ہندوؤں کے علوم و فنون کی طرف بہت راغب ہے اسکی کوششیں چندہ کی فراہمی اور کالج کی بہتری میں ہمیشہ یادگار رہینگی۔ اُس نے اپنی زندگی گویا اس کام کے واسطے وقف کر دی ہے۔ اس کالج میں انگریزی کے ساتھ مذہبی تعلیم لازمی ہے۔ کالج اور سکول کی عمارتیں۔ بورڈنگ ہاؤس اور مندر بہت وسیع اور عمدہ بنے ہوئے ہیں۔ مسلمانوں کے بھی دو تین مدرسے عربی کے ہیں مگر سرمایہ غیر مکتفی اور تعلیم کا انتظام ناکمل ہے۔

ریل کی سڑک کے دوسری جانب دو تین میل کے فاصلے پر چھاؤنی اور سرکاری دفاتر ہیں۔ یہ چھاؤنی خوب آباد اور یہاں سے شہر تک لب سڑک کہیں کہیں آبادی بھی ہے جو روز بروز ترقی کرتی جاتی ہے۔

شہر سے تین چار میل کے فاصلے پر سارناتھ بدھ مذہب کی ایک عمارت ہے زمانۂ حال کی تحقیقات سے معلوم ہوا ہے کہ اس میں بدھ مذہب کے کسی بزرگ کی قبر اور پوجا و زیارت کی چیز ہے۔ یہ عمارت مرور زمانہ سے اب خستہ ہوتی جاتی ہے۔

مغلوں کے عہد میں صوبہ بنگالہ اُس حصۂ ملک کو کہتے تھے جو خلیج بنگالہ کے شمالی ساحل اور ہمالہ پہاڑ کے دامن میں واقع اور دریائے گنگا و برہم پتّر سے سیراب ہوتا ہے۔ انگریزوں نے بہار۔ اُڑیسہ اور چھوٹا ناگپور اس میں ملا کر صوبہ بنگالہ کے نام سے موسوم کیا۔ پھر ۱۹۰۵ء میں لارڈ کرزن نے صوبہ بنگالہ سے بڑا حصّہ[1] نکال کر آسام کے ساتھ ملایا اور مشرقی بنگال و آسام کے نام سے ایک جداگانہ صوبہ قائم کیا۔ کچھ حصّہ ممالک متوسط سے نکال کر اُڑیسہ میں شامل کیا۔ اس تغیّر و تبدّل کے بعد بہار بنگالہ۔ اُڑیسہ اور چھوٹا ناگپور جس قدر اب ہے بدستور سابق ایک لفٹنٹ گورنر کے ماتحت رہا جن کا دار الحکومت کلکتہ ہے ۔

[1] صوبہ بنگالہ سے کمشنری ڈھاکہ ۔ چٹاگانگ ۔ راج شاہی (سوائے دارجیلنگ) ۔ کمشنری بھاگلپور سے ضلع مالدہ اور ریاست ہل ٹپیرا آسام میں منتقل کئے گئے جس سے نئے صوبے کی بنیاد قائم ہوئی۔ اس سے صوبہ بنگالہ کے رقبہ اور آبادی میں حسب ذیل تغیّر ہوا ہے :۔
تقسیم سے پیشتر رقبہ ۱۹۶۴۰۸ مربع میل اور آبادی ۷۸۴۹۳۴۱۰ نفوس کی تھی ۔
تقسیم کے بعد رقبہ ۱۴۸۵۹۲ " اور آبادی ۵۴۶۶۲۵۲۹ نفوس کی ہے ۔
اس تقسیم سے موجودہ صوبہ بنگالہ کا رقبہ بقدر اڑتالیس ہزار مربع میل اور آبادی بقدر دو کروڑ پچاس لاکھ نفوس کے کم ہو گئی (امپیریل گزیٹر آف انڈیا جلد ہفتم) ۔

(الف) جنوبی بہار و بنگالہ و اڑیسہ

بنارس سے سہسرام - گیا - پٹنہ - بہار - ہوگلی - کلکتہ -
کٹک - پوری اور وہاں سے براہ کلکتہ مرشد آباد
(بہار کی گزشتہ و موجودہ حالت پر ایک نظر)

بہار اُس سرزمین کا نام ہے جو صوبجات متحدہ آگرہ و بنگالہ کے درمیان دریائے گنگا کے دونو کناروں پر دور تک پھیلی ہوئی ہے۔ مغلوں کے عہد میں بہار مستقل صوبہ تھا۔ اس نام کا ایک شہر بھی اس میں ہے اور صوبہ اسی کے نام سے مشہور ہے۔ کہتے ہیں کہ بہار اصل میں وہار تھا جس کے معنی سنسکرت میں خانقاہ کے ہیں۔ بدھ مذہب کے زمانہ عروج میں یہاں خانقاہ تھی۔ ہندوستان بلکہ آسام اور چین تک کے طلبا اس میں تعلیم پاتے تھے۔ اس واسطے بہار کا مفہوم دارالعلوم قرار پاکر صوبۂ بہار کی علمی شہرت کا باعث ہوا +

طبعی تقسیم

دریائے گنگا اس صوبہ کے درمیان سے ہو کر گزرتا ہے اور اُس کو دو قدرتی حصّوں میں تقسیم کرتا ہے۔ اوّل جنوبی بہار جس میں اضلاع پٹنہ - گیا اور شاہ آباد شامل ہیں - دوم شمالی بہار جس میں چمپارن - دربھنگہ اور مظفرپور واقع ہیں - مغلوں کے عہد میں جتنا رقبہ اس میں شامل تھا ۱۹۰۵ء کی تقسیم بنگال سے دارجیلنگ وغیرہ اس میں اضافہ ہو کر صوبہ بنگالہ کا ایک حصّہ شمار ہوتا ہے +

رقبہ و آبادی

بہار کا رقبہ ۴۴ ہزار دو سو اُنسٹھ مربع میل اور ۱۹۰۱ء کی مردم شماری دو کروڑ ۲۴ لاکھ ۱۴ ہزار تین سو پچاس نفوس ہے - اس میں ہندو مسلمان اور عیسائی سبھی فرقوں کے لوگ ہیں جن میں سے مسلمان آبادی کا آٹھواں حصّہ

ہیں۔ اُردو اور ہندی زبانیں صوبہ میں بولی جاتی ہیں۔ یہ بات کچھ کم حیرت انگیز نہیں کہ بُدھ مذہب جو ایک عرصہ تک یہاں بہت ممتاز رہا۔ اب اس کے پیرو بالکل معدوم ہو گئے ٭

آب و ہوا

شمالی صوبہ بہار کی آب و ہوا مرطوب اور کچھ سرد ہے اور خاصکر اس کا مشرقی حصہ تو بالکل مرطوب بلکہ ملیریا کا گھر ہے۔ جنوبی حصہ بہار کی آب و ہوا میں ایک خاص قسم کی خوشگواری اور اعتدال ہے۔ اس کی جنوبی جانب کے اکثر مقامات میں شدت کی گرمی پڑتی ہے۔ مگر اس کا عام اثر صحت کے واسطے مفید ہے ٭

پیداوار

بہار بڑا زرخیز اور سیرحاصل ملک ہے مگر بارش کم اور چھیتی ہوتی ہے۔ اور فصل ربیع کو خشک سالی سے نقصان پہنچتا ہے۔ نہری آبپاشی کا بندوبست صرف ضلع شاہ آباد میں ہے۔ تمام صوبہ میں تقریباً نصف پیداوار دھان کی ہے اور باقی نصف میں زیادہ تر مکئی۔ جو۔ گیہوں اور سرسوں پیدا ہوتی ہے۔ کئی قسم کے پھل اور میوہ جات بھی عمدہ ہوتے ہیں۔ پہلے نیل کی کاشت بکثرت ہوتی تھی مگر مصنوعی رنگ کے ایجاد ہونے سے اب اس میں بہت کمی ہو گئی ہے۔ افیون اور شورہ بھی یہاں بافراط ہوتا ہے ٭

باشندے

باشندے عموماً جفاکش اور محنتی ہیں۔ مگر ان کی مالی حالت اچھی نہیں۔ آبادی کا بڑا حصہ حرفت و صنعت سے غافل اور نوکری کی طرف مائل ہے۔ سب سے بڑی نکاسی افیون کی ہے۔ ممالک غیر کو جو افیون جاتی ہے۔ اس میں زیادہ تر بہار کی ہوتی ہے ٭

ریل

اس صوبہ میں ریل کی کئی سڑکیں جاری ہیں۔ (۱) ایسٹ انڈین ریلوے جنوبی بہار میں۔ اس کی ایک شاخ پٹنہ سے گیا تک گئی ہے۔ (۲) بنگال

نارتھ ویسٹرن ریلوے شمالی بہار کے ضلع سارن چمپارن مظفرپور اور دربھنگہ میں۔ اس کی ایک شاخ پورنیہ۔ بھاگلپور اور مونگیر بھی جاتی ہے۔ (۳) ایسٹرن بنگال سٹیٹ ریلوے بہار کے باقیماندہ حصوں میں ✤

تعلیم

بہار کے تمام بڑے بڑے شہروں میں تعلیم کا اچھّا چرچا ہے۔ پٹنہ۔ بانکی پور بھاگلپور، مونگیر اور مظفرپور میں پانچ آرٹس کالج ہیں۔ ان کے علاوہ بانکی پور میں ایک انجینئرنگ سکول اور دربھنگا میں پوسے کا زراعتی کالج ہے۔ کالجوں کی تعداد مردم شماری کے لحاظ سے کم ہے۔ جنوبی بہار کے مسلمانوں نے شمالی بہار کے باشندوں کی بہ نسبت انگریزی تعلیم سے خوب فائدہ اُٹھایا ہے۔ مغلوں کے عہد میں مشرقی علوم کو جو ترقی تھی پٹنہ اور اس کے اطراف میں چند نامور عُلما اب بھی اُن کی یاد کو تازہ کر رہے ہیں۔ مگر موجودہ عربی درسگاہوں کی حالت قابلِ تسلّی نہیں صوفیۂ کرام کی خانقاہوں کے ساتھ شاہی زمانہ کے بڑے بڑے اوقاف موجود ہیں۔ مگر سجادہ نشینوں کو تعلیم کی طرف توجہ نہیں۔ ان کے ہاں جو مدرسے جاری ہیں وہ بہت معمولی ہیں ✤

سنہ ۱۹۰۷ء کی شورش

سنہ ۱۹۰۷ء میں بنگالہ میں جو شورش ہوئی اس کی زہریلی ہوائیں اگرچہ بہار میں آ پہنچی ہیں مگر اُن کا اثر ہنوز نمایاں طور سے نہیں ہؤا۔ اس شورش کے متعلق سب سے بڑا واقعہ خودی رام بوس کا ہے جس نے سنہ ۱۹۰۸ء میں دو بے گناہ یورپین لیڈیوں کو مظفرپور میں بم کے گولے سے ہلاک کیا تھا۔ یہ شخص دراصل بنگالہ کا رہنے والا تھا ✤

تاریخی حالات

صوبہ بہار بہت قدیم ملک ہے۔ ہندو لوگ پہلے زمانہ میں اس کے جنوبی حصہ کو مگدھ اور شمالی حصہ کو متھلا کہتے تھے۔ مگدھ کا دارالحکومت پہلے راجگیر تھا جو گیا سے ۳۰ میل کے فاصلے پر اب ایک معمولی حیثیت کا قصبہ

ہے۔ پھر پاٹلی پوترا پایہ تخت قرار پایا۔ راجہ اشوک نے اسی شہر سے اٹھکر تمام ہندوستان پر قبضہ کیا تھا۔ گوتم بدھ کے مذہبی واقعات کو زیادہ تعلق مگدھ دیس سے ہے۔ مسلمانوں میں سب سے پہلے بختیار خاں خلجی نے حسب الحکم سلطان قطب الدین شہنشاہؒ دہلی ۵۹۹ھ ۱۲۰۲ء میں یہاں اسلامی حکومت کا جھنڈا گاڑا جو انگریزوں کی آمد تک بدستور قائم رہا ÷

اس وقت صوبہ بہار میں تین کمشنریاں اور بارہ ضلعے ہیں :۔

(۱) پٹنہ۔ جس میں پٹنہ۔ شاہ آباد اور گیا تین ضلعے ہیں ÷

(۲) بھاگلپور جس میں بھاگلپور۔ منگھیر۔ پورنیہ۔ سنتھال۔ پرگنہ اور دارجیلنگ پانچ ضلعے ہیں ÷

(۳) مظفر پور جس میں مظفر پور۔ سارن۔ چمپارن۔ اور دربھنگا چار ضلعے ہیں

اب میں اپنے سفر کے تفصیلی حالات لکھتا ہوں ÷

سہسرام

میں بنارس سے براہ مغل سرائے سہسرام پہنچا مغل سرائے گو ایک چھوٹا سا گاؤں ہے مگر ریل کا جنکشن ہونے کی وجہ سے بہت مشہور اور پہلے سے دن بدن ترقی پر ہے۔ سہسرام ریلوے لائن کے کنارے بنارس سے ۷۴ میل کے فاصلے پر ہے۔ سلطان شیر شاہ اسی جگہ پیدا ہوا تھا۔ اس کے زمانہ میں یہ شہر بہت آباد و بارونق تھا مگر اب ضلع شاہ آباد میں ایک معمولی حیثیت کا قصبہ اور چوبیس ہزار اس کی آبادی ہے تجارت و حرفت کے لحاظ سے اسے کوئی خصوصیت نہیں صرف سلطان شیر شاہ کا مقبرہ عمارتی خوبیوں کے لحاظ سے سیاحوں کی دلچسپی کا باعث ہے۔ یہ بادشاہ ہندوستان کے اولوالعزم فرمانرواؤں میں

گزرا ہے۔ اس کو رعایا پروری اور امور رفاہ عام کی وجہ سے خاص شہرت ہے
اس نے بنگالہ سے رُہتاس (پنجاب) تک ایک سڑک بنوائی جو اُس زمانہ میں
چار ماہ مسافت کی تھی۔ سڑک کے دورویہ میوہ دار درخت لگوائے۔ دو دو کوس کے
فاصلے پر سرائے اور ایک ایک کنواں تیار کرایا۔ ہر سرائے میں ہندو مسلمان
کو مفت کھانا ملتا تھا۔ مختلف صوبوں میں جو سڑکیں تیار ہوئیں اُن پر ستر ہزار
سرائیں اس قسم کی تعمیر ہوئی تھیں۔ اور زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ شیر شاہ کی مدت
سلطنت صرف پانچ برس تھی ؛

مقبرہ کی عمارت ایک تالاب کے وسط میں ہے جس کا طول گیارہ سو فٹ
اور عرض ایک ہزار فٹ ہے۔ کرسی مربع مگر اوپر کی منزلیں ہشت پہلو اور کل عمارت
سنگ خارا کی بہت خوش قطع بنی ہوئی ہے۔ مقبرہ کی ہر پہل ساٹھ فٹ لمبی اور
ہر پہل میں ایک ایک دروازہ ہے۔ اس کے اندر بادشاہ کی قبر اور ایک مسجد ہے
در و دیوار پر آیات قرآنی۔ درود شریف اور تاریخ بنا ۹۵۲ھ مطابق ۱۵۴۵ء تحریر ہے۔ یہ
عمارت سلطان شیر شاہ کے بیٹے سلطان سلیم شاہ کی یادگار ہے اور اس قدر
مستحکم ہے کہ پونے چار سو برس گزرنے پر بھی اس میں اب تک کوئی تغیر واقع
نہیں ہوا ؛

مولوی محمد ابوالحسن صاحب (خوندل) نے جو مدرسہ خانقاہ کے عربی
مدرس اور ایک باخبر آدمی ہیں مجھ سے بیان کیا کہ جب ہمایوں بار ثانی ہندوستان
پر قابض ہوا تو شیر شاہ کی عداوت کے باعث حکم دیا کہ اُس کی سب عمارتیں
منہدم کر دی جائیں۔ شاہی عمارات کے بعد جب مقبرہ کی نوبت آئی تو حاکم وقت
نے رپورٹ کی کہ اس کے ساتھ ایک مسجد ہے اگر مقبرہ گرایا گیا تو وہ بھی سربسجود
ہو جائیگی۔ اس پر بادشاہ نے دینی حمیت کو دنیاوی انتقام پر مقدم رکھ کر مقبرہ

سے تعرّض نہ کیا - اور اس مسجد کی بدولت مقبرہ اب تک قائم ہے ✣

گیا

سہسرام اور گیا میں ۳۶ میل کا فاصلہ ہے - یہ شہر پھلگو ندی کے کنارہ ہندوؤں کا ایک مقدّس مقام ہے جہاں یہ لوگ باپ دادوں کی نجات کے واسطے دُور دُور سے دان پُن کرنے آتے ہیں - اس وقت یہ شہر ضلع کا صدر مقام اور اس کی آبادی اکہتر ہزار کے قریب ہے - عام لوگ اُردو سمجھتے ہیں - اور مسلمانوں میں اس کا چرچا زیادہ ہے ✣

شہر کے دو حصّے ہیں - ایک گیا اور دوسرا صاحب گنج - یہ دونوں ایک دوسرے سے متصل ہیں - صاحب گنج کی آبادی گیا کی نسبت فراخ اور بازار عمدہ ہیں - تمام دکاندار اور ساہوکار اس جگہ کاروبار کرتے ہیں - اس میں مسلمانوں کی آبادی بھی خاصی ہے - چند شریف خاندانوں کے لوگ مرفہ الحال اور معزز ہیں - چار ہائی سکولوں کے علاوہ عربی کے دو مدرسے بھی ہیں مگر عربی کی تعلیم کا انتظام کچھ تسلّی بخش نہیں ✣

گیا میں کئی بڑے بڑے مندر ہیں - سب سے بڑا بشن پد امندر ہے جس میں بشن جی کے پاؤں کا درشن ہوتا ہے - اس مندر کے بڑے بڑے دروازے ہیں اور اُن پر چاندی کا پتر الگا ہوا ہے - موجودہ عمارت کی نسبت لوگوں نے بیان کیا کہ یہ اندور کی رانی اہلیا بائی کی تعمیر کرائی ہوئی ہے ✣

گیا کے برہمن جو دان پُن کرواتے ہیں اُن کو گیاوال پنڈے کہتے ہیں یہ موروثی پجاری ہیں اور انہیں کو یہ رُتبہ حاصل ہے کہ جاتریوں کے حق میں دعائے مغفرت کریں - اور اس کے معاوضہ میں حسب منشا نذر و نیاز لیں غریب

سے غریب جاتری کو بھی کم از کم پانچ روپے دینے پڑتے ہیں اور امیروں کو
تو لاکھوں روپے دیکر مشکل مخلصی ہوتی ہے۔ یہاں کے برہمنوں کا دستور ہے
کہ رخصت کے وقت جاتریوں کے ہاتھ پھولوں کے ہار سے باندھ کر پھول کی
چھڑیاں چابک کے طور پر انہیں مارتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تم ہمارے قیدی
ہو جو کچھ گھر سے لائے ہو ہمیں دیدو۔ غرض جہاں تک ممکن ہو اُن کو خوب دق
کرتے ہیں اور پتروں کا ڈنڈ (بزرگوں کی نجات کا تاوان) سمجھ کر ان سے روپیہ
وصول کرتے ہیں ؀

اس ضلع کے رہنے والوں میں ایک صاحب سید محمد یحیٰی خاں ذالی تخلص
ہیں جنھوں نے گزشتہ دس سالوں میں بلاد اسلامیہ اور انگلینڈ تک کا سفر کیا۔
استنبول میں ایک عرصہ تک مقیم رہے۔ میری ان کی چھ ملاقاتیں استنبول
پشاور۔ حیدرآباد دکن۔ لنکا۔ بمبئی اور لاہور میں ہو چکی ہیں۔ آپ نے تھوڑے
دنوں سے الہامات کی بنیاد پر ایک مذہب جدید قائم کیا ہے۔ آپ اپنے تئیں
فرمانروا کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں اور اسی مناسبت سے فرمان نام ایک کتاب
آٹھ سو صفحوں کی ضخامت پر شائع کی ہے۔ اس کتاب کے سرورق پر حسب ذیل
عبارت تحریر ہے جس سے مختصراً آپ کے خیالات کا اندازہ ہو سکتا ہے :-

لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ یحیٰی عین اللّٰہ

فرمان

با جناب اعلیٰ حضرت احدیت مآب فرمانروا سید محمد یحیٰی خاں یحیٰی دوران
نائب اللّٰہ علی العالمین۔ دی لینڈ لارڈ آف موضع یحیٰی پرگنہ اردل ضلع
گیا صوبہ بہار نے بحکم جناب حضرت رب العالمین جلّ جلالہٗ و عمّ نوالہٗ
شائع فرمایا ؀

بُدھ مذہب والوں کا مندر (گیا)
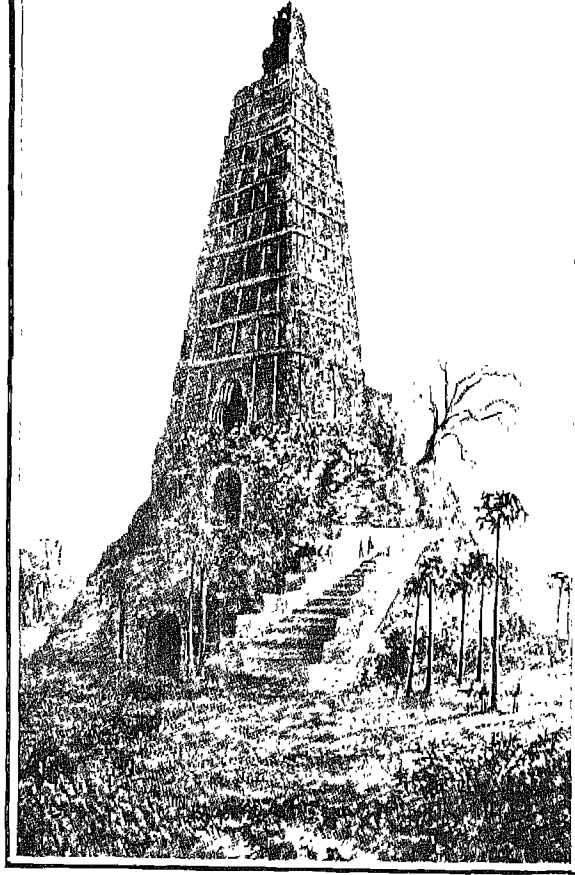
بُدھ گیا

گیا سے سات میل کے فاصلے پر پھلگو ندی کے کنارے ایک بہت پُرانا مندر گوتم بُدھ کے زمانہ کا بنا ہؤا ہے۔ اس کی عمارت بہت مستحکم اور دروازے کی دونوں دیواریں زرا ندود ہیں۔ اس میں گوتم بُدھ کا ایک بہت بڑا بت بنا ہؤا ہے۔ مندر کی دوسری جانب پیپل کا ایک درخت ہے جسکی نسبت برہمنوں کا بیان ہے کہ یہ ہما کا لگایا ہؤا ہے۔ دیکھنے سے تو اس کی عمر کچھ زیادہ نہیں معلوم ہوتی مگر ممکن ہے کہ درخت اُسی قدیم موقعہ پر ہو۔ اس درخت کے نیچے بھی ہندو پنڈ کرواتے ہیں۔ مندر کے چاروں طرف پھولوں کے پودے اور روشیں باقرینہ بنی ہوئی ہیں۔ میرے ہندوستان کے تمام سفر میں یہ پہلا مندر ہے جس میں کسی روک ٹوک کے بغیر میں داخل ہؤا ÷

پٹنہ (عظیم آباد)

گیا اور پٹنہ میں ۵۷ میل کا فاصلہ ہے۔ یہ شہر دریائے گنگا کے کنارے ہندوستان کے پُرانے شہروں میں شمار ہوتا ہے۔ کہتے ہیں کہ شہر پاٹلی پوترا جو ایک زمانہ میں مگدھ دیس کا پایہ تخت رہ چکا ہے۔ اسی موقع پر آباد تھا۔ مغلوں کے زمانہ میں یہ بڑا مشہور شہر تھا اور شہنشاہ دہلی کی طرف سے ایک حاکم یہاں رہتا تھا۔ شاہزادہ عظیم الشان اورنگزیب کا پوتا جب یہاں کا حکمران ہؤا تو اُس نے عظیم آباد نام رکھا۔ بالفعل اس کی تین جدا جدا آبادیاں پٹنہ۔ بانکی پور اور دانا پور کے نام سے مشہور ہیں۔ پٹنہ قدیمی شہر ہے۔ بانکی پور میں

سول سٹیشن اور دانا پور میں چھاؤنی ہے۔ یہ تینوں مقام ایک دوسرے سے دو دو میل کے فاصلے پر ہیں۔ ریلوے سٹیشن تینوں جگہ ہے۔ مجموعی آبادی سنہ ۱۹۰۱ء کی مردم شماری کے موافق ایک لاکھ ۳۴ ہزار اور صوبہ بہار کے سب شہروں سے بڑا ہے ؛

پٹنہ کا بازار وسیع اور تقریباً ڈیڑھ میل لمبا ہے۔ عمارتیں گو اعلےٰ درجہ کی نہیں مگر تجارت کے باعث سے خوب رونق ہے۔ عمارات قدیمہ میں مفصلہ ذیل مقامات قابل دید ہیں :-

مدرسہ مسجد - یہ مسجد دریا کے کنارے بہت نفیس بنی ہوئی ہے۔ اسکی بنیاد نواب سیف خان بہادر نے ڈالی تھی۔ مگر تعمیر نواب ہیبت جنگ کے زمانہ میں ختم ہوئی۔ اس کا مادہ تاریخ "مجموعہ خیر دنیا" ہے۔ مسجد کی عمارت تو اچھی حالت میں ہے مگر مدرسہ کے حجرے فرسودہ ہو رہے ہیں ؛

ہر مندر - سکھوں کے آخری گرو گوبند سنگھ صاحب ۱۰۸۶ھ / ۱۶۷۵ء میں یہاں پیدا ہوئے۔ مندر کی عمارت وسیع اور عمدہ ہے۔ سکھ لوگ سال بسال دور دراز مقامات سے اسکی زیارت کو آتے ہیں ؛

شیر شاہ کی مسجد - یہ مسجد بیرون شہر ہے اور غالباً پٹنہ کی عمارتوں میں سب سے پرانی ہے۔ مرمت کے نہ ہونے سے دیواروں میں دراڑیں پڑ گئی ہیں ؛

درگاہ شاہ ارزاں - شاہ ارزاں ایک بزرگ پشاور کے رہنے والے تھے فرخ سیر کے زمانہ میں علمی فضل و کمال سے انہوں نے بڑی شہرت حاصل کی اس وقت ان کا مزار مرجع خلائق اور پچاس ہزار روپے سالانہ کے اوقاف عطیہ شاہ فرخ سیر اسکے مصارف کے واسطے اب تک واگزار ہیں ؛

گولا عظیم - یہ ایک گنبد کی شکل کی عمارت ہے جسکی بلندی ۹۶ فٹ اور

اندرونی قطر ایک سو دس فٹ ہے ۱۱۹۹ھ ۱۷۸۴ء میں یہ اس غرض سے بنائی گئی تھی کہ جب صوبہ بنگال میں قحط کا اندیشہ ہو تو حفظ ماتقدم کے خیال سے اس میں غلہ جمع رہا کرے۔ کہتے ہیں کہ پینتیس لاکھ من غلہ اس میں بطور ذخیرہ رکھا جاسکتا ہے۔ مگر یہ عجیب اتفاق ہے کہ زمانہ تعمیر سے آج تک غلہ انبار کرنے کی کبھی نوبت نہیں آئی۔ اس کے اوپر جانے کے واسطے باہر کی طرف چکردار زینے بنے ہوئے ہیں۔ چھت پر چڑھنے سے تمام شہر کا نظارہ بہت دلکش معلوم ہوتا ہے۔

گلزار باغ - اس میں افیون کا کارخانہ گورنمنٹ کی طرف سے قائم ہے۔ جو غالباً تمام ہندوستان میں سب سے بڑا ہے۔ سپرنٹنڈنٹ کی اجازت سے کارخانہ کے اندر جاکر افیون کے پکانے اور درست کرنے کا تمام طریقہ بخوبی دیکھا جاسکتا ہے۔

ان عمارتوں کی سیر کرانے اور تاریخی حالات بتلانے میں سید سلیمان صاحب نے بڑی مدد کی۔ سید صاحب خود بیرسٹرایٹ لا اور ان کے والد مولوی محمد زکریا یہاں کے نامی وکیل اور ذی علم شخص ہیں۔

بانکی پور کا اصلی نام باقی پور ہے۔ یہ حصہ بہت آباد اور بجائے خود شہر کا حکم رکھتا ہے۔ حکام ضلع کے دفاتر، سکول، کالج اور مشرقی علوم کی مشہور پٹنہ لائبریری اسی حصہ میں ہے۔ یہ لائبریری خان بہادر مولوی* خدابخش صاحب کی قائم کی ہوئی ہے۔ اس میں عربی اور فارسی کی قدیم خوشخط اور مطلا کتابیں کثرت سے ہیں۔ ان میں سے کئی کتابیں نایاب اور نوادر روزگار ہیں بعض کتابوں پر بادشاہوں کی دستخطی یادداشتیں ثبت ہیں۔ خان بہادر

---

* میرے سفر ۱۹۰۸ء کے بعد مولوی صاحب کا انتقال ہوگیا۔ خدا مغفرت کرے۔ مؤلف

نے آج سے دس بارہ سال پیشتر جبکہ وہ حیدرآباد دکن میں ہائی کورٹ کے جج تھے۔ اس کتب خانہ کی فہرست پانچ چھ سو صفحے پر چھپوائی تھی۔ اُس فہرست سے کتابوں اور اُن کے مصنّفوں کے حالات جاننے میں بڑی مدد ملتی ہے۔

باشندوں کا حال۔ مسلمان شرفا اس شہر اور اس کے اطراف میں بہت ہیں اور زمیندار بھی ہیں۔ مگر انگریزی تہذیب کی فضول خرچیوں سے ان کی جائدادیں رفتہ رفتہ قرضہ میں جا رہی ہیں۔ یہاں کے عام کاشتکاروں کا طبقہ البتہ بہت آسودہ اور مرفہ الحال ہے۔ اُمرا اسی طبقہ سے قرض لینے پر مجبور ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ پُرانے خاندان روز بروز تباہ اور یہ صاحب ثروت ہوتے جاتے ہیں۔

انگریزی تعلیم یافتوں میں سید علی امام بیرسٹر ایٹ لا اور اُن کے بھائی سید حسن امام نے اچھی ترقی کی ہے۔ سید علی امام کو قومی کاموں سے بڑی دلچسپی ہے امور رفاہ عام میں ہمیشہ دل کھولکر چندے دیتے ہیں۔ آل انڈیا مسلم لیگ کے متعلق آپ کی کوششیں مشہور ہیں۔ امرتسر کے جلسہ کانفرنس سنہ ۱۹۰۸ء میں جس فصاحت اور بلاغت سے تقریریں کیں اُس سے آپ کی قابلیت کا سکّہ عام و خاص کے دلوں پر بیٹھ گیا ہے۔ آپ کے بڑے ماموں سید شرف الدین احمد بیرسٹر ایٹ لا ہائی کورٹ کلکتہ کے جج اور چھوٹے ماموں سید نصیر الدین صاحب ریاست بھوپال کے معین المہام ہیں۔

مشرقی علوم میں شمس العلما مولوی احمد علی ایم اے اور اُن کے خاندان کے لوگ بڑے پایہ کے ہیں۔ ان میں کئی ایک شمس العلما اور چند شخص بی اے وایم اے بھی ہیں۔ یہ لوگ صادق پوری خاندان کے نام سے مشہور ہیں صادق پور پٹنہ کا ایک محلہ ہے۔ آج سے پچاس برس پیشتر وہابیوں کا مرکز تھا۔ سنہ ۱۸۶۴ء میں

سرکار نے یہاں کے سربرآوردہ لوگوں کو جلاوطن کردیا۔ سید علی امام کے والد شمس العلما سید امداد امام علاوہ اور علوم کے فن طب سے خوب ماہر ہیں +

ان کے علاوہ اور بھی کئی صاحب علمی فضل و کمال اور تاریخی تصنیفات کے لحاظ سے قابل ذکر ہیں۔ مولوی سید علی محمد صاحب شاد۔ مولوی سید ضمیر الدین احمد صاحب۔ نواب نصیر حسین خاں صاحب خیال۔ یہ نواب صاحب بڑے روشن خیال اور ضروریات زمانہ سے اچھے باخبر ہیں۔ زباندانی میں آپ کو خاص مذاق ہے +

تعلیم۔ انگریزی تعلیم اچھی حالت میں ہے اور صوبہ بہار کے دیگر شہروں کی نسبت ترقی پر ہے۔ پندرہ ہائی سکول اور دو کالج ہیں۔ ایک پٹنہ کالج۔ دوسرا بہار نیشنل کالج بانکی پور۔ ان کے علاوہ ایک انجنیرنگ سکول بھی ہے۔ مسلمانوں کا ایک مدرسہ محمڈن انگلو عربک سکول انٹرنس کلاس تک پٹنہ میں ہے جو شمس العلما مولوی محمد حسن مرحوم صادق پوری اور شمس العلما مولوی عبد الرئوف صادق پوری مرحوم کی یادگار ہے۔ اس وقت مدرسہ کے سیکرٹری اسی خاندان کے ایک رکن مولوی محمد یحییٰ ہیں۔ مدرسہ کے قیام سے خاص مدعا یہ ہے کہ مسلمانوں کو دنیاوی تعلیم کے ساتھ دینی تعلیم بھی دی جائے۔ پٹنہ میں ایک مدرسہ نواب یوسف حسین خاں کی مدخولہ طوائف محمدی جان کا ہے اس کے متعلقہ جائداد کی آمدنی بارہ ہزار روپے سالانہ ہے۔ عربی اور دینیات کی تعلیم کے واسطے دو تین مدرسے اور بھی ہیں۔ مگر انتظام اور تعلیمی حالت کچھ تسلی بخش نہیں +

پھلواری۔ پٹنہ سے پانچ میل کے فاصلے پر قصبہ پھلواری ہے۔ جہاں خاندان چشتیہ و قادریہ کی ایک مشہور گدی مرجع خلائق ہے۔ مولوی قاری شاہ سلیمان صاحب اس خاندان کے مشہور رکن ہیں۔ ان کے فصیح اور بلیغ وعظ ہندوستان میں اس سرے سے اُس سرے تک مشہور ہیں۔ شاہ صاحب کے وعظوں میں

ایک خاص خصوصیت[۵۱] یہ ہے کہ مسلمانوں کی دینی بہبودی کے ساتھ دنیاوی مصلحتیں بھی پہلو بہ پہلو شامل ہوتی ہیں۔ اثنائے وعظ میں مثنوی مولانا روم کے اشعار ایسی خوش الحانی سے پڑھتے ہیں کہ سامعین پر بڑا اثر ہوتا ہے *

بہار

پٹنہ اور بہار میں ۴۶ میل کی مسافت ہے۔ راستہ میں بمقام بختیارپور گاڑی تبدیل کرنی پڑی جہاں سے بہار تک ۱۸ میل کا فاصلہ ہے۔ مسلمانوں کے عہد میں صوبہ بہار اسی شہر کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ اس وقت ضلع پٹنہ میں ایک معمولی قصبہ اور سنہ ۱۹۰۱ء کی مردم شماری کے مطابق اس کی آبادی ۴۵ ہزار آدمیوں کی ہے۔ عام و خاص اُردو میں بات چیت کرتے ہیں *

اس شہر کی موجودہ عظمت مخدوم شرف الدین احمد کے مزار کے باعث ہے جو عام و خاص میں شیخ شرف الدین یحییٰ منیری[۵۲] کے نام سے مشہور ہیں۔ آپ ساتویں صدی ہجری کے صوفیہ میں بہت باکمال ہوئے ہیں۔ ہر سال آپ کے عُرس پر ہزاروں معتقدین دور دراز کی مسافت طے کر کے آتے ہیں۔ مخدوم صاحب کے حالات ضمیمہ میں درج ہیں۔ چند بزرگوں کے مقبرے اور بہت سی مسجدیں بھی قصبہ میں موجود ہیں *

عمارات قدیمہ میں سے پُرانے قلعے کے کھنڈر ایک سو بارہ ایکڑ میں

---

۵۱ شاہ صاحب نے آج سے پندرہ برس پیشتر ایک لکچر ندوۃ العلما میں دیا تھا جو تہذیب الاخلاق سنہ ۱۳۱۳ ہجری میں چھپ چکا ہے۔ اس کے ملاحظہ سے معلوم ہو سکتا ہے کہ آپ کس قدر روشن خیال کثیر الاطلاع اور مسلمانوں کی دینی و دنیوی ضروریات سے باخبر ہیں * مؤلف

۵۲ منیر ایک پُرانا قصبہ شہر بہار سے ساٹھ میل مغرب کی طرف ہے۔ اس کا صحیح تلفظ میم کے زیر اور یائے مجہول سے ہے۔ از سیرۃ الشرف مصنفہ مولوی ضمیر الدین احمد * ۱۲

ہیں جس میں بُدھ مذہب اور برہمنوں کے عالیشان مکانوں کے آثار اب تک پائے جاتے ہیں۔ انہی میں بُدھ مذہب والوں کی درسگاہ کے آثار بھی نمایاں ہیں جس کو وہار (دارالعلوم) کہتے تھے۔ یہی لفظ مرورِ زمانہ سے بہار بن گیا۔

اس جگہ انگریزی تعلیم کا اچھا چرچا ہے۔ پُرانے طریق کے عربی مدارس بھی موجود ہیں۔ مگر روحانی حالت بہت کچھ پست ہے۔ سجادہ نشین اور ان کے اہالی موالی زمانہ حال کی ترقیات سے بیخبری کے ساتھ مخدوم صاحب کے اُس علمی اور عملی کمالات سے بھی کسی قدر دُور ہیں جس کے باعث آپ اپنے زمانہ میں مرجع خلائق تھے۔

صغری بیگم جن کی فیاضی اور نیک دلی کے حالات شدومد سے اخبارات میں درج ہوتے رہے ہیں۔ یہیں کے ایک شریف خاندان کی بی بی ہیں۔ انہوں نے چونسٹھ ہزار روپے سالانہ آمدنی کی جائداد مختلف مقاصد کے واسطے وقف کی ہے۔ سنہ ۱۹۰۸ء میں جب میں اس جگہ آیا تو ایک چھوٹا سا مدرسہ علوم دینیہ کے درس کے واسطے اس روپے میں سے جاری ہو چکا تھا۔ مدرسہ کی عمارت معمولی اور غیر مکتفی۔ طالب علموں کے قیام اور تعلیم کا انتظام انہی پُرانے اصولوں پر ہے جن کی اصلاح اور درستی کے واسطے ملک میں چار طرف کوشش ہو رہی ہے۔ غالباً یہ سب کچھ کارکنوں کی ناواقفی اور سہل انگاری سے ہے بیگم صاحب عورت ذات پردہ نشین کہاں تک بذات خود اس کا سرانجام کر سکتی ہیں۔

ہوگلی

صوبہ بہار کا جنوبی حصہ دیکھنے کے بعد میں بنگالہ میں داخل ہوا سب سے پہلے جس شہر میں میرا گزر ہوا وہ شہر ہوگلی دریائے ہوگلی کے کنارے پر ہے۔

پٹنہ یہاں سے ۳۱۴ میل اور کلکتہ ۲۴ میل ہے۔ یہ شہر اُس موقع کے قریب ہے جہاں شاہی بندر ساتگاؤں (چاٹگام) تھا۔ پرتگیزوں نے ۹۳۴ھ ۱۵۲۷ء میں اس کی بنیاد ڈالی۔ تھوڑے عرصہ میں پرتگیزوں کی تجارت نے ایسی ترقی کی کہ ساتگاؤں کے عوض یہ شاہی بندر مقرر ہوگیا۔ بنگالہ۔ بہار اور آسام کی تجارت یورپ کے ساتھ اسی بندرگاہ سے ہوتی تھی۔ شاہجہاں کے زمانہ ۱۰۴۲ھ ۱۶۳۲ء میں یہ لوگ اپنی بے اعتدالیوں کے باعث یہاں سے نکالے گئے۔ آٹھ برس بعد ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنی تجارتی کوٹھی اس جگہ قائم کی۔ ان کے زمانہ میں ہوگلی کی جو رونق تھی وہ رفتہ رفتہ کلکتہ کو منتقل ہوگئی۔ جو انگریزی سلطنت کا پایہ تخت ہونے سے روزافزوں ترقی کر رہا ہے۔ اس وقت یہ شہر (ہوگلی) اچھا خاصا آباد اور صاحب کلکٹر کا صدر مقام ہے۔

ہوگلی کی آبادی کے دو حصے ہیں۔ ایک ہوگلی اور دوسرا چنسرا۔ یہ دونو آبادیاں باہم ملی ہوئی ہیں اور اُن میں تین مقامات قابل دید ہیں۔ (۱) امام باڑہ محسنیہ (۲) ہوگلی کالج اور (۳) پرتگیزوں کا گرجا۔ پہلی دونو عمارتیں حاجی محمد محسن[۱] مرحوم کے وقف کی یادگار ہیں جو محسن فنڈ کے نام سے مشہور ہے۔ امام باڑہ کی عمارت بہت عالیشان اور تقریباً سوا دو لاکھ روپے کے صرف سے تیار ہوئی ہے۔ بہت سے مرثیہ خوان۔ حفّاظ اور خدّام یہاں متعیّن ہیں۔ فنڈ

[۱] حاجی محمد محسن صاحب کے بزرگ اصفہان کے رہنے والے اور بندر ہوگلی میں تجارت کیا کرتے تھے۔ حاجی صاحب اسی جگہ ۱۱۴۳ھ ۱۷۳۰ء میں پیدا ہوئے۔ کچھ عرصہ ناظم مرشد آباد کے ہاں ایک اچھی خدمت پر مامور رہنے کے بعد حرمین شریفین۔ زیارات مقدسہ اور ایران وغیرہ ممالک کا سفر کیا۔ اور تحصیل علوم کے بعد واپس آکر ہوگلی میں مقیم ہوئے۔ یہ بڑے دولتمند تاجر اور زمیندار مگر لاولد تھے۔ سنہ ۱۸۰۶ء میں اپنی تمام زرعی اراضی اور دیگر ہر قسم

کی آمدنی اس قدر بڑھی ہوئی ہے کہ امام باڑہ کے علاوہ مسلمانان بنگال
کی ترقی تعلیم میں اس سے بڑی مدد ملتی ہے۔ابتدا میں اس کی سالانہ آمدنی
پینتالیس ہزار روپے تھی مگر ۱۸۸۸ء تک ایک لاکھ بارہ ہزار روپے ہوگئی
اس میں سے نصف روپیہ امام باڑہ کے کاروبار میں صرف ہوتا ہے۔
اور نصف روپیہ تعلیمی مقاصد میں۔ہوگلی۔راج شاہی۔ڈھاکہ اور چٹاگانگ

بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۱۶۔کی جائداد امام باڑہ کے مصارف کے واسطے ایک
تحریری وصیت کے ذریعے وقف کر دی ÷

حاجی صاحب کی وفات کے بعد جو ۱۸۱۲ء میں ہوئی محسن فنڈ کی کل آمدنی
امام باڑہ کے کاروبار میں اُن کے حسب وصیت صرف ہوتی تھی اور ہر قسم
کا اختیار متولیوں کے ہاتھ میں تھا۔مگر ۱۸۱۷ء میں باقر علی خاں متولی سوم
کی خیانت کے باعث گورنمنٹ بنگال کو اس کی تولیت اپنے ہاتھ میں لینی
پڑی۔اور چند معزز مسلمانوں کی ایک کمیٹی نگرانی مصارف کے واسطے مقرر
کی۔اصلی متولیوں نے گورنمنٹ کی کارروائی پر اعتراض کیا۔مگر ہندوستان کی عدالتوں
اور انگلستان کی پریوی کونسل سے گورنمنٹ کی تولیت قائم رہی۔دوران مقدمہ
میں آٹھ لاکھ ۱۶ ہزار ایک سو روپیہ کی جو بچت ہوئی۔اُس کے ایک حصہ
سے ہوگلی کالج ۱۸۳۶ء میں تعمیر ہوا اور کچھ روپیہ کالج کے سرمایہ میں جمع
کیا گیا۔ہوگلی کالج کے دو حصے قرار پائے۔ایک علوم عربیہ کی تعلیم کے واسطے
اور دوسرا علوم انگریزی کی تعلیم کے واسطے۔نیز جدید امام باڑہ گورنر جنرل
کے حکم سے تعمیر ہوا جو ۱۸۴۷ء میں شروع ہو کر ۱۸۶۱ء میں خاتمہ کو
پہنچا۔اس زمانہ میں مولوی سید کرامت علی صاحب جونپوری متولی تھے۔
جو علمی فضل و کمال۔انتظامی قابلیت اور دیانتداری میں بڑے نیک نام
مانے گئے ہیں۔امام باڑہ کی عمارت عالیشان اور بہت مستحکم ہے۔دو لاکھ
اٹھارہ ہزار روپے اس کی تعمیر میں اور گیارہ ہزار روپے سامان آرائش
وغیرہ میں صرف ہوئے ÷

کے عربی مدرسے اس سے قائم ہیں۔ مدرسہ عالیہ کلکتہ کے عربی اور انگریزی صیغوں کے مصارف اس سے ادا ہوتے ہیں۔ بنگال کے کالجوں میں جس قدر مسلمان تعلیم پاتے ہیں۔ اگر وہ مقدور نہ ہوں تو اُن کی دو تہائی فیس محسن فنڈ سے دی جاتی ہے۔ طلبا کو وظیفے دیئے جاتے ہیں۔ مسٹر جسٹس سید امیر علی سابق جج ہائی کورٹ کلکتہ کو ولایت میں تعلیم پانے کے لئے اسی فنڈ سے مدد ملی تھی۔ چنانچہ ۶ جون ۱۹۰۶ء کو حاجی صاحب کی انہی فیاضیوں کی یادگار میں محسن فنڈ کی صد سالہ سالگرہ کا جلسہ بڑی دھوم دھام سے ہوا۔

بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۱۷۔ ۱۸۷۲ء تک ہوگلی کالج کی تعلیم میں تقریباً پچاس ہزار روپے سالانہ محسن فنڈ سے صرف ہوتے تھے۔ مگر اس کے نتائج پر غور کرنے سے معلوم ہوا کہ اس سے مسلمانوں کو بمقابلہ ہندوؤں کے بہت ہی کم فائدہ ہوا ہے۔ اس پر گورنمنٹ انڈیا نے ۱۸۷۳ء میں ایک رزولیوشن پاس کیا کہ محسن فنڈ کا روپیہ صوبہ بنگال کے مسلمانوں کی تعلیمی اغراض پر صرف کیا جائے۔ ہوگلی کالج کے انگریزی صیغہ پر جو پچاس ہزار روپے سالانہ خرچ ہوتے تھے۔ گورنمنٹ نے اس صرف کو محکمہ تعلیم کے ذمہ ڈال دیا۔ اور اس بچت سے ہوگلی۔ راج شاہی۔ ڈھاکہ اور چٹاگانگ میں عربی مدرسے قائم کئے۔ اور مدرسہ عالیہ کلکتہ کے عربی اور انگریزی صیغے کا کل خرچ محسن فنڈ کے ذمہ رکھا۔ اس وقف کے اغراض و مقاصد کی نسبت کئی روایتیں بیان کی جاتی ہیں۔ کلکتہ یونیورسٹی کے کیلنڈر میں لکھا ہے کہ یہ جائداد مذہبی خدمات کے واسطے وقف کی گئی تھی۔ ۱۹۰۶ء صد سالہ سالگرہ کے موقع پر اخبار نویسوں نے لکھا کہ تعلیمی مقاصد کے واسطے وقف ہوئی ہے۔ مشرقی بنگال کی تعلیمی رپورٹ ۱۹۱۰ء میں درج ہے کہ یہ رقم نیک کاموں کے واسطے وقف کی گئی ہے۔ مگر حاجی صاحب مرحوم کا جو وصیت نامہ طبقات محسنیہ مصنفہ مولوی شرف الدین احمد متولی امام باڑہ میں درج ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ جائداد صرف امام باڑہ کی خدمات کے واسطے وقف کی گئی تھی۔ وصیت نامہ کے اصل الفاظ یہ ہیں:- منقولین مسطور بعد ادائے خرچ سرکار عالم از بقیہ حاصلات محال مذکورہ ۹ حصہ نمایند۔ ۳ حصہ آنرا اوّلا برائے فاتحہ حضرت سید کائنات خاتم النبیین و حضرات ائمہ معصومین صلوٰۃ اللہ و سلامہ علیہم اجمعین

امام باڑہ کا انتظام اس وقت تک کمیٹی کے سپرد ہے۔ موجودہ متولی مولوی سید اشرف الدین احمد صاحب کمیٹی کی زیر نگرانی امام باڑہ کے کاروبار کو بہت عمدگی سے انجام دیتے ہیں۔ ایک سو اٹھاسی (۱۸۸) آدمی ان کے ماتحت ہیں جن میں اہلکار، مرثیہ خواں اور خدام وغیرہ شامل ہیں۔ محافل اور مجالس کا انتظام بڑی سرگرمی سے ہوتا ہے ۱۹۰۸ء میں ایک مرتبہ مجھے بھی مجلس عزاداری میں شریک ہونے کا موقعہ ملا تھا۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ حاجی صاحب کو دینی خدمت کے باعث دُنیوی عزت بلا طلب حاصل ہوئی۔ اُن کا سٹیچو (مجسّمہ) بحیثیت ایک فیاض شخص ہونے کے کلکتہ کے یونیورسٹی ہال میں رکھا ہے۔ کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے ؎

جزائے حُسن عمل بیں کہ روزگار ہنوز
خراب مے نکند کارگاہ کسرےٰ را

پرتگیزوں کا گرجا چنسرا میں واقع ہے اور غالباً شہنشاہ اکبر کے عہد کا تعمیر شدہ ہے۔ عمارت اگرچہ سادہ ہے مگر اس کے اندر قدیم زمانہ کی تصویریں نہایت عمدہ ہیں ٭

بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۱۸ - "واخراجات عشرہ محرم الحرام وسائر ایّام متبرکہ و ترمیم امام باڑی و مقابر بصرف آرند۔ و دو حصہ را ہر دو متولّی علے السّویہ در وجہ خرج خود بگیرند۔ و چہار حصہ را بعملہ و اہلکار و برکسانیکہ نام انہا در فرد علیحدہ بمہر و دستخط ایں عاصی مندرج ہست دادہ باشند"۔ اگرچہ وقف کا بڑا حصّہ وصیت کے خلاف صرف ہو رہا ہے مگر اس میں شک نہیں کہ یہ خلاف ورزی مسلمانان بنگال کے واسطے مفید ثابت ہوئی ہے۔ فقط مؤلف

کلکتہ

ہوگلی سے ۲۴ میل طے کرنے کے بعد ہم ہوڑا پہنچا۔ یہ ایسٹ انڈین ریلوے اور بنگال ناگپور ریلوے کا انتہائی سٹیشن ہے۔ راستہ میں جہاں تک نگاہ جاتی تھی سبزہ ہی سبزہ نظر آتا تھا۔ اس وقت یہ شہر روزافزوں ترقی پر ہے کئی قسم کے کارخانے جاری ہیں۔ یہ مستقل ضلع اور صاحب کلکٹر کا صدر مقام ہے۔ اس کی آبادی تقریباً ایک لاکھ ۵۷ ہزار ہے ؛

ہوڑا کے نیچے دریائے ہگلی بہتا ہے جس کے دوسرے کنارے کئی میلوں میں کلکتہ آباد ہے۔ یہاں سے شہر جانے کے واسطے لکڑی کا ایک پُل ایسی ترکیب سے بنایا گیا ہے کہ جہازوں کی آمدورفت کے وقت ایک خاص حصہ اصلی مقام سے بآسانی علیحدہ کر دیا جاتا ہے۔ یہ پُل زمانہ حال کی انجنیری ترقیات کا ایک اعلےٰ نمونہ ہے۔ پُل پر سے گزرتے وقت دائیں ہاتھ سینکڑوں جہاز دکھائی دیتے ہیں جو دنیا کے مختلف حصوں سے یہاں آتے ہیں۔ بائیں ہاتھ اُن گھاٹوں کا سلسلہ چلا گیا ہے جہاں ہندو زن و مرد صبح و شام غسل میں مصروف رہتے ہیں ؛

کلکتہ آج سے دو سو برس پیشتر چند چھوٹی چھوٹی آبادیوں کا مجموعہ تھا اُس وقت تجارتی مال کی درآمد برآمد بندر ہوگلی کے ذریعے ہوتی تھی۔ ابتدا میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے یہاں ایک تجارتی کارخانہ قائم کر کے اس پر انگریزی علم نصب کیا۔ ۱۷۵۷ء ؁ میں جب لارڈ کلائیو نے پلاسی کی فتح کے بعد انگریزی حکومت کی بنیاد رکھی تو اس شہر نے ہندوستان کی جدید تاریخ میں خاص جگہ حاصل کی۔ یعنی ہندوستان کی برطانی حکومت کا دارالسلطنت اور گورنر جنرل کا صدر مقام

قرار پایا۔ تھوڑے عرصے میں اس کو ایسی اہمیّت حاصل ہوئی کہ کثرت آبادی تجارت۔ تموّل۔ تعلیم اور پالٹیکس کے لحاظ سے ہندوستان کا سب سے بڑا شہر شمار ہونے لگا۔ اس وقت یہ شہر سولہ مربع میل میں پھیلا ہوا ہے۔ سنہ ۱۹۰۱ء میں اس کی مردم شماری ۸ لاکھ ۴۷ ہزار ۷ سو ۲۶ تھی جو بعد میں بڑھکر دس لاکھ ۲۶ ہزار ۹ سو ۸۷ ہوگئی۔ اس میں ہندوستان کے مختلف حصوں کے علاوہ چین۔ جاپان۔ امریکہ۔ یورپ و ایران تک کے باشندے شامل ہیں۔ عام باشندوں کی زبان بنگالی ہے اور سرکاری دفاتر کی کارروائی انگریزی میں ہوتی ہے۔ کاروباری لوگ اردو زبان بھی سمجھتے ہیں *

مسافروں کی بکثرت آمد و رفت کے باعث اس جگہ بے شمار عمدہ سے عمدہ ہوٹل موجود ہیں۔ مگر دیسیوں کے آرام و قیام کا جو انتظام بمبئی میں ہے وہ یہاں نہیں۔ ہندوؤں نے بہت دنوں سے اس ضرورت کو محسوس کیا اور اپنے ہم مذہبوں کے واسطے دھرم سالہ اور بورڈنگ ہوس بنائے۔ اب تھوڑے دنوں سے مسلمانوں کی توجہ بھی اس طرف مائل ہوگئی ہے چنانچہ لوئر چیت پور روڈ میں جس کو یہاں کے لوگ سندر یا پٹی کہتے ہیں اور بیشتر پردیسی لوگوں کے کاروبار کا مقام ہے۔ دو مسافر خانے بن گئے ہیں۔ جن میں مسلمان مسافر بلا کرایہ ٹھیرتے ہیں۔ ایک حاجی موسےٰ صاحب سورتی سیٹھ کا اور دوسرا شیخ بخش الٰہی صاحب سوداگر دہلی کا۔ سیٹھ صاحب کے مسافر خانے میں ۲۳ کمرے اور ہر قسم کی ضروریات مہیّا ہیں۔ شیخ صاحب کا ارادہ ہے کہ موجودہ مسافر خانہ کو گرا کر ایسی عمارت بنائیں جس میں تمام ضروریات کا بندوبست ہو۔ زکریا مسجد جو کلکتہ کی مشہور جامع مسجد ہے۔ اسی بازار میں ہے *

سواری کی کلکتہ میں کچھ کمی نہیں۔ گھوڑا گاڑیاں تمام بڑے بڑے

چوراہوں میں موجود رہتی ہیں۔ برقی ٹرامویے بھی سارے شہر میں چکّر لگاتی ہے اور تھوڑے خرچ سے شہر کی سیر بخوبی ہوسکتی ہے۔ البتہ بمبئی میں ایک خاص کیفیّت جو ریل کے ذریعے شہر میں سیر کرنے کی ہے۔ وہ اس جگہ حاصل نہیں +

اس شہر میں یوں تو بے شمار بڑی بڑی عمارتیں ہیں مگر ڈلہوزی سکوئیر اور چورنگی میں جو عمارتیں واقع ہیں وہ اپنی شان و شوکت۔ آثار قدیمہ اور علمی ترقیات کے لحاظ سے ایک سیّاح کے واسطے بڑی دلچسپی کا باعث ہیں۔ خوش قسمتی سے قاری محمد یوسف صاحب حیدر آبادی ان دنوں (۱۹۳۰ء) کلکتہ میں مقیم ہیں۔ انہوں نے علم دوستی اور دیرینہ ملاقات کو مدنظر رکھ کر کلکتہ کی سیر میں بڑی مدد دی۔ میری رائے میں یہاں کی سیر کا مختصر طریق یہ ہے:۔

ڈلہوزی سکوئیر۔ جب ہم مسافرخانہ سے فورٹ ولیم کو جائیں تو راستہ میں ڈلہوزی سکوئیر ایک خوشنما باغ سے گزر ہوتا ہے۔ اس کے وسط میں ایک مربع تالاب ہمیشہ پانی سے لبریز رہتا ہے۔ باغ کے چاروں کونوں میں سنگ مرمر کے چار حوض بنے ہوئے ہیں اور اُن کے بیچ میں فوّارے چلتے ہیں۔ اس میں دُوب کے تختے اور موسمی پھولوں کی کیاریاں بڑی خوبی سے لگائی گئی ہیں۔ جنوبی حصّہ میں ڈلہوزی انسٹیٹیوٹ ایک خوشنما عمارت اور اس کے برآمدہ میں وارن ہیسٹنگز گورنر جنرل کا مجسّمہ (اسٹیچو) ہے۔ شمالی حصّے میں تین لفٹنٹ گورنروں کے مجسّمے اور جنوبی مغربی حصّے میں راجہ دربھنگے کا مجسّمہ ہے باغ کے اردگرد آہنی جنگلہ۔ چاروں طرف کشادہ سڑکیں۔ اور بڑی بڑی شاندار سرکاری و غیر سرکاری خوشنما و پاکیزہ عمارتیں مسلسل ہیں۔ اس باغ اور عمارتوں نے ایسا عجیب و غریب منظر بنا رکھا ہے کہ ہندوستان میں اس سے

بہتر کہیں دیکھنے میں نہیں آتا +

بلیک ہول - باغ کے مغرب کی طرف سڑک کے اُس پار جنرل پوسٹ آفس ہے۔ اُس کے دائیں طرف سنگ سیاہ کا ایک چبوترہ بنا ہوا ہے اور پتھر پر یہ الفاظ کندہ ہیں "کالی کوٹھڑی اس جگہ تھی"۔ کالی کوٹھڑی سے اُس حادثہ کی طرف اشارہ ہے جو ۱۷۵۶ء میں نواب سراج الدولہ ناظم بنگالہ کی طرف سے ۱۴۶ گوروں کو ایک تنگ و تاریک کوٹھڑی میں رات بھر بند رکھنے کے متعلق مشہور ہے۔ لارڈ کرزن نے بلیک ہول کے مظلوموں اور کلکتہ کے محافظوں کے واقعات تازہ رکھنے کی غرض سے باغ کے شمال مغرب میں سنگ مرمر کا ایک ہشت پہلو ستون ۱۹۰۲ء میں قائم کیا اور اُس کے متعلق خبروں کو ایک کتاب کے ذریعے شائع کیا۔ مگر عجیب بات یہ ہے کہ ایک بنگالی لکھارے کمار متر نے انہیں دنوں واقعۂ بلیک ہول کے بے اصل ہونے پر ایک کتاب مشتہر کر دی +

امپیریل لائبریری - یہ ڈلہوزی سکوئر سے جنوب مغرب کی طرف ہے پہلے اس عمارت کا نام مٹکاف ہال تھا جو سر چارلس مٹکاف گورنر جنرل کی یادگار میں تعمیر ہوئی ہے۔ سر چارلس پہلے گورنر جنرل ہیں جنہوں نے اخبار نویسوں کو آزادی عطا کی۔ اس میں انگریزی کتب خانہ اور مختلف قسم کے اخبار پہلے سے تھے۔ لارڈ کرزن نے اس کو ترقی دیکر مشرقی علوم کی نادر کتابوں کا ذخیرہ اس میں فراہم کر دیا۔ اس لائبریری کے مہتمم مسٹر ہری ناتھ ڈے مشرقی اور مغربی زبانوں کے زبردست عالم ہیں +

گورنمنٹ ہوس - یہ ڈلہوزی انسٹیٹیوٹ سے تقریباً تین سو قدم جنوب کی طرف ہے۔ اس کی عمارت بہت مستحکم اور خوبصورت ہے۔ لارڈ ولزلے کے عہد میں دس لاکھ پونڈ کے صرف سے تیار ہوئی تھی۔ گورنر جنرل کشور ہند

ایّام اقامت کلکتہ میں اسی جگہ رہتے ہیں ٭

ٹون ہال۔ گورنمنٹ ہوس سے مغرب کی جانب ٹون ہال ہے۔ اس میں بالعموم جلسے اور دعوتیں ہوا کرتی ہیں۔ اس میں انگریزی حکام کے علاوہ اُن نیک دل ہندوستانیوں کی تصویریں بھی ہیں جنہوں نے ملکی خدمات میں ناموری حاصل کی۔ انہی میں مولوی مدنؒ مرحوم کا مجسّمہ ہے ٭

میدان۔ گورنمنٹ ہوس سے جنوب کی طرف ایک بڑا وسیع رقبہ میدان کے نام سے موسوم ہے۔ اس پر گھاس کا فرش زمرّدین ہروقت بچھا رہتا ہے۔ اس کے مغربی حصے میں ایڈن گارڈن (عدن باغ)۔ فورٹ ولیم۔ اور مشرقی و جنوبی جانب اکٹرلونی مانومنٹ۔ کوئین وکٹوریا۔ گورنر جنرلوں اور چند دیگر فوجی افسروں کے مجسّمے ہیں۔ اکٹرلونی مانومنٹ میجر جنرل سر اکٹرلونی کی یادگار میں ۱۶۵ فٹ بلند مینار ہے۔ اس پر چڑھنے سے تمام شہر کی عمارتیں بخوبی نظر آتی ہیں ٭

فورٹ ولیم۔ میدان کی عمارتوں میں سب سے زیادہ شاندار ہندوستان کے انگریزی قلعوں میں سب سے سوا مستحکم۔ اور جنگی ساز و سامان کے لحاظ سے جبرالٹر سے دوسرے درجہ پر ہے۔ اس میں آج سے سو برس پہلے کے پُرانے ہتھیاروں کا ذخیرہ ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ ۱۷۵۸ء سے شروع ہو کر ۱۷۷۳ء میں ختم ہوا اور بیس لاکھ پونڈ اس کی تیاری میں خرچ آیا ٭

گھوڑ دوڑ۔ فورٹ ولیم کے جنوب میں ایک میدان گھوڑ دوڑ کے نام سے موسوم ہے۔ اس میں تین بہت بڑی بڑی عمارتیں کمپنی کی طرف سے تماشبینوں اور جواریوں کے لئے بنائی گئی ہیں۔ ہندو جواریوں کو یہاں پاجامہ پہنکر آنے

٭ مولوی مدنؒ شاہجہانپور کے ایک بہت بڑے عالم اور مشہور متقی تھے۔ لارڈ ڈلہوزی کے زمانہ میں کلکتہ کے مدرسہ عالیہ کی صدر مدرسی کا عہدہ اُن کے متعلق تھا۔ سیّد انشا نے ایک شعر میں اُن کی مقدس داڑھی پر یوں اشارہ کیا ہے:۔ شعر (بڑھائی شیخ نے داڑھی اگرچہ سن کی سی ٭ مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی)

کلکتہ کا نظارہ اخترلونی مینار سے
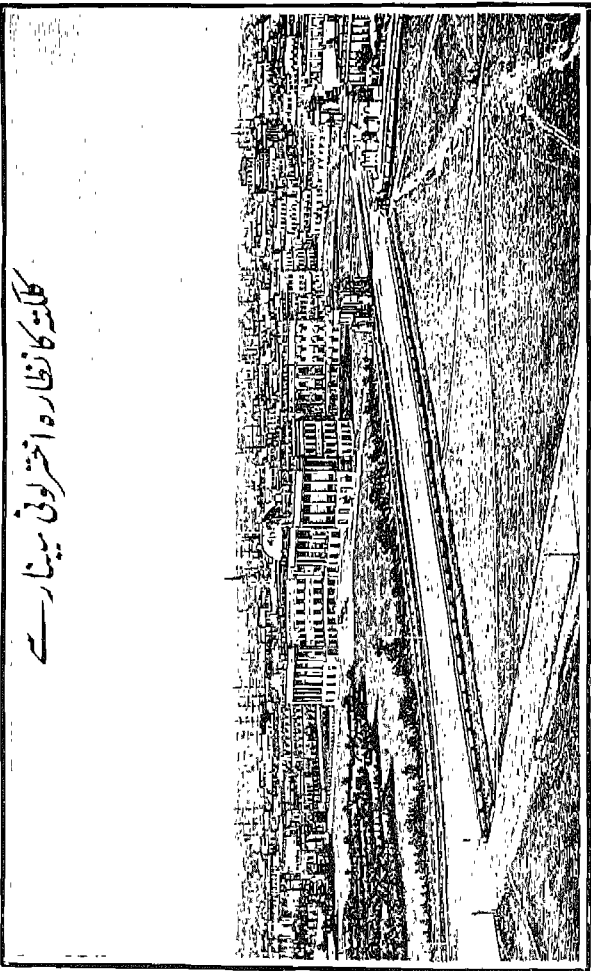
کا حکم ہے۔ بیچارے مارواڑیوں کو اس حکم کی تعمیل میں بڑی دشواری پیش آتی ہے +

چورنگی۔ گھوڑ دوڑ سے جب واپس آئیں تو میدان کے مشرق کی طرف ایک بڑی لمبی سڑک ملیگی جو چورنگی کے نام سے مشہور ہے۔ کُل اچھی اچھی سرکاری اور غیر سرکاری عمارتیں اس سڑک پر ہیں۔ اس کے پیچھے مختلف سڑکوں پر کلکتہ کے دولتمند لوگوں کے خوبصورت مکان باغات کے اندر بنے ہوئے ہیں۔ یہاں کی عمارتوں میں آرمی اینڈ نیوی سٹور۔ ایشیاٹک سوسائٹی۔ آرٹس سکول۔ عجائب خانہ۔ یونائٹڈ سروس کلب بنگال کلب اور اچھے اچھے ہوٹل ہیں +

آرمی اینڈ نیوی سٹور۔ یہ عمارت یہاں کے مکانات میں سب سے زیادہ خوبصورت اور کلکتہ کی عمارتوں میں صناعی کا اعلےٰ نمونہ ہے۔ یہ اس قدر عظیم الشان دکان ہے کہ اس میں ہر ملک کی چیزیں مل سکتی ہیں +

ایشیاٹک سوسائٹی۔ اس میں عربی فارسی اور سنسکرت کا کتب خانہ۔ انواع و اقسام کے سکّوں کا ذخیرہ۔ اور تانبے کے بُت رکھے ہوئے ہیں۔ اس کی بنیاد سر ولیم جونس نے ۱۷۸۴ء میں قائم کی تھی۔ مدعا اس سے یہ تھا کہ سرزمین ایشیا کے اسرار۔ باشندوں کے حالات۔ دماغی ترقیاں۔ مذہبی عقائد۔ اور ملکی رسم و رواج انگریزوں کو معلوم ہوں تاکہ سلطنت کے کاروبار آسانی سے چل سکیں تھوڑے عرصے میں سرکار کی امداد سے ایشیا کے آثار قدیمہ سلطنتوں کی ترقی و تنزل کی تاریخوں۔ سائنس۔ فلسفہ اور ادب کے متعلق تحقیقات شروع ہوئی اور عربی۔ فارسی سنسکرت اور دیگر زبانوں کے قلمی نسخوں کا ایک گراں بہا ذخیرہ جمع ہو گیا۔ چند نادر اور نفیس کتابیں سوسائٹی نے زر کثیر سے شائع بھی کیں۔ خصوصاً ہندوستان کی اکثر بڑی بڑی فارسی تاریخوں مثلاً طبقات ناصری۔ تاریخ فیروز شاہی ضیاء الدین۔ تاریخ فیروز شاہی شمس سراج۔ اکبر نامہ۔ آئین اکبری (شیخ ابو الفضل) منتخب التواریخ عبد القادر بدایونی

اقبال نامہ جہانگیری۔ بادشاہ نامہ۔ عالمگیر نامہ۔ مآثر عالمگیری۔ منتخب اللباب خافی خاں اور مآثر الامرا کے چھاپنے سے تاریخ کا معقول ذخیرہ بہم پہنچا دیا۔ اس وقت پندرہ سولہ ہزار عمدہ عمدہ کتابیں اس سوسائٹی کے قبضہ میں ہیں +

عجائب خانہ۔ اس کی عمارت بہت خوبصورت اور اس میں ہندوستان کی قدیم چیزیں جس قدر فراہم کی گئی ہیں اور جو عجائبات کثرت سے وہاں موجود ہیں۔ اُن کی نظیر ہندوستان کے اور کسی شہر میں نہیں۔ یہ عجائب خانہ ایشیاٹک سوسائٹی نے قائم کیا تھا۔ قدیم چیزوں کے متعلق سوسائٹی نے جس قدر تحقیقات کرکے شائع کی اُس کی نسبت اتنا کہدینا کافی ہے کہ اُس سے زیادہ چھان بین آج تک کسی سوسائٹی نے نہیں کی۔ اب یہ عجائب خانہ ۱۸۶۶ء سے گورنمنٹ کے قبضہ میں ہے +

آرٹس سکول۔ عجائب خانہ کے متصل گورنمنٹ سکول آف آرٹس ہے جس میں طلبا کو دستکاری۔ مصوری۔ لکڑی اور پتھر کے اسٹیچو بنانا اور دیگر ہنر سکھائے جاتے ہیں +

متفرق عمارتیں۔ چورنگی سے مشرق کی طرف ولزلی سٹریٹ میں مسلمانوں کا مشہور مدرسہ عالیہ ہے۔ یہاں سے دھرم تلا سٹریٹ اور بو بازار کو دیکھتے ہوئے جب آگے بڑھیں تو کولوٹولہ کے ارد گرد بنگالیوں کے اخبار اور چھاپے خانے اور علمی درسگاہیں ہیں۔ اسی موقع پر میڈیکل کالج اور کلکتہ یونیورسٹی ہے۔ کلکتہ کی سرکاری اور نجی کی عمدہ عمدہ عمارتوں کو جو شہرت ہے افسوس کہ مذہبی عمارتیں اس حیثیت سے بالکل خالی ہیں۔ ہندؤں کی عمارتوں میں کالی گھاٹ بہت پرانا مندر اور مسلمانوں کی عمارتوں میں زکریا مسجد بہت بڑی وسیع ہے +

کالی گھاٹ کا مندر بھوانی پور میں واقع ہے۔ کلکتہ کے آثار قدیمہ میں یہی ایک جگہ قابل دید ہے۔ مندر کی عمر تین سو برس سے کم نہ ہوگی۔ اس میں کالی دیوی کا بُت رکھا ہُوا ہے جس کو دُرگا بھی کہتے ہیں۔ یہ شیو کی بیوی تھی۔ اس

کا حُلیہ بہت عجیب و غریب ہے چمڑا سیاہ - چہرہ ہولناک اور خون سے بھرا ہُوا
بدن میں سانپ لپیٹے ہوئے - گلے میں کھوپڑیوں کا ہار آویزاں ہے - کسی
زمانہ میں اس کے خوش کرنے کو انسان کی قربانی کی جاتی تھی - کلکتہ کے تمام
ہندو اس کو متبرک سمجھتے ہیں - اور اس کی نسبت یہ مثل اُن کی زبان پر جاری
ہے "کالی کلکتہ والی - تیرا بچن نہ جائے خالی" - دُرگا پوجا جو تمام بنگالہ میں مشہور
تیوہار ہے اس کا بڑا بھاری میلہ اس مندر میں ہوتا ہے +

بوٹینیکل گارڈن (باغ نباتات) - یہ ہوڑا میں ہے اور اس میں ہزاروں
قسم کے درخت ہیں - خاصکر دواؤں کے درخت بہت عجیب و غریب ہیں -
میڈیکل کالج کے طالب علم وقتاً فوقتاً نباتاتی معلومات بڑھانے کی غرض سے
یہاں آتے رہتے ہیں +

صنعت و حرفت - صنعت و حرفت کے لحاظ سے یہاں ایسی کوئی ترقی
نہیں ہوئی جس کا ذکر خصوصیّت سے کیا جائے - البتہ جوہریوں کی بڑی بڑی
دکانیں اور کارخانے ہیں جہاں کئی قسم کے جواہرات درست کئے جاتے ہیں -
اور پھر اُن کے زیورات راجاؤں اور نوابوں کے واسطے بنائے جاتے ہیں -
ہوڑا میں جُوٹ - ریشم - آٹا پیسنے اور نیز دیگر کئی قسم کی بڑی بڑی کلیں جاری ہیں -
جن میں ہزاروں آدمی ہر روز کام کرتے ہیں +

تجارت - تجارت کے لحاظ سے کلکتہ ایک نامور شہر ہے - بہار - بنگال
و آسام کی پیداوار ریل کے ذریعہ چین - جاپان - سنگاپور اور جزائر کا تجارتی
مال جہازوں کے ذریعہ کھچا چلا آتا ہے - یورپ و امریکہ سے خرید و فروخت کا
سلسلہ برابر جاری ہے جس کی وجہ سے سینکڑوں جہاز دریائے ہوگلی میں
کھڑے رہتے ہیں - مال کی اس درآمد برآمد کے واسطے ہُگلی کے متصل کمپنی

کی طرف سے ایک پختہ گدام تقریباً ایک میل لمبا اور دو سو گز چوڑا بنا ہُوا ہے۔ یہاں کے لوگ اس کو جٹی کہتے ہیں۔ سودیشی کی تحریک اور بائی کاٹ کے باعث جس پر تقسیم بنگال کے بعد عملدرآمد ہونے لگا۔ ولایت کا مال آنے میں فی الجملہ کمی ہوگئی ہے۔

تجارت میں سب سے بڑا حصہ مارواڑی اور اگروال بنیوں کا ہے۔ یہ لوگ بیشتر کپڑے اور سوت کی تجارت کرتے ہیں۔ ان کی کوٹھیاں بڑے بازار میں ہیں۔ مسلمانوں میں سورت اور کاٹھیاوار کے بڑے بڑے تاجر اور اکثر چوٹا اور ریشم وغیرہ کے کارخانہ دار ہیں۔ ان کی کوٹھیاں سندر یا پٹی کے قریب ہیں۔ دلّی وال سوداگروں کی دکانیں خاص کر کولوٹولا اسٹریٹ پر ہیں۔ چمڑے کی آڑھت بھی اسی بازار میں ہے۔

انگریزی تعلیم کلکتہ میں انگریزی تعلیم ترقی کے جس معراج کو پہنچی ہے۔ ہندوستان کا کوئی شہر اُس کی برابری نہیں کرسکتا۔ اُنیسویں صدی مسیحی کی پہلی چوتھائی تک تمام علوم[۱] مشرقی زبانوں کے ذریعہ سکھائے جاتے تھے۔ مگر ۱۸۳۵ء میں لارڈ میکالے کی تجویز سے تعلیم علوم کا ذریعہ انگریزی زبان قرار پائی۔

[۱] مشرقی علوم کی ترقی اور تنزّل کی مختصر تاریخ یہ ہے کہ اٹھارھویں صدی مسیحی میں جب صوبہ بہار، بنگالہ اور اُڑیسہ کے اختیارات دیوانی شاہ عالم بادشاہ دہلی کی طرف سے ایسٹ انڈیا کمپنی کو عطا ہوئے تو اُس وقت عدالتوں میں فارسی زبان مستعمل تھی۔ قانون فوجداری اور شہادت۔ شرع محمدی کے موافق تھا۔ انگریزی عہدہ داروں کو ہندوستانیوں کے رسم رواج اور خاصکر مسلمانوں کی زبان و قانون کی نگہداشت کا بڑا لحاظ تھا۔ اسلیئے وارن ہیسٹنگز نے ۱۷۸۰ء میں مدرسہ عالیہ جس کا دوسرا نام محمڈن کالج ہے قائم کیا تاکہ مسلمان طالب علم فارسی زبان اور علم فقہ کی تعلیم پاکر دیوانی اور فوجداری عدالتوں کے عہدے پانے کے لائق ہوجائیں۔ عہدہ ہائے قضا۔ افتا۔ منصفی۔ صدر امینی وغیرہ عہدہ ہائے مال مثل تحصیلداری و ڈپٹی کلکٹری کی قابلیت کا ذریعہ عربی دانی اور علم فقہ کی مہارت تھی۔ وکالت کا پیشہ جو بڑا معزز کام ہے

اس وقت سے انگریزی علوم کی تحصیل کے واسطے کئی مدرسے اور کالج جاری ہو چکے تھے۔ لارڈ ڈلہوزی نے ۱۸۵۵ء میں یونیورسٹی کی بنیاد ڈال کر تعلیم کا انتظام مستحکم کر دیا۔ بنگالی اس نکتہ کو بخوبی سمجھ گئے کہ حکام وقت کے سامنے عزت حاصل کرنے کا ذریعہ انگریزی زبان اور انگریزی علوم ہیں۔ اس واسطے انہوں نے اس کی تحصیل پر پوری توجہ کی۔ بنگالیوں کی موجودہ ترقی تعلیم کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس وقت شہر میں پچھتر ہائی سکول۔ سولہ آرٹس کالج لڑکوں کے واسطے۔ ایک کالج لڑکیوں کے واسطے۔ ایک سول انجنیرنگ کالج (سیب پور) ایک میڈیکل کالج اور ایک سکول آف آرٹس بہت آب و تاب سے چل رہے ہیں منجملہ آرٹس کالجوں کے پریزیڈنسی کالج۔ سنسکرت کالج۔ اور لڑکیوں کا کالج گورنمنٹ کی طرف سے۔ باقی کالج مشنریوں

بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۸ - اس کی لیاقت بھی انہی علوم پر منحصر تھی۔ اس وجہ سے مسلمان اچھے اچھے عہدوں پر ممتاز اور خوشحال تھے اور مشرقی زبانوں کو خوب فروغ تھا*

علوم عربیہ کی اشاعت ہو رہی تھی کہ لارڈ ولزلے گورنر جنرل نے ۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم کالج اس غرض سے قائم کیا کہ تازہ وارد سولیین حکام کو اردو۔ فارسی اور شاستری زبانیں سیکھنے اور باشندگان ملک کے رسم و رواج سے زیادہ واقفیت حاصل کرنے کا موقعہ ملے۔ سرجان گلگرسٹ پرنسپل فورٹ ولیم کالج نے اردو کو کثیر الرواج دیکھ کر تجویز کی کہ اس زبان میں حکام کی تعلیم کے واسطے مناسب اور مفید کتابیں تالیف کرائی جائیں۔ ۱۸۰۱ء میں دہلی و لکھنو کے اردو دان اور گجرات کے شاستری خواں کلکتہ میں بلائے گئے۔ میر امّن دہلوی کی باغ و بہار۔ میر شیر علی افسوس لکھنوی کی آرائش محفل اور سری للوجی گجراتی کی پریم ساگر اور دیگر بیسیوں کتابیں اسی زمانہ کی یادگار ہیں۔ سرجان گلگرسٹ صاحب کی کوششوں کا یہ نتیجہ ہوا کہ دفتر کی زبان فارسی کے عوض اردو قرار پا گئی۔ باوجودیکہ بنگالہ کے دفاتر بنگال میں اور اڑلیسہ کے اوڑیا میں تھے لیکن صدر بورڈ اور صدر نظامت عدالت کا کام اردو میں ہوتا تھا۔ اپیلیں اردو میں لکھی جاتی تھیں۔ بلکہ جو مثل اپیل میں آتی اس کا ترجمہ بھی اردو زبان میں ہو کر پیش ہوتا تھا*

اور ہندوؤں کے روپے سے قائم ہیں۔ بنگالیوں نے تقسیم بنگال کے بعد ایک نیشنل یونیورسٹی اور اُسکے ساتھ ایک عظیم الشان کالج قائم کیا ہے۔ اگرچہ گورنمنٹ نے یونیورسٹی کو چارٹر (فرمان شاہی) عطا نہیں کیا مگر بنگالیوں کا عام رجحان اسی کی طرف ہے۔ اور اس کی ڈگریوں کو بہت وقعت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

مسلمانوں کی تعلیم - کلکتہ میں مسلمانوں کا کوئی کالج نہیں جس کی وجہ کچھ تو کم علمی کچھ ضروریات زمانہ سے ناواقفی اور خاص کر افلاس ہے۔ اس وقت ان کی درسگا

بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۲۹ - انگریزوں کی اس قدردانی سے ہندوستان کے بڑے بڑے لائق علما اور شعرا کلکتہ میں چلے آئے۔ صرف و نحو۔ لغت۔ ادب۔ منطق۔ فلسفہ۔ تاریخ طب اور ہندوستان کی قدیم مذہبی کتابیں چھپنی شروع ہو گئیں۔ اور ساتھ کے ساتھ تصنیفات جدیدہ کا دروازہ بھی کھل گیا۔ فقہ اور دھرم شاستر کی مستند کتابوں کا انگریزی میں ترجمہ ہونے سے انگریزوں کے واسطے ہندوستانیوں کے مذہبی اور ملکی معلومات کا بہت کچھ سرمایہ بہم پہنچ گیا۔ اس زمانہ میں عربی لغت۔ ادب اور فقہ کے متعلق بعض ایسی کتابیں شائع ہوئیں جن کو مہد کے چھاپہ خانوں سے اوّلیت طبع کا حق حاصل ہے۔ اُنیسویں صدی مسیحی کے ایک تہائی زمانہ تک مشرقی علوم کا ڈنکا بڑے زور سے بجتا رہا۔ مدرسہ عالیہ کے تعلیم یافتہ گورنمنٹ میں با اقتدار اور با اثر تھے کہ گورنمنٹ کی تعلیمی پالیسی نے پلٹا کھایا۔ لارڈ میکالے کی تجویز اور ولیم بنٹنگ گورنر جنرل کے حکم سے ۱۸۳۵ء میں تحصیل علوم کا ذریعہ انگریزی زبان قرار پائی۔ مشرقی علوم کے طالب علموں کے وظیفے بند کئے گئے اور عربی و سنسکرت کی کتابوں کا چھاپنا موقوف ہوا۔ مسلمانوں نے اس تجویز کو اپنے حق میں مضر سمجھکر علما اور عمائد شہر کے اتفاق رائے سے گورنمنٹ میں ایک درخواست دی کہ موجودہ طریقہ تعلیم کی تبدیلی سے گورنمنٹ کا منشا معلوم ہوتا ہے کہ سب ہندوستانیوں کو عیسائی بنا لے۔ اُس وقت سے مسلمانوں کو سرکاری مدارس اور انگریزی تعلیم سے اجتناب پیدا ہوا لیکن یہ عجیب بات ہے کہ ہندو جس شوق سے مشرقی زبانیں سیکھا کرتے تھے۔ اب اسی ذوق کے ساتھ انگریزی پر جھک پڑے۔ اس سے بھی زیادہ عجیب واقعہ یہ ہے کہ ۱۸۲۴ء میں جب تعلیمی کمیٹی نے سنسکرت کالج قائم کیا تو ہندوؤں نے بسرپرستی راجہ رام موہن رائے جو بڑے عالی خاندان اور ذی لیاقت برہمن تھے گورنمنٹ سے درخواست کی کہ ہم کو سنسکرت دانی کی ضرورت نہیں۔ گورنمنٹ کو تمام کوششیں انگریزی علوم کی اشاعت پر کرنی چاہئیں + مؤلف

وہیں ایک مدرسہ عالیہ ہے جس کو وارن ہیسٹنگز نے اٹھارھویں صدی مسیحی کی ضروریات کے موافق جاری کیا تھا۔ گورنمنٹ کی تعلیمی پالیسی تبدیل ہونے سے اس مدرسہ کے تعلیم یافتہ زمانہ کی ضرورتوں کے موافق با اثر عالم اور گورنمنٹ میں معزز عہدے پانے کے بجائے محض مسجد کے ملّا رہ گئے۔ کچھ عرصہ ہوا کہ گورنمنٹ نے اس مدرسہ کی بہبودی کو مدنظر رکھ کر تین ہزار روپیہ سالانہ محسن فنڈ سے اس کے مصارف کے واسطے مقرر کر دئے ہیں۔ اس وقت مدرسہ کے دو حصے ہیں :-

(۱) عربی ڈیپارٹمنٹ جس میں عربی علم ادب اور فقہ و فرائض کی تعلیم ہوتی ہے *

(۲) اینگلو پرشین ڈیپارٹمنٹ جس میں انٹرنس کلاس تک پڑھائی کا انتظام ہے *

مدرسہ کے ساتھ دو بورڈنگ ہوس بھی ہیں۔ مگر تعلیمی نتائج خاطر خواہ نہیں۔ اس مدرسہ میں ہمیشہ بڑے بڑے لائق یوروپین پرنسپل رہے ہیں جن کو مشرقی علوم سے خاص دلچسپی تھی۔ جیسے ڈاکٹر سپرنگر اور مسٹر بلاک مین۔ ان کی کوششوں سے چند اعلےٰ درجہ کی عربی فارسی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ اس وقت ڈاکٹر ڈینیسن راس یہاں کے پرنسپل ہیں۔ ان کو عربی فارسی میں اچھا دخل ہے۔ مگر یہ امر افسوسناک ہے کہ عربی فارسی کے مدرس معمولی لیاقت کے ہیں اور یہی سبب ہے کہ عربی درجہ کے فارغ التحصیل طلبہ بہت معمولی لیاقت حاصل کر کے نکلتے ہیں۔ ایک مدرس کی نسبت مشہور ہے کہ وہ ایک دن مَنْ جَدَّ فَوَجَدَ کے متعلق لڑکوں سے کچھ تقریر کر رہے تھے کہ اتنے میں ڈاکٹر راس صاحب آگئے اور انہوں نے مولوی صاحب سے پوچھا فَوَجَدَ پر فَ کیسی ہے۔ مولوی صاحب نے کہا حدیث میں مَنْ کے بعد فَ آجاتی ہے۔ جب ڈاکٹر صاحب نے کتاب حدیث کا حوالہ پوچھا تو بولے کہ کل دیکھ کر بتلاؤنگا *

ڈاکٹر راس صاحب کے زمانہ میں کئی قسم کی اصلاحیں ہوئی ہیں۔ نصاب تعلیم

از سر نو مرتب کیا گیا۔ بعض لائق اساتذہ کا اضافہ بھی ہوا جن میں مولوی عبدالوہاب بہاری علم ادب اور معقولات کے اچھے ماہر ہیں۔ لیکن اصل بات یہ ہے کہ کلکتہ کے مسلمانوں کا نام جہاں تموّل اور تجارت کی فہرست سے خارج ہے۔ تعلیم میں بھی یہ کس مپرس ہیں۔ کلکتہ کے اکثر کالجوں اور سکولوں میں عربی و فارسی پڑھانے کے لئے صوبہ بہار۔ اودھ اور شمالی ہند کے مدرّس ملازم ہیں +

یتیم خانہ

یتیم بچوں کی پرورش اور تعلیم کے واسطے ایک یتیم خانہ سید صالح لین میں ہے۔ یہاں دستکاری اور نوشتخواند دونو چیزوں کی تعلیم ہوتی ہے۔ مگر انتظام اچھا نہیں۔ میں اور قاری محمد یوسف صاحب جس دن یتیم خانہ میں گئے۔ ایک اُستاد صاحب لیٹے ہوئے اور لڑکے اُن کے پاؤں دبا رہے تھے۔ سپرنٹنڈنٹ صاحب موجود نہ تھے۔ معلوم ہوا کہ وہ ایک معزز شخص کے بھائی ہیں۔ صبح و شام ایک دفعہ یتیم خانہ کا چکّر لگا جاتے ہیں اور اس کے عوض ساٹھ روپے ماہوار لے لیتے ہیں +

انجمن اسلامیہ

مسلمانوں کی تعلیمی ترقی اور قومی بہبودی کے واسطے ایک انجمن مذاکرہ علمیہ اسلامیہ ہے جس کو نواب بہادر عبداللطیف سی۔ آئی۔ ای مرحوم نے ۱۸۶۳ء میں قائم کیا تھا بیان کیا جاتا ہے کہ نواب صاحب مرحوم نے مسلمانوں کی تعلیم کی نسبت بڑی خدمات کی ہیں۔ اور وہ کلکتہ میں مسلمانوں کے لیڈر تھے۔ گورنمنٹ ہند نے محسن فنڈ سے جو امداد مسلمانان بنگال کی ترقی تعلیم کے واسطے ۱۸۷۳ء میں منظور کی اس کے محرک نواب صاحب مرحوم ہی تھے۔ اگرچہ کلکتہ کے چند معزز مسلمان اس انجمن کے ممبر ہیں مگر ان کی کوششوں سے مسلمانوں کا کوئی قومی کالج کلکتہ میں قائم نہ ہوا۔ اور نہ انگریزی تعلیم میں مسلمانوں نے معقول ترقی کی۔ حالانکہ ہندوؤں کی تعلیمی ترقی کا نمونہ ان کے سامنے موجود ہے۔ سرسید احمد خاں مرحوم کی کوششوں سے علیگڈھ کالج میں مسلمانوں نے جو ترقی کی وہ بھی ان کے پیش نظر ہے۔ غالباً انجمن کی اصل پالیسی

یہ ہے کہ مسلمانوں میں صرف مذہبی علوم اور عربی زبان کی اشاعت کی جائے۔
بالفعل انگریزی زبان کو مدرسہ عالیہ میں جو ترقی ہے لوگوں نے بیان کیا کہ یہ آنریبل مولوی
سید امیر علی صاحب سابق جج ہائی کورٹ کلکتہ کی بیدار مغزی اور مسلمانوں کی خیرخواہی
کا نتیجہ ہے جو ہمیشہ مسلمانوں کو انگریزی زبان اور انگریزی علوم کی تحصیل پر توجہ دلاتے
رہتے تھے۔ اس وقت انجمن کے سکرٹری نواب مرحوم کے بیٹے نواب ابوالفضل
عبدالرحمن ہیں +

پریس

پریس۔ جتنے اخبار اس شہر سے نکلتے ہیں شاید ہندوستان کے کسی اور حصے
سے نہ نکلتے ہوں۔ سٹیٹمین۔ امپائر اور انگلشمین تین اینگلو انڈین اخبار ہیں۔ ان کا
ایک اڈیشن روزانہ اور ایک ہفتہ وار شائع ہوتا ہے۔ ان کا دفتر میدان میں ہے
بنگالیوں کے دو اخبار بنگالی اور امرت بازار پتر کا انگریزی میں بڑے پایہ کے ہیں
ان کا دفتر کولوٹولہ سٹریٹ میں ہے۔ بنگالی کے اڈیٹر بابو سرندرا ناتھ بنرجی ہیں
جنھوں نے اُنیسویں صدی مسیحی کے آخری حصہ میں علم و فضل اور قومی خدمتگذاری
میں بہت شہرت حاصل کی ہے۔ اس اخبار کے تین اڈیشن روزانہ۔ ہفتہ وار
اور پندرہ روزہ شائع ہوتے ہیں۔ روزانہ کی اشاعت چالیس پینتالیس ہزار ہے
امرت بازار پتر کا بھی روزانہ ہے اور اس کی اشاعت معقول ہے۔ ان دونو اخباروں
کے مضامین کو پبلک اور گورنمنٹ وقعت کی نگاہوں سے دیکھتی ہے۔ ان کے
علاوہ کئی ہفتہ وار اخبار انگریزی اور بنگالی میں شائع ہوتے ہیں۔ ان میں بنگوباشی
بنگالی میں سب سے زیادہ معزز ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ہندوستان کے تمام
اخباروں سے اس کی اشاعت زیادہ ہے کئی ماہوار رسالے بھی نکلتے ہیں۔
ان کے علاوہ اور کئی اخبار تھے جو ۱۹۰۷ء میں شورش انگیز مضامین شائع
ہونے کے باعث بند ہو گئے +

مسلمانوں کا کوئی اخبار انگریزی میں شائع نہیں ہوتا اور یہ امر اُن کے لئے باعث شرم ہے کہ ہندوستان کے دارالحکومت میں اُن کے خیالات ظاہر کرنے کا کوئی آلہ نہ ہو۔ ایک اخبار مسلمان نام جو انگریزی میں چھپتا ہے وہ برائے نام مسلمانوں کا اخبار ہے درحصل اُس سے کانگرس کی حمایت مقصود ہے۔ اس وقت مسلمانوں کے صرف دو اخبار کولوٹولہ سٹریٹ سے شائع ہوتے ہیں حبل المتین فارسی میں اور دارالسلطنت اُردو میں۔ حبل المتین بلا شبہ ایک آزاد خیال اخبار ہے مگر اس میں زیادہ تر ایران کے پالیٹکس سے بحث ہوتی ہے۔ اس واسطے کہا جاسکتا ہے کہ وہ خاص ایرانیوں کے فائدے کے واسطے ہے۔ اس صورت میں یہ کہنا کچھ بیجا نہ ہوگا کہ کلکتہ جیسے عظیم الشان شہر میں مسلمانوں کا صرف ایک اُردو اخبار ہے اور جو کچھ ہے غنیمت ہے۔ اس کے مالک پٹنہ کے ایک تاجر مولوی عبداللطیف ہیں +

آج سے کچھ دنوں پیشتر ایک رسالہ لسان الصدق مولوی ابو الکلام محی الدین آزاد دہلوی کے زیر اہتمام نکلتا تھا۔ مسلمانوں کی اصلاح معاشرت اور اسلامی علوم پر اکثر لطیف بحثیں اس میں ہؤا کرتی تھیں۔ آزاد صاحب اگرچہ ابھی نوجوان ہیں مگر اُن کی تحریریں پُر زور اور تقریریں بہت دلچسپ ہوتی ہیں بمبئی کو نقل مکان کرنے سے یہ رسالہ اب بند ہو گیا ہے +

بنگالیوں کی علمی ترقی

بنگالیوں کی علمی ترقی۔ انگریزی تعلیم اور انگریزی خیالات کی اشاعت سے کلکتہ اور بنگال میں ایسے قابل لوگ پیدا ہوئے جن کی کوششوں نے بنگالیوں میں ترقی کی روح پھونک دی۔ بنگالی قوم جو صدہا سال سے خواب غفلت میں پڑی سو رہی تھی اور جس نے علمی اور عملی حیثیت سے قرون ماضیہ کی تاریخوں میں کبھی جگہ نہیں لی۔ اب ہندوستان میں اُن کی علمی۔ قانونی اور

سیاسی قابلیتوں کی شہرت ہوئی - اُن کی فصاحت بیان اور طلاقت زبان کی ہندوستان سے انگلستان تک دھوم مچ گئی - سب سے بڑے قابل احترام راجہ رام موہن رائے اور بابو کیشب چندر سین ہیں جن کی نیک دلی اور بلند خیالی سے بنگالیوں کو مذہبی اور قومی ترقی کا احساس ہوا - بنگالی زبان کے لٹریچر کو ترقی دینے اور اس میں علمی ذخیرہ بہم پہنچانے سے بنکم چندر چٹرجی شونا تھ شاستری - مائیکل مادھو سودن دت - رویندرا ناتھ ٹھاکر اور رمیش چندر دت جیسے اعلےٰ درجے کے انشا پردازوں نے ملک اور قوم کی وہ خدمت کی جس سے بنگالی زبان کو ہندوستانی السنہ کے مقابلہ میں خاص وقعت حاصل ہوگئی ہے سیاسی معاملات میں مسٹر بانرجی - سر یندر ناتھ بینرجی - لال موہن گھوش اور آربندو گھوش جیسے پُرجوش لیڈروں نے انہیں وہ درس دیا جس سے آزاد خیالی اور حق طلبی کی قوت بجلی کی طرح ان کے رگ وپے میں سرایت کر گئی غرض انگریزی حکومت نے تمدّن اور تہذیب کے جلنے میدان کھولے تھے - بنگالی اُن سب میں ہندوستان کے دیگر باشندوں سے پیش قدم نکلے - مگر ان ترقیات کے ساتھ یہ امر کچھ کم حیرت انگیز نہیں کہ عیسویت نے ان پر غلبہ حاصل کیا اور عام لکھے پڑھوں کے علاوہ چند بڑے بڑے لائق اور قابل لوگ بھی عیسائی ہوگئے - علمی ترقی کے ضمن میں یہ بات خصوصیت سے قابل ذکر ہے کہ مسٹر ہری ناتھ ڈے ان میں وہ شخص ہیں جنہیں سولہ سترہ زبانوں میں عمدہ مہارت ہے - خاصکر عربی میں اُنھوں نے ایسی قابلیت پیدا کی ہے کہ سال گزشتہ میں عربی کے اعلےٰ درجہ کا امتحان پاس کر کے تین ہزار روپے انعام حاصل کیا تھا +

بنگالیوں کی اس عظیم الشان ترقی کے مقابل میں تمام بنگال و بہار میں

اگر کسی مسلمان جلیل القدر عالم کا نام لیا جا سکتا ہے۔ تو وہ صرف مسٹر سید امیر علی صاحب سی آئی ای سابق جج ہائی کورٹ کلکتہ ہیں جنہوں نے انگریزی زبان میں مسلمانوں کے قانون اور اُن کی تاریخ میں ایسی اعلےٰ درجہ کی قابلیت پیدا کی ہے کہ ان کی تصانیف ہندوستان اور انگلستان دونو ملکوں میں نہایت عزت کی نظر سے دیکھی جاتی ہیں +

ہندو بنگالیوں کی علمی ترقی کا سب سے زیادہ قابل تعریف نمونہ "نیشنل کونسل آف ایجوکیشن" ہے جو انہوں نے تقسیم بنگال کے بعد قومی چندے سے قائم کی ہے۔ اس کے ماتحت کلکتہ میں ایک عظیم الشان کالج اور مختلف مقامات میں بہت سے سکول کھول دئے ہیں۔ جو تعلیم گاہیں یونیورسٹی ایکٹ کی قیود کے باعث کلکتہ یونیورسٹی سے علیحدہ ہوگئی تھیں۔ انہوں نے اپنے آپ کو اس جدید قومی کونسل تعلیم سے وابستہ کر لیا اور اس طرح ایک آزاد قومی یونیورسٹی کی بنیاد پڑ گئی۔ اس کی عطیہ سندیں خواہ سرکاری محکموں میں مقبول نہ ہوں مگر دیسی ریاستوں اور پرائیویٹ کارخانوں میں بخوبی کارآمد ہیں +

شورش ۱۹۰۶ء میں جو شورش بنگال میں ہوئی اور جس کی ہولناک آواز نے پنجاب۔ مدراس اور ہندوستان کے چند دوسرے مقامات میں ۱۸۵۷ء کی یاد کو تازہ کر دیا۔ اس کی ابتدا بھی کلکتہ سے ہوئی تھی۔ یہ شہر اس وقت نہ صرف وائسرائے کا دارالحکومت بلکہ چار کروڑ بنگالی زبان بولنے والوں کی علمی سوسائٹی اور سیاسی لیڈروں کا مرکز ہے جس کی نظیر ہندوستان کے کسی حصہ میں نہیں بنگالیوں نے انگریزی علوم اور انگریزی خیالات میں جو ترقی کی اُس کا پہلا نتیجہ آزاد خیالی اور حق طلبی تھا جو نیشنل[1] کانگریس کی شکل میں ظاہر ہوا +

---

[1] نیشنل کانگریس۔ ہندوستانی تعلیم یافتوں کی ایک پولیٹیکل جماعت ہے۔

دوسرا زینہ گورنمنٹ کی تجاویز پر کھلم کھلا نکتہ چینی تھی جس کا ظہور لارڈ کرزن کے انتظامات کے دوران میں ہوا۔ یہ خیالات یوں تو ایک مدت سے ان کی طبائع میں راسخ ہو چکے تھے مگر ان کا اظہار یونیورسٹی ایکٹ سے شروع ہوا جس کو لارڈ کرزن نے ۱۹۰۴ء میں پاس کیا تھا۔ اس ایکٹ سے ہندوستان کے لئے تعلیمی مدارج کا طے کرنا مشکل تر ہو گیا۔ پھر ان خیالات کو زیادہ فروغ اُس تقریر سے ہوا جس میں لارڈ موصوف نے کلکتہ یونیورسٹی کے سالانہ اجلاس میں ہندوستانی تعلیم یافتوں کو بہت ناپسندیدہ الفاظ سے یاد کیا تھا۔ اس تقریر سے تعلیم یافتہ جماعت بھڑک اُٹھی اور تمام ہندوستان میں جوش پھیل گیا۔ جاپان

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۳۶) جس کی ابتدائی تحریک کا اعزاز گورنمنٹ انڈیا کے سابق سکرٹری مسٹر ہیوم کو حاصل ہے ۱۸۸۴ء میں انہیں یہ خیال پیدا ہوا کہ اگر ہندوستان کے نامور مدبر سال بھر میں ایک مرتبہ کسی مرکز میں جمع ہو کر ملک کے سوشل معاملات پر تبادلہ خیالات کیا کریں تو اس سے اُن کے خیالات میں بڑی ترقی ہو گی۔ اور ملک کو بڑا فائدہ پہنچیگا۔ انگریزی تعلیم سے آزاد خیالی کا مادہ دیسی لوگوں میں پیدا ہو چکا تھا۔ اب مسٹر ہیوم کی رہبری سے اس کو عملی صورت کا لباس پہنانے پر آمادہ ہو گئے۔ چنانچہ ۱۸۸۵ء میں بعہد لارڈ ڈفرن تہتر ہندو بہتر منتخدوبین (ڈلیگیٹوں) کی شرکت سے بمبئی میں اس کا آغاز ہوا۔ اور مسٹر ڈبلیو سی۔ بانرجی صدارت کی کرسی پر اجلاس فرما ہوئے۔ رفتہ رفتہ پارسی۔ مرہٹے۔ بنگالی اور مدراسی لیڈروں کے زیر سایہ اس نے وہ نشو و نما پایا۔ کہ ہر صوبہ میں اس کے اغراض و مقاصد کی تکمیل کے واسطے پراونشل کمیٹیاں مقرر ہوئیں۔ بمبئی۔ کلکتہ۔ مدراس۔ الٰہ آباد۔ لاہور اور دیگر بڑے بڑے شہروں میں ہزاروں آدمی اس کے سالانہ جلسوں میں شامل ہونے لگے۔ ہندو۔ پارسی۔ مسلمان اور انگریز مختلف اوقات میں صدر مجلس مقرر ہوئے ملکی معاملات میں کئی قسم کے حقوق حاصل ہونے کے واسطے انہوں نے رزولیوشن پاس کئے۔ غرض اس شان و شوکت کے جلسوں سے گورنمنٹ کو معلوم ہو گیا۔ کہ کانگریس ایک قومی قوت ہوتی جاتی ہے۔ حامیان کانگریس کی تقریریں اور

اور روس کی عظیم الشان لڑائی میں جو کامیابی جاپانیوں کو ہوئی تھی۔ اُس سے بنگالیوں کے خیالات میں اور بھی تلاطم پیدا ہوگیا۔ یہ حالت دیکھ کر لارڈ کرزن نے سال آئندہ میں تقسیم بنگال کی کارروائی شروع کردی جس سے غالباً اُن کی متحدہ قوت کا منتشر کرنا مدِنظر تھا ⁂

یونیورسٹی ایکٹ اور رسالانہ تقریر کی مخالفت سے بنگالیوں کا غصّہ ابھی ٹھنڈا نہیں ہوا تھا۔ کہ ۱۶۔ اکتوبر ۱۹۰۵ء کو تقسیم بنگال کے اعلان سے اُن کا جوش اور بڑھا اور ایجیٹیشن (شورش) کی بنیاد شروع کی۔ بنگالیوں کی وسیع اور تعلیم یافتہ آبادی میں جابجا جلسے کرنے شروع کئے اور بعض اوقات بیباکانہ تقریریں بھی

تحریریں ایسی زبردست تھیں کہ ان کا اثر ہندوستان سے نکل کر انگلستان تک جا پہنچا۔ اور غالباً یہ پہلا آرگن تھا۔ جس نے ہندوستانیوں کی پولٹیکل آواز انگلستان والوں کے کانوں تک پہنچائی ⁂

اگرچہ کانگریس میں چند مرتبہ بعض معزز مسلمان بھی شریک ہوئے۔ مگر اس کا غالب عنصر غیر مسلم قومیں ہی رہیں۔ جنہوں نے انگریزی تعلیم سے پورا فائدہ اُٹھایا۔ اور تجارت و تموّل میں اُن کا نمبر بہت بڑھا ہوا تھا۔ مسلمانوں سے دراصل انہیں واقعی ہمدردی نہ تھی۔ اینگلو انڈین عہدہ دار بھی دل ہی دل میں کانگریس سے ناخوش تھے۔ مسلمانوں نے ان کی اور اپنی حالت میں فرق دیکھ پاکر کانگریس سے علیحدگی اور ناراضی کا اظہار کیا۔ سب سے پہلے شخص آنریبل سر سیّد احمد خاں مرحوم تھے۔ جنہوں نے ۱۸۸۸ء میں کانگریس کی مخالفت پہ کا صفحوں میں کا پھیر دیا۔ بعض مسلمان کچھ تو غدر ۱۸۵۷ء کے واقعات سے خوف زدہ تھے۔ بعض کو گورنمنٹ کی ناراضی کا خیال تھا۔ اور بعض کو کمی تعلیم سے ابھی اس کی جرأت نہ ہوئی تھی۔ یہ سب سر سیّد کے ہم خیال ہوگئے۔ حامیان کانگریس نے ان لوگوں کو طالب خطابات۔ حکّام کی ملاقات کے متمنی۔ لارڈ کی کے خواستگار اور خوشامدی کے الفاظ سے یاد کیا۔ مگر یہ گورنمنٹ کی پالیسی کے ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ گورنمنٹ کو موجودہ طریق عمل قائم رکھنے اور حامیانِ کانگریس کو ٹالے بالے بتانے کا اچھا موقع ملا۔ یہ بات بہت

کیں - قوم اور ملک کو جوش دلانے کے واسطے سودیشی کی تحریک اور بائی کاٹ کے دو بڑے ذریعے یکے بعد دیگرے قائم کیے - سودیشی کی تحریک اگرچہ کوئی ناپسندیدہ کام نہ تھا مگر بائی کاٹ کے مسئلہ نے جلتی آگ پر تیل کا کام دیا بنگالیوں نے ان دونو کی تائید میں نہایت عالیشان جلسے منعقد کیے - بہت بارونق جلوس نکالے اور یہ قرار پایا کہ جب تک تقسیم منسوخ نہ ہو - یہ دونو جاری رہیں - اور تقسیم کی مخالفت کی یادگار میں ہر سال ۱۶ - اکتوبر کو ایجی ٹیشن برپا کیا جائے - علاوہ بریں قوم کو اُکسانے یا گورنمنٹ کو بھڑکانے کے واسطے "بندے ماترم" کا نعرہ جاری کیا - بپن چندر پال - یوگانتر - سندھیا اور بندے ماترم اخباروں کی تحریروں نے اس جوش کو خوب ترقی دی +

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۳۸) بحث طلب ہے کہ اگر ہندو مسلمان دونو فریق متفق رہتے تو کانگریس کو اپنے دعاوی میں کہاں تک کامیابی ہوتی - اور مسلمانوں کو جو تعلیم میں ان سے بہت پیچھے اور تعداد میں نہایت کم ہیں - اس کامیابی سے کیا فوائد حاصل ہوتے +

ہندو مسلمانوں کے باہمی اختلافات کے باعث کانگریس کی یہ کیفیت تھی کہ خود ہندوؤں میں آپس کی نااتفاقی پیدا ہوئی اور حامیان کانگریس کے دو فرقے ہو گئے - ایک فرقہ گورنمنٹ سے بزور دعاوی حاصل کرنے کا خواہشمند ہوا جو اکسٹریمسٹ (انتہا پسند) قرار پایا - اور دوسرا فرقہ حکمت عملی سے اپنے مطالب حاصل کرنے پر قائم رہا - اس کا نام ماڈریٹ (اعتدال پسند) رکھا گیا سنہ ۱۹۰۷ء کی کانگریس منعقدہ سورت میں ان دونو کی ٹھن گئی - اور بائیس برس کے منصوبوں کا جہاز نااتفاقی کے صدمے سے پاش پاش ہو گیا - مخالفین نے خوب قہقہے لگائے اور اخباروں میں دھواں دھار مضامین نکلے - اکسٹریمسٹ کے طرز عمل نے ملک میں سخت ایجی ٹیشن پیدا کیا - گورنمنٹ پر کھلم کھلا نکتہ چینی شروع کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ گورنمنٹ نے کئی اخباروں کا لہجہ بغاوت آمیز دیکھ کر اُن کو بند کر دیا - چند اڈیٹر اور قومی سرگرم جیل خانے بھیجے گئے - کئی ایک بہی خواہان ملک جلاوطن کیے گئے - گویا وہ خوفناک نتائج بعینہٖ ظہور میں آئے جن کی نسبت سرسید نے ۱۸۸۷ء کے لکچر میں اشارہ کیا تھا - اگرچہ کانگریس ٹوٹ گئی - مگر ہر فریق از سرِ نو اس کے چلانے کے فکر میں ہے + مؤلف

یہ تقریری اور تحریری کارروائیاں ہو رہی تھیں کہ بنگالیوں نے گورنمنٹ کو دھمکانے کی عملی تدبیریں شروع کیں اور پولیٹیکل جرائم پر کمر باندھی۔ جنہوں نے آخر کار ڈکیتیوں کی شکل اختیار کی۔ پولیٹیکل جرائم کا آغاز دسمبر ۱۹۰۷ء سے ہے۔ جبکہ بمقام نرائن گڈھ نواب لفٹننٹ گورنر بنگال کی ٹرین تباہ کرنے کی کوشش کی گئی۔ مظفر پور میں ایک بم کے گولہ سے دو انگلش لیڈیاں ہلاک کی گئیں۔ جس کا مرتکب خودی رام بوس تھا۔ اس عرصہ میں مانک ٹولہ باغ کلکتہ میں ایک بہت بڑی بم ساز جماعت کا پتہ ملا۔ اور اس قدر آتش گیر مادے اور اسلحہ گرفتار ہوئے جو کلکتہ کی نصف آبادی کے برباد کر دینے کو کافی تھے۔ اس مقدمہ میں دو واقعات بہت اہم ہیں۔ اول کنہئی لال دت اور ستندرا ناتھ بوس جنہوں نے سرکاری گواہ گوسائیں کو جیل خانہ میں قتل کر ڈالا۔ دوم نندلال بنرجی انسپکٹر پولیس کا قتل جس نے خودی رام بوس کو گرفتار کیا تھا۔ بعض اوقات چلتی ٹرین پر گولے پھینکے گئے۔ ایک گولہ ندیا کے مجسٹریٹ کو پارسل کے ذریعہ بھیجا گیا۔ کئی جگہ ڈکیتیاں ہوئیں اور اس کا سلسلہ بہت سرگرمی سے اب تک جاری ہے بنگالی لوگ ان واقعات کو قوم پرستی اور ملکی خیر خواہی سے تعبیر کرتے ہیں۔ جن لوگوں نے اپنی جان دینے اور قتل و ڈکیتی کرنے میں خصوصیت سے جرأت دکھلائی۔ ان کو قومی شہدا کا لقب دیتے ہیں۔ اور ان کی تصویریں بطور جاں نثاران ملک کے شائع کرتے ہیں۔ یہ حالت دیکھ کر گورنمنٹ کو یقین ہو گیا کہ بنگالیوں کی طرف سے علانیہ تحریکوں کے علاوہ خفیہ طریق سے بھی مخالفانہ کوششیں جاری ہیں۔ اسلئے اخباروں۔ عام جلسوں اور آتشگیر مادوں کی مزید نگرانی کے واسطے گورنمنٹ کو جدید قانون بنانے پڑے۔ علاوہ عدالتی کارروائیوں کے نو بنگالیوں کو جن کی نسبت یہ خیال تھا۔ کہ وہ درپردہ فساد انگیز کارروائیوں میں شامل ہیں

رگیولیشن ۳ ۱۸۱۸ء کے مطابق جلاوطن کیا۔ اگرچہ بنگالیوں کی طرف سے مخالفتوں کا سلسلہ جاری ہے مگر گورنمنٹ تقسیم بنگال کے مسئلہ پر بدستور قائم ہے +

لارڈ کرزن نے یونیورسٹی ایکٹ پاس کرنے اور بنگال کے دو حصے کردینے سے جو ملکی مصلحتیں سوچی ہوں۔ ان کو وہی خوب سمجھتے ہیں مگر اس میں کچھ شک نہیں کہ بنگالی ان دونوں قوانین کے اجرا سے بیدار ہو گئے۔ صنعتی اور علمی ترقی کے واسطے اُنہوں نے ایک انجمن قائم کی جس کے مطابق تیس چالیس تعلیم یافتہ نوجوان ہر سال جاپان۔ امریکہ اور یورپ بھیجے جاتے ہیں۔ ایک نیشنل یونیورسٹی بھی قائم کر لی جو تعلیمی رکاوٹیں دور کرنے کا بڑا بھاری ذریعہ ہے +

کلکتہ سے چند بڑے بڑے شہروں کا فاصلہ حسب ذیل ہے :-

	مسافت	کرایہ درجہ سوم	کرایہ درجہ دوم
مدراس براہ بجواڑہ	۱۰۳۲ میل	۱۳ روپے ۷ آنے	۴۷ روپے ۲ آنے
حیدرآباد براہ بجواڑہ	۹۸۷ //	۱۲ // ۶ //	۴۱ // ۸ //
بمبئی براہ ناگپور	۱۲۲۱ میل	۱۲ // ۵ //	۴۰ // ۱۴ //
بمبئی براہ مغل سرائے	۱۳۴۹ میل	۱۳ // ۳ //	۴۴ // ۱۱ //
احمدآباد براہ جلگاؤں	۱۲۸۱ //	۱۵ / ۱۴ /	۴۲ // ۱۲ //
اجمیر براہ آگرہ	۱۰۲۶ //	۹ // ۱۰ //	۳۶ // ۱۲ //
کراچی براہ دہلی	۱۸۱۰ //	۱۸ // ۱۲ //	۶۱ // ۵ //
کوئٹہ //	۱۷۵۲ //	۱۸ // ۷ //	۶۰ // ۱۴ //
پشاور براہ انبالہ	۱۵۰۱ //	۱۵ // ۵ //	۵۲ // ۱۴ //
شملہ براہ انبالہ	۱۱۳۵ //	۱۴ // ۱ //	۵۱ // ۱۲ //
ڈیرہ دون براہ لکھنؤ	۹۵۳ //	۹ // ۸ //	۳۵ // ۱ //
دارجیلنگ	۳۷۹ //	۸ // ۴ //	۲۴ // ۱۴ //
ڈھاکہ	۲۶۴ //	۳ // ۶ //	۱۲ روپے

کٹک

کلکتہ اور کٹک میں ۲۵۳ میل کا فاصلہ ہے۔ یہ شہر اُس لائن پر واقع ہے جو سمندر کے کنارے کنارے کلکتہ سے مدراس تک ۱۰۳۲ میل لمبی بچھی ہوئی ہے۔ مغلوں اور مرہٹوں کے عہد میں یہ شہر صوبہ اُڑیسہ کا دار الحکومت تھا۔ اب اُڑیسہ کے صاحب کمشنر کا صدر مقام ہے۔ اس کی آبادی اکاون ہزار نفوس کی ہے جس میں چھٹے حصّے کے قریب مسلمان ہیں۔

کٹک کا محل وقوع بہت خوشنما ہے۔ اس کے شمال کی جانب دریائے مہاندی اور جنوب کی طرف کاٹ جوڑی ہے۔ یہ دونو ندیاں کچھ دُور جاکر آپس میں مل گئی ہیں۔ اور اس سے شہر ایک جزیرہ کی شکل بن گیا ہے۔ زمین سرسبز اور میوہ دار درختوں سے بھرپور ہے۔ آب و ہوا صحت بخش اور خوشگوار ہے شہر کے مکانات معمولی اور اکثر خس پوش ہیں۔ صرف ایک پُرانا قلعہ قابل دید ہے جس کو بارہ باتی کہتے ہیں۔ یہ ایک ہندو راجا کا بنایا ہُوا ہے۔ سول سٹیشن اور چھاؤنی کی آبادی ملحق ہونے سے شہر کی رونق اچھی ہوگئی ہے۔

یہاں کے سُنار چاندی اور سونے کے زیورات بنانے میں مشہور ہیں اور ایسا نفیس کام بناتے ہیں کہ تاجر لوگ دُور دُور تک بطور تحفہ و عجائبات لے جاتے ہیں۔

مقامی آبادی کے لحاظ سے تعلیم خاطر خواہ ہے۔ گورنمنٹ کالج کے علاوہ دو تین ہائی سکول بھی ہیں۔ مگر مسلمانوں کی تعلیمی حالت اچھی نہیں۔

پوری

کٹک اور پوری میں ۵۰ میل کا فاصلہ ہے۔ راستہ میں مقام خوردا روڈ

گاڑی تبدیل کرنی پڑتی جو ریلوے کا جنکشن اور پوری سے ۲۸ میل ہے یہ ایک چھوٹا سا قصبہ سمندر کے کنارے ہے۔ اس کی موجودہ شہرت جگن ناتھ جی کے مندر کے باعث ہے جو ہندوؤں کا بہت پرانا اور مقدس معبد ہے۔ ہندوستان کے مختلف مقامات کے لوگ بارہ مہینے اس کی جاترا کو آتے رہتے ہیں۔ قصبہ کی دیسی آبادی کثافت سے پُر ہے مگر سول سٹیشن جس میں صاحب کلکٹر اور دیگر عہدہ دار رہتے ہیں اس کی سڑکیں مصفّا۔ آب و ہوا عمدہ۔ اور منظر قابل دید ہے۔ پوری کے علاقہ میں چاول بکثرت پیدا ہوتے ہیں اور دُور دُور تک جاتے ہیں۔ چنانچہ بمبئی کے مشہور سیٹھ حاجی صابو صدیق کا ایک گماشتہ منشی غلام محمدؐ چاولوں کی خریداری کے واسطے اس جگہ رہتا ہے۔ مختلف مقامات کے دُکاندار میلہ کے دنوں میں یہاں آکر معمولی سودے سلف کی دُکانیں لگاتے ہیں ؂

مندر کی عمارت بہت شاندار اور ایک قلعہ نما فصیل سے گھری ہوئی ہے جس کے چاروں طرف چار دروازے ہیں۔ موجودہ عمارت کی بنیاد راجہ اننگ بھیم دیو نے ڈالی تھی جو ۵۹۵ھ ۱۱۹۸ء میں تکمیل کو پہنچی۔ کہتے ہیں کہ ساڑھے سات لاکھ روپے اس کی تعمیر پر خرچ ہوئے تھے۔ اس کے اندر ایک چبوترے پر تین بُت رکھے ہیں۔ (۱) جگن ناتھ جی کا (۲) بلبھدّر جی کا (۳) سوبھدّرا کا۔ جگن ناتھ جی کے بُت کو بعض لوگ گوتم بُدھ کا اوتار مانتے ہیں اور بعض کرشن جی کا۔ اور بعضوں کا خیال ہے کہ خود پرمیشر نے یہاں جنم لیا۔ مگر محققین کے نزدیک یہ مورت کرشن جی کی ہے۔ کیونکہ بلبھدّر جی اُن کے بھائی اور سوبھدّرا اُن کی بہن ہیں۔ اگرچہ یہ بات محقق ہے کہ کرشن جی یہاں کبھی نہیں آئے۔ بلکہ جزیرہ نما کاٹھیاوار کی بندرگاہ دوارکا میں مارے گئے مگر یہ تسلیم کیا گیا ہے کہ کرشن جی کا روانی

تعلق اس مندر سے ضرور ہے ÷

یہ تینوں مورتیں عمدہ عمدہ زیوروں اور زرق برق لباسوں سے ہمیشہ آراستہ رہتی ہیں۔ ان کو ہر روز اشنان کرایا جاتا ہے۔ رات دن میں کئی مرتبہ کپڑے بھی بدلوائے جاتے ہیں۔ حلوا۔ پوری۔ چاول۔ کھچڑی اور کئی قسم کا بھوگ آٹھ پہر میں چھ دفعہ ان کے آگے رکھا جاتا ہے۔ یہ بھوگ بافراط تیار ہوتا ہے۔ اور پوتّر (پاک) مانا جاتا ہے۔ پوجاری لوگ حصص مقررہ کے مطابق اس کو بانٹ لیتے ہیں۔ گھروں میں خود کھاتے ہیں اور معزز جاتریوں کو کھلاتے ہیں۔ جو بچ رہتا ہے اُسے بازار میں بیچ ڈالتے ہیں۔ غریب جاتری وہاں سے خرید لاتے ہیں۔ غرض یہاں کے لوگوں اور جاتریوں کی خوراک کا دارومدار اسی بھوگ پر ہے۔ کوئی آدمی اپنے ہاں کھانا نہیں پکواتا۔ سب سے عجیب بات یہ ہے کہ ہندؤں کی مختلف قوموں میں کھانے پینے کے متعلق جھوٹا در چھوت چھات کی جو رسمیں ہندوستان میں جاری ہیں۔ اس بھوگ کی افراط نے اُن سب کو جگن ناتھ میں توڑ دیا ہے۔ مصارف مندر کے واسطے بہت سے دیہات واگزار ہیں۔ جاتریوں کے نذرانہ سے لاکھوں روپے سالانہ کی جو آمدنی ہوتی ہے وہ اس کے علاوہ ہے ÷

اس مندر کے متعلق بڑا میلہ رتھ جاترا کا ہے جو سال بسال ساڑھ مہینے میں ہوتا ہے۔ یہ رتھ پندرہ سولہ پہیّے کا ہوتا ہے اور ہر سال لکڑی کی ثابت شہتیریوں سے بنایا جاتا ہے اور اس قدر بھاری ہوتا ہے کہ اُس کے پہیّے چلتے وقت زمین میں دھسے جاتے ہیں۔ جگن ناتھ۔ بلبھدر اور سوبھدرا کو پُر تکلف لباس سے پیراستہ اور زیورات سے آراستہ اس پر سوار کر کے جنک پور کے باغ تک لے جاتے ہیں۔ اس وقت ہزاروں جاتری "جے جے کار" پکارتے ہوئے

بیحد شور و غل برپا کرتے ہیں۔ اور رتھ کے سامنے فحش گیت گاتے جاتے ہیں جن کی نسبت ان کا خیال ہے کہ جگن ناتھ اس سے خوش ہوتے ہیں۔ باوجودیکہ مندر اور جنک پور میں ایک میل سے زیادہ مسافت نہیں۔ مگر جب تک یہاں کے راجہ (ہیڈ پوجاری) کا عمل دخل تھا۔ رتھ تین دن میں پہنچتا اور اُتنی ہی مدت میں واپس آتا تھا۔ ہزاروں آدمی جہازی رسّوں سے اُس کو کھینچتے تھے۔ پجاریوں نے بیان کیا کہ بعض اوقات جب جگن ناتھ جی ناراض ہوتے ہیں تو دو دو تین تین دن تک رتھ ایک جگہ کھڑا رہتا ہے۔ خواہ کتنے ہی آدمی کھینچیں ذرہ جنبش نہیں کرتا۔ اور جب وہ خوش ہوں تو تھوڑے سے آدمیوں کے ہاتھ لگانے سے چل پڑتا ہے۔ میں ۱۹۰۵ء میں اس جگہ آیا تو مندر کا انتظام گورنمنٹ کی تجویز سے بابو راج کشور صاحب مینیجر کے سپرد تھا۔ یہ گورنمنٹ انگریزی میں ڈپٹی کلکٹر کے عہدہ پر مامور تھے۔ اِن کے اہتمام سے رتھ ایک دن میں جنک پور پہنچ جاتا اور اتنے ہی عرصہ میں واپس آجاتا ہے۔ یہ بابو صاحب کی خوش قسمتی ہے کہ جگن ناتھ جی اُن سے کبھی ناخوش نہیں ہوتے۔ اور رتھ کا دورہ وقت مقررہ کے تیسرے حصے میں ختم ہو جاتا ہے +

اجرائے ریل اور خصوصاً انگریزی حکومت سے پیشتر جاتریوں کے سفر۔ مندر کے حالات۔ اور رتھ کی روانگی کے متعلق جو عجیب و غریب معاملات وقوع میں آتے تھے۔ ڈاکٹر برنیر ایک فرانسیسی عالم نے سترھویں صدی کے وسط میں اور چند انگریزوں نے اُنیسویں صدی کے شروع میں اُن کی نسبت چشم دید کیفیات بہت تفصیل سے لکھی ہیں۔ خلاصہ اُن کا یہ ہے :-

(۱) ہندوستان کے اطراف و جوانب کے جاتری دو دو مہینے کی مسافت طے کر کے یہاں آتے ہیں۔ بُعدِ مسافت اور تکالیفِ سفر سے ہزاروں آدمی راستہ

میں مرجاتے ہیں۔ جس قدر جگن ناتھ قریب آتا ہے اُسی قدر انسانوں کی ہڈیاں راستوں میں پڑی ہوئی زیادہ دکھائی دیتی ہیں +

(۲) بعض خوش عقیدہ لوگ اپنے تئیں جگن ناتھ کے رتھ کے پہیّوں کے نیچے ڈال دیتے ہیں اور ہڈیوں کے چُور چُور ہونے سے سسک کر مرجاتے ہیں۔ یہ لوگ اس طرح مرنے کو اپنی نجات کا باعث سمجھتے ہیں +

(۳) کئی سو خوبصورت کسبیاں مندر کی ملازم ہیں جو مندر کے اندر اور رتھ کے سامنے ناچتی ہوئی نہایت بے شرمی کی حرکتیں کرتی ہیں۔ علاوہ بریں یہ اپنے تئیں برہمنوں۔ سادھوؤں اور فقیروں کے واسطے وقف سمجھتی ہیں۔ غیر قوم کا آدمی خواہ کتنا ہی روپیہ انہیں دے۔ اُس کے پاس جانا قبول نہیں کرتیں +

(۴) سال بسال ایک خوبصورت لڑکی جگن ناتھ جی کی شادی کے واسطے منتخب کی جاتی ہے جس کو یہ یقین دلایا جاتا ہے کہ خود جگن ناتھ جی شب کو اُس کے ساتھ ہم بستر ہونگے۔ مگر دراصل ایک ہٹا کٹا برہمن پوشیدہ راستہ سے آکر اُس لڑکی کے ساتھ رات گزارتا ہے +

ریل کے جاری ہونے سے سفر کی تکالیف زائل ہوگئیں۔ اور بانی تینوں رسمیں سرکار نے خلاف اخلاق سمجھ کر حکماً بند کردیں +

دیسی آبادی میں ایک مسجد بھی ہے جو حاجی صابو صدیق کے گماشتے منشی غلام محمد صاحب نے سڑک کے ایک طرف بنوائی ہے۔ یہاں مسافروں کو کھانا ملتا ہے۔ غریبوں اور بے نوا دیوں کو کچھ نقد بھی دیا جاتا ہے اور یہ سب مصارف حاجی صاحب کی ایجنسی سے ادا ہوتے ہیں۔ منشی صاحب نے ایک دکان قصاب کی بھی کھلوا دی ہے۔ پجاریوں نے مخالفت کی تھی مگر کامیابی نہیں ہوئی +

مُرشد آباد

جگن ناتھ سے براہ کلکتہ میں اس جگہ پہنچا۔ کلکتہ اور مرشد آباد میں ۱۲۲ میل کا فاصلہ ہے۔ یہ شہر دریائے بھاگی رتھی کے کنارے نواب مرشد قلی خاں کا آباد کیا ہؤا ہے جو اورنگزیب کے آخری زمانہ ۱۱۱۶ھ میں ناظم بنگالہ تھا۔ اس وقت تک بنگالہ کا دارالحکومت ڈھاکہ تھا۔ مگر نواب صاحب کی حُسن لیاقت سے یہ عزت مرشد آباد کو حاصل ہوگئی۔ شاہی زمانہ میں اس کی آبادی کئی میلوں میں تھی۔ ہر قسم کے باکمال اور اہل ہنر یہاں موجود تھے۔ دہلی کی برہمی کے زمانہ میں بہت سے شرفا اور اہل علم یہاں چلے آئے اور یہیں سکونت اختیار کرلی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہد میں جب بنگالہ۔ بہار اور اُڑیسہ کی دیوانی انگریزوں کو مل گئی اور اُنھوں نے بنگالہ کا صدر مقام کلکتہ قرار دیا تو اس شہر کی رونق گھٹنی شروع ہوگئی۔ اس وقت یہ معمولی حیثیت کا قصبہ ہے۔ حرفت و صنعت کو کچھ فروغ نہیں۔ تجارت بھی نہایت تنزل پر ہے بازار اور دُکانیں سُنسان پڑی ہیں +

عمارات شہر میں پانچ گنبد کی شاہی مسجد چوک دروازے کے باہر بنی ہوئی ہے اس کی عمارت عمدہ مگر غور پرداخت نہ ہونے سے غیر آباد ہے۔ اندرون شہر نواب صاحب مرشد آباد کی کوٹھی اور امام باڑہ کی عمارتیں خوش وضع لب دریا قابل دید ہیں کوٹھی کی عمارت بہت وسیع۔ شاندار اور سہ منزلہ ہے۔ اس کی تیاری کا صرف اٹھارہ لاکھ روپے بیان کیا جاتا ہے۔ یہ انواع و اقسام کے نوادرات سے آراستہ ہے۔ خصوصاً شاہی زمانہ کی چند ایسی نفیس چیزیں اس میں ہیں جن کی خوبی دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے +

اس وقت مرشد آباد کے نواب صاحب امیر الامرا نواب میر واصف خاں بہادر

ہیں جو نواب میر جعفر خاں کی یادگار و سرکارِ انگریزی کے پنشن خوار ہیں۔ یہ میر جعفر خاں نواب سراج الدولہ کے سپہ سالار تھے۔ شکستِ پلاسی[1] کا واقعہ انہی کی طرف منسوب ہے باشندگانِ شہر کو نواب صاحب کی ذات سے بہت فوائد متصور ہیں۔ ایران اور عراق کے مسافر آپ کی فیاضی کی خبریں سنکر یہاں آتے رہتے ہیں۔ مسافروں کیواسطے ایک سرائے ہے جس میں ہر وارد و صادر کو تین دن تک دو آنے یومیہ ملتے ہیں۔ ریاست کے دیوان فضل ربی صاحب بہت مدبر۔ تجربہ کار اور عمیم الاخلاق ہیں۔ آپ نے مسلمانان بنگالہ کی حقیقت پر ایک محققانہ کتاب اُردو زبان میں شائع کی ہے جو آپ کی تاریخ دانی اور تلاش مضامین کی عمدہ شہادت ہے۔

بیرون شہر ایک میل کے فاصلہ پر نواب مرشد قلی خاں کا مقبرہ اور دریا کے پرلی طرف بنگالہ کے آخری ناظم نواب سراج الدولہ کا مقبرہ نمونہ عبرت ہے۔

مرشد آباد سے دہلی اور لکھنؤ کا سیدھا راستہ بردوان ہو کر جاتا ہے پہلے تین چار میل اعظم گنج تک گاڑی کے ذریعے طے کرنے پڑتے ہیں۔ پھر ریل پر سوار ہو کر براہ نلہٹی سٹیشن بردوان پہنچتے ہیں۔ یہاں کلکتہ اور مغل سرائے کی تیز رفتار گاڑی مل جاتی ہے۔

مرشد آباد کی سیر کے بعد میں کلکتہ آیا اور یہاں سے ڈھاکہ کو روانہ ہوا۔ اس کے تفصیلی حالات مشرقی بنگال میں درج ہونگے۔

---

[1] پلاسی وہ جگہ ہے جہاں لارڈ کلائیو اور نواب سراج الدولہ کے درمیان ۱۷۵۷ء میں ایک فیصلہ کُن لڑائی ہوئی تھی۔ یہ رزم گاہ مرشد آباد سے ۳۰ میل کے فاصلہ پر کلکتہ ریلوے لائن کے کنارے واقع ہے۔ مؤلف

(ب) مشرقی بنگال و شمالی بہار

کلکتہ سے ڈھاکہ۔ دارجیلنگ۔ بھاگلپور۔ دربھنگا۔ مظفرپور۔
گورکھپور۔ نگھر۔ بہڑائچ (یہاں سے براہ لکھنؤ مرادآباد)۔ امروہہ اور میرٹھ

(مشرقی بنگال کی گزشتہ و موجودہ حالت پر ایک نظر)

مشرقی بنگال ہندوستان کا کوئی قدیم صوبہ نہیں۔ ۱۹۰۵ء میں چیف کمشنری آسام* کا پورا علاقہ اور صوبہ بنگالہ کا وہ حصہ جس کا ذکر صفحہ ۳۰۱ میں ہو چکا ہے شامل کئے جانے سے ایک نیا صوبہ قرار پایا۔ اس کا نظم و نسق ایک لفٹنٹ گورنر کے زیر حکم ہے جس کا صدر مقام ڈھاکہ ہے ؞

*یہ ملک صوبہ بنگالہ برہما اور تبت کے درمیان واقع ہے۔ ۱۸۱۹ء سے سرکار انگریزی کے قبضہ میں آیا اور ۱۸۷۴ء سے یہاں چیف کمشنری قائم ہوئی جس کا صدر مقام شیلانگ تھا۔ یہ ملک کثرت بارش میں دنیا بھر سے فوقیت لے گیا ہے۔ چنانچہ مقام چراپونجی میں جو سطح سمندر سے صرف ساڑھے چار ہزار فٹ بلند ہے تقریباً پانسو انچ سالانہ بارش ہوتی ہے۔ ندیاں بھی اس کثرت سے بہتی ہیں کہ دوسری جگہ نہ ہونگی۔ خاصکر اکسٹھ ندیاں تو ایسی ہیں کہ جن میں بارہ مہینے ناؤ چلتی ہے۔ موسم برسات میں پانی چاروں طرف پھیلا رہتا ہے۔ دریاؤں کی کثرت اور بارش کی شدت یہ دونو چیزیں اس ملک کے لئے کئی صدیوں تک ایک حصار کا کام دیتی تھیں۔ اس پر جنگلوں اور بنوں کی بہتات نے اسے اور بھی دشوار گزار کر رکھا تھا۔ انہی وجوہات سے کسی حملہ آور نے ادھر کا رخ نہیں کیا۔ اورنگ زیب پہلا فرمانروا ہے جس کے عہد میں میر جملہ نے آسام پر فوج کشی کی اور فتوحات کرتا ہوا کئی سو میل تک بڑھ گیا +

جہالت اور وحشت سے ذات پات کی یہاں کے لوگوں میں کچھ تمیز نہ تھی۔ کھانے پینے میں بھی بلانوش تھے۔ کتے اور سانپ تک چٹ کر جاتے تھے۔ مصنف عالمگیر نامہ نے ان باشندوں کی نسبت لکھا ہے "قوم بد نژاد کہ بہزاراں ہزار مرحلہ از شہرستان آدمیت و کشورستان انسانیت دور و از حلیہ دین و دانش و شعار مروت و مردمی مہجور"۔ مگر اب انگریزی

رقبہ و آبادی

یہ صوبہ ہندوستان کے شمال مشرقی دریاؤں کے حصہ زیریں میں واقع ہے اس کی مشرقی حد برہما سے اور مغربی حد صوبہ بنگالہ سے ملی ہوئی ہے۔ رقبہ ایک لاکھ گیارہ ہزار پانسو مربع میل۔ آبادی تین کروڑ نو لاکھ ۱۶ ہزار چار سو نفوس۔ اور آمدنی دو کروڑ ۳۴ لاکھ ۵۸ ہزار روپے سالانہ ہے۔ مردم شماری کے لحاظ سے مسلمان سب میں زیادہ۔ پھر ہندو۔ ان کے بعد بُدھ اور عیسائیوں کا نمبر ہے۔ یہاں کے لوگوں کی زبان بنگالی ہے۔ مگر مسلمانوں میں اردو کا بھی چرچا ہے ؞

آب و ہوا

صوبہ کی آب و ہوا میں بوجہ ناہمواری سطح زمین بہت اختلاف ہے۔ مگر سخت سردی یا سخت گرمی کہیں نہیں پڑتی۔ بارش کے دنوں میں آب و ہوا معتدل ہوجاتی ہے۔ بارش اس کثرت سے ہوتی ہے کہ امساک باراں کی شکایت کا موقع کبھی نہیں ہوتا۔ خاصکر قسمت آسام میں بارش حد سے زائد ہوتی ہے جیسا حاشیہ میں ابھی لکھا جاچکا ہے۔ آب و ہوا کے مرطوب ہونے سے کئی قسم کی جلدی بیماریاں غربا کو بیشتر ہوجاتی ہیں۔ گھینگا (گلا پھولنا) فتق (فوطوں کا بڑھنا)۔ فیلپا (پاؤں کا پھولنا) کے عوارض یہاں کثرت سے ہوتے ہیں ؞

پیداوار

مشرقی بنگال بہت زرخیز ملک ہے۔ اس میں کئی قسم کے غلّے۔ میوجات۔ اور نباتات ہوتے ہیں۔ نصف سے زیادہ کاشت دھان کی ہے جو ملک بنگال کی خوراک کا سب سے بڑا حصّہ ہے۔ میوجات میں آم۔ انناس اور کیلا ایسا عمدہ ہوتا ہے کہ دوسری جگہ

بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۴۹

عملداری میں تعلیم کی بدولت ان کی حالت کچھ کچھ سُدھرنی شروع ہوگئی ہے +
یہ عجیب بات ہے کہ آسام مدت ہائے مدید سے جادوگروں کا گھر سمجھا جاتا تھا۔ اور حسب بیان مصنف عالمگیرنامہ ہندوستان کے جادوگروں کی اُستانی لُونا چماری اور اُن کے گرد گھنٹال میاں اسمٰعیل جوگی جن کے نام جادو ٹونوں کے منتروں میں یہ لوگ جپا کرتے ہیں۔ اُن کے مندر قلعہ ناندو کے متصل پہاڑ کی چوٹی پر بنے ہوئے ہیں۔ ان پر آمد و رفت کے واسطے پتھر کا ایک ہزار زینہ تراشکر راستہ بنایا ہے منتخب از سفرنامہ ڈاکٹر بربیر مترجمہ خلیفہ سیّد محمد حسین صاحب ؞ مؤلف

کم ہوتا ہوگا۔ اور گلاب جامن تو خصوصیت سے مشہور ہے۔ چاے کی کاشت آسام میں خوب ترقی پر ہے۔ ہندوستان میں سب سے پہلے چاے کی کاشت اسی جگہ شروع ہوئی ہے۔ جُوٹ کی پیداوار بھی بکثرت ہوتی ہے ٭

باشندے کے حالات

بنگالی لوگ علی العموم غریب المزاج اور فرمانبردار ہیں۔ زیادہ تر چاول کھانے سے ان کے جسمانی قوا کمزور ہیں اور غالباً یہی وجہ ہے کہ فوجی خدمات کی فہرست بنگالیوں کے نام سے خالی ہے لیکن ذہنی قابلیت اور روشن دماغی میں انہوں نے بڑی شہرت حاصل کی ہے۔ اور اب علمی ترقی کے ساتھ ساتھ جسمانی قوت بھی بڑھاتے جاتے ہیں۔ آسامی لوگ پہلے تو سخت وحشی تھے جیسا کہ حاشیہ میں درج ہو چکا ہے لیکن اب ان کی حالت میں بہت ترقی ہوتی جاتی ہے ٭

تعلیم

انگریزی زبان اور انگریزی علوم کی ترقی کے واسطے بارہ آرٹس کالج اس صوبے میں ہیں جن میں سے دو ڈھاکہ میں ایک ایک راج شاہی۔ باریسال۔ چٹاگانگ اور سلہٹ وغیرہ مقامات میں جاری ہیں۔ بنگالیوں نے اعلیٰ تعلیم سے خوب فائدہ اُٹھایا ہے۔ مگر مسلمان اپنے ہم وطنوں سے بہت پیچھے ہیں۔ گورنمنٹ بنگال نے یہ حال دیکھ کر ۱۸۷۳ء میں محسن فنڈ (ہوگلی) سے تیس ہزار روپے سالانہ خاص مسلمانوں کی تعلیم کے واسطے منظور فرمائے اور اس سے ڈھاکہ۔ چٹاگانگ اور راج شاہی میں تین مدرسے قائم کئے جن میں علوم مشرقی اور مغربی کے دو جداگانہ صیغے مثل کلکتہ مدرسہ کے ہیں۔ باوجودیکہ مسلمانوں کی تعداد ۶۶ فیصدی ہے۔ مگر اس کثرت پر جو ترقی انہوں نے اس عرصہ میں کی ۱۹۰۶-۰۷ء کی سالانہ رپورٹ سے اُس کی تفصیل مقابلۃً حسب ذیل معلوم ہوتی ہے:۔

قسم مدارس	ہندو فیصدی	مسلمان فیصدی
پرائمری	۴۳٫۵۳	۵۱٫۶۲

قسم مدارس	ہندو فیصدی	مسلمان فیصدی
سکنڈری	۷۰ ، ۵۲	۲۷ ، ۵۱
آرٹس کالج	۹۳ ، ۶۲	۵ ، ۹۳
پروفیشنل کالج	۹۴ ، ۰۹	۵ ، ۶۴

رجسٹرار نکاح

مسلمانوں میں دینداری کے خیال سے علوم عربی کی تحصیل کا شوق یوں تو پہلے سے تھا۔ مگر اب رجسٹرار نکاح کے عہدے نے اس شوق کو اور ترقی دی۔ جو لوگ کلکتہ مدرسہ کے مجوزہ نصاب تعلیم کے مطابق امتحانات پاس کرلیں اُن کو یہ استحقاق حاصل ہے کہ رجسٹرار نکاح کے عہدے پر مقرر کئے جائیں۔ کوئی نکاحنامہ قابل اعتبار نہیں ہوتا جب تک اس رجسٹرار کے دفتر میں درج نہ کرایا جائے۔ رجسٹرار گورنمنٹ کی مقررکردہ فیس وصول کرتا ہے۔ اس کا تقرر گورنمنٹ گزٹ میں شائع ہوتا ہے۔ حکام حسب ڈیوٹی دورہ کے وقت اس کے رجسٹروں کی پڑتال کرتے ہیں۔ دیگر عہدہ داروں کی طرح اس کی تبدیلی بھی ہوتی رہتی ہے۔ ڈھاکا اور بنگالہ کے شہروں میں عربی کو جو ترقی اس وقت ہے اُسکی بڑی وجہ یہ رجسٹراری کا منصب معلوم ہوتا ہے اور اسی وجہ سے طلبا پرائیویٹ مدرسوں میں فیس دیکر عربی پڑھتے ہیں +

اگرچہ مسلمانوں کی بڑی تعداد افلاس میں مبتلا ہے مگر اس میں بھی شک نہیں کہ لیڈران قوم غریب مسلمانوں کو انگریزی تعلیم پر رغبت دلانے اور اُن کی مدد کرنے سے ایسے ہی قاصر ہیں جیسے اُن کے ہندو بھائی اپنے ہم قوموں کی مدد میں جان و مال تک صرف کرنے کو مستعد ہیں۔ آسودہ حال مسلمانوں کو بمبئی کے ایک ہندو فیاض پریم چند رائے چند سے سبق لینا چاہیئے جس نے کمال فیاضی سے سنسکرت اور انگریزی وغیرہ کے ساتھ عربی زبان کے لئے بھی وظیفہ عطا کیا ہے +

تقسیم بنگال

۱۹۰۵ء میں بنگالہ کی تقسیم پر جس قدر ناراضی کا اظہار بنگالیوں نے کلکتہ میں کیا۔ اُسی قدر مسلمانوں کے جلسے اُس کی پسندیدگی کی نسبت ڈھاکہ میں ہوتے

رہے ہیں - بنگالیوں کی طرف سے اس عرصہ میں گورنمنٹ کے برخلاف جو کاروائیاں
مثل بم کے گولوں اور ڈکیتی وغیرہ کے بنگالہ میں ہوئیں وہی حال مشرقی بنگال کا
ہے - مردم شماری کے لحاظ سے اگرچہ مسلمانوں کا عنصر غالب ہے مگر یہ جس قدر آبادی
میں بڑھے ہوئے ہیں اُسی قدر علم و دولت میں پھسڈی ہیں - اس واسطے تقسیم کا
نتیجہ عام طور پر ان کے حق میں اس سے زیادہ کچھ نہیں ہوا کہ ہندو مسلمانوں میں دشمنی
دن بدن بڑھتی جاتی ہے اور آئے دن عدالتوں تک نوبت پہنچنے سے مسلمانوں
کی حالت بُری ہوتی جاتی ہے - لیڈران قوم میں خلوص کی نسبت شوق مسابقت
اور سرکاری مناصب و حصول خطابات کی آرزو غالب ہے - ان کی قومی ہمدردی کا اندازہ
کمیلہ اور باریسال کے اُن فوجداری مقدمات سے ہوسکتا ہے جو مسلمانوں کے
برخلاف قائم ہوئے تھے - بیان کیا جاتا ہے کہ مقدمات کی پیروی کے واسطے
ڈھاکہ سے ایک مسلمان بیرسٹر بھیجا گیا تھا - مجسٹریٹ نے ثبوت استغاثہ کے بعد
بیرسٹر سے کہا کہ اب آپ کچھ کہئے - آپ نے کہا ملزم مسلمان - بیرسٹر مسلمان اور
مجسٹریٹ مسلمان - اس سے زیادہ مجھے کسی دفعہ کی ضرورت نہیں - اس لاجواب
ڈیفنس کو سُنکر مجسٹریٹ نے سب کو قید کر دیا +

تاریخی حالات

تقسیم بنگال سے پیشتر جو ملک صوبہ بنگال کے نام سے موسوم تھا - قدیم
زمانہ میں ہندو راجے اس پر حکمران تھے - آخری دور میں ندیا اُن کا پایۂ تخت
اور سنسکرت زبان کا مخزن تھا ۔۔۔ میں محمد بختیار خاں خلجی نے لکھنوتی[1] اور بنگالہ کو
فتح کرکے اسلامی حکومت قائم کی - کچھ عرصہ تک یہ صوبہ دہلی کے ماتحت تھا مگر پھر

[1] مسلمانوں کی آمد سے پیشتر بنگالہ کا ایک حصہ لکھنوتی کہلاتا تھا - اس کے دارالحکومت
کا نام بھی لکھنوتی تھا - طبقات ناصری میں لکھا ہے - "چوں سکہ و خطۂ بلاد لکھنوتی
بنام حسام الدین حسین خلجی شد و خطابش سلطان غیاث الدین گردید شہر لکھنوتی
را دارالملک ساخت" - بلاد لکھنوتی کی حد بست صاحب تاریخ فرشتہ نے بدیں قلم بند

یہاں کے صوبیداروں نے آزاد ہو کر سلاطین کا لقب اختیار کیا۔ نویں صدی ہجری کے اخیر تک لکھنوتی (گور)، سنار گاؤں، حضرت پنڈوا اور سات گاؤں (چاٹگام) وقتاً فوقتاً یہاں کے دارالخلافے ہوتے رہے ہیں۔ گوڑ اور حضرت پنڈوا ضلع مالدہ میں سنار گاؤں ضلع ڈھاکہ میں اور سات گاؤں ضلع ہوگلی میں ہے۔ سلاطین بنگالہ تقریباً سوا دو سو برس خود مختار فرمانروائی کر چکے تھے کہ ۹۸۴ھ (۱۵۷۶ء) میں شہنشاہ اکبر نے سلطنت دہلی میں اسے شامل کیا۔

بنگالہ کی سر سبزی، پیداوار کی کثرت اور سلاطین کی قدردانی کا حال سنکر بلاد اسلامیہ کے شرفا، نجبا، علما اور مشائخ وقتاً فوقتاً یہاں چلے آتے تھے جو غالباً مسلمانان بنگالہ کی موجودہ نسلوں کے مورث اعلیٰ ہیں۔ چنانچہ سادات، شیوخ، پٹھان اور مغل قوموں کا وجود اس کا مؤید ہے۔ بعض مشاہیر کو یہاں کے سلاطین نے زاد راہ بھیجکر خود بھی طلب کیا تھا۔ چنانچہ سلطان غیاث الدین بن سلطان سکندر سور (۷۶۹ھ / ۱۳۶۷ء) کا خواجہ حافظ کو شیراز سے طلب کرنے کا قصہ[1] مشہور ہے۔ مغلوں کے عہد میں ایرانی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۵۳) کی ہے۔ "بعضے گویند لکھنوتی عبارت است از گور و بنگالہ تا کنار دریاے بزرگ۔ بعضے گویند از گور تا سرحد بہار لکھنوتی است و از آں طرف گور تا بنارس و تا کنار دریاے بزرگ بنگالہ باشد و او را بتحقیق نیز بنگ گویند۔" اس جگہ دریاے بزرگ سے مراد گنگا ہے۔

گور کی تحقیقات میں مورخوں کا بہت کچھ اختلاف ہے۔ شمس العلما مولوی محمد ذکاء اللہ صاحب نے "تاریخ ہند" میں اس پر ایک طولانی تقریر کی ہے۔ خلاصہ اس کا یہ ہے۔ البیرونی کی تحقیقات کے موافق وسط بنگال کا قدیمی نام گوڑ ہے۔ ملک کے نام پر دار السلطنت بھی گوڑ ہوا جس کو مسلمانوں نے اپنی زبان میں گور بنا لیا۔ شیخ ابوالفضل کی رائے میں لکھنوتی اور گور دونوں ایک ہی ہیں وہ لکھتے ہیں "لکھنوتی زبانزد خلائق و برخے برگور"۔ مؤلف

[1] سلطان غیاث الدین سنار گاؤں کا فرمانروا تھا۔ یہ شہر دریاے پدا کے کنارے نرائن گنج ریلوے سٹیشن سے چھ سات گھنٹے کی مسافت پر ہے۔ سلطان مذکور اہل علم و فضل کا اس درجہ قدردان تھا کہ خواجہ حافظ کی شہرت کا حال سنکر ایک معتبر ان کی طلبی کے واسطے شیراز بھیجا۔ بحری سفر کی صعوبتوں کو دیکھ کر خواجہ صاحب نہ آئے۔

اور عربوں کے علاوہ ڈچ - پرتگیز اور انگریزوں کی آمد بھی شروع ہو گئی اور اُنھوں نے تجارتی کوٹھیاں یہاں قائم کیں۔ شہر ہوگلی جو تقسیم بنگال سے پیشتر صوبہ ڈھاکہ کے ماتحت تھا۔ جہازوں کا بندرگاہ قرار پاتے سے مرکز تجارت بن گیا نواب امیر الامرا شائستہ خاں صوبیدار ڈھاکہ کا زمانہ باکمال لوگوں کی آمد کے واسطے خصوصیّت سے مشہور ہے۔ اس وقت ارزانی کا یہ حال تھا کہ روپے کے آٹھ من دھان بکتے تھے۔ مغلوں کے آخری زمانہ میں جو لوگ غیر ملکوں سے بنگالہ میں آئے اور یہاں سے دہلی جاکر شہرت حاصل کی۔ اُن میں سے میر محمد نیشاپوری المخاطب بہ نواب برہان الملک سعادت خاں بانی خاندان اودھ اور حکیم میر ہادی شیرازی کے بھتیجے نواب علوی خاں طبر نامور اشخاص ہوئے ہیں۔ یہ لوگ محمد شاہ کے زمانہ میں مرشد آباد سے دہلی گئے تھے۔

انگریزی کمپنی جو ابتدا میں صرف تجارت کی غرض سے وارد ہند ہوئی تھی مغلوں کے ضعف اور اپنی دانائی سے رفتہ رفتہ ملک گیری کی طرف مائل ہوئی۔ ۱۱۷۹ھ ۱۷۶۵ء میں بنگالہ - بہار اور اڑیسہ کی دیوانی شاہ عالم بادشاہ دہلی کی طرف سے اُنہیں عطا ہوئی اور آخر کار ہندوستان کا ملک مستقل طور سے ان کے قبضہ میں آگیا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۵۴)

اور ایک غزل لکھ کر شاہی معتبر کے حوالہ کر دی جس کے آخر کے دو شعر یہ ہیں ؎

شکر شکن شوند ہمہ طوطیان ہند — زیں قند پارسی کہ بہ بنگالہ میرود

حافظ ز شوق مجلس سلطان غیاث دیں — خامش مشو کہ کار تو از نالہ میرود

مؤلف

ڈھاکہ

میں کلکتہ کے سیالدہ ریلوے سٹیشن سے رات کے دس بجے روانہ ہو کر علی الصبح گوالندو پہنچا۔ اور ریل سے اُتر کر میل سٹیمر پر سوار ہُوا۔ جو پدّا۔ میگنا۔ اور ست لکھا دریاؤں سے گزرتا ہُوا چھ گھنٹے کے عرصے میں نرائن گنج پہنچ گیا۔ پدّا اور ست لکھا دریائے گنگا کی شاخیں اور میگنا برہم پتر کی شاخ ہے۔ نام کو تو یہ شاخیں ہیں۔ مگر ان کا عرض اس قدر وسیع ہے کہ دُخانی جہاز اُن میں بآسانی آتے جاتے ہیں۔ جہاز میں ریفرشمنٹ روم کے علاوہ دلیسی اشیاے خوردنی کی بھی ایک دکان ہے۔ درمیانی بندرگاہوں میں دریا کے دونو طرف جدھر نظر ڈالو سبزی ہی سبزی دکھائی دیتی ہے خصوصاً نرائن گنج کی بندرگاہ تو بہت ہی دلکش ہے۔ یہاں کے گھاٹ پختہ اور دُخانی جہاز و کشتیاں بکثرت لنگر انداز ہیں۔ اس وقت مئی مہینہ میں دریا کا سفر بہت خوشگوار ہے۔ مگر جُون سے اکتوبر تک کبھی کبھی تلاطم کے باعث کچھ نہ کچھ تکلیف ہوتی ہے نرائن گنج سے ریل پر سوار ہو کر ایک گھنٹہ میں ڈھاکہ پہنچا۔ کلکتہ سے گوالندو تک ۱۵۰ میل۔ گوالندو سے نرائن گنج ۱۰۴ میل اور نرائن گنج سے ڈھاکہ تک ۱۰ میل کا فاصلہ ہے۔ غرض یہ ۲۶۴ میل خشکی اور تری کی مسافت ۱۴ گھنٹے میں طے ہوئی ۔

شہر ڈھاکہ بوڑھی گنگا ندی کے کنارے اُن شہروں میں سے گنا جاتا ہے۔ جو سلاطین مغلیہ کے وقت میں بڑی ترقی پر تھے ۹۸۴ھ / ۱۵۷۶ء میں اکبر اعظم کے زمانہ میں راجہ مان سنگھ نے بنگالہ پر قابض ہو کر ڈھاکہ کو سلطنت مغلیہ میں شامل کیا اور بھاگلپور صدر مقام قرار پایا۔ شہنشاہ جہانگیر کے زمانہ میں شیخ علاء الدین اسلام خان نبیرہ حضرت سلیم چشتی نے اسکو دوبارہ رونق دی اور بنگالہ کا دار الحکومت بھاگلپور سے ڈھاکہ میں منتقل کر کے جہانگیر نگر نام رکھا

پہلے بادشاہوں کے عہد میں لکھنوتی (گوڑ) - سنارگاؤں - حضرت پنڈوا اور ساتگاؤں (چاٹگام) جو باوقات مختلفہ بنگالہ کے دارالخلافہ رہ چکے تھے - ڈھاکہ کی عظمت اور شہرت سے بالکل ماند پڑ گئے - ایک مدت تک بنگالہ کے ناظم ڈھاکہ میں رہا کرتے تھے - ان لوگوں کی سرپرستی اور خصوصاً امیرالامرا شائستہ خان کی توجہ سے ڈھاکہ نے بڑی ترقی کی - چنانچہ اُن کی عظیم الشان عمارتیں اب تک اُن کی عظمت کی گواہی دے رہی ہیں - ڈھاکہ اسی روزافزوں ترقی پر تھا کہ نواب مرشد قلی خاں ۱۱۱۳ھ ۱۷۰۱ء میں ناظم بنگالہ مقرر ہوئے اور آہستہ آہستہ حکمت عملی سے بنگالہ کے صوبیدار بن گئے - ان کی ترقی اور ڈھاکہ کے تنزل کا ایک ہی زمانہ سمجھنا چاہئے - انہوں نے ڈھاکہ چھوڑ کر اپنے آباد کئے ہوئے شہر مرشد آباد کو دارالخلافہ بنایا اور ڈھاکہ میں نائب ناظم رہنے لگے - آخرکار بنگالہ کا دارالحکومت کلکتہ مقرر ہوا - اب ۱۹۰۵ء سے ڈھاکہ مشرقی بنگال کا دارالحکومت ہو گیا ہے اور ترقی کے آثار نمایاں ہیں اس وقت اس کی آبادی نوّے ہزار ہے +

یہ شہر کئی میلوں میں پھیلا ہوا ہے - اس کی آبادی بہت وسیع اور ریلوے سٹیشن سے بالکل متصل ہے - شہر کی عمارتیں پختہ - بازار کشادہ اور سڑکیں صاف و ستھری ہیں - نواب پورہ سے صدر گھاٹ تک ایک وسیع بازار تقریباً ایک میل لمبا چلا گیا ہے - راستہ میں کئی عمدہ عمدہ سرکاری اور غیر سرکاری عمارتیں خصوصاً ڈھاکہ کالج اور عربی مدرسہ دیکھنے کے لائق ہیں +

ڈھاکہ کالج سے ذرا آگے بڑھ کر ایک بازار چوک کو جاتا ہے جو تخمیناً ایک میل لمبا ہو گا - نواب صاحب ڈھاکہ کی عالیشان عمارت "احسن منزل" اسی بازار میں ہے یہ عمارت نواب احسن اللہ خاں مرحوم کی تعمیر کرائی ہوئی ہے جو نواب سلیم اللہ خاں صاحب رئیس حال کے والد اور ڈھاکہ کے بہت بڑے متموّل و فیّاض شخص تھے +

احسن منزل کا احاطہ اس قدر وسیع ہے کہ نواب صاحب کے خاندان اور متوسلین

کے مکانات سب کے سب اسی میں ہیں۔ احسن منزل کی عمارت قابل دید ہے۔ قیمتی فرش و فروش۔ شیشہ آلات اور انواع و اقسام کے عجائبات سے ایسی آراستہ ہے کہ اُس کے دیکھنے سے جی خوش ہو جاتا ہے۔ خصوصاً ڈھاکہ کی ململوں کے نمونے۔ جالیدار نقرئی ظروف۔ ہاتھی دانت کی سنیل پاٹی اور بہت سی ایسی نادر چیزیں ہیں جو دیگر مقامات میں ایک جا مشکل سے نظر آئینگی۔ اسی احاطہ میں مرزا فقیر محمدؐ اور خواجہ عزیز اللہ خاں صاحب آنریری مجسٹریٹ و رئیس ڈھاکہ کے مکانات ہیں۔ یہ دونو صاحب بڑے خوش خلق۔ مہمان نواز۔ روشن خیال اور نواب صاحب کے خاندان کے ممبر ہیں +

بازار کی بائیں جانب بڑے کٹرہ اور چھوٹے کٹرہ میں شاہی زمانے کی عمارتوں کی دو بڑے بڑے دروازے اب تک موجود ہیں۔ بڑے دروازہ کے کتبے سے معلوم ہوتا ہے کہ شہزادہ شجاع کے حکم سے تعمیر ہوا ہے۔ اگرچہ یہ دونو دروازے شمالی ہند کی عمارتوں کے مقابلے میں کچھ چیز نہیں مگر ڈھاکہ میں خصوصیت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ اسی موقع پر اخبار المشرق کا دفتر ہے جس کے مالک واڈیٹر حکیم مولوی حبیب الرحمٰن صاحب ہیں حکیم صاحب مسافر دوست۔ وسیع الاخلاق اور ذی علم ہیں اُنھوں نے فن طبابت اور اخبار نویسی سے ڈھاکہ میں بڑا رسوخ پیدا کیا ہے +

چوک بازار کے خاتمے پر امیر الامرا شائستہ خاں ناظم بنگالہ کی دو منزلہ مسجد ہے اس کی آبادی اور آراستگی کا انتظام بہت عمدہ ہے۔ حال میں سنگ مرمر کا فرش بنایا گیا ہے۔ روشنی بھی بجلی کی ہوتی ہے۔ کتب فروشوں کی دکانیں اسی چوک میں ہیں +

چوک بازار سے نکلنے کے بعد شہر کا وہ حصہ آتا ہے جو شاہی زمانہ میں بہت

آباد مگر اس وقت ویرانہ کا مشابہ ہے۔ اس حصہ کی عمارتوں میں سے لال باغ قابل دید ہے جس میں شاہی قلعہ کے کھنڈر اور نواب شائستہ خاں کی بیٹی بی بی پری (ایران دخت) کا مقبرہ سنگ سفید کا بہت خوشنما بنا ہوا ہے۔ قلعہ کے باہر ایک وسیع مسجد لال باغ کے نام سے مشہور ہے۔ بنگالہ کے نامور ادیب مولوی عبیداللہ صاحب عبیدی کا مقبرہ اس کے احاطہ میں ہے۔ اس سے مغرب کی طرف محلہ املی گولہ میں خان محمد مِردھ (میردہ) کی مسجد اس قدر بلند ہے کہ ۲۷ زینے چڑھنے کے بعد صحن تک پہنچتے ہیں۔ عمارات بیرون شہر میں ایک امام باڑہ کئی قسم کے ساز و سامان سے آراستہ اور قابل دید مقام ہے۔ نواب صاحب ڈھاکہ کا باغ جس کو شہنشاہ باغ کہتے ہیں شہر سے دو تین میل کے فاصلہ پر اپنی وسعت کے لحاظ سے مشہور ہے۔ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس ۱۹۰۶ء میں اسی جگہ ہوا تھا +

شہر اور بیرون شہر کی عمارات کی تفصیلی اطلاع حاصل کرنے میں حکیم مولوی حبیب الرحمٰن صاحب مالک و اڈیٹر المشرق۔ حافظ غلام محمد صاحب تاجر کتب چوک بازار مرزا فقیر محمد اور خواجہ عزیز اللہ خاں صاحب رئیس ڈھاکہ کی تکلیف فرمائیوں کا شکر گزار ہوں +

باوجود بازاروں کی عمدگی اور عمارتوں کی خوبی کے یہ بات بہت افسوسناک معلوم ہوئی کہ میونسپل کمیٹی کی بے پروائی اور بدنظمی سے گلی کوچے اکثر گندے رہتے ہیں۔ سنڈاسوں کی کھڑکیاں باہر کی طرف بنی ہوئی ہیں۔ ہندوستان کی طرح یہاں کے مہتر (حلال خور) مالکان مکان کے نوکر نہیں ہیں بلکہ وہ میونسپل کمیٹی کے ماتحت ہیں اور مہینے میں صرف دو مرتبہ سنڈاس صاف کرتے ہیں۔ اس تعفّن سے راہ گیروں کو تکلیف ہوتی ہے۔ انسپکٹر جنرل حفظان صحت کو اس پر توجہ کرنی لازم ہے +

قدیم زمانے سے یہاں صنعت و حرفت کا بڑا چرچا ہے۔ خصوصاً ململ۔ جامدانی۔ کشیدہ کا کام اور جالیدار نقرئی ظروف بہت نفیس تیار ہوتے ہیں۔ ڈھاکہ جیسی باریک ململ دنیا میں کہیں نہیں بنتی۔ کسی زمانے میں ململ کا تھان اس قدر باریک بنتا تھا کہ انگوٹھی کے حلقے میں سے نکل جاتا تھا۔ گو وہ نفاست اب نہیں رہی۔ مگر پھر بھی ۲۰ روپے فی گز فروخت ہوتی ہے۔ کچے چمڑے کی تجارت کو خوب ترقی ہے۔ اطراف و جوانب سے اس قدر کھالیں آتی ہیں کہ کئی تاجروں کی وجہ معاش اسی پر ہے۔ چنیوٹ ضلع جھنگ کے ایک تاجر محمد دین کا بڑا کارخانہ چمڑے کا ہے۔ یہ چمڑا بیشتر کلکتہ کو جاتا ہے +

ڈھاکہ کے لوگ عموماً نرم مزاج۔ دیندار اور مہمان نواز ہیں۔ انگریزی عملداری سے پیشتر کثرت پیداوار اور ارزانی اجناس کے باعث شمالی ہند کے باکمال لوگوں کی آمد و رفت کا سلسلہ یہاں جاری رہتا تھا جو باشندگان شہر کی قدردانی سے چند روز میں مرفہ الحال ہو جاتے تھے۔ سابقہ قدردانی کی شہرت پر علما اور حفاظ اس وقت تک اطراف ہند سے چلے آتے ہیں۔ مگر اب تغیرات زمانہ سے وہ بات نہیں رہی۔ ناچار اکثر لوگوں کو ناکامی کے ساتھ واپس جانا پڑتا ہے +

مذہب کی پابندی اور قومی اتحاد گویا مسلمانان بنگالہ کی سرشت میں خمیر ہو چکا ہے اُن کے اتحاد کی دو باتیں نمونہ کے طور پر اس جگہ درج کرنی مناسب معلوم ہوتی ہیں:۔

(۱) قومی پنچایت۔ اگرچہ شمالی ہند کی بعض ادنٰے اقوام مثل دھوبیوں۔ سائیسوں وغیرہ اور نیز کاٹھیاوار کے میمن سوداگروں میں پنچایت کا دستور ہے۔ مگر ڈھاکہ کے مسلمانوں میں بلا لحاظ قوم و مذہب و ادنٰے و اعلٰے جس عمدگی اور خوبی سے پنچایت کا سلسلہ جاری ہے۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ آج سے کئی سو برس پیشتر یہاں کے مسلمانوں کا تمدن کیسی عمدہ حالت میں ہوگا۔ جس کے

باقیماندہ آثار اُن کی حُسنِ معاشرت کو ظاہر کر رہے ہیں +

قومی پنچایت

ڈھاکہ کے ہر محلّے میں ایک سردار ایک نائب سردار اور ایک گوریت (خبر رسان) مقرر ہے۔ محلہ کے سب لوگ سوائے اُمرائے کبار برادر کے لفظ سے پکارے جاتے ہیں۔ ان کی نشست و برخاست کے واسطے ہر محلے میں ایک بنگلہ قومی خرچ سے بنا ہوا ہے۔ جب برادری میں کوئی تنازع یا حادثہ واقع ہوتا ہے تو گوریت خبر دیتا ہے۔ سردار اور نائب سردار بنگلے میں اجلاس کرتے ہیں اور فریقین کو بلا کر اُن کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔ اگر کوئی فریق ناراض ہو تو چار سرداروں کے حضور میں اس کا اپیل ہوتا ہے۔ اگر پھر بھی شکایت باقی ہو تو تمام سرداروں کے مجمع میں اُس کی نظرِ ثانی ہوتی ہے۔ آخری فیصلہ قطعی اور قابلِ نفاذ ہوتا ہے جو فریق تعمیل حکم سے انکار کرے وہ خارج از برادری سمجھا جاتا ہے۔ اور برادرانِ محلہ اُس کی شادی غمی میں شریک نہیں ہوتے۔ جب تک کہ وہ پنچایت کے حکم کی تعمیل نہ کرے۔ اکثر صورتوں میں ایسے اشخاص تعمیل پر مجبور ہوتے ہیں کیونکہ برادری سے خارج ہو جانا اُن کے لیئے بہت مصیبت انگیز ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ مرنے کے بعد تجہیز و تکفین کی بھی کسی سے اُمید نہیں رکھ سکتے۔ جیسا کہ آگے چلکر معلوم ہوگا کہ تجہیز و تکفین کا یہاں بالکل نرالا انتظام ہے۔ بنگلہ کی مرمت اور جلسوں کے مصارف کے واسطے تقریبات شادی پر برادروں سے ایک مقررہ ٹیکس وصول کیا جاتا ہے۔ خاص کر نکاح کے وقت تین قسم کے ٹیکس وصول ہوتے ہیں۔ (۱) مصارف پنچایت (۲) نذرانہ مسجد (۳) نذرانہ نہ زمینی ہر ٹیکس کی مقدار محلہ والوں کی حیثیت کے مطابق دو دو تین تین روپے مقرر ہے۔ پنچایت کے ٹیکس سے دریاں۔ شامیانے اور دیگر ضروریات خرید کر بنگلوں میں رکھتے ہیں۔ اور جملہ برادروں کو اُن کی تقریبات پر بلا معاوضہ دئے جاتے

ہیں۔ مساجد کا نذرانہ۔ مسجدوں کی آبادی میں صرف ہوتا ہے۔ یہاں بے شمار مسجدیں اور سب آباد ہیں۔ تیسری قسم کا ٹیکس صرف اُس حالت میں لیا جاتا ہے جبکہ مکان سکنی غیر ملوکہ زمین میں بنا گیا ہو۔ قاضی کا ذمہ ہے کہ نکاح پڑھنے سے پیشتر تینوں قسم کے ٹیکس وصول کرے۔ اور نکاح خوانی کا حق بعد میں لے +

تجہیز و تکفین۔ یہ رسم اپنی نوعیت کے لحاظ سے پہلی رسم پر بھی فائق ہے۔ ڈھاکہ میں مُردہ شوئی اور گورکنی کا کام کسی خاص فرقے سے متعلق نہیں۔ ہر محلے کے لوگ اس کام کو بلا معاوضہ انصرام کرتے ہیں۔ نوجوان قبر کھودتے ہیں۔ اور بڑے بوڑھے میّت کو غسل دیتے ہیں اور اس کو کارِ ثواب سمجھتے ہیں +

تجہیز و تکفین

مگر یہ امر نہایت افسوسناک ہے کہ باوجود اس قومی اتحاد کے مذہبی عناد بھی کچھ کم نہیں۔ خاص کر بدعتی وہابی اور مقلّد و غیر مقلّد کا اختلاف تو حد سے زیادہ ہے +

تعلیم یہاں اچھی ترقی پر ہے۔ دو کالج انگریزی تعلیم کے واسطے اور تین مدرسے عربی تعلیم کے واسطے موجود ہیں۔ عربی مدرسوں کا نصاب تعلیم کلکتہ کے مدرسۂ عالیہ کے برابر ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ طالب علم عربی زبان پرائیوٹ مدرسوں میں نہیں دیکھ پڑھتے ہیں۔ اور انگریزی تعلیم کے واسطے وظائف کے خواستگار ہیں لیکن مسلمان امرا کو ادھر توجہ نہیں۔ نواب احسن اللہ خاں رئیس ڈھاکہ مرحوم نے چھ چھ روپے ماہوار کے چار وظیفے جو کالج میں تعلیم پانے والوں کے واسطے مقرر کئے تھے۔ وہ نواب سلیم اللہ خاں رئیس حال کی توجہ سے بدستور جاری ہیں۔ اس خاندان نے شہر کی آراستگی۔ مسجدوں اور امام باڑوں کی مرمت۔ عام غربا سے حُسن سلوک کرنے میں لاکھوں روپے صرف کئے مگر تعلیمی ترقی میں ایسا کوئی کام نہیں کیا کہ ہوگلی کے حاجی محمد محسن اور بمبئی کے سیٹھ

راے چند اور پریم چند جیسے فیاض شخصوں کی فہرست میں ان کا نام درج ہوتا +

نواب سلیم اللہ خان

شمالی ہند کے جو لوگ ڈھاکہ میں آکر مقیم ہوئے۔ اُن میں سے خواجہ نواب احسن اللہ خاں مرحوم نے یہاں بہت عروج حاصل کیا تھا۔ اُن کی املاک کی مجموعی آمدنی اٹھارہ لاکھ روپے سالانہ تھی۔ نواب صاحب مرحوم اس قدر منتظم تھے کہ باوجود فیاضی اور امیرانہ مصارف کے کئی لاکھ روپے نقد چھوڑ مرے۔ آمدنی اگرچہ پہلے کی سی ہے مگر پھر بھی ان کے جانشین خواجہ نواب سلیم اللہ خاں بہادر اس وقت چودہ لاکھ روپے کے قرضدار ہیں۔ انہوں نے تقسیم بنگال کے زمانہ سے بڑی شہرت پائی ہے۔ تقسیم کی تائید میں متعدد جلسے کئے۔ عام مسلمان جو تقسیم کی کیفیت سے ناواقف تھے اُن کو باخبر کرنے کے واسطے مولوی ہدایت رسول کو دو سو روپے ماہوار پر نوکر رکھا۔ یہ مولوی صاحب جس قدر لسانی میں شہرۂ آفاق تھے اُسی قدر علم و فضل سے عاری اور ضروریات زمانہ سے بےخبر۔ مسلمانوں کو تقسیم کے فوائد سمجھانے کے بجاے وہابی بدعتی۔ مقلد اور غیر مقلد کے مسئلے چھیڑ کر خود مسلمانوں میں باہمی تفرقہ کا باعث ہوئے۔ جس پر نواب صاحب کو مجبوراً انہیں علیحدہ کرنا پڑا۔ ان کارروائیوں کا نتیجہ سر دست اس سے زیادہ کچھ نہیں نکلا کہ ہندو مسلمانوں میں جو اتحاد نواب مرحوم کے زمانہ میں تھا وہ جاتا رہا +

ڈھاکہ سے مفصلہ ذیل کے شہروں کی مسافت حسب ذیل ہے:-

(۱) کلکتہ ۲۶۴ میل + (۲) چٹاگانگ ۱۵۰ میل + (۳) میمن سنگھ ۷۵ میل +

دارجیلنگ

ڈھاکہ سے نرائن گنج۔ گوالندو اور پوڑاہا ہوتے ہوئے دامکدیا گھاٹ پر دریاے گنگا سے عبور کیا۔ اور یہاں سے سارا گھاٹ تک جو دریا کے پرلی طرف ہے،

سٹیمر کے ذریعے بارہ میل کی مسافت طے کی۔ پھر سلی گوڑی آیا۔ یہ کوہ ہمالہ کے دامن میں چھوٹا سا شہر ہے۔ یہاں پہاڑ کی تہ کے ساتھ ساتھ ایک دلدلی حصہ زمین ہے جس کو ترائی کہتے ہیں۔ یہاں سے دارجیلنگ تک چڑھائی کے باعث ایک ہلکی اور تنگ پٹڑی کی لائن سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی جاتی ہے۔ دارجیلنگ سے سلی گوڑی ۵۱ میل۔ ڈھاکہ ۴۳۸ میل اور کلکتہ ۳۷۹ میل ہے +

دارجیلنگ پہلے ریاست سکم کے ماتحت تھا ۱۸۳۵ء میں لارڈ ولیم بینٹنگ نے راجہ صاحب سے خرید لیا۔ ۱۹۰۱ء کی مردم شماری کے مطابق اس کی آبادی ۲۵ ہزار ہے۔ عمدگی آب و ہوا کے باعث بنگال کے لفٹنٹ گورنر موسم گرما ہر سال یہیں گزارتے ہیں۔ دیگر حکام و امرا بھی آب و ہوا تبدیل کرنے کی غرض سے آتے رہتے ہیں۔ مختلف حصص ملک کے ہندو مسلمان سوداگر تجارتی مال لاتے ہیں۔ صوبہ بنگال و بہار کے اکثر کاروباری و اہل مقدمہ جمع رہتے ہیں۔ اسلئے گرمیوں میں یہاں اچھی رونق رہتی ہے۔ اُردو زبان کا بھی خاصا رواج ہے۔ ضرورت کی سب چیزیں مل سکتی ہیں۔ مگر گراں +

چاول بکثرت ہوتا ہے۔ پھلوں میں کیلا۔ ناشپاتی۔ لیموں وغیرہ کی خاص پیداوار ہے۔ رنگ برنگ کے پھول اور جڑی بوٹیاں پہاڑ پر کثرت سے دکھائی دیتی ہیں۔ خصوصاً چائے کی کاشت کو یہاں خوب ترقی ہے۔ چائے کا پہلا باغ ۱۸۵۶ء میں لگایا گیا تھا۔ مگر یہ باغیچے عموماً انگریزوں کی ملکیت ہیں۔ ان میں کئی ہزار مزدور روزانہ کام کرتے ہیں جن کا بڑا حصہ نیپالی لوگ ہیں +

سنکونا جو رفع بخار کی مجرب دوا ہے۔ اس کی کاشت بھی روز بروز ترقی پر ہے سب سے پہلے ۱۸۶۱ء میں سرکاری طور پر اس کی کاشت ہوئی تھی +

دولتمند مسافروں کے واسطے مختلف قسم کے ہوٹل موجود ہیں۔ مگر عام لوگوں

کے لئے کوئی سرائے نہیں۔ انہیں کھانے پینے کی بھی تکلیف اُٹھانی پڑتی ہے +

بھاگل پور

دارجیلنگ سے براہ پاربتی پور۔ کٹھار۔ وتھانہ بھی پور بھاگلپور پہنچا۔ رستے میں دریائے گنگا سے عبور ہوا جو بھاگلپور سے تقریباً تین میل اس طرف ہے۔ یہ شہر مغلوں کے ابتدائی عہد حکومت میں بنگالہ کا دارالحکومت تھا۔ آج کل صاحب کمشنر کا صدر مقام اور اس کی مردم شماری ۷۵ ہزار سے کچھ زیادہ ہے۔ کلکتہ یہاں سے ۲۶۵ میل دُور ہے +

بھاگلپور کے بازار وسیع اور عمارتیں عموماً پختہ ہیں۔ یہاں بزرگان دین کے چند مقبرے بہت اعلےٰ درجے کے ہیں خصوصاً مُلّا چک محلہ میں حضرت مخدوم شہباز شطاری کی خانقاہ ہے جو بڑے پایہ کے مشہور مقدّس بزرگ تھے۔ اس کے علاوہ نواب عبدالرسول خاں کا ایک چھوٹا سا مقبرہ اور امام باڑہ ہے۔ نواب مغفور شاہی زمانہ میں بھاگلپور و سنتال وغیرہ کے عامل اور ان کے باپ محمد شاہ کے وزیر اعظم تھے۔ یہاں ساحل دریا کے قریب ایک تہ خانہ ہے جس کے طویل و تاریک رستے کا پورا پتہ معلوم نہیں۔ شاہی زمانہ کا بنا ہوا ہے۔ اسٹیشن سے تین میل کے فاصلہ پر جینیوں کا مندر اور پندرہ میل کی دوری سے وسط گنگا میں ایک پتھر پر گو بناتھ کا مندر بنا ہوا ہے۔ یہاں لوگ کشتیوں میں سوار ہو کر جاتے ہیں +

یہاں ٹسر اور ریشم کے کپڑے بہت عمدہ تیار ہوتے ہیں۔ ایک کارخانہ مسلمانوں کا بھی ہے جو غالباً احمد خاں صاحب کی زیر نگرانی چلتا ہے اور اُس کا مال دور دور تک روانہ ہوتا ہے۔ تعلیمی حالت قابل اطمینان نہیں۔ صرف ایک کالج ہے مگر اب لوگوں کو تعلیم کی اہمیت و ضرورت محسوس ہوتی جاتی ہے +

دربھنگا

بھاگلپور سے براہ سماستی پور ہم دربھنگے آیا۔ یہ بہت پرانا شہر ہے۔ اس کی موجودہ شہرت کی وجہ ایک راجہ صاحب ہیں جو راجہ دربھنگا کے نام سے مشہور اور ایک بڑی ریاست پر قابض ہیں۔ شہر کی آبادی تقریباً ایک لاکھ اور ضلع کا انتظام صاحب کلکٹر کے ماتحت ہے ٭

یہاں کے بازار کئی میلوں میں پھیلے ہوئے ہیں لیکن آبادی کم اور ویرانہ زیادہ ہے مسلمانوں کی آمد سلطان محمود غزنوی کے زمانہ سے بیان کی جاتی ہے اور شہر کے محلے بھی زیادہ تر مسلمانی ناموں کے ہیں۔ پیشتر شرفا کی آبادی بہت تھی جس کی یاد کو چند خاندان اب تک تازہ کر رہے ہیں۔ انہی میں حکیم مولوی محمد اسحاق صاحب ایک خاندانی بزرگوار ہیں جنہوں نے علم و فضل سے اس علاقہ میں بڑی شہرت حاصل کی ہے

دھان۔ تمباکو۔ ایک قسم کا سوتی کپڑا۔ سرخ کپاس۔ بانس خصوصاً آم یہاں کے مشہور ہیں۔ اس ضلع میں ایک جگہ بھوسرا ہے جہاں کا تمباکو اور بیل (ڈانگر) مشہور ہے۔ دوسری جگہ دل سنگھ سرائے ہے جہاں کی بیل (بہل) عمدہ ہوتی ہے

یہاں کوئی کالج نہیں۔ صرف تین ہائی سکول ہیں۔ ایک گورنمنٹ کی طرف سے۔ ایک راجہ صاحب کی طرف سے اور تیسرا پبلک کی طرف سے۔ البتہ راج کی طرف سے ایک سنسکرت سکول بھی ہے ٭

٭ راجہ صاحب کے بزرگوں نے شہنشاہ اکبر کو ہلال عید کا مژدہ پہنچایا تھا جس کے صلہ میں ریاست اور راجگی خطاب ملا۔ اس وقت ریاست کی آمدنی تقریباً تیس لاکھ روپے سالانہ اور ڈیڑھ کروڑ روپیہ بنکوں میں جمع ہے۔ ریاست کا مینجر انگریز ہے اور اس کے ماتحت سب مینجر بھی بیشتر انگریز ہیں ٭ مؤلف

مظفرپور

دربھنگے سے براہ سماستی پور میں مظفرپور آیا۔ یہ شہر دریائے گنڈک کے ایک طرف آباد اور صاحب کلکٹر کا صدر مقام ہے۔ اس کی آبادی ۴۵ ہزار ۶ سو نفوس کی ہے۔

مظفرپور کی عمارتیں بہت نفیس ہیں۔ سڑکیں صاف و شستہ مگر گلی کوچے غلیظ و گندہ ہیں۔ شہر کے آس پاس مختلف المذہب عیسائیوں کے چند گرجے ہیں۔ شرفائے قدیم سے اب یہ شہر بالکل خالی ہوگیا ہے۔ البتہ شہر کے کنارے سات پورہ محلہ میں چند افراد گزشتہ خاک نشینوں کی یادگار دکھائی دیتے ہیں۔ یا بڑا ہنپورہ میں سادات کے چند گھر آباد ہیں۔ باقی سب نوخیز اور نووارد جن میں بڑا حصہ بنگالیوں کا ہے۔ یہ ہر محکمے اور ہر صیغے میں مصروف کار نظر آتے ہیں۔

پھلوں میں یہاں کی لیچی بہت مشہور ہے۔ حاجی پور ضلع مظفرپور کا آم بھی دہرپا اور شیریں ہوتا ہے۔ خصوصاً لنگڑا جو مالدہ کی ایک قسم ہے یہیں سے پیدا ہوا ہے۔ لوگ عموماً زراعت پیشہ ہیں۔ مگر فطرۃً کاہل اور زمانہ کی رفتار سے بے خبر۔ صنعت و حرفت کی طرف سے عام بے پروائی ہے۔ ہر شخص سرکاری ملازمت کا دلدادہ ہے۔

یہاں ایک کالج اور دو اسکول اور جدید و قدیم تعلیم کے چند سکول و مدارس اور بھی جاری ہیں۔ مگر باشندوں کی تعلیمی حالت بگڑی ہوئی ہے۔ عربی کا ایک مدرسہ پبلک کی امداد سے چل رہا ہے۔

گورکھپور

میں مظفرپور سے حاجی پور۔ چھپرا اور بھٹنی ہوتا ہوا گورکھپور پہنچا۔

شہر کلکتہ سے ۵۰۶ میل کے فاصلہ پر ہے۔ اس کی آبادی ۱۹۱۱ء کی مردم شماری کے موافق تقریباً ۶۴ ہزار ہے۔ مغلوں کے زمانہ میں یہ صوبہ اودھ میں شمار ہوتا تھا۔ مگر اب ممالک متحدہ آگرہ کا ایک ضلع ہے۔ کاروباری لوگ اُردو بخوبی سمجھتے ہیں۔

گورکھپور بہت لمبا چوڑا شہر ہے۔ سول سٹیشن اور پرانی چھاؤنی کے ملنے سے اس کی آبادی پانچ چھ میل میں پھیلی ہوئی ہے۔ شہر کا سب سے بڑا بارونق حصہ اُردو بازار ہے۔ جہاں شاہی زمانہ کی ایک دو منزلہ مسجد ہے۔ شہر کے پرلی طرف ایک عظیم الشان امام باڑہ ہے۔ کئی شریف خاندان اس جگہ آسودہ حال اور علمی فضل و کمال سے آراستہ ہیں۔ حکیم برہم صاحب مالک اخبار مشرق کی مہربانی سے چند بزرگوں کی ملاقات کا موقع بھی ملا۔

یہاں کا تمباکو بہت عمدہ ہوتا ہے اور دور دور تک جاتا ہے۔ دیسی کھانڈ کے کارخانے اس ضلع میں بکثرت ہیں۔ تھوڑے دنوں سے انگریزی طریق پر کھانڈ بنانے کی کل بھی جاری ہو گئی ہے۔

انگریزی تعلیم اچھی ترقی پر ہے اور ملحقہ اضلاع کی نسبت یہاں کا چرچا زیادہ ہے۔ مشرقی علوم کا شوق بھی اب تک باقی ہے۔ خاندانی لوگوں کی توجہ اس پر خصوصیت سے مائل ہے۔

مگھر

مگھر اور گورکھپور میں سولہ میل کا فاصلہ ہے۔ یہ ایک چھوٹا سا گاؤں اس ریلوے لائن پر ہے جو گورکھپور سے لکھنؤ کو جاتی ہے۔ اس کی موجودہ شہرت کبیر نامی ایک باکمال فقیر کی وجہ سے ہے جو سلطان سکندر لودی کے عہد میں ہوا ہے۔ یہ ہندو و مسلمان دونو فرقوں میں ہردلعزیز تھا۔ خداشناسی اور خداپرستی کے خیالات ہندی نظم میں اس عمدگی اور خوبی سے ظاہر کرتا کہ سامعین

اس کا بڑا اثر ہوتا تھا۔ ہندو مسلمانوں کو جو خوش اعتقادی کبیر کی زندگی میں تھی مرنے پر بھی وہ قائم رہی چنانچہ مسلمانوں نے مقبرہ اور ہندوؤں نے مڑھی اُس کی یادگار میں بنائی۔ یہ دونو عمارتیں گاؤں کے باہر اب تک موجود ہیں اور ان کے احاطہ کی دیوار مشترک ہے +

بہرائچ

گھر سے گونڈہ ہوتا ہوا میں بہرائچ پہنچا۔ گونڈہ ضلع کا صدر مقام اور ریلوے کا جنکشن ہے۔ گورکھپور یہاں سے ۹۶ میل۔ بہرائچ ۳۸ میل اور لکھنؤ ۳ میل ہے بہرائچ بہت پرانا قصبہ دریا سے گھاگرا کے کنارے ہے۔ اسلامی تاریخ میں اس کا ذکر سب سے پہلے سپہ سالار مسعود غازی کے زمانہ میں آتا ہے جبکہ اُنہوں نے گیارھویں صدی مسیحی میں اس شہر کو فتح کیا۔ مغلوں کے زمانہ میں یہ شہر حاکم نشین تھا۔ اب بھی صاحب ڈپٹی کمشنر کا صدر مقام اور ۲۷ ہزار کی آبادی ہے +

شہر کے بازار چوڑے۔ سیدھے اور ریختہ ہیں مگر کوئی عمارت خصوصیت سے قابل ذکر نہیں۔ اناج۔ شکر۔ عمارتی لکڑی اور تمباکو یہاں کی تجارتی چیزیں ہیں۔ نیپال کو جو تجارتی مال جاتا ہے اسی راستہ سے ہو کر گزرتا ہے +

شہر سے دو میل کے فاصلہ پر سپہ سالار مسعود غازی کی درگاہ ہے جو سلطان محمود غزنوی کے زمانہ میں اشاعت اسلام کرتے ہوئے یہاں آئے اور ۴۲۴ ہجری ۱۰۳۳ء میں شہید ہوئے۔ درگاہ کی عمارت مستحکم اور احاطہ بہت وسیع ہے۔ ہر سال عرس کے دنوں میں ہندو مسلمان زائرین ایک لاکھ کے قریب جمع ہوتے ہیں۔ اس وقت یہاں بڑا بھاری میلہ ہوتا ہے جس میں تجارتی مال ایک ماہ تک فروخت ہوتا رہتا ہے۔ اس سے بیس ہزار روپے کے قریب درگاہ کو آمدنی ہو جاتی ہے +

درگاہ کے گنبد اور اردگرد کے درختوں سے لوگ کئی قسم کی منتیں باندھتے ہیں گنبد پر دوّنی چوّنی اور روپے پیسے کے نشانے لگاتے ہیں۔ درختوں میں رسیاں ڈال کر کوئی اپنا ہاتھ باندھتا ہے۔ کوئی پاؤں اور کوئی گلا۔ اور اپنے گمان میں ان کاموں کو مرادیں حاصل ہونے کا ذریعہ سمجھتے ہیں +

نیپال گنج

بہرائچ سے نیپال گنج تک ایک مرتبہ سفر کرنے کا اتفاق ہوا۔ یہ جگہ گورنمنٹ انگریزی اور ریاست نیپال کی سرحد پر بہرائچ سے ۳۲ میل دور ہے سٹیشن سے قصبہ تک کوئی تین میل کا فاصلہ ہے۔ سڑک کچی اور سواری کا انتظام بالکل ناکافی ہے۔ اس میں انگریزی علاقہ کے چند ہندو اور مسلمان سوداگروں کی دکانیں ہیں الائچی کلاں۔ سونٹھ۔ بروزہ۔ گھی [illegible] نیپال سے ہندوستان کو جاتا ہے۔ واپسی کے وقت ریاست نانپارہ میں بھی تھوڑی دیر کے واسطے قیام ہوا۔ مگر یہاں کوئی عمدہ عمارت یا عجیب چیز قابل ذکر معلوم نہیں ہوئی +

امروہہ

نیپال گنج سے براہ لکھنؤ و مرادآباد ٹیشن امروہہ پہنچا۔ دہلی یہاں سے براہ ہاپوڑ و غازی آباد لائن ۸۰ میل ہے۔ اسلامی تاریخ میں امروہہ کا نام پہلی مرتبہ سلطان غیاث الدین بلبن کے زمانہ میں ملتا ہے جبکہ وہ ۶۶۵ھ (۱۲۶۶ء) میں کٹھیر کی بغاوت فرو کرنے کے واسطے اس جگہ آیا تھا۔ اس وقت یہ شہر مرادآباد کی ایک تحصیل ہے۔ اس کی آبادی بروئے مردم شماری ۱۹۱۱ء تقریباً چالیس ہزار ہے۔ زبان سب کی اردو ہے +

سٹیشن سے شہر تک ایک میل کا فاصلہ ہے۔ بازار وسیع اور عمارتیں عموماً پختہ ہیں۔ بہت دُکانوں کا روکار منقش لکڑی سے آراستہ ہے۔ ہندوؤں کے چند مندر اور سو سے زیادہ مسجدیں ہیں۔ وسط شہر میں ایک جامع مسجد سب سے قدیم ہے +

صنعت و حرفت کا چرچا یہاں کم ہے۔ کامدار کشتی نما ٹوپیاں اور مٹی کے روغنی برتن البتہ اچھے بنتے اور باہر جاتے ہیں۔ بیرونی تجارت بھی کچھ ایسی نہیں۔ امید کی جاتی ہے کہ ریل کے باعث اب اس میں ترقی ہو جائیگی۔ مقامی پیداوار میں یہاں کے آم بالخصوص قابل ذکر ہیں۔ شہر کے باہر جدھر دیکھو آموں کے باغات دکھائی دیتے ہیں +

انگریزی تعلیم متوسط درجہ کی ہے۔ علوم عربیہ کا بھی چرچا ہے۔ چند اچھے اچھے لائق لوگ یہاں کی سرزمین سے پیدا ہوئے ہیں۔ نواب وقار الملک مولوی مشتاق حسین، علیگڈھ کالج کے آنریری سکرٹری اور منشی حامد علی خاں بیرسٹر ایٹ لا اسی سرزمین کے جوہر قابل ہیں +

امروہہ کو تاریخی حیثیت سے یہ خصوصیت ہے کہ یہاں شیخ سدّو ایک بزرگ کا مزار ہے جن کو میراں بھی کہتے ہیں۔ انہوں نے جونپور وغیرہ مقامات میں علمی قابلیت حاصل کی اور یہاں آکر عملیات اور گنڈے تعویذ میں بہت مشہور ہو گئے۔ لوگوں کا خیال ہے کہ ان کا مزار شہر کی قدیم جامع مسجد میں ہے مگر قبر کا کوئی نشان موجود نہیں۔ عوام الناس کا خیال ہے کہ جب کسی عورت پر بھوت پریت سوار ہو تو شیخ سدّو کی منت ماننے سے اُس کا مرض زائل ہو جاتا ہے۔ اسی وجہ سے کئی مسلمان اور ہندو عورتیں منت پوری کرنے اور نذرانے چڑھانے کے واسطے بارہ مہینے یہاں آتی رہتی ہیں۔ چڑھاوا

وصول کرنے والوں کی ایک جماعت ہے جس نے مسجد کے صحن کے اندر دائیں
بائیں گھر بنا کر سکونت اختیار کر رکھی ہے - یہ لوگ نہ شیخ سدّو کی اولاد سے ہیں
اور نہ اُن کے جانشین معلوم نہیں کس زمانے ہیں اور کیونکر اس پر قابض ہو گئے
ان لوگوں کی بے پروائی سے مسجد بھی کچھ ویران سی ہو رہی ہے ٭

میرٹھ

امروہہ سے براہ ہاپوڑ میں میرٹھ آیا - یہ شہر حضرت مسیح سے پہلے کا آباد ہے
بُدھ مذہب کے آثار کم و بیش جامع مسجد کے پاس اب تک پائے جاتے ہیں -
گیارھویں صدی مسیحی میں سید سالار مسعود غازی نے اس کو فتح کیا تھا مغلوں کے
عہد میں یہاں عمدہ عمدہ عمارتیں تیار ہوئیں - اور دارالخلافہ دہلی کے قرب کے
باعث اس کو خاص امتیاز حاصل تھا - اٹھارھویں صدی مسیحی کے آخر میں سکھوں
مرہٹوں - رُہیلوں اور جاٹوں کی دستبرد سے اس کی حالت بہت ابتر ہو گئی تھی
انگریزی عملداری میں اس نے پھر ترقی کی - اس کی موجودہ آبادی ایک لاکھ ۱۸ ہزار
ہے جو شروع صدی کی مردم شماری سے ڈھائی گُنے کے قریب ہے ٭

یہاں کے بازار وسیع اور عمارتیں باقرینہ ہیں - سب سے زیادہ بارونق
حصہ قلعہ کے قریب ہے - اسی موقعہ پر شاہی زمانہ کی ایک جامع مسجد ایک ٹیکرے
پر بنی ہوئی ہے - بیرون شہر حضرت شاہ پیر کی درگاہ سنگ سُرخ کی ہے -
جس میں پچی کاری کا نہایت نفیس کام کیا ہوا ہے مگر روضہ کا گنبد ادھورے
نامکمل ہے - یہ شاہ صاحب شہنشاہ جہانگیر کے مرشد تھے اور اس کی عمارت
نورجہاں بیگم کی یادگار ہے - سلطنت دہلی کے زمانہ میں یہاں کو ہمایوں اور ٹوپیاں
مخصوصیت سے مشہور ہیں ٭

تجارت یہاں خوب ترقی پر ہے۔ مصالحہ۔ گھی۔ سُوتی کپڑا اور عمارتی لکڑی بکثرت باہر سے آتی ہے۔ خصوصاً مال گودام کے ذریعہ جو شہر سے ایک میل کے فاصلہ پر ہے لاکھوں من غلّے اور شکر کی تجارت ہوتی ہے۔ یہ مال گودام ریلوے کی شاخ کے ذریعے شہر سے ملا ہوا ہے۔

شہر سے باہر ایک میل کے فاصلہ پر نوچندی دیوی کا مندر ہے۔ یہاں ہر سال ایک میلہ نئے چاند کی خوشی میں ہوتا ہے۔ میلہ کے دنوں میں زراعتی پیداوار۔ آلات زراعت۔ مویشی اور گھوڑوں کی بڑی عظیم الشان نمائش ہوتی ہے۔ صدہا بیوپاری اور ہزاروں شائقین اس موقع پر آتے ہیں جس سے میلہ کی شان و شوکت میں نہایت رونق ہوتی ہے۔

تعلیمی حالت اچھی ہے۔ ایک کالج پبلک کے روپے سے چل رہا ہے۔ دس ہائی سکول ہیں جن میں سے آریہ سکول سب سے زیادہ بارونق ہے۔ عربی تعلیم کا چرچا خاصہ ہے۔ مسلمانوں کو عربی مدرسہ سے بہت دلچسپی ہے۔ مولوی احمد علی صاحب کی اعلےٰ قابلیت اور خوش خلقی سے دور دراز کے طلبا تحصیل علم کی غرض سے یہاں چلے آتے ہیں۔

میرٹھ کی چھاؤنی ہندوستان کی پرانی چھاؤنیوں میں بہت مشہور ہے ۱۸۵۷ء کی شورش جس نے ہندوستان کے امن و امان میں خلل ڈالا یہیں سے شروع ہوئی تھی۔ یہاں کی سول لائن صفائی اور طول مسافت کے باعث خاص طور پر مشہور ہے۔ انگریزی فوجوں کا بڑا شاندار ہیڈ کوارٹر اس جگہ رہتا ہے۔ امپیریل کیڈٹ کور (دیسی رئیس زادوں کی نوآموز فوج) کے مرکز ہونے کا فخر بھی اس کو حاصل ہے۔ اس چھاؤنی کو ایک یہ خصوصیت ہے۔ کہ یہاں یورپین اور دیسی مفلوک الحال لوگوں کے واسطے ایک آرامگاہ بنی ہوئی ہے۔

مشہور اور خوب آباد ہے نہایت عمدہ جامع مسجد بنی ہوئی ہے۔ اس کے میناروں پر سے شہر کا نہایت پر لطف نظارہ دکھائی دیتا ہے +

یہاں حرفت و صنعت کو اچھی ترقی ہے۔ دریاں۔ شطرنجیاں۔ چاقو۔ سُوسی کے تھان لیور لاک (انگریزی قفل) مضبوط اور خوشنما بنتے اور ہندوستان میں دور دور جاتے ہیں۔ ہر سال ماہ فروری میں ہندوستان کی صنعتی اور حرفتی پیداوار کی ایک بارونق نمائش اور اس کے ساتھ گھوڑوں اور مویشیوں کی منڈی بھی ہوتی ہے +

محمدن اینگلو اورینٹل کالج

انگریزی تعلیم کے لئے گورنمنٹ کی طرف سے ایک ہائی سکول اور اعلےٰ تعلیم کے واسطے مسلمانوں کا ایک بے نظیر محمدن اینگلو اورینٹل کالج ہے۔ یہ کالج شہر سے ایک میل کے فاصلے پر پرانی چھاؤنی میں سر سید احمد خاں بہادر مرحوم کا قائم کیا ہوا ہے۔ سید صاحب دہلی کے رئیس اور آخری زمانہ میں بنارس کے صدر الصدور تھے۔ انہوں نے مسلمانوں کی تعلیمی حالت پست پا کر ۱۸۶۸ء و ۱۸۶۹ء میں انگلستان کا سفر کیا۔ اور دو برس قیام کر کے وہاں کی درسگاہوں کے طرز تعلیم و تربیت سے واقفیت بہم پہنچائی اور ہندوستان واپس آنے پر مسلمانوں کے واسطے ایک کالج قائم کرنے کی تجویز کی کئی سال کی متواتر کوششوں کے بعد پبلک کی مدد سے ۱۸۷۵ء میں یہ کالج قائم ہوا۔ اگرچہ چند متعصب اور زمانہ کی مصلحتوں سے بے خبر مسلمانوں نے سید صاحب کی مخالفت کی۔ بانی کو بداعتقاد اور کالج کی تعلیم کو کفر و الحاد کا مخزن بیان کر کے عام لوگوں کو بدگمان کرتے رہے۔ مگر سید صاحب کی وجاہت۔ ہمت۔ دوراندیشی اور پُرزور تقریروں و تحریروں کے اثر سے بہت سے اہل علم اور رؤسا آپ کے ساتھ ہو گئے۔ خصوصاً حضور نظام والئے دکن۔ نواب کلب علی خاں بہادر والئے رام پور اور

مہاراجہ مہندر سنگھ صاحب والئے پٹیالہ نے آپ کے مشن سے بڑی ہمدردی کی اس زمانہ کے وائسرائے ہند لارڈ لٹن نے بھی جیب خاص سے معقول مدد دی لیکن حق یہ ہے کہ حیدرآباد دکن کے وزیر اعظم سر سالار جنگ اول کی سچی کوشش کالج کی امداد پر مبذول نہ ہوتیں اور ریاست حیدرآباد سے بیش قرار سالانہ امداد نہ ملتی تو کالج کی ترقی کے واسطے بڑی بڑی مشکلات کا مقابلہ کرنا پڑتا۔ سید صاحب نے کیمبرج اور آکسفورڈ کے نمونہ پر کالج کی بنیاد قائم کی۔ بڑے بڑے لائق تعلیم یافتہ انگریز انگلستان سے منتخب کر کے بیش قرار مواجب پر بلوائے۔ دنیاوی تعلیم کے ساتھ دینی تعلیم کو لازم قرار دیا۔ اور باوجود اسلامی درسگاہ ہونے کے ہندوؤں اور عیسائیوں کے واسطے تعلیم کا دروازہ کھلا رکھا اور اُن کو اسلامی مذہبی تعلیم سے مستثنےٰ کر دیا۔ کالج اور بورڈنگ ہاؤس کی عمارتیں ایسی وسیع اور عظیم الشان تیار کرائیں کہ ایک شخص دو دن صبح سے شام تک چل پھر کر بمشکل تمام اُن کو اچھی طرح دیکھ سکتا ہے۔ انگریز استادوں کی اعلےٰ قابلیت اور سرسید کی حُسن تربیت سے طالب علموں نے ایسی ترقی کی کہ کل ہندوستان سے جس قدر مسلمان گریجوایٹ سال بسال نکلتے ہیں اس میں علیگڈھ کالج کے پاس شدوں کا شمار پچاس فیصدی ہے۔ کالج کے نتائج امتحانات طالب علموں کی قابلیت۔ جفاکشی۔ دیانت داری اور وفاشعاری کی نسبت گورنمنٹ ہند بارہا اعتراف کر چکی ہے۔ اور اس کالج کو ریذیڈینشل سسٹم میں سب کالجوں سے فائق سمجھتی ہے۔ کالج کے قیام سے اس وقت تک جس قدر وائسرائے (نائب السلطنت) ہندوستان میں آئے سب کے سب علیگڈھ میں تشریف لا کر کالج کی نسبت اپنی قیمتی رایوں کا اظہار کر چکے ہیں۔ دماغی تعلیم کے ساتھ جسمانی ورزشوں میں طلبا نے ایسی
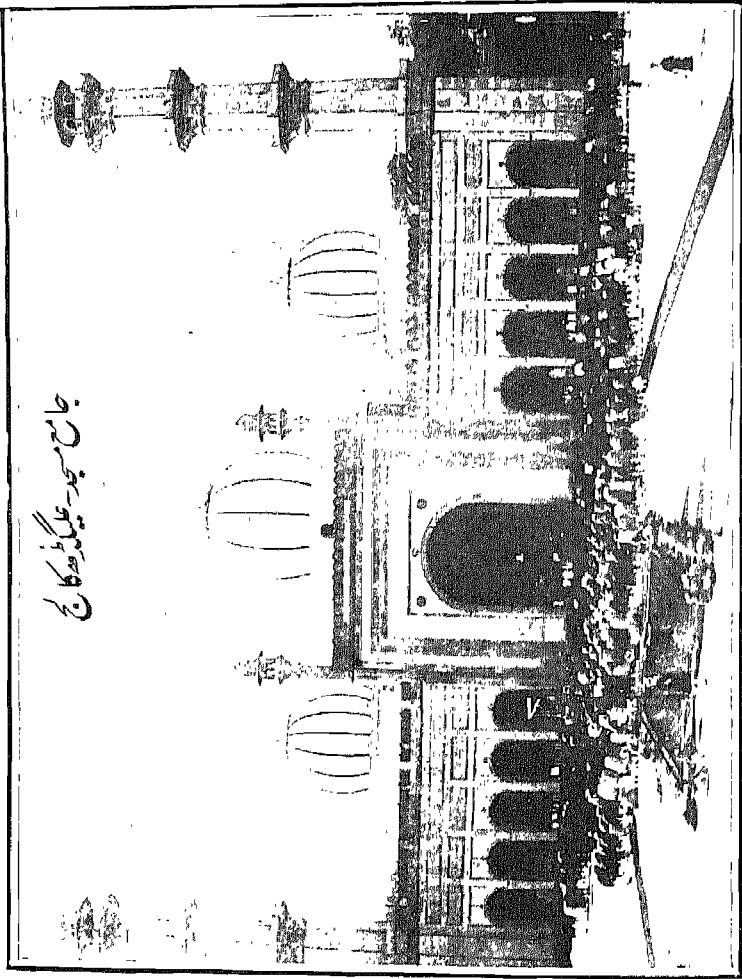
جامع مسجد۔علیگڈھ کالج

ترقی کی کہ علیگڈھ سٹیم کو ہندوستان میں ایک خاص امتیاز حاصل ہے۔ اس عمدگی تعلیم اور تربیت کا ایسا چرچا ہؤا کہ مصر و شام اور استنبول بلکہ یورپ و امریکہ تک اس کی خبریں پہنچ چکی ہیں۔ یورپ کے جس قدر بڑے بڑے سیّاح ہندوستان آتے ہیں۔ اس کالج کی سیر ضروری سمجھتے ہیں۔ ۱۹۰۶ء میں ہز رائل ہائنس پرنس آف ویلز اور ۱۹۰۷ء میں ہز مجسٹی سراج الملۃ والدین امیر حبیب اللہ خاں صاحب فرمانروائے افغانستان بھی دوران سیاحت ہند میں یہاں تشریف لائے اور کالج کے حالات دیکھ کر بہت خوشنودی کا اظہار فرمایا۔ نیز چھ ہزار روپے سالانہ کا عطیہ اس کے واسطے منظور کیا جو سال بسال سفیر افغانستان کے ذریعے آتا رہتا ہے۔

تعداد طلبہ اور سرمایہ

۱۹۰۸ء میں نوسو سے زیادہ طالب علم سکول اور کالج میں پڑھتے تھے جس میں سے تقریباً ساڑھے سات سو بورڈر کے طور پر رہتے ہیں۔ ہندوستان کے علاوہ برہما اور ایران تک کے مسلمان طالب علم بھی تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے یہاں آتے ہیں۔ کالج اور بورڈنگ ہوس کی عمارتوں پر بیس لاکھ روپیہ خرچ ہو چکا ہے۔ اس میں دیگر عمدہ عمدہ قابل دید عمارتوں کے سوا ایک عالیشان مسجد بھی ہے جو دہلی کی جامع مسجد کے نمونے پر بنائی گئی ہے۔ سال مذکور میں کالج کی آمدنی ایک لاکھ ۹۴ ہزار اور خرچ ایک لاکھ ۸۶ ہزار روپے تھا۔

محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس

کالج کے علاوہ سرسیّد نے ایک بڑا کام یہ کیا کہ آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی بنیاد ڈالی جو بائیس سال سے روز افزوں ترقی کے ساتھ کام کر رہی ہے۔ اس کا صدر دفتر علیگڈھ کالج میں ہے اور سالانہ جلسے ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں میں دسمبر کی تعطیلوں میں ہؤا کرتے ہیں۔ بمبئی۔ مدراس۔ کلکتہ۔ ڈھاکہ۔ الہ آباد۔ لکھنؤ۔ شاہجہانپور۔ رام پور۔ دہلی۔ امرتسر۔ لاہور۔ کراچی۔

اور دیگر شہروں میں کئی جلسے ہو چکے ہیں۔ اس کانفرنس کے جلسوں نے تمام ہندوستان میں بیداری پیدا کر دی۔ شمالی ہند کے لوگ جنوبی ہند کے باشندوں سے اور مغربی ہند کے لوگ مشرقی ہند کے باشندوں سے جواب تک ناشناس تھے۔ اُن میں اسلامی اخوت کی روح کو تازہ کر دیا۔ انگریزی زبان اور مغربی علوم کی تعلیم پر مسلمانوں کو بہت کچھ متوجہ کیا۔ ہندوستان کے مختلف حصّوں کے تعلیم یافتہ اور سربرآوردہ مسلمان اس میں شریک ہو کر اپنے ہم قوموں کے تعلیمی مسائل پر غور کرتے ہیں ✣

محمڈن یونیورسٹی

سرسیّد کو انگلستان کے سفر کے بعد چونکہ اس بات کا یقین ہو گیا تھا کہ اس زمانہ میں قومی ترقی کا کوئی ذریعہ اعلےٰ درجہ کی مغربی تعلیم کے سوا نہیں ہے اس واسطے انہوں نے ایک کالج کو غیر مکتفی سمجھکر قومی یونیورسٹی کی ضرورت کو محسوس کیا اور بقیہ زندگی کو اس کے عملی صورت میں لانے کی جدو جہد میں صرف کرتے رہے۔ اگرچہ یہ کام اُن کی زندگی میں پورا نہیں ہوا۔ مگر ملک اور قوم اس کے فوائد سے آگاہ ہو گئی ہے۔ اور اس کی تکمیل کے واسطے لگاتار کوشش کر رہی ہے۔ سرسیّد کی رائے میں دس لاکھ روپے کے سرمایہ سے یہ یونیورسٹی قائم ہو سکتی ہے ✣

پرنسپل بیک و مسٹر آرنلڈ

سرسیّد کی سعی اور قوم کی خوش قسمتی سے کالج کو مسٹر بیک اور ماریسن پرنسپل اور مسٹر ٹی ڈبلیو آرنلڈ پروفیسر ایسے لائق اشخاص ملے کہ ان کی قابلیت اور مسلمانوں کے ساتھ ہمدردی کو کالج کی روز افزوں ترقی اور شہرت عام میں بہت کچھ دخل تھا۔ خاصکر مسٹر آرنلڈ کو مسلمانوں کے علوم کے ساتھ ایسی دلچسپی تھی کہ انہوں نے اشاعت اسلام کے متعلق "پریچنگ آف اسلام" بہت دلچسپ کتاب شائع کی۔ یہ کتاب ایسی عمدہ اور مبسوط ہے کہ اس کو مسلمانوں نے بہت شکرگزاری و خوشی سے پڑھا۔ اور غالباً یہ کتاب اپنی آپ نظیر ہے ✣

سرسیّد کو تعلیمی اور ملکی خدمات کے صلہ میں گورنمنٹ نے کے سی۔ایس آئی اور علمی قابلیت کی وجہ سے اڈنبرا یونیورسٹی نے ایل۔ایل ڈی کا خطاب مرحمت کیا۔آپ نے اکیاسی سال کی عمر کے بعد ۱۸۹۸ء میں انتقال فرمایا۔ مادۂ تاریخ وفات غفرلہٗ ہے۔آپ کی مفصّل سوانح عمری جس کا نام حیات جاوید ہے شمس العلما خواجہ الطاف حسین صاحب حاؔلی نے نہایت شرح و بسط سے شائع کر دی ہے۔

نواب محسن الملک۔ سرسیّد کے نیک ارادوں کا یہ نتیجہ ہوا کہ اللہ تعالےٰ نے کالج کی خدمت کیواسطے ایسے لائق اور وفا دار قوم لوگ بہم پہنچائے کہ اُنھوں نے اپنی زندگیاں اِن کام کے واسطے وقف کر دیں۔سرسیّد کے انتقال اور اُن کے فرزند سید محمود سابق جج ہائی کورٹ الہ آباد کے عہدہ سکرٹری سے مستعفی ہونے کے بعد یہ خدمت نواب محسن الملک مولوی سید مہدی علی صاحب نے اپنے ذمہ لی۔جو گورنمنٹ نظام میں پولیٹیکل اینڈ فنانس سکرٹری کے معزز عہدے سے پنشنیاب ہوئے تھے۔ نواب محسن الملک کی حسن تدبیر اور سحر البیانی نے قوم کو اس قومی درسگاہ کی جانب ایسی توجہ دلائی کہ کالج کی مالی حالت اور تعداد طلبا میں پہلے سے بہت ترقی ہوئی۔اور نہ صرف ہندوستان بلکہ برہما اور ایران تک کے طلبا اس کالج میں آنے شروع ہوئے۔نواب صاحب مشرقی علوم کے عالم متبحّر اور بڑے روشن خیال تھے۔خاصکر امور سیاسیّہ میں اُنھوں نے بڑی شہرت حاصل کی مگر موجودہ فوائد کو مستقبل پر ہمیشہ ترجیح دیتے تھے۔ ۱۹۰۷ء میں ان کا انتقال ہوا اور یغفرلہٗ مادۂ تاریخ پایا۔

آل انڈیا مسلم لیگ۔ سرسیّد کی توجہ پولیٹیکل جد و جہد کی طرف بالکل نہ تھی مسلمانوں کو کمی تعلیم کے باعث ہمیشہ اس سے علحدگی اختیار کرنے کی تلقین کرتے رہتے تھے لیکن زمانہ کی رفتار اور تھوڑی بہت تعلیمی روشنی پھیل جانے کے بعد

مسلمانوں کو نواب محسن الملک کے زمانہ میں پولیٹیکل میدان میں قدم رکھنے کا خیال پیدا ہوا۔ نواب صاحب مرحوم کی کوششوں سے مسلمانوں کا ایک بہت باوقعت وفد (ڈیپوٹیشن) اپنے قومی حقوق کی حفاظت کی غرض سے سنہ ۱۹۰۶ء میں شملہ گیا اور ایک میموریل لارڈ منٹو وائسرائے ہند کے حضور میں پیش کیا۔ اس کا حوصلہ افزا جواب ملنے پر مسلمانوں کی ایک علیحدہ پولیٹیکل انجمن قائم ہو گئی۔ جس نے سال آئندہ میں آل انڈیا مسلم لیگ کی شکل اختیار کی۔ اس کا صدر دفتر بھی علیگڈھ میں ہے اور اس کی شاخیں ہندوستان کے تمام صوبوں میں پراونشل مسلم لیگ کے نام سے بہت سرعت کے ساتھ قائم ہو گئی ہیں۔ مگر افسوس ہے کہ اس لیگ کے قائم ہونے سے پیشتر نواب محسن الملک اس دنیا کو چھوڑ چکے تھے۔ اس لیگ کی دو جنرل میٹنگ آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے ساتھ کراچی اور امرتسر میں بڑی کامیابی کے ساتھ ہو چکی ہیں۔

نواب وقار الملک

نواب محسن الملک کے بعد نواب وقار الملک مولوی مشتاق حسین صاحب سنہ ۱۹۰۷ء میں کالج کے سکرٹری قرار پائے۔ یہ بھی گورنمنٹ نظام کے ایک معزز وظیفہ خوار اور دیانتداری و اصابت رائے میں بہت مشہور ہیں۔ انکی جو عزت و عظمت قوم کے دل میں ہے۔ وہ اس بات کا یقین کرنے کے واسطے کافی شہادت ہے کہ ان کے زمانہ میں کالج کو زیادہ ترقی ہوگی٭

صاحبزادہ آفتاب احمد خاں

حسن اتفاق سے ان دونو بزرگوں کو جائنٹ سکرٹری صاحبزادہ آفتاب احمد خاں بیرسٹر ایٹ لا جیسا روشن خیال اور مستعد شخص مل گیا ہے جو قومی خدمات کے انصرام کے واسطے ہر دم آمادہ رہتا ہے٭

٭ سنہ ۱۹۰۶ء میں کالج کے پرنسپل مسٹر آرچی بولڈ اور ٹرسٹیوں میں جو سخت کشمکش ہوئی اور جس سے کالج کی مستقبل زندگی نہایت خطرے میں پڑ گئی تھی۔ اس کا فیصلہ بوجہ احسن ہونے سے پبلک کو یقین ہو گیا کہ نواب صاحب کامل مدبر۔ دلیر اور قوم کے سچے خیر خواہ ہیں٭ مؤلف

مسلمانوں کی ان ترقیات کے ساتھ میں اس امر کے ظاہر کرنے سے رُک نہیں سکتا کہ علیگڈھ کالج جو کل ہندوستان میں مسلمانوں کا بہترین قومی کالج ہے۔ اس کے قیام کا مدار زیادہ تر عارضی امداد پر ہے اور تاحال کوئی ایسا مستقل سرمایہ فراہم نہیں ہؤا جو اس قسم کی امداد سے اس کو مستغنی کردے۔ ہمیں اس معاملہ میں برادران وطن سے سبق لینا چاہئے کہ ان کے جسقدر قومی سکول اور کالج ہیں۔ اکثروں کے واسطے انہوں نے مستقل سرمایہ بہم پہنچا لیا ہے۔ ان کی یہ اولوالعزمی کہ کلکتہ کی نیشنل یونیورسٹی دو برس میں قائم ہو جاتی ہے اور ہماری یہ پست ہمتی کہ محمڈن یونیورسٹی کا قیام دس سال سے ہنوز روز اوّل کا مصداق نظر آئے۔

زنانہ نارمل سکول

علیگڈھ میں مسلمانوں کا ایک زنانہ مدرسہ بھی ہے۔ اس کی ابتدائی تحریک شیخ محمد عبداللہ صاحب بی اے ایل ایل بی نے ۱۹۰۲ء میں۔ لکھنؤ کانفرنس میں کی اور پھر دو برس کی لگاتار کوششوں کے بعد مسز عبداللہ اور اُن کی ہمشیرہ صاحبہ سکندر جہاں بیگم کی نگرانی میں یہ مدرسہ کھولا شیخ صاحب علیگڈھ کے ایک نامور پنجابی گریجوایٹ اور اس وقت علیگڈھ میں بڑی کامیابی سے وکالت کا کام کر رہے ہیں۔ تعلیم نسواں کی ضرورت اور شیخ صاحب کی مستعدی و قابلیت کے ساتھ ان دونو خاتونوں کی روشن خیالی اور قومی ہمدردی نے پبلک میں ایسا اعتماد حاصل کیا کہ اس تھوڑے عرصے میں لڑکیوں کی تعداد ۱۰۰ تک پہنچ گئی۔ دو لائق اُستانیاں ان کی زیر نگرانی نہایت عمدگی سے کام کر رہی ہیں۔ خاندانی لوگوں نے مدرسہ کی تعلیم اور پردہ کے انتظام کو بہت پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا۔ مدرسہ اگرچہ اس وقت ابتدائی حالت میں ہے مگر اس کا بنیادی پتھر ایسے اصول پر رکھا گیا ہے کہ اعلےٰ درجہ کے نارمل سکول تک پہنچ جائے تاکہ یہاں سے لائق استانیاں تمام اطراف ہند کے واسطے بہم پہنچ سکیں۔ اور مسلمان اُستانیوں

کے نہ ملنے سے جو دقتیں تعلیم نسواں میں مزاحم ہو رہی ہیں۔ زائل ہو جائیں۔

مدرسہ کی ماہوار آمدنی ۱۹۰۸ء میں پانسو روپے ماہوار تھی جس میں سے نصف ہندوستانی والیان ملک کا عطیہ اور نصف گورنمنٹ کی امداد ہے۔ والیان ملک میں سب سے زیادہ اعانت ہر ہائینس بیگم صاحب والیہ بھوپال کی ہے۔ گورنمنٹ نے پندرہ ہزار روپے تعمیر مدرسہ اور بورڈنگ ہاؤس کے واسطے علحدہ دئے ہیں تیس ایکڑ زمین بھی اس غرض کے واسطے حاصل کر لی گئی ہے۔ یہ کامیابی سر سید کے اس خیال کا بیّن نتیجہ ہے جو انہوں نے آج سے پچیس سال پیشتر پنجاب کے سفر میں اس طرح ظاہر کیا تھا۔" جب کسی قوم کے مرد تعلیم سے بہرہ ور ہوں تو یہ ناممکن ہوگا کہ اس کی عورتیں اس فیض سے محروم رہ جائیں"۔

مدرسہ کی خوش قسمتی کے یہ بڑے آثار ہیں کہ مردوں کے علاوہ تعلیم یافتہ بی بیوں نے بھی ملک کے ہر حصہ سے اس کی امداد پر آمادگی ظاہر کی ہے۔ چنانچہ رسالہ خاتون جو شیخ صاحب کے زیر اہتمام تعلیم نسواں کی صلاح و فلاح کے واسطے جاری ہے۔ اس میں وقتاً فوقتاً ان بی بیوں کی امداد کا ذکر ہوتا رہتا ہے۔ ان میں سے مس زہرہ فیضی اور مس عطیہ فیضی خصوصیت سے قابل ذکر ہیں جن کو ابتدا سے اس درسگاہ کے ساتھ کمال ہمدردی ہے۔ چندہ فراہم کرنے اور کئی قسم کی مدد دینے سے انہوں نے اپنا فرض بہت قابلیت سے ادا کیا ہے۔ سلطانہ بیگم صاحب دہلوی اور بنت نذر الباقر[ملا] صاحب سیالکوٹی کو اس مدرسہ کی بہبودی اور ترقی سے خاص دلچسپی ہے۔ غرض موجودہ حالات سے امید کی جا سکتی ہے کہ علیگڈھ جس طرح مسلمان مردوں کی تعلیم کا مرکز ہے۔ ویسے ہی رفتہ رفتہ مسلمان عورتوں کی تعلیم کا بھی مرکز بن جائیگا۔

ملا یہ نذر الباقر ہمارے قدیمی مہربان ہیں جن کا ذکر صفحہ ۲۶۳ میں کیا جا چکا ہے۔

کانپور

علیگڈھ سے ۱۹۲ میل طے کرنے کے بعد ہیں کانپور آیا۔ یہ شہر دریائے گنگا کے کنارے واقع ہے۔ اٹھارھویں صدی مسیحی میں یہ ایک معمولی حیثیت کا گاؤں تھا۔ ابتداءً انگریزی چھاؤنی کے قیام اور پھر تجارت سے اس کو وہ ترقی اور شہرت ہوئی کہ اس وقت شمالی ہند میں سب سے بڑا تجارتی شہر سمجھا جاتا ہے۔ اس کی مردم شماری ایک لاکھ ۹۷ ہزار نفوس کی ہے +

آبادی بہت وسیع ہے۔ شہر کے ایک طرف چھاؤنی اور دوسری طرف سول سٹیشن کی عمارتیں ہیں۔ تمام آبادی دریا کے کنارے کنارے کئی میلوں میں پھیلی ہوئی ہے۔ اس کے بعض موقعوں میں برقی ٹریوے کے ذریعے آمدورفت میں آسانی ہوگئی ہے۔ شہر کے اندرونی بازار تنگ اور اکثر ٹیڑھے ہیں۔ مگر بیرونی آبادی کی سڑکیں سیدھی اور وسیع ہیں۔ بازار عموماً بارونق اور دکانیں تجارتی مال سے پُر ہیں +

یہاں کوئی عمارت ایسی نہیں جو صنعتی خوبیوں کے لحاظ سے قابل دید ہو۔ البتہ غدر ۱۸۵۷ء کے واقعات کا ایک دردانگیز کُواں چھاؤنی کے میموریل باغ میں تاریخی حیثیت سے مشہور ہے۔ دُھوندو پنت مرہٹہ نے جو عام طور پر ناناراؤ کے نام سے مشہور ہے چند یورپین عورتوں اور بچوں کو نہایت بیرحمی سے قتل کرا کر اس میں ڈال دیا تھا۔ اس کوئیں کے اوپر سنگ مرمر کا ایک خوبصورت بُت نصب کیا ہوا ہے۔ ایک فرشتہ اپنے بازوؤں کو نیچے گرائے ہوئے صلیب پر تکیہ لگائے اور ہاتھوں پر کھجوروں کے پتّے لئے کھڑا ہے۔ اس کوئیں کی سیر کے واسطے صاحب کلکٹر کی خاص اجازت حاصل

کرنا ضروری ہے

کانپور سے دہلی - آگرہ - لکھنؤ - الہ آباد اور جھانسی کو ریل کی کئی سڑکیں نکلتی ہیں اور اس سے مال کی درآمد برآمد میں خوب ترقی ہے - پہلے صرف روئی - غلہ - تیل نکالنے کے بیج - نمک - شورہ اور شکر کی نکاسی ہوتی تھی - مگر گزشتہ صدی کی آخری تہائی میں کلوں کے ذریعے بہت کام بننا شروع ہو گیا ہے - بنولے نکالنے - سوت کاتنے - سوتی اور اونی کپڑا بننے اور لوہا ڈھالنے کا کام ان کلوں کے ذریعے خوب ترقی پر ہے - دباغت کا کام خاصکر بہت عمدگی سے ہوتا ہے - ہر قسم کے بوٹ اور گھوڑوں کا ساز سامان نہایت نفیس بنایا جاتا ہے - زین سازی کا ایک سرکاری کارخانہ بڑے وسیع پیمانے پر قائم ہے - کانپور کا چرمی سامان صرف ہندوستان ہی میں خرچ نہیں ہوتا بلکہ مصر جنوبی افریقہ اور چین تک جاتا ہے - ان کے علاوہ خیمہ سازی - برش سازی - شکر سازی اور دیگر کئی قسم کے کارخانے یہاں جاری ہیں - مختصر یہ کہ ان کارخانجات میں اس قدر کام ہوتا ہے کہ شہر کے نصف باشندوں کا گزارہ اسی پر ہے +

انگریزی تعلیم اچھی ترقی پر ہے - دو ہائی سکولوں کے علاوہ ایک مشن کالج ہے - مسلمانوں کے چند مذہبی مدرسے بھی جاری ہیں جو کسی زمانہ میں بڑے بڑے لائق استادوں کی وجہ سے مرجع طلبا بنے ہوئے تھے - یہاں کے سوداگروں اور عام مسلمانوں کو مذہبی خدمات سے خاص دلچسپی ہے - ندوۃ العلما کی بنیاد یہیں قائم ہوئی تھی جس کا صدر مقام تھوڑے دنوں سے لکھنؤ کو منتقل ہو گیا ہے - حال میں انہوں نے علم الٰہیات کا ایک مدرسہ قائم کیا ہے تاکہ طالب علموں کو اسلام کی حقانیت اور دیگر ادیان کی حقیقت کا بخوبی علم ہو جائے - حافظ محمد حلیم صاحب سوداگر و آنریری مجسٹریٹ اس کام میں بڑے سرگرم ہیں +

یہاں کا پریس خصوصیت سے قابلِ ذکر ہے۔ لکھنؤ کے بعد کتابوں کے عمدہ چھاپنے میں کانپور نے بڑی شہرت حاصل کی ہے۔ منشی رحمت اللہ صاحب رعد نے خوشخط اور مصفّا کتابیں چھاپنے سے پہلے مطبعوں پر خطِ نسخ کھینچ دیا ہے۔ رسالہ "زمانہ" ادبی۔ اخلاقی اور تاریخی مضامین کا ایک عمدہ مجموعہ ماہوار شائع ہوتا ہے۔ ایک زراعتی رسالہ بھی گورنمنٹ کے زیرِ اہتمام بہت عمدگی سے نکلتا ہے۔ جس کا نام مفید المزارعین ہے ؛

الٰہ آباد (پراگ)

کانپور سے ۱۲۰ میل طے کرنے کے بعد میں الٰہ آباد آیا۔ یہ شہر دریائے جمنا کے بائیں کنارے پر آباد اور ہندوستان کے مشہور تیرتھ گاہوں میں شمار ہوتا ہے۔ قدیم زمانہ میں اس کو پراگ کہتے تھے۔ مغلوں کے عہد میں الٰہ آباد اس کا نام قرار پایا۔ گنگا اور جمنا دو نو دریا اس جگہ ملتے ہیں۔ ہندوؤں کا یہ عقیدہ ہے کہ سرسوتی دریا جو پنجاب کے جنوب مغربی ریتلے حصے میں غائب ہو گیا ہے گنگا اور جمنا کے ملنے کے لئے پھر اس جگہ نمودار ہو جاتا ہے۔ گویا الٰہ آباد تین دریاؤں کا مقام اتصال ہے۔ اور اسی مناسبت سے اس کو تربینی بھی کہتے ہیں۔ اس شہر کو قدیم تاریخ سے بہت زیادہ تعلق ہے۔ راجا رامچندر نے اپنی جلاوطنی کے زمانہ میں پراگ میں پناہ لی تھی۔ راجا اشوک نے بُدھ مذہب کے احکام ایک بڑے سنگین ستون پر لکھوا کر اس جگہ نصب کرایا تھا۔ جو اب تک قلعہ میں موجود ہے ؛

مسلمانوں کے عہدِ حکومت میں یہ شہر کڑہ کے ماتحت ایک معمولی قصبہ تھا جس کو پولیٹیکل اعتبار سے کچھ اہمیت نہ تھی ۹۸۳ھ ۱۵۷۵ء میں شہنشاہ اکبر نے ایک

شاندار قلعہ جمنا کے کنارے تعمیر کرا کر اس کو صوبہ[1] کا دار الحکومت قرار دیا اٹھارہویں صدی مسیحی میں سلطنت مغلیہ کے زمانۂ ضعف میں ایک عرصہ تک شمالی ہند کے معرکوں کا آماجگاہ بنا رہا۔ اس زمانہ میں نوبت بنوبت بُندیلے۔ مرہٹے اور نوابان اودھ اس پر قابض رہے ۱۸۰۱ء سے انگریزوں کے قبضے میں آیا۔ غدر کے بعد لفٹنٹ گورنر کا صدر مقام آگرہ سے یہاں تبدیل ہوا۔ اور اس وقت تک بدستور لفٹنٹ گورنر اور حکام سول کا صدر مقام اور روز افزوں ترقی پر ہے۔ اس کی آبادی بروے مردم شماری ۱۹۰۱ء ایک لاکھ ۷۲ ہزار ۳۲ ہے۔ یہاں کی زبان اُردو ہے۔

شہر کی آبادی اسٹیشن سے ملی ہوئی ہے۔ عمارتیں علے العموم پختہ مگر کچھ زیادہ شاندار نہیں ہیں۔ بازاروں میں چوک بازار بہت وسیع۔ مصفّا اور دور تک لمبا چلا گیا ہے۔ اس بازار میں ہر قسم کا تجارتی مال فروخت ہوتا ہے۔

شاہی زمانہ میں یہ شہر صوفیۂ کرام اور علمائے دین کا مسکن تھا۔ ان لوگوں کے محل اقامت کو دائرہ کہتے تھے۔ ہر دائرہ کے احاطے میں متعدد مکانات اور اکثر کے ساتھ مسجد و خانقاہ بھی ہوتی تھی۔ یہ دائرے تعداد میں بارہ تھے۔ اور صاحب دائرہ کے نام سے پکارے جاتے تھے۔ مثلاً دائرہ شاہ خوب اللہ۔ دائرہ شاہ اجمل وغیرہ۔ ایک دائرہ میں شیخ امام بخش ناسخ مشہور شاعر کا گھر تھا۔ چنانچہ ایک شعر میں وہ اس کا اشارہ بھی کرتے ہیں ؎

پھر پھر کے دائرہ ہی میں رکھتا ہوں میں قدم
آئی کہاں سے گردش پرکار میرے پاؤں میں

---

[1] بادشاہی زمانہ میں صوبہ الہ آباد کے متعلق یہ شہر تھے:۔ الہ آباد۔ غازی پور۔ بنارس۔ جونپور۔ قلعہ چنار۔ قلعہ کالنجر۔ کڑا مانک پور۔

یہ دائرے اب بھی موجود ہیں۔ مگر پہلے کی سی رونق کہاں ؟

اس وقت چند ایسے بزرگوار اس جگہ موجود ہیں جو فضل و کمال اور خوش خلقی کے لحاظ سے قابل ملاقات ہیں۔ مولوی محی الدین صاحب علوم ظاہری کے علاوہ کمالات باطنی میں بہت ممتاز ہیں۔ حکیم احمد حسین صاحب نے تاریخ ابن خلدون کا ترجمہ کرنے اور چند ناموران اسلام کے تاریخی حالات لکھنے میں ایک نمایاں خدمت کی ہے۔ مولوی سید کرامت حسین صاحب بیرسٹر ایٹ لا جج ہائی کورٹ الہ آباد انگریزی اور عربی زبانوں میں بڑے اعلےٰ درجے کے ماہر ہیں۔ عربی زبان کے اصول پر آپ نے ایک فاضلانہ کتاب عربی زبان میں شائع کی ہے۔ آپ کنتور ملک اودھ کے اُن سادات میں سے ہیں جن کے ہاں علمی قابلیت اور خاندانی وجاہت پُشت ہا پُشت سے ورثہ کے طور پر چلی آتی ہے۔ خان بہادر مولوی سید اکبر حسین صاحب پنشنر سشن جج جن کی ظریفانہ اور نتیجہ خیز نظمیں آجکل شوق سے پڑھی جاتی ہیں بڑے علم دوست اور مشہور سخن طراز ہیں ؁

شہر کے شمالی جانب سول لائن ہے۔ اس کی سڑکیں بہت وسیع اور مصفّا ہیں۔ یہاں ایک بہت لمبا چوڑا باغ الفرڈ پارک ہے جو ۱۸۷۰ء میں ڈیوک آف اڈنبرا کی یادگار میں بنایا گیا ہے۔ کہتے ہیں کہ ہندوستان کے پارکوں میں یہ سب سے خوشنما ہے۔ سول لائن کی عمارتوں میں گورنمنٹ ہاؤس سرکاری دفاتر۔ ہائی کورٹ۔ بار لائبریری۔ میموریل ہال۔ میور سنٹرل کالج قابل دید ہیں۔ میور سنٹرل کالج کے قریب ایک آبادی جے سنگھ پورہ مہاراجہ جے پور کی ملکیت ہے ؁

حرفت و صنعت ۔ الہ آباد کسی خاص قسم کی حرفت و صنعت کے واسطے مشہور نہیں۔ غلہ کی منڈی یہاں عرصہ سے قائم ہے۔ فیض آباد اور جونپور کے

ساتھ ریلوے کا جو سلسلہ جاری ہؤا ہے۔ امید ہے کہ اُس سے تجارت کو خوب ترقی ہوگی ٭

تعلیم۔ تعلیمی مقاصد میں اس شہر نے بڑی ناموری حاصل کی ہے۔ یہاں کا میور سنٹرل کالج کثرت طلبا اور عمدگی نتائج امتحانات کے لحاظ سے تمام ممالک مغربی وشمالی میں اوّل درجہ کا ہے۔ اس کالج کے متعلق ایک محمدن بورڈنگ ہاؤس ہے جو مولوی سمیع اللہ خاں صاحب مرحوم سی۔ ایم۔ جی رئیس دہلی کے اہتمام سے تیار ہؤا تھا۔ اس میں انتیس[29] کمرے ہیں۔ آرٹس کالج۔ لا کالج غرض ہر قسم کے طالب علم بادائے فیس یہاں رہ سکتے ہیں۔ ایک لائق سپرنٹنڈنٹ ان کی نگرانی کے واسطے موجود ہے۔ ایک کمرے میں نماز خوانی کا انتظام بھی ہے۔ تمام بڑے بڑے شہروں میں ضرورت ہے کہ اس قسم کے فری بورڈنگ ہاؤس مسلمان طالب علموں کے واسطے بنائے جائیں۔ کائستھ پاٹھ شالا ایک بہت بڑی درسگاہ ہے جس میں سکول اور کالج شامل ہیں۔ نورمل سکول اور ٹریننگ کالج جو پہلے لکھنؤ میں تھے۔ اب یہاں منتقل ہو کر آ گئے ہیں۔ عیسائیوں کی مذہبی تعلیم کے لئے یہاں ایک ڈیوی نٹی کالج جاری ہے جس میں اردو زبان کے ذریعہ علم الٰہیات کی تعلیم دی جاتی ہے۔ غالباً یہ مدرسہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے ہندوستان کے سب سے بڑے مدارس میں سے ہے۔ کئی مدرسے انگریزوں اور یوریشین کی تعلیم کے واسطے بھی جاری ہیں ٭

پریس۔ یہاں اُردو ہندی کے دو چار چھاپے خانے جاری ہیں اور ایک سوراج اخبار اُردو میں شائع ہوتا ہے جو بہت کچھ آزادی کا دعویدار ہے۔ یہاں کے اخباروں میں پاینیر خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے۔ یہ اخبار انگریزی میں ہے اور روزانہ شائع ہوتا ہے۔ اس کا سٹاف نہایت قابل

اور اعلےٰ درجہ کا ہے - اس کے نامہ نگار یورپ اور ہندوستان کے تمام بڑے بڑے حصّوں میں موجود ہیں - اس کی پالیسی سخت کنسرویٹو ہے - اور گورنمنٹ کی حمایت کا پہلو ہمیشہ لئے رہتا ہے - اسی وجہ سے اس نے گورنمنٹ میں وہ رسوخ حاصل کیا ہے کہ ہندوستان میں آج تک کسی اور اخبار کو نصیب نہیں ہوا - پایونیر کی عزت ہندوستان میں ایسی سمجھنی چاہئے جیسی انگلستان میں ٹائمز کی ٭

عمارات قدیمہ - الہ آباد کی عمارات قدیمہ میں یہ چیزیں قابل دید ہیں :-

خسرو باغ جو ریلوے سٹیشن کے قریب سول لائن میں ہے - اس میں شہنشاہ جہانگیر کے بیٹے خسرو کا مقبرہ بنا ہوا ہے - اس کی عمارت سادہ مگر عظیم الشان ہے - اکثر لوگ صبح و شام سیر کی غرض سے یہاں آتے رہتے ہیں٭

قلعہ جو شہر سے ایک میل کے فاصلہ پر دریائے گنگا اور جمنا کے مقام اتّصال پر واقع ہے - اس قلعہ کو شہنشاہ اکبر نے ۱۵۷۵ء میں تعمیر کرایا تھا - اس کی عمارت بہت مستحکم اور مضبوط ہے - شاہی زمانہ میں جو مکانات اس کے اندر تھے - انگریزوں نے اُنہیں توڑ پھوڑ کر عمارات کا نقشہ بدل دیا ہے اور جو باقی ہیں - اُن کی خوبصورتی پلاسٹر اور قلعی کے نیچے چھپ گئی ہے - اس قلعہ میں ہندوستان کی قدیم یادگاروں میں سے پتھر کی لاٹھ ۳۰ فٹ بلند ہے جس پر راجہ اشوک نے مسیح سے ۲۴۰ برس پیشتر بدھ مذہب کے احکام کندہ کرائے تھے ٭

میدان میں کھڑے ہو کر دیکھنے سے قلعہ کی فصیل سطح زمین کے برابر معلوم ہوتی ہے - لیکن جب دریا کے کنارے جا کر دیکھیں تو اس کی اصلی عظمت و شان کا پتہ چلتا ہے - فصیل کی بائیں دو ایک چھوٹے چھوٹے مندر

دریا کے رہتے ہیں ہیں۔ جہاں پجاری صبح کے وقت عموماً موجود ہوتے ہیں اور زائرین کو پوجا پاٹ کراتے ہیں۔ یہاں سے میدان کی دوسری جانب فصیل اور دریا کے درمیان پاپیادہ آمدورفت بخوبی ہوسکتی ہے +

میلہ ہر سال جنوری مہینے میں دریا کے کنارے یہاں بڑا بھاری میلہ ہوتا ہے دُور دراز مقامات کے لاکھوں ہندو سفر کی صعوبتیں اٹھاکر آتے ہیں۔ اور گنگا و جمنا دونو متبرک دریاؤں میں نہاکر اپنے گزشتہ گناہوں کی تلافی کرتے ہیں۔ بارھویں سال خصوصیت سے بڑا ہجوم ہوتا ہے ۱۸۹۴ء میں جس قدر زائرین یہاں آئے سرکاری کاغذات کے مطابق ان کا تخمینہ دس لاکھ کیا گیا تھا +

آرہ کی رسم۔ پراگ ہندوؤں کے نزدیک اس قدر مقدس جگہ ہے کہ وہ یہاں مرنے کو باعث نجات سمجھتے ہیں۔ زمانہ سابق میں یہاں لوہے کا ایک زبردست آرہ موجود رہتا تھا۔ بعض لوگ نجات آخرت کی غرض سے اور بعض اس اُمید پر کہ مرنے کے بعد کسی راجہ یا کسی بڑے آدمی کا جنم لیں جیتے جی آرہ سے اپنے آپ کو چروا ڈالتے تھے۔ آخر یہ رسم شاہجہاں کے زمانہ میں حکماً موقوف ہوئی +

مَیں ان تمام مقامات کی سیر کے واسطے ریورنڈ میلکم جان صاحب کی مہربانی کا ممنون ہوں۔ آپ رام پور کے ایک خاندانی شخص ہیں۔ اُردو فارسی اور انگریزی اچھی جانتے ہیں۔ ایران اور انگلستان کا سفر بھی کر چکے ہیں۔ آپ کو ہندوستانیوں اور بالخصوص مسلمانوں سے بڑی ہمدردی ہے +

جبل پور سے سناڑہ - اورنگ آباد - دولت آباد - خلد آباد - غارہائے الّورا - (وہاں سے اورنگ آباد کی واپسی) - ناندیر - سکندر آباد - حیدر آباد - (وہاں سے سناڑ کی واپسی) احمد نگر - بیجاپور (وہاں سے ہٹگی کی واپسی) گلبرگہ - واڑی - مدراس - پانڈی چری - ترچناپلی - ٹوٹی کورن (وہاں سے مدراس کی واپسی) ویلور - بنگلور - سری رنگ پٹن - میسور (وہاں سے بنگلور کی واپسی) کولہاپور - پونا اور پھر لاہور کی روانگی +

(دکن* کی حالت پر ایک سرسری نظر)

ہندوستان کی سیر کے بعد ہم نے دکن کا رُخ کیا جو طبعی خصوصیّات - باشندوں کے عادات و اطوار - اور زبانوں کے اختلاف کے باعث ہندوستان سے بالکل ایک جداگانہ ملک ہے - دریائے نربدا یا بالفاظ دیگر سلسلۂ کوہستان بندھیاچل ان دونوں ملکوں کے درمیان حدِ فاصل واقع ہُوا ہے - وسیع ترین معنوں میں دکن سے مراد ہندوستان کا وہ حصّہ ہے جو مغرب کی طرف خلیج کمبایت سے شروع ہوکر مشرق کی طرف جگن ناتھ کے قریب خلیج بنگالہ تک اور جنوب میں راس کماری تک پھیلا ہُوا ہے - اس کی مغربی سمت ساحل بحرِ ہند سے اور مشرقی جانب خلیج بنگالہ سے پیوستہ ہے - پہلی کو ساحل مالابار اور دوسری کو ساحل کورومنڈل کہتے ہیں - ان حدود میں جس قدر

* دکن یا دکھن سنسکرت کے ایک لفظ "دکشنا" سے مشتق ہے جس کے معنی جنوبی کے ہیں +

رقبہ واقع ہے وہ جزیرہ نمائے ہند کہلاتا ہے۔ اس زمانہ کی ملکی تقسیم کے مطابق ممالک متوسط۔ علاقہ نظام حیدرآباد۔ احاطۂ بمبئی۔ احاطۂ مدراس۔ ریاست ہائے ٹراونکور۔ کوچین اور بعض دیگر ریاستیں اس کے بڑے بڑے حصّے ہیں +

دکن کا ملک جس قدر وسیع ہے۔ اُسی قدر کثرت سے مختلف قوموں اور مذہبوں کے لوگ اس میں آباد ہیں جن میں ہندو بیشتر اور مسلمان کمتر ہیں۔ عیسائی ہندوستان کے دیگر حصّوں کی نسبت یہاں زیادہ پائے جاتے ہیں۔ زبانیں بھی اس کثرت سے مروّج ہیں کہ ایک ایک حصہ میں کئی بولیاں بولی جاتی ہیں۔ چنانچہ ریاست نظام حیدرآباد میں تلنگی مرہٹی اور کناری۔ احاطہ بمبی میں مرہٹی کناری اور گجراتی احاطہ مدراس میں تامل تلنگی کناری اور ملایا زبانیں مروّج ہیں۔ اُردو زبان دکن کے تمام مسلمانوں میں خصوصاً اور تجارت پیشہ ہندوؤں میں عموماً مستعمل ہے لیکن مدراس سے جس قدر جنوب کو بڑھتے جائیں۔ اُردو کم ہوتی جاتی ہے اور شمالی ہند سے دُور ہونے کے باعث اُس کے محاورات بہت کچھ غلط ہیں

دکن میں کئی بڑے بڑے دریا ہیں جو اس ملک کے اکثر حصّوں کو سیراب کرتے ہیں۔ دریائے نربدا و تاپتی وسط ہند کے مشرقی پہاڑوں سے نکل کر بندھیاچل کے جنوب میں مشرق سے مغرب کو بہتے ہوئے چلے جاتے ہیں دریائے گوداوری۔ کرشنا اور کاویری مغربی گھاٹ سے نکلتے ہیں اور مشرق کی طرف بہتے ہوئے خلیج بنگالہ میں جا گرتے ہیں +

دکن کے مغربی حصّہ کی آب وہوا خوش گوار ہے۔ مغربی گھاٹ پر اور اس کے نیچے کی طرف بارش بہت ہوتی ہے اور موسم سرد رہتا ہے۔ مگر باقی حصّوں کی آب وہوا عموماً گرم ہے۔ خاصکر مشرقی حصّوں میں گرمی زیادہ پڑتی ہے۔ چاول باجرا۔ جوار۔ گیہوں اور نیل کی پیداوار کثرت سے ہے۔ خصوصاً چاول اور روئی تو ملک کے ہر حصہ میں پیدا ہوتی ہے +

مالابار[1] میں سیاہ مرچیں - دارچینی - مسالے ۔ ترچناپلی میں تمباکو اور اکثر مقامات میں ناریل عمدہ قسم کا پایا جاتا ہے - میوہ جات میں گوا کا آم بہت مشہور ہے ۔

صنعت وحرفت

صنعت وحرفت کو اس ملک میں کچھ زیادہ ترقی نہیں - بمبئی کے علاقہ میں سوتی کپڑا خاصکر صافے اور ساڑھیاں عمدہ بنتی ہیں - مدراس کے علاقہ میں ہاتھی دانت کا کام اچھا ہوتا ہے - لکڑی پر کھدائی کا کام بھی یہ لوگ خوب کرتے ہیں - لکڑی کے سامان پر جیسا عمدہ روغن یہاں کیا جاتا ہے ہندوستان میں دوسری جگہ نہیں ہوتا - سیگار بنانے کے کارخانے اس احاطہ میں بکثرت ہیں - احاطہ بمبئی میں کلوں کے ذریعے کام کو اس قدر ترقی ہے کہ ہزارہا آدمی یہاں مزدوری کرکے اپنا پیٹ پالتے ہیں ۔

[1] مالابار ایک زمانہ میں بہت وسیع ملک تھا - اس کی قدیم حد راس کماری سے لیکر گوا تک پھیلتی تھی - اب ٹراونکور کوچین کی ریاستیں مالابار اور جنوبی کنارہ کے ضلعے - قدیم مالابار کی حد میں ہیں - ساحل مالابار کی چوڑائی ۲۵ میل سے ۷۰ میل تک ہے - ساحل کے برابر برابر مغربی گھاٹ کا پہاڑ چلا گیا ہے - جس کی بلندی تین ہزار فٹ سے سات ہزار فٹ ہے مالابار میں مرچ بکثرت ہوتی ہے - اور اس کا دساور دور تک ہے - ساحل میں قدیمی بندرگاہیں بہت ہیں - اور ایک نامعلوم زمانہ سے غیر ملکوں کے ساتھ بحری تجارت کا سلسلہ جاری ہے - کالی کوٹ - کوچین اور تیلی چری اس ساحل کے مشہور بندرگاہ ہیں - ظہور اسلام سے بیشتر یہودیوں اور عیسائیوں کی آمدورفت ان بندرگاہوں کے ذریعے مالابار میں تھی - مسلمانوں میں سب سے پہلے عرب تاجر ۲۱۲ھ / ۸۲۷ء میں اس جگہ آئے - جن کو ماپلے کہتے ہیں - ان کی اولاد اور ان کے علاوہ کثیر التعداد مسلمان اس علاقہ میں موجود ہیں - عربوں کے بعد یورپین تاجر انہی بندرگاہوں سے ہندوستان میں داخل ہوئے - واسکوڈیگاما پرتگال کا مشہور ناخدا پہلا شخص ہے جو سنہ ۹۰۴ھ / ۱۴۹۸ء میں کالی کوٹ آیا - اسی وقت سے یورپ کے لوگوں کو ہندوستان کے بحری راستہ سے آگاہی ہوئی - پھر نوبت بنوبت ڈچوں - فرانسیسوں اور انگریزوں کی آمد شروع ہوگئی اور انہوں نے اپنی نوآبادیاں یہاں قائم کیں - ان یورپینوں کی اولاد اور عام عیسائی کثرت سے اس جگہ آباد ہیں ۔ مؤلف

ریلوے لائن

دکن میں ریل کے کئی سلسلے جاری ہیں۔ ان کا صدر مقام مدراس ہے جہاں سے ایک سڑک براہ بنگلور و پونا بمبئی جاتی ہے۔ دوسری براہ رائچور اور واڑی مناڑ کو۔ تیسری براہ بجواڑہ وحیدر آباد مناڑ کو۔ چوتھی براہ بجواڑہ کلکتہ کو۔ پانچویں ترچناپلی ہوتی ہوئی ٹوٹی کورن کو جو لنکا جانے والوں کی بندرگاہ ہے۔ چھٹی براہ کالی کوٹ بنگلور کو۔ یہ دونو مغربی ساحل کی بڑی بندرگاہیں ہیں +

تجارت

دکن میں تجارت بہت ترقی پر ہے۔ اندرون ملک ریل کے ذریعے اور ممالک غیر کے ساتھ جہازوں کے ذریعے کثرت سے لین دین ہوتا ہے۔ غلہ اور روئی بیشتر یہاں سے باہر جاتی ہے۔ مالابار سے کافی۔ سیاہ مرچیں۔ دار چینی۔ املی اور مدراس سے کپڑے اور دباغت شدہ چمڑے کی روانگی بہتات سے ہوتی ہے۔ ہاتھی دانت اور لکڑی کے سامان کا دساور بھی خوب ہے۔ یورپ سے سوتی کپڑا۔ دھاتیں۔ کلیں اور مٹی کا تیل ملک کے ہر حصہ میں آتا ہے + مال کی درآمد برآمد کے لحاظ سے بمبئی سب سے بڑا بندرگاہ ہے۔ یہاں سے ممالک غیر کے ساتھ تقریباً اسی کروڑ روپے سال کی تجارت ہوتی ہے - ایک کروڑ روپے کے قریب مالابار کے بندرگاہوں۔ شہر مدراس اور ٹوٹی کورن کے بندرگاہوں سے تجارت ہوتی ہے +

بیرونی تجارت میں زیادہ حصہ غیر قوموں کا ہے۔ دکھنی لوگ علے العموم اپنے ہی ملک میں کاروبار کرنے کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔ اور اس خصوصیت میں ہندو مسلمان دونو برابر ہیں۔ اندرونی تجارت میں مسلمانوں کی حالت بھی اچھی ہے۔ بمبئی بنگلور وغیرہ شہروں میں بعض کروڑپتی مسلمان موجود ہیں +

باشندوں کی حالت

باشندگان دکن کا غالب عنصر ہندو ہے۔ ہر فرقہ کے لوگ خاص خاص وضع کا لباس پہنتے ہیں۔ کوٹ اور کالر کا رواج اگرچہ دن بدن ان میں بڑھتا

جاتا ہے۔ مگر وصوتی اور اپنے اپنے فرقہ کی پگڑیوں کی بندش بدستور قائم ہے۔ اکثر لوگ اب تک پاؤں سے ننگے پھرتے ہیں۔ بوٹ پہننے کا رواج صرف تعلیم یافتوں میں شروع ہؤا ہے ◆

برہمن لوگ بڑے ذہین ہیں۔ جسمانی طاقت کے لحاظ سے مرہٹے خاصکر مشہور ہیں۔ آج سے دوسو برس پیشتر انہوں نے فنون سپاہگری میں ایسی قابلیت بہم پہنچائی کہ تھوڑے عرصہ میں پونا اور ستارا سے اُٹھکر دہلی تک قابض ہوگئے۔ مگر ملک میں امن قائم ہونے اور تعلیم پھیلنے سے جنوبی ہند کے باشندوں کی جنگی سپرٹ عام طور پر معدوم ہوگئی اور اس سے اہل دکن کی جفاکشی مستعدی قابلیت میں مقابلتًا کمی آگئی ہے◆

مسلمانوں میں دینداری کے ساتھ قدامت پسندی غالب ہے۔ ہر نئے کام سے خواہ وہ کتنا ہی مفید کیوں نہ ہو۔ پرہیز کرتے ہیں۔ اسی واسطے انہوں نے جدید تہذیب وتمدّن سے کم فائدہ اُٹھایا ہے ◆

تعلیم

دکن میں انگریزی تعلیم بہت ترقی پر ہے۔ مدراس اور بمبئی اس ترقی کے مرکز ہیں۔ اور دو نو جگہ علٰحدہ علٰحدہ یونیورسٹی قائم ہے۔ مدراس یونیورسٹی کے متعلق جس قدر کثیر التعداد کالج ہیں۔ ہندوستان کی کوئی یونیورسٹی اس کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔ اعلےٰ تعلیم کے واسطے دکن میں تقریبًا ساٹھ کالج ہیں جن میں سے چند سرکار کے روپے سے اور زیادہ تر مشنریوں اور ہندوؤں کے مصارف سے چل رہے ہیں۔ مگر اس وسیع رقبہ میں مسلمانوں کا کوئی قومی کالج نہیں۔ تھوڑے عرصہ سے مسلمانوں میں اس کی تحریک ہورہی ہے۔ ممکن ہے کہ کسی وقت خوش کُن نتیجہ پیدا ہو۔ کالجوں کی سب سے بڑی تعداد بمبئی۔ پونا اور مدراس میں ہے۔ جہاں آرٹس کالجوں کے علاوہ متعدد پروفیشنل کالج ہیں ان میں قانون۔ میڈیکل۔ انجنیرنگ۔ زراعت اور آرٹ کی تعلیم دی جاتی ہے

قانونی جماعتیں اکثر کالجوں کے ساتھ قائم ہیں +

اس تعلیم سے برہمنوں اور مرہٹوں نے پورا فائدہ اُٹھایا ہے۔ اور چند ایسے لائق تعلیم یافتہ ان میں پیدا ہو گئے ہیں جنہوں نے ہائی کورٹ اور کونسل کی ممبری صرف علمی لیاقت کی بدولت حاصل کی ہے۔ قومی اور ملکی بہبودی کے خیالات بھی ان میں راسخ ہوتے جاتے ہیں۔ اور کئی قابل شخصوں نے ملک اور قوم کی خدمت کے واسطے اپنی زندگی وقف کر دی ہے نیشنل کانگریس کو فروغ دینے میں دکھنیوں کی کوششیں بنگالیوں سے کچھ پیچھے نہیں رہیں +

شنہ ۱۹ء کی شورش

سال گزشتہ میں جو شورشیں گورنمنٹ کے برخلاف بنگال اور پنجاب میں برپا ہوئی تھیں۔ سال حال (شنہ ۱۹۰۸ء) میں اُن کا اثر برقی طاقت کی طرح جنوبی ہند تک پہنچ گیا۔ اس کی بنا سودیشی کی تحریک اور بائی کاٹ کی تائید تھی۔ پچھمبارام پلے نے جو جنوبی ہند سے لنکا جانے والی جہازی کمپنی "سودیشی سٹیم نیوی گیشن کمپنی" کا ایجنٹ اور بااثر شخص ہے۔ مارچ میں ٹوٹی کورن اور تناولی میں اس مضمون کے لکچر دینے شروع کئے کہ اگر حامیان سودیشی دل و جان سے مستعد ہو جائیں تو یورپین دکانیں خود بخود بند ہو جائینگی اور شاید یہ لفظ بھی کہے کہ ہم ۳۰ کروڑ ہندوستانی ۵۰ ہزار غیر ملکیوں کو پھونک مار کر اُڑا سکتے ہیں۔ چند وکلا اور کالج کے بعض پروفیسر بھی ان معاملات میں اُس کے ہم خیال تھے۔ مقامی حکام نے یہ حالات دیکھ کر بخیال خود مصلحتاً حُسن تدبیر کے بجائے زیادہ تر دباؤ سے کام لینا شروع کیا جس سے لوگوں کے غصہ کی آگ دن بدن بھڑکتی گئی اور تناولی میں ایک زبردست بلوہ ہوا۔ انہوں نے سرکاری عمارتوں کو آگ لگا دی۔ دفتر جلائے اور بازار لوٹ لئے۔ مالی اعتبار سے جو نقصان اس حادثہ میں ہوا وہ راولپنڈی کے شنہ ۱۹۰۷ء کے بلوہ کی نسبت بڑھا ہوا تھا۔ گورنمنٹ نے تناولی

میں چھ ماہ کے واسطے تعزیری پولیس قائم کی۔ اور مجرموں کو سزائیں دیکر فتنہ فرو کیا۔
اس دوران میں بعض مقامی حکام کی طرف سے سودیشی جہازی کمپنی کے ساتھ سختی کا برتاؤ شروع ہوا۔ خلاف ضابطہ اس کے دفتر کے معائنہ کی کوشش کی گئی۔ ہوٹل کے چند ملازموں کو اس بناپر گرفتار کیا کہ وہ مسافروں کو سودیشی جہازوں کے ذریعے سفر کرنے کی ترغیب دیتے تھے۔ پورٹ افسر نے سودیشی جہازوں کی روانگی کچھ عرصہ کے واسطے حکماً بند کر دی جس کے لئے کمپنی کو ساٹھ ہزار روپے ہرجانہ گزشتہ اور پندرہ سو روپیہ یومیہ ہرجانہ آئندہ کے واسطے دیوانی عدالت میں چارہ جوئی کرنی پڑی +
پونہ کے مشہور کانگریسی لیڈر مسٹر تلک نے جو مضامین گورنمنٹ کے خلاف کیسری اخبار میں شائع کئے تھے۔ اُن کا خاتمہ مسٹر تلک کی سزایابی پر ہوا۔ مقدمہ بمبئی ہائی کورٹ میں ہوا تھا۔ اس کے حالات صفحہ ۴۸۴ میں مختصر طور پر درج ہیں دکن کے بعض دیگر مقامات میں بھی شورش ہوئی۔ مگر وہ کچھ ایسی اہم نہ تھی جو خصوصیت سے قابل ذکر ہو +

(اسلامی عہد کی تاریخ)
علاء الدین کا زمانہ

مسلمانوں کی آمد سے پیشتر دکن کا ملک کچھ ایسا الگ تھلگ تھا کہ سو برس تک سلاطین اسلام کے حملوں سے بالکل محفوظ رہا۔ سب سے اوّل علاء الدین خلجی نے یہاں کی سرسبزی اور زر و جواہر کی کثرت کی خبر سن سنہ ۶۹۴ھ ۱۲۹۴ء میں دیوگڑھ کے راجا پر یورش کی اور سنہ ۷۱۰ھ ۱۳۱۰ء تک اس سلسلہ کو جاری رکھا۔ وارنگل۔ کرناٹک اور ملیبار سے لیکر راس کماری تک فتوحات حاصل کیں۔ افواج علائی کے سپہ سالار ملک کافور نے فتح کی یادگار میں سیت بند رامیشور میں ایک مسجد تعمیر کرائی۔ یہ وہ مقام ہے جہاں سے راجا رام چندر نے جزیرہ لنکا کے فرمانروا راجا راون پر چڑھائی کی تھی۔ آج کل اس جگہ کو رامیشورم کہتے ہیں۔ فتوحات دکن سے

علاء الدین کو اس قدر سونا چاندی اور جواہرات ہاتھ آئے کہ تمام شمالی ہند میں دکن کے تموّل کی دھوم مچ گئی +

بہمنی خاندان

سلطان محمدؐ تغلق کے عہد تک دکن کا ملک دہلی کے ماتحت تھا۔ مگر ۷۵۲ھ / ۱۳۴۷ء میں بہمنی خانداں کی ایک خود مختار سلطنت یہاں قائم ہوئی۔ پندرھویں صدی مسیحی کے شروع میں اس کا دائرہ مشرق کی طرف مچھلی پٹم تک اور مغرب کی طرف گوا تک وسیع ہو گیا تھا۔ اس عہد میں بڑی بڑی عمدہ عمارتیں تعمیر ہوئیں۔ میر محمدؐ گیسو دراز۔ میر فضل اللہ انجو۔ شیخ آذری اور نظیری جیسے باکمال بہمنی خاندان کی قدر دانی سے دکن میں چلے آئے +

پانچ سلطنتوں کا قائم ہونا

پندرھویں صدی مسیحی کے خاتمے پر بہمنی خاندان کا شیرازۂ انتظام بکھرنے سے سلطنت کے اوراق منتشر ہوئے اور اُمرائے شاہی نے خود مختار ہو کر پانچ سلطنتیں حسب ذیل قائم کیں۔ (۱) عادل شاہیہ دار الحکومت بیجا پور۔ (۲) نظام شاہیہ دار الحکومت احمد نگر۔ (۳) قطب شاہیہ دار الحکومت گولکنڈہ۔ (۴) عماد شاہیہ دار الحکومت ایلچ پور۔ (۵) بریدشاہیہ دار الحکومت بیدر۔ ان بادشاہوں خصوصاً عادل شاہیوں کے زمانہ میں ایسی نفیس عمارتیں تعمیر ہوئیں جو اپنی عمدگی اور خوبی کی وجہ سے اب تک سیاحانِ عالم کا مرجع ہیں۔ ایران کے نامور علما اور شعرا بھی کثرت سے یہاں جمع ہو گئے تھے جن میں شاہ طاہر۔ ملک قمی۔ ملا ظہوری۔ محمدؐ حسین مصنف برہان قاطع۔ محمدؐ قاسم مصنف تاریخ فرشتہ کا نام زیادہ مشہور ہے +

مغلوں کا زمانہ

ان سلاطین کی باہمی رقابت سے اندرونی لڑائیاں شروع ہوئیں۔ چنانچہ نمبر ۴ و ۵ کی سلطنتیں سو برس کے اندر اندر مٹ گئیں اور باقیماندہ تین کو شہنشاہ اکبر۔ شاہجہان اور اورنگ زیب کی فتوحات نے سلطنت دہلی کا صوبہ بنایا۔

یہ امر قابل افسوس ہے کہ اورنگ زیب کی اس عظیم الشان کشورکشائی کا اثر کچھ دیر پا نہ ہوا۔ مرہٹوں نے ۱۱۱۸ھ / ۱۷۰۶ء میں جنوبی ہند سے خراج لینے کا حق بزور شمشیر حاصل کیا۔ محمد شاہ کے عہد میں نواب نظام الملک نے حیدرآباد کی نظامت قائم کی۔ دکن کے باقی شاہی مقبوضات چھوٹے چھوٹے رئیسوں میں منقسم ہو گئے جو مرہٹوں یا نظام الملک کے اثر کے غلبہ سے ایک نہ ایک کے تابع فرمان رہتے تھے۔ میسور جو یکے بعد دیگرے ان دونو کا باجگزار تھا۔ ۱۷۶۱ء میں نواب حیدر علی خان کے ہاتھ آیا۔ صرف ٹراونکور کی ریاست الگ تھلگ ہونے کے باعث محفوظ رہی۔

یورپین قومیں جو تاجرانہ حیثیت سے ساحل پر مقیم تھیں۔ ان میں سے فرانسیس اور انگریز با اقتدار تھے۔ ملک کا یہ حال دیکھ کر ان لڑائیوں میں جو دیسی حکمرانوں کے درمیان اٹھارھویں صدی کے وسط میں ہوتی تھیں۔ یہ دونو حریف قوموں کے مددگار رہے۔ انگریزوں نے نواب نظام حیدرآباد سے جو رسوخ حاصل کیا تھا۔ اُس سے ان کی طاقت میں ترقی ہوئی۔ ۱۷۹۹ء میں ٹیپو سلطان کا خاتمہ کیا۔ ۱۸۱۸ء میں مرہٹوں کو شکست دیکر پیشوا کا علاقہ انگریزی سلطنت کے ساتھ شامل کر لیا۔ اس وقت تمام ملک دکن گورنمنٹ انگریزی کے زیر حکم ہے ✣

اب میں یہاں سے دکن کے تفصیلی حالات شروع کرتا ہوں ✣

جبل پور

یہ شہر الہ آباد سے ۲۲۸ میل ہے۔ بمبئی اور کلکتہ کی سب سے پرانی ریلوے لائنیں اسی جگہ ملتی ہیں۔ دریائے نربدا جو ممالک متوسط کا مشہور دریا ہے اس سے چھ میل کے فاصلہ پر بہتا ہے۔ اٹھارھویں صدی مسیحی تک اس کے حالات کی کچھ اطلاع نہ تھی۔ موجودہ شہرت کا آغاز ۱۷۸۰ء سے ہے جبکہ مرہٹوں نے اس کو صدر مقام قرار دیا۔ آبادی اور تجارت کے لحاظ سے

تمام ممالک متوسط میں جبل پور کا دوسرا درجہ ہے۔ ۱۹۱۱ء کی مردم شماری ۱۰ لاکھ ہزار تھی۔ اصل زبان ہندی مگر کاروباری لوگوں اور بالخصوص مسلمانوں میں اُردو کا رواج ہے +

شہر کے بازار وسیع۔ سڑکیں مصفّا اور عمارتیں بہت باقرینہ ہیں۔ اردگرد کے باغوں اور نالاپوں نے اس کی دلچسپی کو اور بھی بڑھا دیا ہے۔ غلّہ کی تجارت خوب ترقی پر ہے۔ تانبے کے برتن اچھے بنتے ہیں۔ سنگتراشی کا کام بھی عمدہ ہوتا ہے۔ خصوصاً سنگ مرمر کی چیزیں بہت نفیس بنتی ہیں۔ سوت کاتنے اور کپڑا بُننے کا کام کلوں کے ذریعے بھی ہوتا ہے +

تعلیم اچھی ترقی پر ہے۔ اعلےٰ تعلیم کے واسطے ایک گورنمنٹ کالج ہے جس کے متعلق قانون اور انجنیری کی جماعتیں بھی ہیں۔ یہاں کی انجمن اسلامیّہ کی مالی حالت اچھی ہے۔ مسلمانوں کی بہبودی کے واسطے ایک مدرسہ اس کی زیر نگرانی قائم ہے +

اخباری جدّوجہد کے لحاظ سے جبل پور اپنے برابر کے شہروں پر فائق ہے۔ ایک ہندی اور ایک انگریزی اخبار روزانہ یہاں سے شائع ہوتے ہیں۔ مسلمان کمی تعلیم کے ساتھ اخباری حیثیت میں بھی پست ہیں +

ریلوے سٹیشن کے پرلی طرف انگریزی چھاؤنی ہے جس میں انگریزی اور دیسی فوجیں کافی تعداد سے موجود رہتی ہیں +

جبل پور سے ۱۳ میل کے فاصلہ پر بھیراگھاٹ وہ مقام ہے جہاں دریائے نربدا سنگ مرمر کی چٹانوں میں سے ہوکر گزرتا ہے۔ اس کا نظارہ بہت دلچسپ اور قابل دید ہے۔ شہر سے گھاٹ تک آمد و رفت کے واسطے سواری ہر وقت مل سکتی ہے +

اورنگ آباد

یہ شہر سنماڑ سے ۱۰۰ میل اُس لین پر ہے جو وادی گوداوری سے گزرتی ہوئی حیدرآباد پہنچتی ہے۔ ہندو و مسلمانوں کے زمانہ کے آثار قدیمہ اورنگ آباد و اُس کے نواح میں کئی میل تک پھیلے ہوئے ہیں جو شائقین اور سیاحوں کو کشاں کشاں یہاں لئے چلے آتے ہیں۔

میں اورنگ آباد پہنچکر مولوی سید محمد صاحب بلگرامی بی اے بیرسٹرایٹ لا اوّل تعلقدار (ڈپٹی کمشنر) کے ہاں ٹھیرا۔ آپ شمس العلما مولوی سید علی بلگرامی کے بھائی اور علمی قابلیت و مہمان نوازی میں اُن کا نمونہ ہیں۔ آپ کے ذریعہ اکابر شہر کی ملاقات اور آثار قدیمہ کی سیر کا اچھا موقع ملا۔

اورنگ آباد شہنشاہ اورنگ زیب کی یادگار ہے جس نے اپنی صوبیداری کے زمانہ میں آباد کر کے اسے دکن کا دارالحکومت مقرر کیا تھا۔ اٹھارھویں صدی عیسوی میں دارالحکومت حیدرآباد منتقل ہونے سے اس کی رونق گھٹ گئی۔ اس وقت گورنمنٹ نظام کے مغربی صوبے کا صدر مقام اور فی الجملہ بارونق ہے۔ اس کے بازار وسیع اور عمارتیں عمدہ ہیں مگر آبادی میں نشیب و فراز بہت ہے۔ آبنوشی کا انتظام جو اورنگ زیب کی یادگار ہے اُس سے ہر ایک گھر میں پانی پہنچتا ہے۔ یہ پانی کئی میل کی مسافت سے لایا گیا ہے اور مٹی کے نلکوں کے ذریعہ سارے شہر میں تقسیم ہوتا ہے۔

عمارات شہر میں سے رابعہ دورانی کا مقبرہ قابل دید ہے جو اورنگ زیب کی پیاری بیگم اور شہزادہ عظیم الشان کی والدہ تھیں۔ روضہ کی عمارت تاج محل کے نمونہ پر ۱۰۷۰ھ (۱۶۶۰ء) میں بہت خوش قطع تعمیر ہوئی ہے۔ باغات اور حوضوں نے اس کو

خوب رونق دے رکھی ہے۔ اس کے نیچے کی منزل میں شاہی زمانہ کے قرآن مجید چینی کی رکابیاں۔ کاشانی پردے۔ قالین۔ تونابیں۔ تانبے کے طلائی برتن ایرانی ساخت کی تمام چینی کی سلفچیاں عجوبۂ روزگار رکھی ہوئی ہیں۔ بیرون شہر قلعہ ارک میں اورنگ زیب کے زمانہ کا ایک شکستہ محل موجود ہے۔ ایک مشہور بزرگ مسافر شاہ (المتوفی ۱۱۲۶ھ ۱۷۱۴ء) کی خانقاہ مرجع خلائق ہے +

یہاں تجارت معمولی ہے مگر امید ہے کہ ریل کے جاری ہونے سے اس میں ترقی ہوگی۔ تعلیمی حالت متوسط درجہ کی ہے۔ صرف ایک ہائی سکول ہے جس میں انٹرنس تک پڑھائی ہوتی ہے +

دولت آباد

اورنگ آباد سے تانگہ کی سواری پر میں اس جگہ آیا۔ مولوی سید محمد صاحب بلگرامی نے مہربانی فرما کر ایک رہنما میرے ساتھ کر دیا اور مزید احتیاط کی غرض سے دولت آباد کے قلعہ دار اور خلد آباد کے نائب تحصیلدار کے نام خطوط بھی لکھ دئے ۔۔

یہ شہر اورنگ آباد سے نو میل اور ریلوے لائن سے چار میل کے فاصلہ پر ہے۔ ہندؤں کے زمانہ میں اس کا نام دیوگڑھ اور فارسی تاریخوں میں دیوگیر لکھا ہے۔ یہاں کے راجا کی دولت مندی کا حال سنکر سب سے اول علاء الدین خلجی نے ۶۹۴ھ ۱۲۹۴ء میں اس پر حملہ کیا تھا۔ سلطان محمد شاہ تغلق شہنشاہ دہلی نے ۷۳۹ھ ۱۳۳۷ء میں اس کو از سر نو آباد کر کے دولت آباد نام رکھا اور دہلی کے عوض ہندوستان کا دارالخلافہ مقرر کیا۔ اس زمانہ میں دہلی سے یہاں تک آٹھ سو میل کا فاصلہ تھا۔ سلطان کی توجہ سے اس کو جو رونق حاصل ہوئی اس کی نسبت ابوالعباس احمد ایک دمشقی سیاح نے یہ لکھا ہے " اس شہر کے بہت حصے ہیں

قلعہ دولت آباد - دکن

اور ہر ایک حصہ میں بہت سی مسجدیں - بازار اور کوئیں وغیرہ ہیں مختلف قسم کے صناع وہاں رہتے ہیں - گویا ہر ایک حصہ بجائے خود ایک آزاد اور الگ شہر ہے"۔ مشہور منزلی سیاح ابن بطوطہ نے اس کو دہلی کا ہم پلہ بیان کیا ہے تھوڑے عرصہ بعد سلطان نے اپنا دارالخلافہ یہاں سے دہلی کو منتقل کیا جو گویا اس شہر کی بربادی کا پیش خیمہ تھا - ۸۴۹ھ ۱۴۴۵ء میں سلطان احمد شاہ بہمنی نے اس کو از سر نو رونق بخشی اور چاند مینار دو سو دس فٹ بلند اس میں تعمیر کرایا - یہاں کی آب و ہوا ایسی عمدہ ہے کہ شاہجہاں اور اورنگ زیب شاہزادگی کے زمانہ میں موسم گرما اسی جگہ بسر کیا کرتے تھے - مگر اس کی موجودہ حالت ایک گاؤں کی ہے - جس میں ڈیڑھ ہزار آدمی چند کچے کوٹھوں میں آباد ہیں +

اس وقت دولت آباد میں جو آثار قدیمہ باقی ہیں - ان میں سے چاند مینارہ - ایک بہت بڑا پختہ تالاب اور ایک عالیشان مسجد قابل دید ہیں - سب سے عمدہ عمارت یہاں کا قلعہ ہے جو عمودی شکل کا چھ سو فٹ بلند پہاڑ کاٹ کر بنایا ہے - اس کے گرد ایک عمیق خندق بھی اسی پہاڑ کو تراش کر تیار کی ہے شاہی عمارتیں قلعہ کی چوٹی پر ہیں جن میں آمدورفت کے واسطے عمودی پہاڑ کے اندر ہی اندر ایک بڑا وسیع راستہ سرنگ کے طور پر بنا ہوا ہے - مغلوں کی یادگار میں شہنشاہ اورنگ زیب کی ایک توپ ہے - جس کا نام مینڈھا توپ اور بنانے والے کا نام محمد حسین عرب لکھا ہے - اس پر قرآن شریف کی آیتیں تحریر ہیں - نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِيْبٌ - بَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ - وَاللّٰهُ خَيْرٌ حَافِظًا +

گو دولت آباد برباد ہو گیا - مگر قاضی شہاب الدین دولت آبادی - میر سید محمد گیسو دراز اور دیگر باکمال جنہوں نے یہاں کی خاک پاک میں نشو و نما پایا ہے -

ان کی وجہ سے دولت آباد کا نام عرصہ تک زندہ رہیگا۔

خُلد آباد (روضہ)

یہ قصبہ دولت آباد سے پانچ میل شمال کی طرف ہے۔ تجارت اور تعلیم یا آثار قدیمہ کے لحاظ سے اسے کوئی خصوصیت نہیں۔ سب سے بڑا شرف اس کو یہ ہے کہ بہت سے دینی اور دنیاوی مشاہیر اس جگہ مدفون ہیں۔ شاہ منتخب الدین اور ان کے بھائی شیخ برہان الدین جو آٹھویں صدی ہجری میں یکے بعد دیگرے سلطان الاولیا شیخ نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ کی طرف سے دکن میں خلیفہ تھے۔ اُن کے مزار مرجع خلائق ہیں۔ ملک عنبر۔ ابو الحسن تانا شاہ۔ شہنشاہ اورنگ زیب نظام الملک آصف جاہ اوّل۔ میر غلام علی آزاد بلگرامی اور بہت سے باکمال خواب دائمی میں اس جگہ آرام کر رہے ہیں۔

منجملہ ان قبور کے شہنشاہ اورنگ زیب کی قبر خصوصیت سے قابل ذکر ہے جو شاہ منتخب الدین کے روضہ کے احاطہ میں بنی ہوئی ہے۔ اصل قبر تو مٹی کا ڈھیر ہے مگر اس کے چاروں طرف پختہ فرش بنا ہوا ہے اور قبر پر لٹھے کا سفید غلاف پڑا رہتا ہے۔ یہ قبر اگرچہ شہنشاہ موصوف کی وصیت کے موافق بالکل سادہ بنائی گئی ہے جو دم واپسین تک اُس کے شرعی احکام کی مراعات کو ظاہر کرتی ہے۔ مگر سلاطین ہند کے عہد میں مُردوں کی عزت قائم رکھنے کے واسطے جو لوازم بہم پہنچائے جاتے تھے اُن کا نمونہ اب تک یہاں باقی ہے۔ قبر کے دیوار بدیوار ایک مکان تسبیح خانہ کے نام سے موجود ہے۔ جس میں حافظوں کی جماعت ہر روز صبح کو قرآن شریف پڑھتی ہے۔ ایک لنگر خانہ ہے جہاں غربا کو ہر شام کھانا مفت دیا جاتا ہے۔ چند چوبدار بھی مقرر ہیں جو حکام اور اُمرا کی آمد پر زرق برق

لباس پہنے اور نُقرئی عصا ہاتھ میں لئے ہوئے قبر کے پاس حاضر رہتے ہیں
ان موقعوں پر زرلبفت کا پردہ قبر کے جنگلہ پر ڈالا جاتا ہے۔ قبر کے احترام اور
موجودہ انتظامات کے واسطے سلطنت آصفیہ بہت کچھ تعریف اور ستائش کی مستحق
ہے جس نے اُلو العزمی سے اس کے مصارف کے واسطے جاگیر و اگنزارہ
کررکھی ہے +

غارہائے الّورا

خلدآباد سے ایک میل کے فاصلہ پر بُدھ جَین اور ہندو مذہب کے سترہ
مندر غارہائے الّورا کے نام سے مشہور ہیں جو غالباً چوتھی اور پانچویں صدی مسیحی
کی یادگار ہیں - یہ مندر ایک سنسان ٹیلہ کو اندر سے کاٹ کاٹ کر بنائے ہیں -
ان کی قطار شمالاً جنوباً کوئی سوا میل لمبی ہوگی۔ بعض غار دو منزلہ اور بعض سہ منزلہ
ہیں - ان غاروں کی اونچی اونچی دیواریں - فراخ چھتیں - اُن پر مختلف دیوتاؤں
کی تصویریں اور انواع و اقسام کے نقش و نگار اس عمدگی اور خوبی سے تراش کر
بنائے ہیں کہ ہندسی اصول سے سرِمُو تجاوز نہیں کیا - اس بےنظیر صنّاعی کے
دیکھنے سے اس امر کا بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے کہ ہندوستانی معماروں کو فنِ تعمیر
میں کیسی اعلےٰ درجہ کی مہارت تھی - گویا وہ پہاڑوں کو موم بنا کر جس طرح چاہتے
اندر باہر سے تراش لیتے تھے +
سب سے زیادہ حیرت انگیز ایک مندر ان غاروں کے خاتمہ پر ہے جو ایک
پہاڑ میں ۲۷۰ فٹ لمبا اور ۱۵۰ فٹ چوڑا صحن تراشنے کے بعد بنایا ہے۔ اس کی بُنیاد میں پہاڑ
کی سطح سے پیوستہ ہیں - مندر کے مقابل پورے قد کے دو ہاتھی اور اسی قدر
اونچے دو ستون اصل مندر کی طرح تراشے ہوئے ہیں - مندر کے بالائی حصّہ پر

ہاتھیوں۔ شیروں اور پرندوں کی عمدہ عمدہ تصویریں تراشی ہوئی ہیں +

اس قسم کی عمارتیں بمقام لُقصر جو مصر کے دارالخلافہ قاہرہ سے پانسو میل جنوب کی طرف ہے میری نظر سے گزری ہیں - یہ قدماسے فراعنہ مصر کے سات مقبرے ہیں۔ الورا کے غار زمین سے تین درجے اوپر کو ہیں اور فراعنہ کے مقبرے سطح زمین سے تین درجے نیچے۔ مگر سنگتراشی کے کام میں الورا کا مرتبہ بڑھا ہؤا ہے +

غاروں کی سیر کے بعد ہم اور ہمارا رہنما پہاڑی کے اوپر آئے - یہاں گورنمنٹ نظام کی طرف سے ایک ڈاک بنگلہ بنا ہؤا ہے - جس میں سیاحوں کے آرام و آسائش کے واسطے ہر قسم کا سامان موجود رہتا ہے۔ کھانا کھانے اور تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد ہم اورنگ آباد کو واپس آئے +

ناندیر

غارہا سے الورا کی سیر کے بعد ہیں اورنگ آباد آیا اور یہاں سے حیدرآباد کو روانہ ہؤا۔ راستہ میں تھوڑی دیر کے واسطے ناندیر قیام کیا - یہ ایک چھوٹا سا قصبہ اورنگ آباد سے ۱۴۷ میل کے فاصلہ پر ہے - اس کی شہرت کا سبب سکھوں کے دسویں پیشوا گرو گوبند سنگھ صاحب کی سمادھ ہے جس کی زیارت کو پنجاب اور دیگر مقامات کے سکھ ہر سال آتے رہتے ہیں - سکھوں کو جنگجو فرقہ بنانے اور دیگر اصلاحات عمل میں لانے کے مجوز آپ ہی ہیں - آپ کا انتقال ۱۷۰۸ء میں ہؤا ہے +

حیدرآباد (دکن)

اورنگ آباد اور حیدرآباد میں ۳۱۵ میل کا فاصلہ ہے - یہ شہر اسی نام کی ریاست

کا دارالحکومت موسیٰ ندی کے کنارے واقع ہے۔ قطب شاہی خاندان کے فرمانروا محمد قطب علی شاہ نے ۱۵۹۱ء ۱۰۰۰ھ میں اس کی بنیاد ڈالی۔ اور پایہ تخت گولکنڈہ سے یہاں منتقل کیا۔ کسی باکمال نے اس کا مادہ تاریخ "یا حافظ" کہا ہے۔ اس کی آبادی ساڑھے چار لاکھ نفوس ہے جس میں باشندگان ملک کے علاوہ ہندوستان کے مختلف مقامات نیز ایران۔ افغانستان۔ عرب اور یورپ کے باشندے بھی موجود ہیں۔ مسلمانوں میں اُردو اور ہندوؤں میں تلنگی۔ مرہٹی اور کناری زبانیں مروج ہیں۔ دفتر کی زبان چونکہ اُردو ہے۔ اس واسطے عام و خاص کو اس کی طرف بہت توجہ ہے ؛

سنہ ۱۹۰۱ء میں جب مَیں پہلی مرتبہ اس جگہ پہنچا تو شیخ عبدالحق بغدادی جسکو مصر سے میں ہمراہ لایا تھا پولیس نے اُس کی مزاحمت کی۔ معلوم ہوا کہ گورنمنٹ انگریزی نووارد عربوں اور پٹھانوں کا یہاں آنا ملکی مصلحت کے خلاف سمجھتی ہے اگر کوئی شخص ان کا ذمہ وار نہ ہو تو یہ لوگ ریاست کے خرچ سے اُس جگہ کو واپس کر دئے جاتے ہیں جہاں سے وہ ریل پر سوار ہوئے ہیں۔ سنہ ۱۹۱۰ء میں جب مَیں آخری مرتبہ حیدرآباد آیا تو ایک پٹھان نوکر میرے ہمراہ تھا۔ اور معلوم ہوا کہ قانون مذکور اس وقت تک بدستور نافذ ہے ؛

حیدرآباد کی اصل آبادی ایک فصیل سے محدود ہے۔ مرور زمانہ سے آبادی میں اس قدر ترقی ہوئی کہ کئی محلے اور بازار بیرون شہر میلوں کی وسعت میں آباد ہو گئے ہیں۔ درحقیقت یہ محلے اور بازار حیدرآباد کی کثرت آبادی* اور رونق کا بڑا سبب ہیں۔ یہ آبادیاں اگرچہ غیر مسلسل ہیں مگر بہت بارونق۔ اصل شہر کا جو

*: میرے آخری سفر کے بعد موسیٰ ندی کی طغیانی سے ایک قیامت خیز طوفان آیا تھا جس سے آبادی کو بہت کچھ نقصان پہنچا ؛ مؤلف

حصہ افضل گنج دروازہ سے چار مینار تک چلا گیا ہے۔ بازار کی وسعت اور عمارتوں کی عمدگی کے باعث قابل دید ہے۔ چار منارہ ایسے موقع پر ہے کہ وہاں سے شہر کے چاروں طرف سڑکیں نکلتی ہیں۔ اس کی بلندی ۱۸۴ فٹ اور اس کی منزل بالائی پر ایک مسجد اور ایک حوض بنا ہوا ہے۔ کہتے ہیں کہ قطب شاہی خاندان کے فرمانرواؤں نے جو شیعہ مذہب کے تھے مشہد مقدس کے روضہ (امام ضامن) کی وضع پر اس کو تعمیر کرایا تھا۔ ڈھائی تین لاکھ روپے اس کی لاگت کا صرف بیان کیا جاتا ہے ۔

چار منارہ

چار منارہ کے قریب ایک اور پرانی عمارت اسی خاندان کی بنائی ہوئی ہے جو مکہ مسجد کہلاتی ہے۔ یہ مسجد جنوبی ہند کی بڑی مسجدوں میں شمار کی جاتی ہے۔ اسکی بلندی ۷۵ فٹ مگر منار سے صرف ۲۵ فٹ اونچے ہیں۔ حیدر آباد کے لوگ اس مسجد کا بڑا احترام کرتے ہیں۔ اکثر والیان دکن اور ان کے اقربا کی قبریں بھی صحن کی ایک جانب بنی ہوئی ہیں۔ اس مسجد کے متعلق ایک عظیم الشان لنگر خانہ حضورِ نظام کی طرف سے جاری ہے۔ جس میں ہر روز صبح کے وقت تقریباً ایک ہزار مسکینوں کو کھچڑی تقسیم ہوتی ہے۔ مگر ان میں زیادہ تر گداگری پیشہ ہٹے کٹے سنڈ مسنڈ ہوتے ہیں۔ جن کا کھلایا باپ نہ ہُن۔ ان کے ہاں بلا زحمت ہُن* برستا ہے۔ جسے وہ رحمت الٰہی سمجھتے ہیں ۔

مکہ مسجد

چار منارہ کے قریب حضور نظام کا خاص محل ہے جسے چومحلہ کہتے ہیں حضور نظام کے شاہی دربار اور نواب گورنر جنرل بہادر کی ملاقات اس محل کے ایک حصہ میں ہوا کرتی ہے۔ اس محل کا سامان آرائش بہت اعلےٰ درجہ کا ہے

چومحلہ

* ہُن ایک قسم کا طلائی سکہ ہے جس کی قیمت تقریباً ساڑھے چار روپے ہے۔ اس کو پیگوڈا بھی کہتے ہیں۔ (دیکھو ترجمہ سفرنامہ ٹورنیر جلد اوّل)

عمارات جدیدہ

والئی ریاست - اُن کے وزرا اور شہر کے تمام عمائد کی عالیشان عمارتیں
دراصل شہر کے اندر ہیں۔ مگر انگریزی تہذیب کے پھیلنے سے والی ریاست اور اُمرانے
شہر کے باہر بھی عمارتیں بنوانی شروع کر دی ہیں - ان جدید التعمیر عمارتوں میں سب
سے عمدہ عمارت فلک نما شہر کے پرلی طرف ہے جس کو نواب وقارالامرا بہادر
نے بنوایا تھا اور بعد میں ۲۵ لاکھ پر والئی ریاست نے ان سے خرید لیا۔ ایسا
ہی بشیر باغ شہر کی اس جانب ہے - جسے نواب سرآسمان جاہ بہادر نے تعمیر
کرایا ہے - یہ باغ وسعت اور آرائش کے لحاظ سے بہت پُرفضا ہے +

باشندگان شہر آرام آسائش کے لحاظ سے باغ عامہ (پبلک گارڈن) سب سے زیادہ
پسندیدہ عمارت ہے جو سرسالارجنگ اول مرحوم کے زمانہ میں گورنمنٹ کے
صرف سے تیار ہوئی تھی - کہتے ہیں کہ ۱۰ لاکھ روپے اس پر خرچ ہوئے تھے -
یہ اس قدر وسیع اور خوشنما ہے کہ جنوبی ہند میں کہیں اس کی نظیر نہیں - تمام باغ
کے گرد ایک فصیل بنی ہوئی ہے - باغ میں جابجا عمدہ روشیں اور سڑکیں نہایت
سلیقہ سے بنائی گئی ہیں - روشوں کا سبزہ نہایت فرحت افزا اور غم رُبا ہے -
ان عمارتوں کے علاوہ حسین ساگر کا تالاب ایک بڑا پُرفضا مقام ہے جو کئی میلوں میں
پھیلا ہوا ہے - اکثر لوگ سرِشام اس کے بند پر ہواخوری کو جاتے ہیں +

سکندرآباد

بند سے تھوڑے فاصلہ پر سکندرآباد ہے - یہاں برٹش گورنمنٹ کی ایک زبردست
چھاؤنی ہے جو حیدرآباد کنٹنجنٹ کے نام سے مشہور ہے - یہ چھاؤنی اُس وقت
سے قائم ہے - جب انگریزی گورنمنٹ نے ریاست کی حفاظت کا ذمہ وار
ہو کر ریاست کے خرچ سے اس کو قائم کیا تھا - صوبہ برار اسی فوج کے مصارف
کی کفالت کے واسطے انگریزوں کے حوالہ کیا گیا تھا - سنہ ۱۹۰۱ء میں برار کا فیصلہ
ہو جانے سے اب فوج کی تعداد بہت گھٹ گئی ہے +

عادات و اطوار

لوگ عموماً با اخلاق۔ ملنسار اور مہمان نواز ہیں۔ مگر زیادہ جفاکش نہیں۔ حرفت و صنعت سے بے رغبتی اور شوق ملازمت برسر ترقی ہے۔ دینداری کا چرچا بھی ان میں خاصہ ہے۔ علما۔ صوفیا اور باکمال لوگوں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آتے ہیں۔ بالخصوص صوفیہ سے انہیں کمال عقیدت ہے۔ بزرگوں کے مزار اور اُن کے سجادہ نشینوں کا بہت ادب کرتے ہیں۔ ہزارہا روپے کی منتیں مانتے ہیں اور اس کو دینی و دنیوی مرادوں کے پورا ہونے کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ اُمرا میں انگریزی معاشرت روز بروز ترقی کرتی جاتی ہے۔ یہ لوگ مکانات کی آراستگی۔ لباس کی تیاری اور روزمرہ کی ضروریات میں مصارف کثیر کے متحمل ہوتے ہیں۔ مگر آمدنی بڑھانے اور لوازم زندگی کو ملکی پیداوار سے بہم پہنچانے پر کچھ توجہ نہیں۔ اسی وجہ سے صنعت و تجارت کو تنزل ہے۔ ضروریات کی تمام چیزیں یورپ اور دیگر ممالک سے کھچی چلی آتی ہیں۔ تعلیمی حالت بھی کچھ تسلی بخش نہیں۔ جیسا کہ عنقریب بیان کیا جائیگا +

والیٔ ریاست

ریاست کے موجودہ فرمانروا نواب میر محبوب علی خان فتح جنگ بہادر آصف جاہ مظفر الممالک نظام الملک نظام الدولہ ہیں۔ آپ کو انگریزی۔ فارسی اور اُردو زبانوں میں خوب مہارت ہے۔ اُردو کے شاعر بھی ہیں اور اچھا شعر کہتے ہیں۔ نواب مرزا داغ مرحوم دہلوی آپ کے اُستاد تھے۔ ملک داری اور رعایا پروری میں آپ کو اعلےٰ درجہ کی قابلیت ہے۔ مسلمان۔ ہندو۔ پارسی اور عیسائی بلاتفریق قوم و مذہب اچھے اچھے عہدوں پر ممتاز اور بیش قرار تنخواہیں پاتے ہیں۔ چنانچہ مدار المہام کو پندرہ ہزار روپے اور پیشکار کو دس ہزار روپے ماہوار ملتے ہیں۔ لاکھوں روپے کی جاگیریں اس کے علاوہ ہیں۔ اسی مناسبت سے دیگر عہدہ داروں کی تنخواہیں اور جاگیریں سمجھنی چاہئیں۔ خانقاہوں۔ مسجدوں۔ مندروں اور گرجاؤں

کے لیئے بھی نہایت بے تعصّبی اور فیاضی سے لاکھوں روپے کی جاگیریں اگزار ہیں۔ سرکاری کاغذات کے مطابق تخمینہ کیا گیا ہے کہ ہر قسم کی جاگیروں کی تعداد ایک کروڑ روپے سالانہ کے قریب ہے جو ریاست کی آمدنی کے پانچویں حصّہ کے برابر ہے +

وزرا و اُمرا

اُنیسویں صدی کے وزرا میں نواب میر تراب علی خاں سر سالار جنگ اوّل ہندوستان کے مشہور ترین مدبّروں میں شمار کیئے گئے ہیں جن کا زمانہ وزارت ۱۸۵۳ء سے ۱۸۸۳ء تک کمال استقلال سے گزرا ہے۔ اُن کی اعلےٰ قابلیّت اور حُسن تدبیر سے ریاست کے مالی اور ملکی کاروبار میں بہت کچھ اصلاحیں ہوئیں۔ ہندوستان کے مختلف حصّوں سے بڑے بڑے قابل اور لایق عہدہ دار انتخاب کرکے اُنھوں نے بُلوائے۔ مگر اُن کے انتقال کے بعد پارٹی فیلنگ کے ترقی پانے سے وزارت کا عزل و نصب بہت جلد جلد عمل میں آیا۔ اور پچیس برس کے عرصہ میں چار مدار المہام یکے بعد دیگرے حسب ذیل وزارت کے عہدہ پر متمکن ہوئے۔ (۱) نواب میر لائق علی خان بہادر سالار جنگ ثانی۔ (۲) نواب سر آسمان جاہ بہادر بشیر الدولہ۔ (۳) نواب وقار الامرا بہادر اقبال الدولہ (۴) یمین السلطنت مہاراجہ کشن پرشاد بہادر یہی کیفیت اور عہدہ داروں کے عزل و نصب کی ہے۔ چنانچہ آغا مرزا سرور جنگ۔ نواب محسن الملک مولوی سید مہدی علی خاں۔ نواب وقار الملک مولوی سید مشتاق حسین۔ نواب عماد نواز جنگ حسن بن عبداللہ۔ مولوی سید علی حسن شمس العلما مولوی سید علی بلگرامی جیسے مدبّر اور معزز اشخاص جنہیں سر سالار جنگ اول نے ہندوستان سے انتخاب کرکے بلایا تھا۔ پولٹیکل سازشوں کا شکار ہوئے اور یکے بعد دیگرے پنشنیاب ہو ہو کر چلے گئے۔ اب انتظامی محکموں میں انگریز عہدہ داروں کی تعداد آئے دن بڑھتی جاتی ہے۔ اور اختیارات میں اُنہی کا پلّہ بھاری ہے +

تعلیم

گورنمنٹ نظام کی طرف سے انگریزی علوم کے واسطے نظام کالج اور مشرقی زبانوں کے واسطے دارالعلوم جاری ہے۔ایک مدرسہ رئیس زادوں کی تعلیم کے واسطے علیحدہ ہے۔پرفیشنل تعلیم کے واسطے ڈاکٹری۔قانون اور انجنیرنگ کا بھی ایک ایک مدرسہ ہے۔ایک مدرسہ خاص فوجی تعلیم کے واسطے ہے۔یہ درسگاہیں اگرچہ مقامی آبادی کے لحاظ سے کم ہیں لیکن لوگ ان سے بھی پورے طور پر مستفید نہیں ہوتے۔نظام کالج جس پر ۸۶ ہزار روپے سالانہ خرچ ہوتے ہیں۔گزشتہ سالوں میں ہر تین برس بعد ایک گریجوایٹ یہاں سے نکلتا رہا ہے۔عام لوگوں کی توجہ مشرقی علوم کی طرف فی الجملہ اچھی ہے۔پنجاب یونیورسٹی کے امتحانات عربی اور فارسی میں جس قدر طلبا کامیاب ہوئے ہیں۔کہا جاتا ہے کہ ان میں تقریباً نصف طالب علم دارالعلوم کے تھے۔کچھ طالب علم ریاست کے خرچ سے انجنیرنگ۔میڈیکل اور دیگر علوم کی تحصیل کے واسطے وقتاً فوقتاً انگلینڈ بھی بھیجے جاتے ہیں۔مگر ان کا انتخاب زیادہ تر خاندانی حیثیت سے ہوتا ہے۔اس واسطے وہاں کے نتائج امتحانات چنداں تسلی بخش نہیں ہوتے۔لڑکیوں کی تعلیم پر البتہ خاص کوشش ہو رہی ہے۔تعلیم نسواں اور آزادی مستورات سے یہاں کی تعلیم یافتہ جماعت کو جس قدر دلچسپی ہے۔وہ ہندوستان کے مسلمانوں میں دوسری جگہ کم ہوگی +

مذہبی تعلیم کے واسطے یہاں کئی درسگاہیں جاری ہیں جن میں قدیم طریقہ تعلیم کے موافق درس کا سلسلہ جاری ہے۔ان میں سے مدرسہ نظامیہ جو حضور نظام کے اُستاد مولوی انوار اللہ خان صاحب کی زیر نگرانی جاری ہے نسبتہً اچھی حالت میں ہے +

اشاعت علوم

مشرقی علوم کی ترقی کے واسطے گورنمنٹ نظام کی طرف سے کئی قسم کی

سہولتیں بہم پہنچائی گئی ہیں۔ اور اس کے متعلق چند جداگانہ محکمے ہیں ۱۹۰۱ء
میں جب میں اس جگہ آیا تو مفصلہ ذیل محکمے قائم تھے :۔

(۱) کتب خانہ۔ جس میں عربی اور فارسی کی کئی ہزار عمدہ عمدہ کتابیں موجود اور بعض ان میں سے نادر الوجود ہیں۔ اس کے مہتمم مولوی سید تصدق حسین صاحب ہیں +

(۲) محکمۂ علوم و فنون۔ جس کے اجرا کا یہ مدعا ہے کہ عربی۔ فارسی اور مغربی زبانوں سے مفید عام کتابیں ترجمہ کر کے شائع کی جائیں۔ اس کے نگران شمس العلما مولوی سید علی صاحب بلگرامی ہیں +

(۳) فقہ اہل بیت۔ یہ محکمہ اس غرض سے قائم ہوا ہے کہ اہل بیت کی روایت سے جو حدیثیں اہل سنت و جماعت کی کتابوں میں درج ہیں اُن کو منتخب کر کے ایک سلسلۂ فقہ اہل بیت تیار کیا جائے۔ اس کے مہتمم مولوی حسن الزمان صاحب ہیں +

(۴) دائرۃ المعارف۔ اس محکمہ کی خاص خدمت یہ ہے کہ فقہ۔ حدیث۔ تفسیر۔ رجال۔ علم کلام۔ لغت اور نحو کی نایاب کتابیں شائع کی جائیں۔ اس کے سکرٹری ملا عبدالقیوم صاحب ہیں اب تک ۳۲ کتابیں شائع ہو چکی ہیں +

کتب خانہ اور دائرۃ المعارف کے سوا باقی دونو محکموں کی رفتار ترقی بہت دھیمی ثابت ہوئی۔ محکمۂ علوم و فنون اور فقہ اہل بیت کے کارکنوں نے اس کو حلوائے بے دود سمجھ رکھا تھا۔ باوجودیکہ پندرہ سولہ ہزار روپیہ سالانہ ان پر خرچ ہوتا تھا۔ مگر نتیجہ بہت کم نکلا۔ اس واسطے یہ دونو محکمے توڑ دئے گئے +

علما کو وظیفے

ان کے علاوہ کئی عالموں کو ہندوستان کے مختلف حصوں میں صدہا روپے ماہوار وظیفے ملتے ہیں۔ تاکہ یہ لوگ بےفکری سے تصنیف و تالیف کے کام میں مشغول رہیں۔ ان میں سے مولانا عبدالحق حقانی۔ شمس العلما مولوی شبلی نعمانی۔ شمس العلما خواجہ الطاف حسین حالی اور مولوی سید احمد صاحب دہلوی مؤلف فرہنگ آصفیہ

یہاں کے نامور وظیفہ خوار ہیں ۔ غرض ریاست حیدرآباد کا یہ ایسا کارنامہ ہے جس کی نظیر ہندوستان کے کسی حصہ میں نہیں ملتی ٭

مشاہیر

مشرقی اور مغربی علوم کے جس قدر عالم حیدرآباد میں مجتمع ہیں۔ ہندوستان کے کسی حصہ میں اُن کی نظیر نہ ہوگی۔ یہاں کے باکمال لوگوں میں سے نواب عماد الملک مولوی سید حسین بلگرامی کا نام خصوصیت سے قابل ذکر ہے۔ آپ عربی۔ فارسی۔ انگریزی اور فرانسیسی زبانوں کے بڑے ماہر ہیں ۔ پہلے محکمۂ تعلیم کے ڈائرکٹر تھے اور پنشنیاب ہونے کے بعد لنڈن کی انڈیا کونسل کے ممبر ہوکر ولایت تشریف لے گئے۔ ان کے بھائی شمس العلما مولوی سید علی بلگرامی کو عربی۔ فارسی و انگریزی کے علاوہ فرانسیسی۔ جرمنی۔ سنسکرت و ہندوستان کی متعدد زبانوں کی جامعیت کا فخر حاصل ہے۔ آپ پہلے محکمۂ تعمیرات کے سکرٹری تھے۔ یہاں سے پنشنیاب ہونے کے بعد کیمبرج میں مرہٹی زبان کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ ڈاکٹر سید سراج الحسن صاحب علوم مغربی کے عالم اور اس وقت محکمۂ تعلیم کے ڈائرکٹر ہیں۔ بوبکر بن شہاب علوم عربیہ کے عالم اور دار العلوم کے اوّل مدرس ہیں۔ آپ کا وطن ملک یمن ہے ۔ سنا د الملک علّامہ شوستری عربی و فارسی کے ادیب اور روا لیئے ملک کے اُستاد ہیں۔ مولوی حسن الزمان صاحب علوم دینیہ کے بڑے ماہر اور محکمہ نقہ اہل بیت کے ناظم ہیں۔ حکیم مولوی عبد الرحمٰن صاحب سہارنپوری ادب اور طب میں بہت نامور ہیں ۔ مولوی عبد الحلیم صاحب شرر لکھنوی مشہور ناول نویس اور اس وقت محکمۂ تعلیم کے نائب ڈائرکٹر ہیں۔ مولوی ظفر علی خاں اُردو کے اعلیٰ انشاپرداز۔ لارڈ کرزن کے سفرنامہ اور کئی کتابوں کے مترجم اور اس وقت مجلس وضع قوانین کے سکرٹری ہیں ۔ مولوی عبد الغفور خاں رام پوری سلسلہ آصفیہ کے مؤلف اور تاریخ ابن اثیر کے مترجم ہیں۔ شیخ غلام قادر گرامی تخلص پنجاب کے

رہنے والے۔ فارسی شعر کے مسلم الثبوت استاد ہیں۔ اور بھی بہت باکمال ہیں جن کے اسما بخوف طوالت قلم انداز کئے گئے ہیں +

ملا عبد القیوم

باشندگان حیدرآباد میں علمی قابلیت۔ دینی حمیت اور قومی خدمات کے لحاظ سے ملا عبد القیوم ایک خاص بزرگوار ہیں۔ آپ کے بزرگ موصل سے ہندوستان میں آئے اور برہانپور رہوتے ہوئے مدراس میں اقامت کی۔ آپ ریاست میں اول تعلقدار (ڈپٹی کمشنر) کے عہدے پر ممتاز تھے۔ آزاد خیالی اور وسیع الاخلاقی آپ کا حصہ تھا۔ مہمان نوازی میں آپ کا رتبہ اپنے اقران سے بڑھا ہوا تھا۔ ہندوستانی علما اور عرب و ترک سیاحوں کی آمد و رفت ہمیشہ آپ کے ہاں جاری رہتی تھی۔ رخصت کے وقت نقد زادراہ سے اُن کے ساتھ کافی سلوک کیا جاتا تھا۔ آپ نے ملک اور قوم کی جو خدمات کیں۔ اُن کی تفصیل بالاختصار یہ ہے :-

(۱) مطبع دائرۃ المعارف دینی کتابوں کی اشاعت کے واسطے قائم کیا +

(۲) شہدائے جنگ کریٹ و یونان کے پس ماندوں کے واسطے چندہ فراہم کیا +

(۳) حجاز ریلوے کی اعانت کے واسطے سب سے اول ایک کمیٹی قائم کی جس کی دیکھا دیکھی ہندوستان کے ہر حصہ میں چندہ وصول کرنے کی بنیاد پڑ گئی +

ان کارناموں کے باعث مصر۔ شام۔ حجاز۔ عراق اور استنبول تک ملا صاحب کی قومی اور دینی خدمات کا چرچا پھیل گیا۔ یہ بات کسی اور ہندوستانی کو اب تک نصیب نہیں ہوئی۔ ۹۔ رمضان ۱۳۲۴ھ کو آپ کا انتقال ہوا۔ خدا مغفرت کرے +

قلعہ گولکنڈہ

بیرون شہر جو قدیمی عمارتیں ہیں۔ ان میں سب سے عمدہ اور قابل دید گولکنڈہ کا قلعہ ہے۔ یہ شہر سے پانچ میل مغرب کی جانب واقع ہے۔ قطب شاہی

خاندان کے زمانہ میں ریاست حیدرآباد کا پہلا دارالحکومت یہی تھا۔ ۱۹۱۵ء میں
جناب ملّا عبدالقیوم صاحب اور ہم اس قلعہ کی سیر کو گئے تھے۔ نواب افسر جنگ
بہادر کمانڈر انچیف ریاست نے براہ مہربانی ایک سوار ہمارے ساتھ کر دیا تھا۔
جس نے ہمیں ہر ایک مقام کی بخوبی سیر کرائی +

یہ قلعہ کئی میلوں میں پھیلا ہؤا اور ایک بڑی مستحکم فصیل سے محدود ہے
اس کے اندر ۲۵۰ فٹ اونچی اور مخروطی پہاڑی پر بالاحصار ہے۔ جہاں قطب شاہی
خاندان کی عمارتیں اب تک موجود ہیں۔ سطح زمین سے بالاحصار تک بہت
دشوار گزار اور تنگ راستہ ہے جو صرف پا پیادہ طے کرنا پڑتا ہے۔ ایک مدت تک
بادشاہوں کا یہ خیال رہا کہ گولکنڈہ کے قلعہ کا فتح کرنا بہت دشوار ہے۔ اورنگ زیب
جیسے اولو العزم شہنشاہ نے جس عرصہ دراز کی محنت اور تکالیف شاقہ سے اسے فتح کیا۔
وقایع نعمت خاں عالی اس کی ایک زندہ شہادت ہے۔ اس وقت قلعہ کی عمارتیں
شکستہ ہوتی جاتی ہیں اور ملکی ضروریات کے لحاظ سے شاید مرمت کی ضرورت
بھی نہیں۔ بالفعل گورنمنٹ نظام کی فوج کا ایک برگیڈ یہاں رہتا ہے زمانہ
قدیم کے اسلحۂ جنگ بھی یہاں موجود ہیں +

قلعہ کے شمال مشرق کی طرف قریباً چھ سو گز کے فاصلہ پر قطب شاہی خاندان کے
مقبرے بنے ہوئے ہیں۔ جنہوں نے تقریباً پونے دو سو برس ریاست گولکنڈہ
پر حکومت کی۔ یہ مقبرے جنوبی ہندوستان کے تمام اور مسلمانی مقبروں کی نسبت
اُستواری میں بدرجہا بڑھکر ہیں۔ ان مقبروں میں سنگتراشی کا کام جس عمدگی سے
ہؤا ہے۔ وہ اُس زمانہ کی ترقی کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔ قبروں کی لوحوں پر خطِ
ثُلث میں دُعائیں۔ آیات قرآنی اور سلاطین کے نام و سنہ وفات تحریر ہیں +

نوٹ۔ اب سنماڑ سے بیش حیدرآباد کا دوسرا راستہ اختیار کرتا ہوں کہ اس طرف کئی
اسلامی سلطنتوں کے آثار قدیمہ ہیں + مؤلف

احمد نگر

منماڑ سے ۹۵ میل طے کرنے کے بعد ہَیں احمد نگر آیا۔ عام لوگ اس کو نگر اور چاندبی بی کا نگر بھی کہتے ہیں۔ احمد نظام شاہ بحری نے سنہ ۹۰۰ھ ۱۴۹۴ء میں اس کی بنیاد ڈالی تھی۔ یہ شہر تقریباً ڈیڑھ سو برس تک نظام شاہی خاندان کا دار الحکومت رہا۔ کچھ عرصہ تک اس کو ایسی ترقی ہوئی کہ دکن کے نامور شہروں میں شمار ہوتا تھا۔ مگر سلاطین عادل شاہیہ کی تاخت و تاراج اور شہنشاہ اکبر کی فتوحات سے اس کو بڑے بڑے حوادث کا مقابلہ کرنا پڑا۔ سنہ ۱۰۴۳ھ ۱۶۳۳ء میں جب شاہجہان نے اس کو فتح کیا تو شاہی عمارتیں سب خاک میں ملا دیں۔ اٹھارھویں صدی عیسوی میں نواب نظام الملک آصف جاہ اور پھر کچھ مدت مرہٹے اس پر قابض رہے سنہ ۱۸۰۳ء سے گورنمنٹ انگریزی کے زیر حکم ہے۔ اس وقت صاحب کلکٹر کا صدر مقام اور فوجی سٹیشن ہے۔ اس کی آبادی تقریباً ۴۳ ہزار۔ باشندوں کی اصل زبان مرہٹی ہے۔ یہ لوگ اُردو بھی سمجھتے اور اس میں بات چیت کرتے ہیں +

شہر ریلوے سٹیشن سے دو میل کے فاصلے پر ہے۔ اس کے بازار بارونق اور عمارتیں پختہ ہیں۔ نظام شاہی خاندان کی عمارتیں تو سب ملیامیٹ ہو چکی ہیں۔ مگر اُس زمانہ کی کئی سو مسجدیں اب تک موجود ہیں جن میں سے ویران بیشتر اور آباد کمتر ہیں۔ مگر کسی مسجد کی عمارت ہندسی صنعت کے لحاظ سے خاص طور پر قابلِ تعریف نہیں ہے۔ مسجدوں کی کس مپرسی کا یہ حال ہے کہ "دودبا" نامی ایک مسجد میں ہندوؤں کا کتب خانہ قائم ہے۔ کہا جاتا ہے کہ مسجد کے متولّی نے اسے ہندوؤں کے پاس گرو کر دیا تھا۔ یہ مسجد اگرچہ معمولی ہے۔ مگر چوک میں ہونے کے باعث اس کا موقع بہت عمدہ ہے +

صنعت و حرفت کے لحاظ سے احمد نگر کو کوئی خصوصیت نہیں تعلیم کا انتظام انٹرنس کلاس تک ہے۔ مگر مسلمان انگریزی تعلیم پر کم راغب ہیں ۔ تھوڑے دنوں سے یہاں کے مسلمانوں نے ابتدائی تعلیم کے واسطے ایک انجمن اصلاح المسلمین قائم کی ہے۔ جس کے ماتحت ایک مدرسہ لڑکوں کا اور ایک لڑکیوں کا جاری ہے ایک معمولی درجہ کا اسلامی کتب خانہ بھی ہے جس میں اردو فارسی کی کچھ کتابیں اور چند اخبار شائقینوں کے واسطے مہیا رہتے ہیں +

بیرون شہر مفصلہ ذیل پرانی عمارتیں ہیں۔ (۱) جنوبی سمت کو چند مقبرے ایک باغ میں بنے ہوئے ہیں۔ کسی زمانہ میں انکی حالت اچھی ہوگی۔ مگر اس وقت مقبرے ویران اور باغ میں زراعت ہوتی ہے۔ (۲) شمالی سمت کو ایک عمارت کوٹلہ ارہ امام کے نام سے مشہور ہے۔ اس میں ایک پختہ مسجد اور دائیں بائیں کی سمتوں میں حجرے ہیں جو غالباً طالب علموں کے رہنے کے لیئے تعمیر ہوئے ہونگے۔ کتبہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مسجد ۹۴۳ھ ۱۵۳۶ء میں تعمیر ہوئی تھی۔ مگر اس وقت نماز کی بجائے تعزیہ داری کے کام آتی ہے۔ (۳) قلعہ جو مشرقی سمت کو ایک کوس کے فاصلہ پر واقع ہے۔ یہ قلعہ حسین نظام شاہ بحری نے اپنے عہد حکومت میں پتھر اور چونہ سے بنوا کر ایک وسیع اور عمیق خندق اس کے گرد کھدوائی تھی۔ ۱۰۰۴ھ ۱۵۹۵ء میں جب شہنشاہ اکبر کی فوجیں قلعہ پر حملہ آور ہوئیں تو چاند بی بی نے جو تاریخ ہند میں چاند سلطانہ کے نام سے مشہور ہے قلعہ کی مضبوطی کے بھروسہ پر شاہی فوجوں کا مقابلہ بڑی جوانمردی سے کیا۔ اور آخر کار حملہ آوروں کو ہرا کر ناکامی مصالحت سے لیکر مراجعت کرنی پڑی۔ قلعہ کی مشرقی جانب فتح برج کے قریب ایک درخت ہے۔ جس کے نیچے ڈیوک آف ولنگٹن نے فتح قلعہ کے بعد ۱۸۰۳ء میں حاضری کھائی تھی۔ اس حاضری کھانے کی کیفیت انگریزی زبان میں ایک تختی پر لکھ کر درخت کے ساتھ آویزاں کی ہوئی

ہے۔ یہ موقع قابل دید ہے +

قلعہ کے قریب اور شہر سے دو میل کے فاصلہ پر انگریزی چھاؤنی ہے۔ جس میں ایک توپخانہ اور دیسیوں و گوروں کی پلٹنوں کے دستے مقیم ہیں +

احمد نگر کے اطراف و جوانب میں بعض دلچسپ اور تاریخی عمارتیں قابل دید ہیں۔ چار میل کے فاصلہ پر ایک جگہ عالم گیر کی درگاہ کے نام سے مشہور ہے۔ شہنشاہ عالمگیر جب ۱۱۱۹ھ ۱۷۰۷ء میں فوت ہوا تو اسی جگہ اس کو غسل دیا گیا تھا۔ اگرچہ عالمگیر کی لاش اس کی وصیت کے مطابق اورنگ آباد بھیجی گئی تھی۔ مگر غسل کی یادگار میں ایک مسجد اور ایک مغتسل بنا ہوا ہے۔ اسی مغتسل کو درگاہ کہتے ہیں۔ اس کے متصل ایک چبوترہ پر حافظان قرآن روزمرہ قرآن شریف پڑھتے ہیں۔ کئی ہزار روپے کی جاگیر اس درگاہ کے متعلق واگزار ہے۔ جس سے متولی۔ حفاظ اور خدام کے مصارف ادا ہوتے ہیں۔ شہر سے چھ میل کے فاصلہ پر ایک پہاڑی ہے جس کی چوٹی پر نواب صلابت جنگ والئے حیدرآباد۔ اسکی محبوبہ پدمنی اور کُتّے کی قبریں بنی ہوئی ہیں۔ اس پہاڑی کی آب و ہوا بہت خوشگوار اور صحت بخش ہے +

بیجاپور

احمد نگر سے ڈھونڈ (ڈون) ہوتا ہوا ۱۷۶ میل طے کرنے کے بعد میں ہُٹکی پہنچا۔ یہ بڑا اسٹیشن اور بیجاپور کا جنکشن ہے۔ یہاں سے بیجاپور تک ۵۹ میل کا فاصلہ ہے۔ یوسف عادل شاہ نے ۸۹۱ھ ۱۴۸۵ء میں اس کو پایہ تخت قرار دیا۔ اور تقریباً دو سو برس تک دکن کے بہت بارونق اور ترقی یافتہ شہروں میں شمار ہوتا رہا۔ ۱۰۴۵ھ ۱۶۳۵ء میں شاہجہان نے اسے دہلی کا باجگزار بنایا اور ۱۰۹۸ھ ۱۶۸۶ء میں اورنگ زیب نے سلطنت مغلیہ سے ملحق کیا۔ اورنگ زیبی فوجوں کے محاصرہ

سے جو مصیبتیں اس شہر پر آئی تھیں۔ شہر اور قلعہ کی ویرانی اب تک اُس کی یاد دلا رہی ہے۔ اٹھارھویں صدی مسیحی میں نواب نظام الملک آصف جاہ اور پھر کچھ مدت بعد مرہٹے اس پر قابض رہے۔ شہر کی آبادی اور رونق جو کچھ باقی تھی مرہٹوں نے اُس کو خاک میں ملا دیا۔ ۱۸۱۸ء سے گورنمنٹ انگریزی کے زیر حکم ہے۔ اس وقت یہ معمولی درجہ کا شہر اور صاحب کلکٹر کا صدر مقام ہے۔ اس کی آبادی تقریباً ۲۴ ہزار ہے۔ اصلی زبان مرہٹی اور اُردو مثل احمدنگر کے بھی جانی ہے۔ شہر ریلوے سٹیشن سے کوئی دو میل کے فاصلہ پر ہے۔ بازار وسیع اور فی الجملہ بارونق ہیں۔ اس شہر کو حرفت وصنعت یا تجارت کے لحاظ سے کوئی خصوصیت نہیں ہے۔ تعلیم بھی صرف انٹرنس کلاس تک ہوتی ہے اور مسلمانوں کی حالت بہت معمولی ہے۔ دور و دراز کے سیاحوں کو جو چیز یہاں کشاں کشاں لیے چلی آتی ہے۔ وہ صرف عادل شاہی خاندان کی عجوبۂ روزگار عمارتیں ہیں جو تمام دکن میں بے نظیر تسلیم کی گئی ہیں۔ اور جن کے دیکھنے سے اسلامی طرز تعمیر کا سماں نظروں کے سامنے کھنچ جاتا ہے۔ ان میں سے چند عمارتیں جو اب تک اپنی اصلی حالت پر قائم اور لائق دید ہیں۔ ان کی مختصر کیفیت یہ ہے :-

۱۔ **گول گنبد**۔ یہ بیجاپور کے ساتویں فرمانروا محمد عادل شاہ کا مقبرہ ہے جو ریل سے شہر کو جاتے ہوئے دائیں جانب آتا ہے۔ محمد عادل شاہ نے اپنی زندگی میں اسے تعمیر کرایا تھا۔ بادشاہ کی قبر ایک اونچے چبوترہ پر بنی ہوئی ہے۔ اس کے ساتھ تین قبریں اس کی بیویوں اور بیٹی کی ہیں۔ قبر کے اوپر تین طغرے فارسی زبان میں نہایت خوبصورت لکھے ہوئے ہیں۔ اور ہر ایک سے بادشاہ کی وفات کا سن ہجری نکلتا ہے۔ ایک طغرا "عاقبت محمود شد" ہے جس سے ۱۰۶۷ھ نکلتے ہیں۔ مقبرہ کی بلندی ۱۹۸ فٹ اور گنبد کا اندرونی قطر ۱۲۴ فٹ ہے۔

بول گنبد۔ بیجاپور
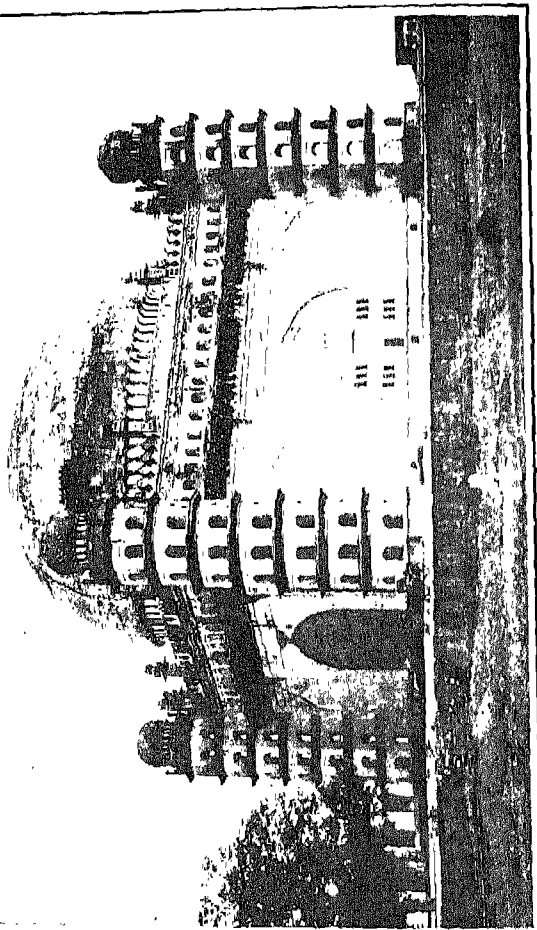
۱۰۹ فٹ کی بلندی پر چاروں طرف گیارہ فٹ چوڑی گیلری بنی ہوئی ہے۔ اس کے اندر بات کرنے سے آواز گونجتی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ در و دیوار میں کوئی شخص ہماری آواز کی نقل کرتا ہے۔ سولھویں صدی مسیحی تک دنیا میں سب سے بڑا گنبد رُومتہ الکبریٰ کے پانتھین کے گرجا کا مانا جاتا تھا جس کا رقبہ ۱۵۸۳۳ مربع فٹ ہے۔ مگر اس گنبد کے تعمیر ہونے سے جس کا رقبہ ۱۸۲۲۵ مربع فٹ ہے۔ پانتھین کا گنبد دوسرے درجہ پر شمار ہونے لگا۔ مَیں نے ۱۹۰۶ء کے سفر یورپ میں پانتھین کا گنبد دیکھا تھا۔ عمارتی خوبیوں کے لحاظ سے فی الواقع بہت نفیس ہے۔

گنبد کے چاروں کونوں پر چار مینار ہفت منزلہ ہیں اور ہر منزل پر سیڑھیوں کے ایک جانب نشست بنی ہوئی ہے جس میں روشنی کے واسطے متعدد کھڑکیاں موجود ہیں۔ شمالی ہند کی مسجدوں اور مقبروں کے جس قدر مینار میری نظر سے گزرے ہیں۔ ان میں یہ بات نہیں ہے۔ منارہ کی آخری منزل پر پہنچنے سے شہر کی تمام عمارتیں بخوبی دکھائی دیتی ہیں۔ اور ان کا نظارہ بڑا دلچسپ معلوم ہوتا ہے۔

۲۔ جامع مسجد۔ یہاں سے آدھ میل کے فاصلہ پر مسلمانوں کی آبادی میں ایک جامع مسجد ہے جس کو بیجاپور کے پانچویں فرمانروا علی عادل شاہ نے جو شہنشاہ اکبر کا ہمعصر تھا ۹۸۵ھ ۱۵۷۷ء میں تعمیر کرایا تھا۔ مسجد کا صحن نہایت وسیع اور رلداؤ کی چھت عظیم الشان محرابدار ستونوں پر قائم ہے۔ جن کی قطاریں طول کی سمت میں نو اور عرض کی سمت میں پانچ ہیں۔ وسط میں تین تین محرابیں چھوڑ کر ایک مربع قطعہ زمین نکالا ہے اور اس پر بہت بڑا گنبد بنایا ہے۔ اس قطعہ میں کئی سو آدمی اس طرح بیٹھ سکتے ہیں کہ ہر ایک کی نگاہ واعظ پر بخوبی پڑ سکے۔

یہ تمام عمارت سادہ مگر بہت مستحکم ہے۔ طلائی کام صرف محراب پر کیا ہوا ہے
جو اپنی عمدگی اور خوبی کی وجہ سے نہایت نفیس ہے۔ حفاظت کی غرض سے اس پر
ٹاٹ کا ایک پردہ پڑا رہتا ہے جب کوئی مسافر آتا ہے تو خدام پردہ اُٹھا کر محراب کا
نقش و نگار اُس کو دکھا دیتے ہیں صحن کے دائیں بائیں برآمدوں کی دو مسقف قطاریں ہیں
جنکی ہر قطار میں بائیں محرابیں قلینچی کی شکل کی بہت چوڑی اور بلند بنی ہوئی ہیں +
مسجد کی تعمیر سلطان علی عادل شاہ کی وفات سے دو تین برس پیشتر شروع
ہوئی تھی۔ پھر اس کی وفات کے بعد جانشینوں نے سلسلۂ تعمیر جاری رکھا۔
خصوصاً سلطان محمد عادل شاہ نے اس پر بہت روپیہ صرف کیا۔ مگر مسجد تکمیل کو
نہ پہنچی۔ چنانچہ مشرقی سمت کی ناتکمل عمارت اس کی زندہ شہادت موجود ہے۔
اگرچہ اس مسجد پر کوئی منارہ نہیں۔ مگر پھر بھی ایسی وسیع اور خوش قطع ہے۔
کہ ہندوستان کی اعلےٰ اور نفیس ترین مسجدوں میں شمار ہوتی ہے اور دکن میں
جس قدر مسجدیں ہیں۔ ان سب سے خوبصورتی اور وسعت میں بہتر ہے +
اِس مسجد کے مصارف کے واسطے سرکار سے دو روپیہ یومیہ مقرر ہیں۔
جو خطیب۔ امام۔ مؤذن۔ خدام کی تنخواہ اور تیل بتی کے کام آتے ہیں۔ یہ زمانہ
کا انقلاب ہے کہ جس مسجد میں ہزاروں آدمی نماز پڑھتے تھے۔ اب اس میں
دس پانچ آدمی سے زیادہ نہیں ہوتے اور جہاں بڑے بڑے عالم۔ خطیب
امام اور مؤذن ہوتے تھے۔ اب ان کے جانشین نوشت خواند سے بے بہرہ
اور ادائے فرائض سے ناواقف ہیں۔ صرف تنخواہ کا لالچ وقت بیوقت انہیں
مسجد کی طرف کشاں کشاں لئے چلا آتا ہے +

۴۔ آثار محل۔ جامع مسجد سے قلعہ کو جاتے ہوئے یہ عمارت راستہ میں
آتی ہے۔ اس کو سلطان محمد عادل شاہ نے تعمیر کرایا تھا۔ پہلے اس کو دار محل
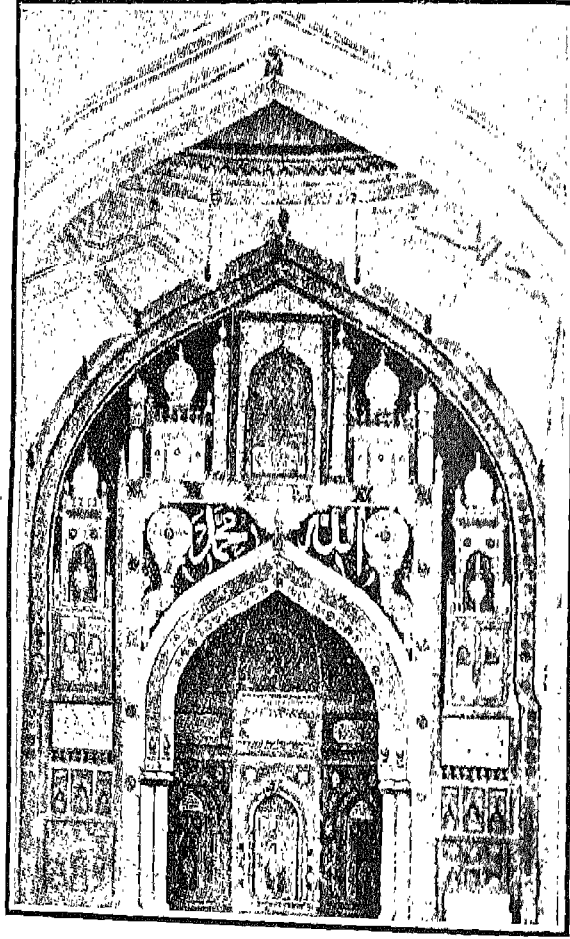
منقش محراب جامع مسجد — بیجاپور

کہتے تھے۔ مگر جب سے رسول کریمؐ کی ریش مبارک کے دو بال جن کو محمد صالح ہمدانی بیجاپور میں لایا تھا۔ قلعہ سے یہاں منتقل کئے گئے تو اس کا نام آثار محل ہوگیا۔ یعنی تبرکات کا محل۔ یہ عمارت چنداں شاندار نہیں۔ مگر اس کا دالان جو ساٹھ فٹ کے چوبی ستونوں پر قائم ہے بہت خوشنما ہے۔ موئے مبارک ایک صندوقچہ میں بند کر کے ایک حجرے میں رکھے ہوئے ہیں اور اوقات معینہ پر ان کی زیارت کرائی جاتی ہے +

یہاں زمانہ شاہی کا ایک کتب خانہ بھی تھا۔ جس کی باقیماندہ کتابیں ۱۸۵۶ء میں لندن کے انڈیا آفس میں بھیج دی گئیں +

۴۔ قلعہ۔ شہر کی نئی اور پرانی آبادی کے درمیان عادل شاہیوں کا قلعہ آتا ہے۔ جس کے اندر کسی زمانہ میں بہت اعلیٰ درجہ کی عمارتیں تھیں۔ قلعہ کی فصیل منہدم ہو چکی ہے۔ اور عامتہ الناس کی آمد و رفت کے واسطے اس میں سڑک جاری ہے۔ اس کے دونو طرف چینی محل۔ ست من ملی۔ انند محل یا تاج محل۔ گگن محل یا دیوان عام کی عمارتیں ہیں۔ یہ اپنے وقت پر عجوبۂ روزگار تھیں مگر اب معمولی حالت میں ہیں۔ اس وقت یہ تمام عمارتیں سرکاری دفاتر۔ سول سرجن کے قیام اور دیگر عہدہ داروں کے کاروبار میں مستعمل ہوتی ہیں۔ شاہی عہد میں اس کے گرد بہت بڑی خندق تھی۔ ٹیورنر صاحب فرانسیسی سیّاح جو شاہجہاں کے عہد میں اس جگہ آیا تھا۔ اس کا بیان ہے کہ اس خندق میں اس قدر مگرمچھ اور گھڑیال ہیں کہ کوئی شخص اس سے عبور کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ اب اس خندق کا اکثر حصہ مٹی سے پٹا ہوا ہے +

۵۔ بے سقف مقبرہ۔ قلعہ سے نئی آبادی کو جاتے ہوئے سڑک کے دائیں ہاتھ علی عادل شاہ ثانی کا مقبرہ آتا ہے جو اب تک بے سقف ہے۔ اس کی

قینچی دار محرابیں سنگ موسلے کی بنی ہوئی ہیں +

۶۔ مقبرہ ابراہیم عادل شاہ ثانی۔ یہ مقبرہ عادل شاہی خاندان کے چھٹے فرمانروا کی یادگار ہے۔ اس کی بلندی اور وسعت کے ساتھ کام کی باریکی اور نفاست بہت اعلےٰ درجہ کی ہے۔ روضہ کے ساتھ ایک مسجد بہت عمدہ بنی ہوئی ہے جس کے مسلسل گنبد نہایت متناسب اور خوشنما ہیں۔ یہ مقبرہ اور مسجد بیجاپور کی عمارتوں میں بہت خصوصیت کی ہے +

۷۔ توپ مالک میدان۔ یہ توپ حسین نظام شاہ فرمانروائے احمد نگر کی جنگی ترقیات کی یادگار ہے۔ جس کو حسین خاں رومی نے بادشاہ کے حسب الحکم ۹۵۶ھ / ۱۵۴۹ء میں ڈھالا تھا۔ اس کا وزن ۱۲۰۰ من اور اندر سے اس قدر کشادہ ہے کہ ایک مسلّح آدمی اس میں بخوبی بیٹھ سکتا ہے۔ طول ۱۵ فٹ۔ جڑ پر سے قطر ۴ فٹ آٹھ انچ اور دہانہ پر سے ۲ فٹ ۴ انچ ہے۔ سلطان محمد شاہ کے عہد ۱۰۴۲ھ / ۱۶۳۲ء میں یہ بیجاپور لائی گئی تھی اور اب تک وہیں پڑی ہے۔ ماہرین فن کی تحقیقات کے مطابق اتنی لمبی چوڑی اور وزنی توپ روئے زمین پر غالباً کہیں نہیں۔ مگر چونکہ اس کا نقل وحمل بہت مشکل ہے۔ اس واسطے باوجود اپنی عظمت کے بیکار ہے +

گلبرگہ

بیجاپور سے براہ خشکی ۲۳۷ میل طے کرنے کے بعد میں گلبرگہ پہنچا۔ یہ دکن کے ہندو راجاؤں کی ایک پرانی یادگار اور تقریباً چھ سو برس سے مسلمان بادشاہوں کے زیر حکم ہے۔ آٹھویں صدی ہجری کے وسط میں بہمنی خاندان کا دارالسلطنت ہونے سے اس کو وہ رونق تھی کہ تمول تجارت، صنعت و حرفت کے لحاظ سے

بڑی توپ ۔ بیجاپور
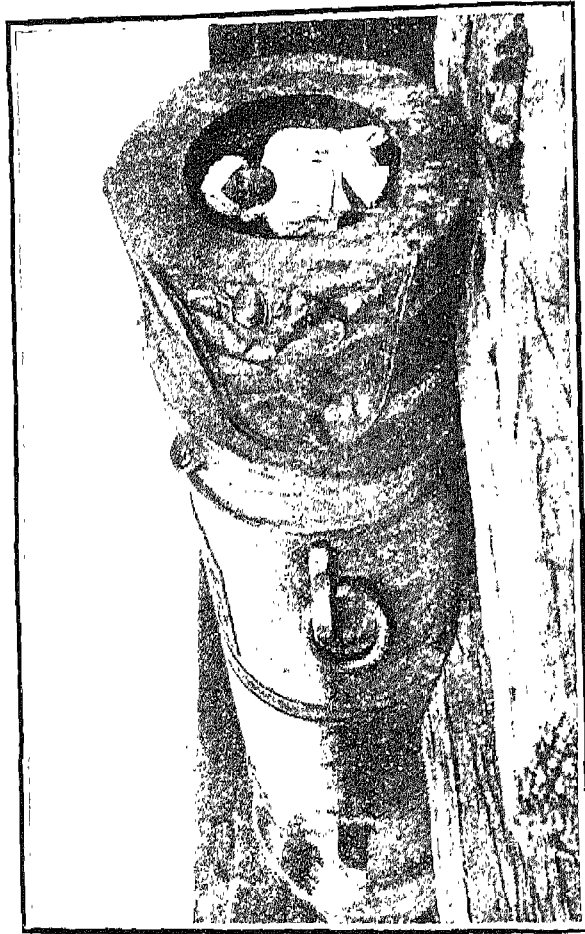
دکن کے نامور شہروں میں شمار کیا جاتا تھا۔ دارالسلطنت کے اُٹھ جانے سے اگرچہ اس کی وہ عزت اور عظمت سب جاتی رہی۔ مگر صوفیۂ کرام کے مزار اور سلاطین بہمنی کی چند عمارتیں اس میں ایسی موجود ہیں جو اس حالت میں بھی زائرین اور سیّاحوں کی دلچسپی کا باعث ہیں۔ گلبرگہ اس وقت گورنمنٹ نظام کے صوبیدار (کمشنر) کا صدر مقام اور نسبتاً بارونق ہے +

یہ شہر ریلوے سٹیشن سے دو میل کے فاصلہ پر ہے۔ شہر کے گرد ایک پختہ فصیل اور وسط میں ایک فوّارہ ہے جہاں سے شہر کے چاروں طرف چار سڑکیں نکلتی ہیں۔ بازار وسیع مگر کچھ زیادہ بارونق نہیں۔ تجارت بھی کم ہے۔ اور تعلیم کا انتظام ہائی سکول تک ہے +

شہر کے مغرب کی طرف گلبرگہ کا پُرانا قلعہ ہے۔ کسی زمانہ میں یہاں عمدہ عمدہ شاہی محل ہوتے تھے۔ جن میں سے اکثر اب ویران ہیں۔ وسط قلعہ میں ایک چھوٹی سی مسجد بلا صحن شہر قُرطبہ کی مسجد کے نمونہ پر بنی ہوئی ہے۔ اس کی چھت کثیر التعداد محرابوں پر قائم ہے جن کی قطاریں بہت خوشنما اور تین طرف سے بالکل کشادہ ہیں۔ چھت کے چاروں کونوں پر چار گنبد اور درمیان میں محرابوں کی چھتوں کا سلسلہ ہے جو سب ملا کر ایک سو گیارہ اور اپنی وضع کے لحاظ سے تمام ہندوستان میں بے نظیر ہیں۔ یہ مسجد بہمنی خاندان کے دوسرے بادشاہ محمود کی یادگار ہے جس نے ۷۶۶ھ / ۱۳۶۵ء میں اسے تعمیر کرایا تھا +

شہر کے مشرق کی جانب آدھ میل کے فاصلہ پر بہمنی خاندان کے بادشاہوں کے مقبرے ہیں۔ ان سے تھوڑے فاصلہ پر دکن کے ایک مشہور بزرگ میر سید محمدؐ گیسو دراز کا روضہ ہے جو حضرت نصیر الدین روشن چراغ دہلی کے مشاہیر خلفا میں سے گزرے ہیں۔ روضہ کے متعلق نوبت خانہ، مسجد، مدرسہ اور مسافر خانہ موجود ہے جس کے مصارف کے واسطے گورنمنٹ نظام کی

طرف سے جاگیر مقرر ہے۔ ہر سال ہزاروں آدمی زیارت کو آتے ہیں۔ ایام عُرس
میں بیوپاری لوگ مال لاکر بیچتے ہیں اور یہی سالانہ تجارت گلبرگہ کی موجودہ آبادی
کا بڑا سبب ہے۔ میر سید محمد صاحب کے حالات ضمیمے میں درج ہیں +

مدراس

گلبرگہ سے براہ واڑی اور رائچور میں مدراس پہنچا۔ واڑی بڑا جنکشن ہے۔
یہاں سے مدراس حیدر آباد شمالاً اور پونہ کو سڑکیں نکلتی ہیں +

مدراس ایک نو آباد شہر ہے جس کی آبادی کی بنیاد ایسٹ انڈیا کمپنی نے
۱۰۴۸ھ ۱۶۳۸ء میں ڈالی تھی۔ یہ وہ زمانہ ہے جب کہ مغلوں کا دارالسلطنت دہلی تعمیر
ہوا۔ اٹھارھویں صدی کے وسط تک مغلوں۔ مرہٹوں اور فرانسیسوں کی تاخت
و تاراج نے اسے پنپنے نہ دیا۔ اب ڈیڑھ سو برس سے اس کی آبادی۔ تجارت اور
تعلیمی حالت روز افزوں ترقی کر رہی ہے۔ احاطہ مدراس کے گورنر کا صدر مقام
جنوبی ہندوستان کے سب بندرگاہوں سے زیادہ نامور اور آبادی کے
لحاظ سے کل انڈیا میں تیسرے درجے پر ہے۔ اس کی مردم شماری پانچ لاکھ
سے کچھ زیادہ ہے۔ جس میں ہندو۔ مسلمان۔ عیسائی۔ پارسی یہودی اور
دیگر قومیں بھی آباد ہیں۔ ہندوؤں میں زیادہ تر تامل بولی جاتی ہے مسلمانوں
میں خصوصیت سے اُردو کا چرچا ہے۔ اور چونکہ دفاتر کی زبان انگریزی ہے
اس واسطے عام و خاص میں اس کا رواج ہے۔ بہت تھوڑے اشخاص
ایسے ہونگے جو انگریزی سے ناآشنا ہوں +

مدراس کی آبادی نو دس میل کے لمبان میں شمالاً جنوباً گئی حصّوں
میں پھیلی ہوئی ہے۔ جس کے بُعد مسافت کو برقی ٹریموے نے کم کر دیا ہے

ان حصّوں میں کہیں کہیں غیر آباد زمین بھی آجاتی ہے۔ سنٹرل سٹیشن سے تقریباً ایک میل کے فاصلہ پر مونٹ روڈ ایک نہایت آباد مقام ہے جہاں سوداگروں کی بڑی بڑی دکانیں اور اس کے قریب متعدد ہوٹل مسافروں کے قیام کے واسطے موجود ہیں۔ یہاں سے شہر کے مختلف حصّوں کو پانچ سڑکیں نکلتی ہیں۔ ٹریم کے ذریعے جب شمال کو جائیں تو پیوپل پارک اور مور مارکیٹ سے گزر ہوتا ہے۔ پیوپل پارک ایک پُر فضا باغ ہے جس کا رقبہ ۱۱۶ ایکڑ ہوگا۔ اس کے احاطہ میں چڑیا خانہ ہے۔ جس میں انواع و اقسام کے چرند و پرند موجود ہیں۔ لوگ صبح و شام سیر کی غرض سے اس میں بکثرت آتے رہتے ہیں۔ مور مارکیٹ میں ہر قسم کی چیزیں فروخت ہوتی ہیں۔ اور اس قدر وسیع ہے کہ اس میں سو سے زیادہ دکانیں ہونگی۔ اس کے بعد جاپانی بازار آتا ہے۔ یہ بھی خوب بارونق ہے۔ اس کے قریب ہی ہائی کورٹ کی عالیشان عمارت ہے۔ جاپانی بازار سے جارج ٹون کو راستہ نکلتا ہے +

جارج ٹون۔ یہ مدراس کی سب سے قدیمی آبادی اور تجارت کا مرکز ہے۔ دیسی اس کو پٹن کہتے ہیں۔ اس کے باشندے بیشتر ہندو ہیں۔ مشرق کی طرف ایک بڑا لمبا بازار بیچ (بی چ) کے نام سے مشہور ہے۔ اس کی ایک جانب سمندر اور جہازوں کے کارخانے ہیں۔ دوسری جانب یورپین سلطنتوں کے کونسل خانے۔ ترکی کونسل کا دفتر۔ جنرل پوسٹ آفس۔ پولیس کا دفتر۔ یورپین اور اعلےٰ درجے کے ہندو مسلمان سوداگروں کی دکانیں ہیں۔ مدراس میل انگریزی کا نامور اخبار اسی حصّہ سے شائع ہوتا ہے۔ آبادی کی کثرت اور ترقی تجارت کے لحاظ سے یہ مدراس کی تمام آبادیوں

پر فائق ہے +

پیچ سے جنوب کی طرف بڑھیں تو قلعہ سینٹ جارج آتا ہے۔ جو انگلستان کے بادشاہ چارلس اوّل کے حکم سے تعمیر ہوا تھا۔ اسی سڑک پر سمندر کے کنارے کنارے چلتے جائیں تو بادشاہ باغ ہیں سینٹ تال۔ پریزیڈنسی کالج اور بورڈ آف ریونیو کی عمارتیں ملتی ہیں۔ ان عمارتوں کا بڑا حصہ نوابان کرناٹک کے عہد کا تعمیر شدہ ہے۔ باغ سے باہر نکل کر تھوڑی دور جائیں تو ٹریلی کین کی آبادی شروع ہو جاتی ہے۔ مونٹ روڈ کا چوک جہاں سے سیر شروع کی تھی۔ بالکل قریب ہے۔ اس چوک سے گورنمنٹ ہاؤس ملا ہوا ہے۔ جو گورنر مدراس کا صدر مقام ہے +

ٹریلی کین۔ یہ مسلمانوں کی آبادی ہے۔ دیسی اس کو تریل کھیڑی کہتے ہیں۔ اس کی آبادی اُس وقت سے شروع ہوتی ہے۔ جبکہ نواب والاجاہ فرمانروائے کرناٹک کی سکونت مدراس میں قرار پائی۔ اس بازار کے بائیں کونہ پر سب سے پہلے ایک کتب خانہ دو منزلہ مکان پر ملتا ہے جس میں عربی۔ فارسی اور اُردو کی متعدد کتابیں موجود ہیں۔ ایک کمرہ میں اُردو اور انگریزی اخبار بھی رکھے ہوئے ہیں۔ ان کتابوں اور اخباروں سے عام و خاص مستفید ہوتے ہیں۔ کتب خانہ کی فہرست۔ اگرچہ چھاپہ شدہ ہے۔ مگر بہت بے ترتیب اور غلطیوں سے پُر ہے +

ٹریلی کین کا بازار وسیع مگر مکانات اکثر متوسط درجہ کے ہیں۔ چند تجارتی دکانیں چند کتب فروشوں کی چھوٹی چھوٹی دکانیں اور کچھ نانبائیوں کی ہیں۔ اس حصہ میں بعض اُمرا و تاجروں کے مکانات اور نوابی عہد کی مسجدیں البتہ بہت عمدہ ہیں۔ دائیں ہاتھ ایک بڑے وسیع احاطہ میں نواب والاجاہ کی عظیم الشان

جامع مسجد ہے۔ یہ مسجد سنگ خارا کی بنی ہوئی ہے۔ اس پر گنبد تو کوئی نہیں مگر دو مینار بہت اونچے ہیں۔ اس کے احاطے میں نواب غلام غوث خاں و مولانا عبد العلی بحر العلوم اور چند دیگر اشخاص کی قبریں ایک مسقّف بارہ دری کے نیچے ہیں۔ مسجد اور قبروں کے مصارف کے واسطے تقریباً چھ ہزار روپے کی سالانہ جاگیر ہے ٭

ترکی کونسل ۔ اسی احاطہ کے ایک طرف ترکی کونسل کا مکان ہے ان کا نام حاجی عبد العزیز بادشاہ ہے۔ ان کا خاندان مدراس کے مسلمان تاجروں میں بہت بڑا معزز مانا جاتا ہے۔ ان کی تجارت کا سلسلہ اٹلی اور فرانس تک جاری ہے۔ ترکی کونسل اور ان کے بھائی دیندار۔ با اخلاق اور مہمان نواز ہیں۔ شہر کے معززین علما اور امرا کی آمد و رفت ان کے ہاں اکثر رہتی ہے۔ حاجی صاحب کے داماد مولانا عبد السبحان صاحب علوم عربیہ سے باخبر اور ضروریات زمانہ کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ قومی امور سے بھی ان کو دلچسپی ہے ٭

پرنس آف ارکاٹ ۔ بازار میں کچھ دور آگے جانے سے نواب غلام غوث خاں آخری نواب کرناٹک کا شادی محل اور اس سے کچھ فاصلہ پر پرنس آف ارکاٹ کا امیر محل ہے۔ یہ پرنس ایک نوجوان آدمی ہیں۔ باوجودیکہ ان کی پنشن مختصر ہے مگر اس پر بھی امیری کے لوازم سے ہاتھ نہیں کھینچا۔ گورنمنٹ انگریزی بنظر تالیف قلوب ان لوازم سے متعرض نہیں ہوتی۔ ان کے محل سرا میں چھ توپیں موجود اور چند سپاہی مدراسی فوج کی وردی پہنے ہوئے ہر وقت پہرے پر حاضر رہتے ہیں ٭

تھیوسوفیکل سوسائٹی ۔ ترپل کھیڑی کے بعد میلاپور آبادی کا ایک حصہ

ہے اور اس کے خاتمے پر اڈیار آتا ہے جس میں تھیوسوفیکل سوسائٹی کا دفتر ہے۔ یہ سوسائٹی امریکہ کے ایک مشہور عالم کرنل الکاٹ اور مس اینی بی سنٹ جیسی مشہور فاضل عورت کی احسان مند ہے جس کی علمی قابلیت سے اس کو ہندوستان میں فروغ ہؤا ہے ؞

حرفت و تجارت ۔ مدراس کے باشندے علے العموم تجارت پیشہ ہیں۔ ہندو اور مسلمان قریب قریب سبھی اس گھُڑ دوڑ میں شامل ہیں۔ کچھ مدت پیشتر چمڑے اور نیل کی تجارت کو خوب فروغ تھا۔ چمڑے کا کام تو اب بھی اچھی حالت میں ہے۔ مگر جرمنی کے مصنوعی اور ارزاں نیل سے یہاں کے نیل کی تجارت گھٹ گئی۔ لُنگیاں اور رومال قدیم سے یہاں اچھے بنتے ہیں۔ اور دُور دُور تک ان کا دساور ہے۔ کچھ عرصہ سے سات آٹھ کلیں کپڑا بُننے کی بھی جاری ہوگئی ہیں۔ دستکاری میں یہاں کے لوگوں کو اچھی دسترس ہے۔ خصوصاً آبنوس کی لکڑی۔ زردوزی کا کام۔ صندل اور ہاتھی دانت کی منقش چیزیں خوب بنتی ہیں۔ ایلومینیم (دھات) کے برتن جو سُبکی اور صفائی میں مشہور ہیں۔ ان کی ابتدا بھی یہیں سے ہوئی ؞

تعلیم ۔ مدراس میں انگریزی تعلیم بہت ترقی پر ہے۔ گورنمنٹ کی طرف سے پریزیڈنسی کالج۔ انجنیرنگ کالج۔ میڈیکل کالج اور لا کالج بہت اعلےٰ درجے کے ہیں۔ ہندوؤں کا ایک قومی کالج پچیاپا ہے۔ مشن کے دو تین کالج نہایت آب و تاب سے جاری ہیں جن میں مدراس کرسچن کالج ہندوستان کے مشہور ترین کالجوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ مشن کا ایک علمی کارنامہ جس سے تمام ہندوستان کے مشن سکولوں کے طالب علم مستفیض ہو رہے ہیں۔ کرسچن لٹریچر سوسائٹی فار انڈیا ہے۔ اس کے زیر اہتمام ہر قسم کی عمدہ عمدہ کتابیں انگریزی میں تالیف ہو کر

شائع ہوتی ہیں۔ اور انڈیا بھر کے مشن سکولوں میں پڑھائی جاتی ہیں +

ان کالجوں کی تعلیم سے ہندؤں نے پورا فائدہ اٹھایا ہے۔ اور اس وقت ترقی کی اُس اعلےٰ سٹیج پر پہنچ گئے ہیں جہاں سے کہ علمی اور پولیٹیکل معاملات میں بڑی قابلیت سے حصہ لیتے ہیں۔ انڈین نیشنل کانگرس جو ہندوستان کی ایک مشہور پولیٹیکل جماعت ہے۔ اُس کے چند زبردست حامیوں کو انہی کالجوں کے تعلیم یافتہ ہونے کا فخر ہے۔ مگر اس ترقی تعلیم کے ساتھ یہاں کے تعلیم یافتوں کی یہ حالت نہایت حیرت انگیز ہے کہ کوٹ پتلون کے ساتھ پیروں سے ننگے پھرتے ہیں۔ تعلیم یافتہ اصحاب میں کچھ کچھ بوٹ پہننے کا رواج ہوتا جاتا ہے +

انگریزی تعلیم کی اس اشاعت پر مسلمان اپنے ہمسایوں سے ہر طرح پیچھے ہیں۔ عام طور پر اس کی وجہ مسلمانوں کا افلاس بیان کیا جاتا ہے۔ اگرچہ یہ وجہ ایک حد تک صحیح بھی ہے۔ مگر تاخر کی اصلی وجہ ان لوگوں کی قدامت پسندی۔ انگریزی سے بے رغبتی اور علوم عربیہ کی طرف میلان ہے۔ ویلور کے عربی مدرسہ باقیات الصالحات کے واسطے صوبہ کے تاجروں اور عام مسلمانوں نے ڈیڑھ لاکھ روپے چندہ سے فراہم کیئے اور غریب مسلمانوں کے بچوں کو وظیفے دیکر انگریزی پڑھوانے کا جو رزولیوشن ۱۹۰۱ء کی محمدن ایجوکیشنل کانفرنس میں پاس ہؤا تھا۔ سات برس گزر جانے پر ابھی سترہ ہزار روپے سے اس کا نمبر آگے نہیں بڑھا۔ اور افسوس ہے کہ منجملہ اس رقم کے چار ہزار روپے آربتھنٹ کمپنی کے دیوالے کی نذر ہوئے +

مدرسۂ اعظم۔ اس وقت مسلمانوں کی تعلیم کا متکفل صرف مدرسۂ اعظم ہے جس کو نواب غلام غوث خاں بہادر نواب کرناٹک نے آج سے ساٹھ برس پیشتر قائم کیا اور نہایت فیاضی سے ایک ہزار روپے ماہوار اس کے مصارف کے

واسطے اپنی جاگیر سے وقف کر دیئے۔ ابتداً اس میں عربی فارسی اور دینیات کی تعلیم اعلیٰ درجہ کی ہوتی تھی۔ مگر سررشتۂ تعلیم نے ۱۸۵۹ء سے اس کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے۔ اور اب اس میں صرف انگریزی اور دیگر علوم مروّجہ کی تعلیم دی جاتی ہے۔ گورنمنٹ نے اس مدرسہ کے واسطے عمدہ باغ کی عمارت ایک لاکھ روپے کی لاگت سے خرید کر دی ہے اور مقامی انجمن کی کوشش سے ایک چھوٹا سا بورڈنگ ہوس بھی بن گیا ہے۔ اگرچہ مسلمانوں کا اپنا کوئی کالج نہیں۔ مگر دیگر کالجوں سے فی الجملہ فائدہ اُٹھا رہے ہیں۔ اور گریجوایٹوں کی تعداد پہلے کی نسبت ترقی پر ہے۔ بعض طالب علم تحصیل علوم کی غرض سے ولایت کا سفر بھی کرنے لگے ہیں ÷

قومی انجمنیں۔ یہاں کئی انجمنیں ہیں۔ ایک ان میں سے انجمن مفید اہل اسلام ہے جو چند باہمت اشخاص کی سعی سے ٹرپلی کین میں قائم ہوئی ہے۔ اس میں مسلمانوں کے کم سن لڑکوں کو لوہار۔ بڑھئی اور موچی کا کام سکھایا جاتا ہے۔ اور وقتاً فوقتاً مسلمانوں کی بہتری کی تدابیر پر غور کی جاتی ہے۔ میرے ۱۸۹۱ء کے سفر میں اس کے سکرٹری ڈاکٹر محمد رئیس الاسلام اور پریزیڈنٹ آنریبل جسٹس باڈم جج ہائی کورٹ تھے۔ ان دونو صاحبوں کو انجمن کے کاروبار سے بہت دلچسپی تھی۔ ۱۹۰۸ء میں جب مَیں آخری مرتبہ یہاں آیا تو معلوم ہوا کہ ڈاکٹر محمد رئیس الاسلام فوت ہو چکے ہیں۔ آنریبل باڈم پنشن پاکر ولایت کو چلے گئے ہیں۔ انجمن کی سات ہزار روپے کی رقم جو آربتھ نٹ کمپنی کے پاس امانت تھی۔ وہ ڈوب چکی ہے۔ آنریبل باڈم نے تھوڑی چندہ سے چھ ہزار روپے فراہم کئے تھے۔ مگر وہ خرچ ہو چکے۔ اب انجمن کے سکرٹری مسٹر عبدالحمید حسن علیگڈھ کے تعلیم یافتہ اور پریزیڈنٹ مسٹر

جسٹس ڈولس ہیں۔ کام معمولی طور سے چل رہا ہے +

ایک انجمن حمایت الاسلام یتیم بچّوں کی پرورش کے واسطے قائم ہے۔ خان بہادر غلام محمود مہاجراس کے سکرٹری ہیں۔ یہ انجمن بھی کام کر رہی ہے مگر دنیا کا کوئی کام روپے اور اتفاق کے بغیر نہیں ہوتا۔ لیکن افسوس یہاں دونو مفقود ہیں +

پریس

پریس۔ یہاں کا پریس بہت زبردست ہے۔ ہندوؤں کے چند نامور اخبار انگریزی اور تامل میں چھپتے ہیں۔ مسلمانوں کا ایک اخبار محمڈن انگریزی میں۔ شمس الاخبار۔ جریدہ روزگار۔ مخبر دکن اور نیّر آصفی اُردو میں شائع ہوتے ہیں۔ ان میں سے اکثر اخباروں میں حیدرآباد کے حالات چھپتے رہتے ہیں۔ اور بعض کے صدر دفتر بھی حیدرآباد ہی میں ہیں۔ لیکن ریاست کی دارو گیر سے بچنے کے واسطے چھپوائی کا کام مدراس میں ہوتا ہے +

مسلم لیگ

پولیٹکل معاملات میں مدراس کے مسلمانوں میں سے آج تک صرف آنریبل مولوی سید محمد صاحب کا نام زبانزدِ خاص و عام تھا جو اپنی خداداد قابلیت سے کونسل کی ممبری تک ترقی کر چکے ہیں۔ مگر سال حال (۱۹۰۸ء) میں یہاں کے مسلمانوں کا خیال بھی اس طرف مائل ہُوا ہے اور اُنہوں نے مدراس پریزیڈنسی مسلم لیگ کے نام سے ایک کمیٹی قائم کی ہے۔ اس کے مقاصد کو تمام پریزیڈنسی میں شائع کرنے کی کوششیں درپیش ہیں۔ اگرچہ افسوس ہے کہ بعض لوگوں نے اس کی مخالفت بھی کی جو یہاں کے مسلمانوں کی بے اتفاقی کا ادنےٰ نمونہ ہے +

یہاں سے کلکتہ براہ بجواڑہ ۱۰۳۲ میل۔ حیدرآباد براہ رائچور ۵۲۳ میل۔ دہلی براہ سمارڑہ ۱۵۶۹ میل۔ بمبئی براہ رائچور و پونا ۷۹۴ میل۔ بمبئی براہ بنگلور و پونا ۹۶۳ میل۔ پانڈی چری ۱۲۵ میل۔ ٹوٹی کورن ۴۴۳ میل۔ کالی کوٹ ۴۱۴ میل ہے +

پانڈی چری

میں مدراس سے پانڈی چری آیا جو سمندر کے کنارے پر فرانسیسوں کا ایک مشہور شہر اور اُن کی ہندوستانی آبادی کا دارالحکومت ہے۔ یہ شہر مدراس سے ۱۲۵ میل کے فاصلہ پر ہے اور ریل کے ذریعہ ۶ گھنٹہ میں سفر ختم ہوتا ہے۔

پانڈی چری اگرچہ کوئی بڑا شہر نہیں۔ مگر بازاروں کی چوسر نما شکل اور آب و ہوا کی عمدگی نے اس کو جنوبی ہند میں بہت مشہور کر رکھا ہے۔ اس خوبی کے ساتھ کھانے پینے کی چیزیں اور ضروریات زندگی بہت ارزاں ہیں ارزانی کے باعث کاروبار کا معاوضہ اس قدر کم ہے کہ ہائی کورٹ کا جج ڈھائی سو روپیہ ماہوار لیتا ہے جو فرانس کی یونیورسٹی کا سند یافتہ اور وہاں کی قانونی عدالتوں کا تجربہ حاصل کئے ہوئے ہوتا ہے۔ اسی نسبت اور انداز سے وہاں کے دیگر حکام اور ملازموں کی تنخواہیں ہیں ❊

اس ارزانی کے ساتھ دوسری جو چیز مجھے پسند آئی وہ حاکم اور محکوم کے باہمی برتاؤ میں بے تکلفی اور آزادی ہے۔ چنانچہ شام کے وقت ایک میدان میں جہاں تفریح طبع کی غرض سے لوگ فراہم ہوتے ہیں۔ میں نے دیکھا کہ فرانسیسی اور دیسی لوگ ایک ہی بنچ پر بڑی بے تکلفی سے ملکر بات چیت کرتے تھے۔ یہی عدم مغائرت سرکاری عہدوں میں بھی ہے۔ چنانچہ گورنر جنرل کا پرائیویٹ سکرٹری ایک دیسی شخص منشی عبدالعزیز نامی پانڈی چری کا باشندہ ہے۔ ہندوستان کے انگریزی حکام اور دیسی رعایا میں نشست و برخاست اور عہدوں کی تقسیم میں جو قومی تفریق باعث تنفر ہے وہ یہاں بالکل نہیں ❊

پانڈی چری کے دفاتر کی زبان فرانسیسی ہے۔ انگریزی دان اس جگہ مشکل

سے ملتا ہے۔ مسلمانوں میں اُردو زبان کا رواج ہے۔ دینی تعلیم کا چرچا بھی اس جگہ ہے لیکن علوم عربیہ سے یہ لوگ بہت کم واقف ہیں۔ دو تین مسجدیں بھی ہیں مگر معمولی۔ ان کی عمارت میں کوئی خصوصیت نہیں۔ یہاں کے مسلمانوں میں منشی عبد العزیز کی ملاقات اور اُن کے والد کے حسن اخلاق سے طبیعت بہت مسرور ہوئی +

پانڈی چری کی عمارات میں سے ڈُپلے کا بُت دیکھنے کے قابل ہے۔ جو ستون دار چبوترہ پر نصب کیا گیا ہے۔ اس چبوترہ کا سامان عمارت جنجی کے قلعہ سے لایا گیا ہے جو ضلع ترچناپلی کی ایک قدیم عمارت ہے۔ ڈُپلے کے بُت سے چند گز کے فاصلہ پر "پلیس دو گورنمنٹ" یعنی گورنمنٹ ہاؤس کی خوشنما عمارت ہے اس کے عین وسط میں ایک عجیب و غریب مستطیل عمارت ہے جو درحقیقت ایک فوارہ ہے اس پر کسی غیر زبان میں کچھ لکھا ہوا ہے +

پانڈی چری باوجودیکہ ایک چھوٹا سا شہر ہے۔ مگر فرانسیسی گورنمنٹ کے علمی شوق سے یہاں ایک اعلےٰ درجہ کا شاہی کتب خانہ ہے۔ جس میں تقریباً تیرہ ہزار کتابیں موجود ہیں۔ اس میں بعض نادرالوجود تاریخیں۔ مشاہیر دنیا کی یادداشتیں اور سفرنامے بھی ہیں +

پانڈی چری میں دو دن قیام کرنے کے بعد میں مدراس کو واپس چلا آیا۔ جس سٹیشن پر گورنمنٹ انگریزی کی حد ملتی ہے۔ پانڈی چری کو جاتے وقت تو وہاں کسی نے دیکھ بھال یا روک ٹوک نہیں کی تھی۔ مگر واپسی کے وقت مسافروں کے مال کی تلاشی ہوئی۔ اور اشیائے قابل محصول پر چُنگی لی گئی +

ترچناپلی

مَیں مدراس سے ۲۵۴ میل طے کرنے کے بعد ترچناپلی آیا۔ یہ شہر دریائے کاویری کے دائیں کنارے پر آباد اور سمندر سے ۵۶ میل کے فاصلہ پر ہے۔ اس کی تاریخی دلچسپیوں کا زمانہ مسیح سے پیشتر بیان کیا جاتا ہے۔ سولھویں صدی عیسوی کے آخر میں یہ شہر نیاکن شاہان مدورا کے قبضہ میں تھا۔ جنہوں نے مدورا کو چھوڑ کر پایہ تخت بنایا۔ اٹھارھویں صدی میں اس کو خاص شہرت کرناٹک کی اُن لڑائیوں کے باعث ہوئی جو انگریزوں اور فرانسیسوں کے مابین مدت تک جاری رہیں۔ اب بھی یہ شہر اچھی ترقی پر ہے۔ پریسیڈنسی کے شہروں میں مدراس کے بعد اس کا دوسرا نمبر اور وسعت کے اعتبار سے تمام ہندوستان میں پچیسواں نمبر ہے۔

حرفت وصنعت کو یہاں خوب ترقی ہے۔ خصوصاً سونے چاندی کے زیورات نہایت خوشنا بنتے ہیں۔ ململ اور اس پر چھپائی کا کام بھی عمدہ ہوتا ہے بعض کپڑے ریشم اور سُوت کو ملا کر بہت اچھے بنائے جاتے ہیں۔ ترچناپلی کے ضلع میں ایک خاص قسم کا سنگ مرمر برآمد ہوتا ہے۔ اس کی دواتیں۔ پیپرویٹ اور میزوں کی آرائش کی بعض چیزیں یہاں بہت خوبصورت بنتی ہیں۔ اور اطراف وجوانب سے ہمیشہ ان کی مانگ رہتی ہے۔ خاص ترچناپلی میں سب سے بڑا کام سبگار بنانے کا ہوتا ہے۔ اور یہاں کی آبادی کا بڑا حصہ اسی وسنگاری میں مصروف ہے

مسلمانوں کی علمی حالت بہت تنزّل پر ہے۔ انہوں نے انگریزی تعلیم سے بہت کم فائدہ حاصل کیا ہے۔ اُردو زبان جو اس وقت ہندوستان بھر

مشرقی مندر۔ ترچناپلی
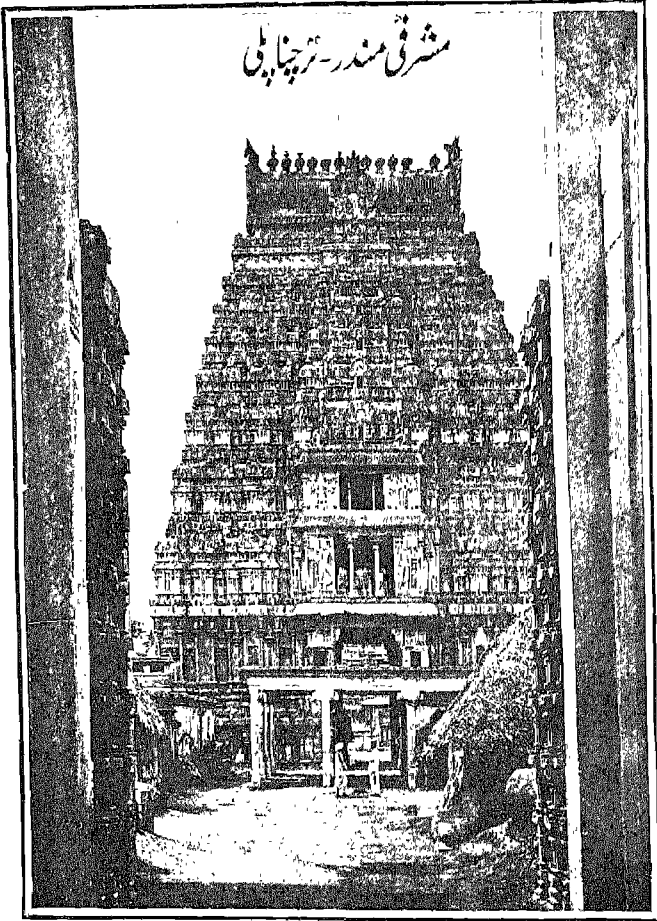
ہیں مسلمانوں کی قومی زبان تسلیم ہو چکی ہے ۔ اس کے سمجھنے والے بھی یہاں
کم ہیں +

عمارات قدیمہ کے لحاظ سے جو چیزیں ایک سیاح کی دلچسپی کا باعث
ہو سکتی ہیں ۔ وہ دو ہیں :-

(۱) ایک پہاڑی جو سطح زمین سے ۲۷۴ فٹ بلند اور اس پر قدیم
زمانہ کی کچھ عمارتیں باقی ہیں ۔ اس کا نظارہ نہایت دلکش اور ہندوستان
کی دلفریب چیزوں میں شمار کیا گیا ہے ۔ اس پر چڑھنے کے لئے پہاڑی
کاٹ کاٹ کر ستون دار رستہ بنایا ہے اور درمیان میں بعض بڑے بڑے
ستونوں پر عظیم الشان مورتیں تراشی ہوئی ہیں +

(۲) سری رنگ جی کا عظیم الشان مندر جو شہر کے سامنے اور دریائے
کاویری کے ایک جزیرہ میں بنا ہوا ہے ۔ اس کی بیرونی دیوار کا دور تقریباً
چار میل ہوگا ۔ اس دیوار کے اندر ساڑھے تین تین سو فٹ کے فاصلہ پر چھ
دیواریں یکے بعد دیگرے اور ہیں ۔ غرض سات دیواروں کے طے کرنے
کے بعد مندر تک رسائی ہوتی ہے ۔ اس مندر کا کلس طلائی ہے اور ان
دیواروں کے درمیان جا بجا مکانات ۔ دکانیں اور دھرم سالہ بنے ہوئے ہیں
ان میں سے ایک دھرم سالہ ہزار ستون کا ہے +

ٹوٹی کورن

میں ترچنا پلی سے ٹوٹی کورن پہنچا ۔ مدراس اور ٹوٹی کورن میں ۴۴۳
میل کا فاصلہ ہے ۔ موتی نکالنے کا کام قدیم زمانہ سے یہاں ہوتا ہے ۔ لنکا
جانے والے مسافر یہیں سے جہازوں پر سوار ہوتے ہیں ۔ اس کی عمارتیں معمولی اور اس پر

مزید قباحت یہ ہے کہ دھوپ میں حد سے زیادہ گرد اڑتی ہے اور بارش میں کیچڑ کی کچھ انتہا نہیں رہتی - اگرچہ اس کی آبادی سترہ ہزار سے زیادہ نہیں - مگر غیر ممالک کی تجارت کے اعتبار سے ہندوستان کے بندرگاہوں میں اس کا چھٹا نمبر ہے - ہر سال تقریباً بیس لاکھ روپے کی درآمد برآمد ہوتی ہے یہاں سے چاول - روئی - کافی - شکر - مویشی - گھوڑے - بھیڑیں - مرغیاں وغیرہ زیادہ تر لنکا کو جاتی ہیں +

ٹوٹی کورن سے ہر روز ایک جہاز کولمبو کو جاتا ہے - دونو مقامات میں صرف ڈیڑھ سو میل کا فاصلہ ہے اور بحری سفر سولہ گھنٹے میں ختم ہوتا ہے - کولمبو اور قلعہ آدم کے حالات اس کتاب کے دوسرے حصہ میں لکھے جائینگے جس کا نام "جزائر مشرقی" ہے +

ویلور

مدراس سے بنگلور جاتے ہوئے مجھے ویلور دیکھنے کا اتفاق ہوا - یہ مدراس سے ۸۷ میل اور کاٹ پاڈی ریلوے اسٹیشن سے چار میل کے فاصلے پر ہے - سترھویں صدی مسیحی سے ڈیڑھ سو برس تک دکن کے صوبیداروں - مرہٹوں اور نوابان کرناٹک کا رزمگاہ رہا - اس وقت شمالی ارکاٹ میں حصہ ضلع کا صدر مقام اور تقریباً ۴۴ ہزار نفوس کی آبادی ہے +

شہر کے بازار معمولی اور عمارتیں متوسط درجہ کی ہیں - خوشبودار پھولوں کی کاشت خاص طور پر یہاں ہوتی ہے اور ان کے کئی گٹھے ریل کے ذریعے مدراس کو روزانہ بھیجے جاتے ہیں +

مشرقی علوم کا ایک بڑا مدرسہ "باقیات الصالحات" اس جگہ قائم ہے جس

ہیں وہ سب علوم پڑھائے جاتے ہیں جو شمالی ہند کے عربی مدرسہ* دیوبند میں داخلِ
درس ہیں۔ صوبہ کے مسلمان تاجروں نے ملکر تقریباً ڈیڑھ لاکھ روپیہ اس کے
واسطے فراہم کیا۔ چالیس ہزار روپے عمارتوں پر صرف کیے اور ایک لاکھ روپیہ
بطور سرمایہ کے محفوظ رکھا۔ مدرسہ کی عمارت بہت عمدہ اور اس کے ساتھ ایک
بورڈنگ ہؤس ہے۔ یہاں کے تعلیم یافتہ تمام دکن میں مستند مانے جاتے ہیں
تھوڑے عرصہ سے چند مسلمان تاجروں نے ایک پیر صاحب کی درگاہ کے
ساتھ اسی قسم کا ایک اور مدرسہ جاری کیا ہے۔ اس کی عمارت پہلے سے زیادہ
عالیشان اور وسیع ہے۔ مگر طالب علم تھوڑے اور تعلیمی حالت غیر تسلّی بخش۔ ایک
متوسط شہر میں ایک ہی قسم کے دو متحد الغرض مدرسوں کا علیحدہ علیحدہ قائم ہونا
ایسا نظارہ ہے جس کی ایک جانب مسلمانوں کے تموّل اور دینی محبت اور
دوسری جانب ضروریات زمانہ سے ناواقفیت اور باہمی نااتفاقی کی جھلک
دکھائی دیتی ہے +

عمارات قدیمہ میں سے یہاں کا قلعہ قابل دید ہے۔ اس کی فصیل اس قدر
مستحکم اور خندق ایسی عمیق ہے کہ جنوبی ہند کی جنگی عمارتوں میں یہ اعلےٰ نمونہ
سمجھا جاتا ہے۔ اس میں ایک مندر بہت عمدہ بنا ہؤا ہے اس کے دروازہ
کی ڈیوڑھی پر جو مورتیں تراش کر بنائی ہیں۔ وہ خوبی اور خوشنمائی میں بے مثل
ہیں۔ ایک مسجد بھی معمولی عمارت کی ہے۔ ٹیپو سلطان کے مارے جانے کے
بعد چند سال تک اُن کی اولاد اس قلعہ میں مقیم تھی۔ مگر ۱۸۰۶ء میں ایک شورش
برپا ہونے کی وجہ سے کلکتہ کو منتقل کی گئی۔ اس وقت سول کے دفاتر اور پولیس
ٹریننگ سکول اس جگہ ہے +

* مدرسہ دیوبند کے حالات صفحہ ۲۴۹ میں درج ہو چکے ہیں + مؤلف

بنگلور

ویلور سے میں بنگلور آیا۔ مدراس یہاں سے ۲۱۹ میل اور بمبئی ۷۴۴ میل ہے۔ سترھویں اور اٹھارھویں صدی مسیحی میں اس کو کئی حوادث کا مقابلہ کرنا پڑا۔ ۱۷۹۹ء میں انگریزوں کی آخری فوج کشی تھی جس سے ٹیپو سلطان کی ریاست کا خاتمہ ہوگیا۔ اس وقت یہ شہر مہاراجہ صاحب میسور کے زیر حکم اور ریاست کے دفاتر کا صدر مقام ہے۔ اس کی اور انگریزی چھاؤنی کی مردم شماری ایک لاکھ ۵۹ ہزار ہے جس میں سے شہر کی آبادی ۶۹ ہزار ہے + شہر کی سڑکیں اور بازار مصفّا ہیں۔ تجارتی کاروبار کو خوب ترقی ہے۔ روئی سُوت۔ اُون۔ نیل اور صابون کے بڑے بڑے کارخانے ہیں تعلیم بھی اچھی حالت میں ہے۔ اور سب سے بڑی درسگاہ سنٹرل کالج ہے علمی حیثیت سے اس شہر کو عنقریب "انڈین انسٹیٹیوٹ آف ریسرچ" کے قیام کا فخر حاصل ہونیوالا ہے جس کے واسطے بمبئی کے ایک علم دوست پارسی مسٹر ٹاٹا نے ۳۰ لاکھ روپے عطا کئے تھے۔ اس میں صرف گریجوایٹوں کو علوم سائنس کی تعلیم دی جائیگی۔ ریاست نے بھی پانچ لاکھ روپے اسکی امداد کے واسطے منظور کئے ہیں +

بیرون شہر کئی باغات اور عمدہ عمدہ عمارتیں ہیں جن میں سے۔ مہاراجہ صاحب کا محل۔ قلعہ۔ لال باغ اور کبن پارک قابل دید ہیں۔ لال باغ بہت وسیع اور اس میں انواع واقسام کے پودے اور درخت علمی اصول پر لگائے ہیں۔ علم نباتات کے طالب علموں کو ان درختوں کا مطالعہ نہایت مفید ہے۔ یہ باغ وسعت کے لحاظ سے تمام دکن میں اوّل درجہ کا ہے۔ مگر خوبصورتی میں حیدرآباد کے باغ عامہ کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ کبن پارک بھی وسیع ہے اور

اس میں شہر کے لوگ شام کے وقت سیر کو جاتے ہیں - سرکاری دفاتر
کا یہی مرکز ہے +

چھاؤنی

انگریزی چھاؤنی شہر سے دو میل مشرق کی طرف تیرہ مربع میل رقبہ
میں پھیلی ہوئی ہے - یہ رقبہ گورنمنٹ انگریزی نے سنہ ۱۸۸۱ء میں سری رنگ پٹن
کے تبادلہ میں مہاراجہ صاحب سے لیا تھا - اس کی مردم شماری ۸۹ ہزار ہے
یہ چھاؤنی بہت بارونق اور اس میں انگریزی اور دیسی فوجیں بکثرت ہیں +

مسلمانوں کی آبادی شہر کی نسبت یہاں زیادہ ہے - اور اکثر لوگ خوشحال
ہیں - مسلمانوں کی طرف سے ایک انجمن اور ایک یتیم خانہ قائم ہے - یہ دونو
علیحدہ علیحدہ کمیٹیوں کی سرپرستی میں چل رہے ہیں اور سرمایہ کافی ہے - خاصکر انجمن کا
انتظام بہت عمدہ ہے - اور اس کے ساتھ ایک ریڈنگ روم بھی ہے جس
میں کتابیں اور اخبار شائقین کے واسطے موجود رہتے ہیں - کچھ مدت پیشتر
ایک اخبار منشور محمدی ردّ نصاریٰ میں یہاں سے نکلا کرتا تھا - اخبار تو اس وقت
کوئی نہیں مگر اُردو کے دو تین معمولی چھاپے خانے ہیں - حافظ سید مجو صاحب کا فردوسی پریس
اچھی حالت میں ہے - حافظ صاحب بہت بااخلاق اور مسافرنواز ہیں +

میسور

بنگلور اور میسور میں ۸۶ میل کا فاصلہ ہے - یہ شہر ہندوستان کے
اُن شہروں میں شمار کیا جاتا ہے جن کی بنیاد حضرت مسیح سے پیشتر قائم ہوئی
تھی - اس وقت ریاست میسور کا دارالحکومت اور ۶۸ ہزار کی مردم شماری
ہے +

یہاں کے بازار بہت لمبے چوڑے اور سڑکیں مصفّا ہیں - سوتی کپڑا

کمبل۔ تانبے کے برتن اور شکر کا کام کثرت سے ہوتا ہے۔ تجارتی لین دین زیادہ تر بنگلور اور مدراس سے ہے۔ تجارت پیشہ اکثر مسلمان سوداگر اور خوشحال ہیں۔ قدامت پسندی کے ساتھ دینداری ان پر غالب ہے +

تعلیم کا انتظام اچھا ہے۔ سب سے بڑی درسگاہ مہاراجہ کالج ہے۔ یہاں کے نورمل سکول میں یہ خاص بات دیکھنے میں آئی کہ مہاراجہ صاحب کی بےتعصبی اور فیاضی سے ہندوؤں اور مسلمانوں میں عام تعلیم کی اشاعت کے واسطے نورمل سکول کے دو علیحدہ علیحدہ درجے ہیں۔ ایک درجہ میں ہندوؤں کو کنٹری زبان میں اور دوسرے درجہ میں مسلمانوں کو اُردو زبان میں علوم پڑھائے جاتے ہیں۔ علاوہ بریں ہندوؤں کو سنسکرت میں لیاقت بڑھانے کے واسطے پنڈت کلاس اور مسلمانوں کو عربی فارسی میں مہارت حاصل کرنے کی غرض سے مولوی کلاس قائم کی ہے۔

یہاں کے مدرسین میں مولوی مظہر حسن خاں ٹونکی اور مولوی سکندر دین صاحب پنجابی ہیں

یہاں کی عمارتوں میں مہاراجہ صاحب کا محل سب سے عمدہ ہے۔ پُرانا محل ۱۸۹۷ء میں جل گیا تھا۔ اب یہ نیا محل نئے نمونہ پر صرف کثیر سے تیار ہوا ہے اور بہت عالیشان ہے۔ دیواروں پر خوشنما پتھر لگے ہوئے ہیں۔ اور ستونوں پر طلائی کام بہت عمدگی سے کیا ہے۔ صندل کی لکڑی پر جو ہاتھی دانت کا کام کیا ہے وہ بہت ہی نفیس ہے +

میسور کے فرمانروا ہز ہائنس مہاراجہ کرشن راج اودیار صاحب بہادر ہیں جن کی خوش انتظامی کی تمام ہندوستان میں شہرت ہے مگر انتظامی کاروبار میں انگریزی کارکن زیادہ اور اختیارات میں انہی کا پلّہ بھاری ہے +

سری رنگ پٹن

میسور سے ایک دن کے واسطے مَیں اس جگہ آیا۔ مولوی سکندر دین

محل قلعہ - میسور
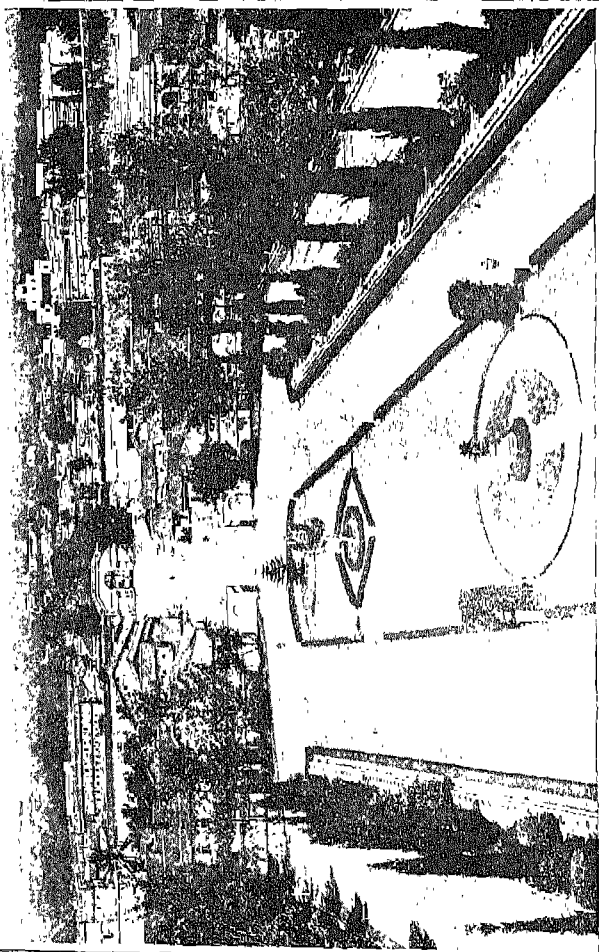
مقبرہ نواب حیدر علی و ٹیپو سلطان
سری رنگاپٹن
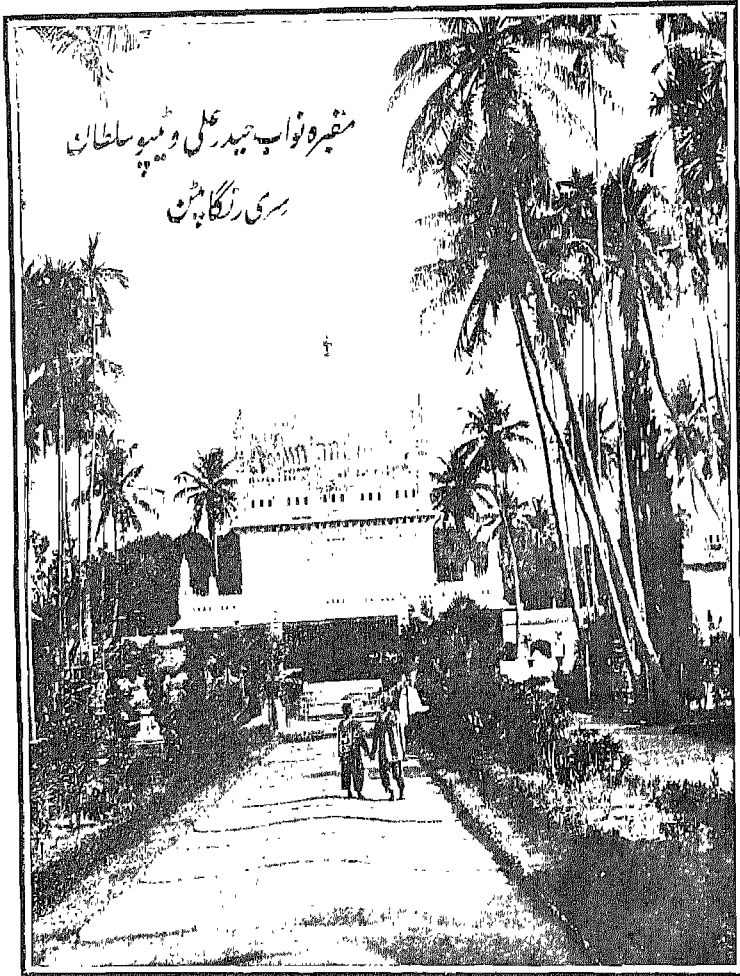
اور مولوی مظہر حسن خان صاحب میرے شریک سفر تھے۔ ان صاحبوں کی مہربانی سے سری رنگ پٹن کی سیر کا اچھا موقع ملا +

یہ شہر میسور سے نو میل کے فاصلہ پر دریائے کاویری کے ایک جزیرہ میں آباد ہے جس کا طول تین میل اور عرض ایک میل ہے۔ ریل کی سڑک شہر میں سے ہو کر گزرتی ہے۔ نواب حیدر علی خان اور ٹیپو سلطان کے زمانہ میں (جو ۱۷۶۱ء سے ۱۷۹۹ء تک میسور کے فرمانروا تھے) یہ شہر بہت آباد اور ریاست میسور کا دارالخلافہ تھا۔ اب ریاست کا ایک معمولی قصبہ اور تقریباً نو ہزار کی مردم شماری ہے +

سری رنگ پٹن کی موجودہ شہرت کا ذریعہ وہ معرکہ آرا لڑائیاں ہیں جو اٹھارھویں صدی مسیحی کے آخری حصہ میں سرکار انگریزی اور ٹیپو سلطان کے درمیان ہوئی تھیں۔ اس زمانہ کی ٹوٹی پھوٹی تاریخی عمارتیں دیکھنے کو اکثر سیاح آتے ہیں شکستہ فصیل۔ آرچ (محراب)۔ رانگا کا مندر۔ جامع مسجد۔ دریا دولت اور ٹیپو سلطان کا مقبرہ یہاں کی قابل دید عمارتیں ہیں +

دریا دولت قلعہ کے باہر ایک محل ہے جس میں ٹیپو سلطان موسم گرما میں رہا کرتا تھا۔ اس کی دیواروں پر طلائی اور نقرئی نقش و نگار ہیں۔ ایک دیوار پر نواب حیدر علی خان۔ ٹیپو سلطان اور کرنیل بیلی کی لڑائیوں کا نقشہ ہے جس میں انگریزوں کو شکست ہوئی تھی۔ دوسری دیوار پر نظام حیدرآباد۔ شاہ دہلی۔ نواب کرنول۔ راجا تنجور۔ راجا بنارس۔ راجا کورگ۔ مہاراجہ میسور اور دیگر فرمانرواؤں کی بہت عمدہ تصویریں بنی ہوئی ہیں +

ٹیپو سلطان کا مقبرہ شہر سے تین میل کے فاصلہ پر لال باغ میں ہے اس کے اندر نواب حیدر علی خاں۔ ٹیپو سلطان اور اس کی والدہ کی قبریں ہیں

مقبرہ کی عمارت بہت عمدہ اور اس کے کواڑوں پر ہاتھی دانت کا کام کیا ہے۔
یہ کواڑ لارڈ ڈلہوزی نے ٹیپو سلطان کی یادگار ہیں کلکتے سے بھیجے تھے۔ مقبرہ
کے متعلق کچھ لوازم شاہی مثل چنور۔ مورچھل۔ آفتاب گیری۔ شامیانے اور
قالین یہاں موجود ہیں جو اوقات مقبرہ پر متوفیان کی شان و شوکت کے اظہار
کا ذریعہ ہوتے ہیں +

مقبرہ اور سری رنگ پٹن کی جامع مسجد کو یہاں کی اصطلاح میں علاقتین
کہتے ہیں۔ ان دونو کے مصارف کے واسطے تقریباً ایک ہزار روپیہ ماہوار
اور عرس و فاتحہ کے واسطے دو ہزار روپے سالانہ ریاست کے خزانہ سے
ملتے ہیں۔ مولوی عبدالخالق صاحب امیر تخلص علاقتین کے ناظم ہیں انہوں
نے اپنے نام اور تخلص کے متعلق ایک شعر سنایا جو خالی از دلچسپی نہیں ؎

از ہمہ آزاد و ہستم ہستی خود را اسیر خالقم در خلق و ہم در فقر ہیباشم امیر

کولھاپور

یہ شہر بنگلور اور پونہ کے راستہ میں مرج جنکشن سے ۳۰ میل کے فاصلہ
پر ہے اور مرہٹہ خاندان کا ایک راجا اس پر حکمران ہے۔ مجھے کولھاپور آنے
سے صرف اس مسجد کے حالات کا دریافت کرنا مد نظر تھا جس کی بنسبت شمالی ہند
کے اخبارات میں لمبی چوڑی مراسلتیں شائع ہو چکی تھیں۔ خلاصہ ان مراسلتوں کا یہ ہے
کہ راجا صاحب نے ایک مسجد ضبط کر لی۔ مسلمانوں کو نماز پڑھنے سے روک
دیا۔ پوجا پاٹھ کے واسطے ایک بت اس میں رکھ دیا۔ اور مسجد سے اصطبل کا
کام لینا شروع کیا۔ اس مسجد کی عمارت وسیع اور بہت مستحکم ہے اور غالباً
عادل شاہی زمانہ کی بنی ہوئی ہے۔ اس کے اردگرد مسلمانوں کی کوئی آبادی

نہیں۔ اس وقت راجا صاحب کا غلّہ اس میں رکھا جاتا ہے۔ مسلمانوں کو اُس میں نماز پڑھنے کی اجازت نہیں لیکن یہ مسجد راجا صاحب حال نے ضبط نہیں کی بلکہ اُن کے دادا کے زمانہ سے ریاست کے قبضہ میں چلی آتی ہے ...بھی مسجد کے اندر نہیں بلکہ صحن کے باہر احاطہ میں رکھا ہُوا ہے۔ احاطہ کے دائیں طرف کے حجروں میں بگھی خانہ اور بائیں طرف کسی بزرگ کا مزار بیش قیمت غلافوں سے آراستہ ہے۔ اس مسجد کے تفصیلی حالات میں نے اُنہی دنوں اخبار وطن لاہور میں شائع کرادئے تھے ؛

مسجد کی حمایت کرنا بیشک مسلمانوں کا فرض ہے۔ مگر مجھے اپنے اس طولانی سفر میں معلوم ہُوا کہ مساجد کی ہتک کے مُلزم کچھ ہندو ہی نہیں بلکہ مسلمانوں نے بھی کئی جگہ مسجدوں کی ناگفتہ بہ حالت کر رکھی ہے۔ احمد آباد (گجرات) میں کسی پیرزادہ نے ایک مسجد تیس روپے ماہوار پر ایک انگریز کو کرایہ دے رکھی ہے۔ احمد نگر (دکن) میں متولی نے ایک مسجد ہندوؤں کے پاس گرو کر دی ہے جس میں اس وقت انگریزی اور شاستری کا کتب خانہ ہے۔ اجمیر کی اکبری مسجد کا ایک ... مجاوروں نے علیحدہ کر کے اُس کو مال گودام بنا دیا ہے۔ ان مساجد کے متعلق میری ایک مفصّل تحریر روزانہ پیسہ اخبار لاہور میں شائع ہو چکی ہے ؛

غیرت مند مسلمانوں کو چاہیے کہ پہلے ان ظالم مسلمانوں کے قبضے سے مسجدیں نکلوائیں۔ جب اُن کی مستعدّی اور دینی جوش با اثر ثابت ہو تو نہیں کولھاپور۔ الور۔ لاہور اور دیگر مقامات کی مسجدوں کا ہندوؤں سے چھڑانا آسان ہو جائیگا ؛

کولھاپور میں مسلمانوں کی آبادی فی الجملہ خاصی ہے۔ اعلےٰ تعلیم کا انتظام کالج تک ہے۔ راجا صاحب کی طرف سے مسلمان طالب علموں کے ساتھ کچھ رعایت

بھی کی جاتی ہے۔ مگر یہ لوگ تعلیم سے غافل ہیں ٭

شمالی ہند کے باشندوں میں سے مولوی سعید اللہ خاں۔ ایک صاحب عبداللہ خاں اور لالہ کنج لال دلوالی ایم اے پروفیسر فارسی راجارام کالج قابل ملاقات ہیں ٭

پُونہ

کولھاپور سے براہ ج ۱۹۰ میل طے کرنے کے بعد میں پُونہ آیا۔ سترھویں صدی مسیحی تک یہ ایک معمولی گاؤں تھا۔ اس کی ترقی ابتدا اُس وقت سے ہے جبکہ پیشوا نے مرہٹوں کا پایۂ تخت قرار دیا۔ مغلیہ سلطنت کے ضعف اور مرہٹوں کی شوکت کے زمانہ میں پُونہ کو خوب ترقی ہوئی۔ چنانچہ فرانس کا ایک سیّاح انکیٹل دو پیرون جب ۱۷۵۸ء میں اس جگہ آیا۔ تو یہ شہر بہت رونق پر تھا۔ سیّاح مذکور لکھتا ہے کہ "پُونہ ایک خوبصورت شہر ہے۔ اس کی آبادی کوئی چھ لاکھ سے زیادہ اور مکانات تقریباً ایک لاکھ ۴۰ ہزار ہیں۔ فوجی کاروبار کو اس قدر ترقی ہے کہ پیشوا کے کارخانوں میں ۳۶ اور ۴۲ رطل کی توپیں بنائی جاتی ہیں" ۱۸۱۷ء سے یہ انگریزوں کے قبضہ میں ہے۔ اس سے چند سال بعد قحط سالی نے باشندوں کو اس قدر ستایا کہ لوگ گھر چھوڑ کر بھاگ گئے اور آبادی پچاس ہزار رہ گئی۔ اب پچاس برس سے اس کی حالت پھر رو بہ ترقی ہے۔ آب و ہوا کی عمدگی اور زمین کی سرسبزی سے یہ شہر گورنر بمبئی کا گرمائی صدر مقام اور گورنمنٹ کے تمام بڑے بڑے دفاتر کا مرکز ہے۔ بمبئی پریزیڈنسی کی فوجوں کا ہیڈ کوارٹر بھی اسی جگہ ہے۔ اس کی مردم شماری ایک لاکھ ۵۳ ہزار ہے ٭

موجودہ آبادی کے دو حصّے ہیں۔ ایک پُونہ اور دوسرا صدر بازار یا لشکر

پونا کی عمارتوں سے صدر کی عمارتیں زیادہ عمدہ اور اکثر نئی طرز کی بنی ہوئی ہیں - صفائی کا انتظام بھی شہر سے بہتر ہے - شہر میں ہندوؤں کی آبادی اور صدر میں مسلمانوں کی آبادی بیشتر ہے - تجارت کو دونو جگہ روزافزوں ترقی ہے - خاص کر میوہ جات اور ہر قسم کی سبزی بکثرت ہوتی ہے - آم - انجیر اور سبزی کی ایک ٹرین روزمرّہ بمبئی کو جاتی ہے - ریشمی ساڑھیاں - سوتی کپڑا اور کاغذ سازی کا کام دن بدن ترقی پر ہے ؛

شہر سے پانچ چھ میل کے فاصلہ پر گولہ بارود بنانے کا ایک کارخانہ ہے - جہاں سے تمام بمبئی پریزیڈنسی کو سامان جنگ بھیجا جاتا ہے ؛

پونا میں عام تعلیم بہت ترقی پر ہے - اعلےٰ تعلیم کے واسطے تین کالج ہیں جن میں سے دکن کالج اور سائنس کالج گورنمنٹ کے زیر اہتمام اور فرگسن کالج دکنی برہمنوں کا قومی کالج ہے - ان کالجوں خصوصاً فرگسن کالج کی تعلیم نے دکن کے برہمنوں میں قومیّت کی رُوح پھونک دی ہے - مسٹر تلک - مسٹر گوکھلے اور مسٹر پرنج پے جیسے فدائے قوم انہی کالجوں کے تعلیم یافتہ ہیں - مسٹر پرنج پے ہے جو کیمبرج یونیورسٹی کے امتحان سینیر رینگلر میں سب سے اوّل آ کر سرکاری نوکری سے بے پروا ہو کر قومی خدمت کے واسطے پچھتر روپے ماہوار تنخواہ پر اکتفا کی ؛

تھوڑے دنوں سے مسلمانوں نے بھی ایک مدرسہ اسلامیہ سکول کے نام سے صدر بازار میں جاری کیا ہے - منشی قطب الدین خاں صاحب کی توجہ سے مجھے اس کے دیکھنے کا اتفاق ہوا - منشی صاحب با اخلاق اور علم دوست آدمی ہیں - مدرسہ میں اس وقت ابتدائی تعلیم کا انتظام ہے - لڑکے اور لڑکیاں دونو علیحدہ علیحدہ درجوں میں تعلیم پاتی ہیں - اس کے

متعلق ایک چھوٹا سا کتب خانہ اور نیز اخبار بینی کا انتظام بھی ہے۔ انگریزی و مرہٹی کے متعدد اخبارات ہر وقت میز پر موجود رہتے ہیں حصہ رسا دار میں ہاشم سیٹھ چرم فروش نے ایک بہت بڑی مسجد بنا کر اس کے ساتھ یتیم خانہ قائم کیا ہے۔ اس میں یتیم بچوں کی پرورش اور تعلیم کا معقول انتظام ہے +

یہاں کے مرہٹی اخبار بڑے زور کے ہیں۔ خصوصاً کیسری اخبار جو تلک کی اڈیٹری سے شائع ہوتا ہے۔ اُس نے ملک اور قوم میں بڑی [illegible] حاصل کی ہے۔ مسٹر تلک اعلےٰ درجہ کے تعلیم یافتہ ہیں۔ مگر اُن کی [illegible] زیادہ آزادی اُن کی ذات کے واسطے مفید ثابت نہیں ہوئی۔ چنانچہ [illegible] میں جب میں دوسری مرتبہ پُونا سے ہوتا ہوا بمبئی پہنچا تو اُس وقت مسٹر [illegible] کے برخلاف سڈیشن (بغاوت) کا ایک مقدمہ دائر تھا۔ مسٹر تلک نے حسن قابلیت سے اس مقدمہ کی جوابدہی کی۔ بڑے بڑے لائق انکی قانون دانی کی تعریف [illegible] اللسان تھے۔ مگر آخر کار ہائی کورٹ نے چھ برس کی قید بعبور دریائے شور کا حکم صادر کر دیا +

مولوی رفیع الدین احمد

پونہ کے مسلمانوں میں مولوی رفیع الدین احمد [illegible] بیرسٹر ایٹ لا ایک [illegible] شخص ہیں مسلمانوں کی بہبودی کے واسطے کوشش [illegible] اُن کے [illegible] ملک اور قوم کو اُس سے فائدہ پہنچیگا

خدا کے فضل و کرم سے سیاحت سندھ برہ اختتام ہے۔ اگرچہ اس میں ہندوستان کی کیفیت مفصل طور سے لکھی گئی ہے۔ لیکن ایسے وسیع ملک کے حالات میں جس قدر لکھنا چاہئے تھا نہیں لکھا گیا۔ کسی اُستاد کا یہ مصرع گویا میری ہی زبان سے کہا ہے: مصرعہ بپایاں آمد ایں دفتر حکایت ہمچناں باقی +